الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

مول

ور نعمانی

الفرقان
ماہنامہ — لکھنؤ

فی کاپی ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۸/-
ششماہی
ہندوستان سے ۲/۵۰
پاکستان سے ۴/-

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
۱½ پونڈ

جلد ۳۴ | بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۶ھ مطابق مئی ۱۹۶۶ء | شمارہ (۱)

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۵ مئی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

الحمد للہ کہ تینتیسواں سال بھی تمام ہوا اور اس شمارہ سے الفرقان کی چونتیسویں جلد کا افتتاح ہو رہا ہے۔

نئے سال کا آغاز خود بھی قابلِ شکر تھا، مگر یہ ایک مزید نعمت بھی اپنے دامن میں لایا ہے۔ گزشتہ نو مہینے سے ایک ابتلا کا دور چل رہا تھا وہ دور اس سال کے آغاز ہی پر ختم ہوا۔

الفرقان میں تو اگرچہ اس قصے کا ذکر کبھی نہیں آیا۔ مگر دوسرے ذرائع سے شاید سبھی ناظرین کرام واقف ہوں گے کہ یکم اگست ۶۵ء کو ہم لوگوں کے ہفتہ وار "ندائے ملت" پر حکومت یو۔پی نے ڈی، آئی، آر کا ایک زبردست وار کیا تھا جس میں اس کے مخصوص "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر کے پورے ذخیرے کو (جو قریب ۸ ہزار کاپیوں پر مشتمل تھا) قبضے میں کر لینے کے ساتھ ساتھ اسکے پرنٹر و پبلشر حافظ حفیظ الرحمٰن نعمانی (جو راقم کے چھوٹے بھائی ہیں) اور دفتر کے دو ارکان کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ اور اُس وقت سے ۲۶ر اپریل ۶۶ء مطابق ۴ محرم ۸۶ھ تک یہ لوگ مسلسل جیل میں رہے۔ ان کے مقدمہ کے سلسلے کی تگ و دو، اخبار کی مختلف ذمہ داریاں اور جیل کی دوڑ یہ سب چکر نو مہینے تک بیک وقت چلتے رہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اُس نے اس ابتلاء سے خیریت کے ساتھ گزار دیا اور ۲۶ر اپریل کو یہ لوگ اس بنا پر رہا کر دیئے گئے کہ حکومت نے ان کے خلاف مقدمہ واپس لے لیا۔

حضرت مولانا محمد یوسفؒ نمبر پاکستان کے جن خریداروں نے رجسٹری فیس بھیجدی تھی اُن سب کی کاپیاں روانہ کی جا چکی ہیں، باقی حضرات کو بعض دقتوں کی بنا پر اب تک نہیں جا سکا اب روانہ کیا جا رہا ہے۔

خاص خاص سورتوں اور آیتوں کے فضائل

معارف الحدیث

(مسلسل)

سورۃ الکہف:-

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَأَ سُوْرَۃَ الْکَہْفِ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ اَضَاءَ لَہُ النُّوْرُ مَا بَیْنَ الْجُمُعَتَیْنِ ــــــــ رواہ البیہقی فی الدعوات الکبیر

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھے اس کے لیے (یہ) روشن ہو جائے گا دو جمعوں کے درمیان۔ (دعوات الکبیر للبیہقی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ کہف کو جمعہ کے دن کے ساتھ کوئی خاص مناسبت ہے جس کی وجہ سے اس دن میں اس کی تلاوت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ ترغیب دی ہے اور فرمایا ہے کہ جمعہ کے دن سورۂ کہف کے پڑھنے سے قلب میں ایک خاص نور پیدا ہوگا جس کی روشنی اور برکت اگلے جمعہ تک رہے گی۔ اس حدیث کو حاکم نے بھی مستدرک میں روایت کیا ہے اور کہا ہے "ھذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ"۔

ایک دوسری حدیث میں (جس کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے) سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ جو ان کو یاد کرلے گا اور پڑھے گا وہ دجال کے

فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ اس کی توجیہ میں شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ سورۂ کہف کے ابتدائی حصہ میں جو تمہیدی مضمون ہے اور اسی کے ساتھ اصحاب کہف کا جو واقعہ بیان فرمایا گیا ہے اس میں ہر دجالی فتنہ کا پورا توڑ موجود ہے۔ اور جس دل کو ان حقائق اور مضامین کا یقین نصیب ہو جائے جو کہف کی ان ابتدائی آیتوں میں بیان کیے گئے ہیں وہ دل کسی دجالی فتنہ سے کبھی متاثر نہ ہوگا۔ اسی طرح اللہ کے جو بندے ان آیتوں کی اس خاصیت اور برکت پر یقین کرتے ہوئے ان کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ کریں گے اور اُن کی تلاوت کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو بھی دجالی فتنوں سے محفوظ رکھے گا۔

سورۂ الاعلیٰ:-

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ هٰذِهِ السُّوْرَةَ "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى"۔

رواہ احمد

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سورہ (سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى) خاص طور سے محبوب تھی۔ (مسند احمد)

(تشریح) کتاب الصلوٰۃ میں وہ حدیثیں گزر چکی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز میں اور اسی طرح عیدین کی نماز میں اکثر پہلی رکعت میں "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى" پڑھتے تھے۔ آپ کا یہ معمول اسی لیے تھا کہ یہ سورۃ اپنے خاص مضمون اور پیغام کے لحاظ سے آپ کو زیادہ محبوب تھی۔

سورۃ التکاثر:-

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا يَسْتَطِيْعُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّقْرَءَ اَلْفَ اٰيَةٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ؟ قَالُوْا وَمَنْ يَّسْتَطِيْعُ اَنْ يَّقْرَاَ اَلْفَ اٰيَةٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ. قَالَ اَمَا يَسْتَطِيْعُ

اَحَدُکُمْ اَنْ یَّقْرَأَ اَلْھَاکُمُ التَّکَاثُرُ ــــــ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی یہ نہیں کر سکتا کہ روزانہ ایک ہزار آیتیں قرآن پاک کی پڑھ لیا کرے؟ صحابہ نے عرض کیا، حضور کس میں یہ طاقت ہے کہ روزانہ ایک ہزار آیتیں پڑھے (یعنی یہ بات ہماری استطاعت سے باہر ہے) آپ نے ارشاد فرمایا کیا تم میں کوئی اتنا نہیں کر سکتا کہ سورۂ "الھاکم التکاثر" پڑھ لیا کرے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

تشریح) قرآن مجید کی بعض بہت چھوٹی سورتیں ایسی ہیں جو اپنے مضمون اور پیغام کی اہمیت کی وجہ سے سیکڑوں یا ہزاروں آیتوں کے برابر ہیں، انہی میں سے سورۂ تکاثر بھی ہے، اس میں دنیا پرستی اور آخرت فراموشی پر سخت ضرب لگائی گئی ہے اور آخرت کے محاسبہ اور دوزخ کے عذاب کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ اگر دل بالکل مردہ نہ ہوگیا ہو تو اس میں فکر اور بیداری پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً اسی لحاظ سے اسکے پڑھنے کو ہزار آیتیں پڑھنے کے قائم مقام بتایا ہے ــــ آگے درج ہونے والی بعض حدیثوں میں جن دوسری چھوٹی چھوٹی سورتوں کو نصف قرآن یا تہائی قرآن، یا تہائی قرآن کے برابر بتایا گیا ہے۔ ان کے بارہ میں بھی اسی طرح سمجھ لینا چاہیے، اور ممکن ہے کی تلاوت کا ثواب بھی اسی حساب سے زیادہ عطا فرمایا جائے ــــ اللہ کا خزانہ ہمارے وہم و گمان سے زیادہ وسیع ہے۔

سورۂ زلزال، سورۂ کافرون، سورۂ اخلاص:-

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ وَ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اِذَا زُلْزِلَتْ" تَعْدِلُ نِصْفَ الْقُرْاٰنِ وَ "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ وَ "قُلْ يَا اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" تَعْدِلُ رُبُعَ الْقُرْاٰنِ ــــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سورۂ "اذا زلزلت" نصف قرآن
کے برابر ہے اور "قل ھو اللہ احد" تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اور "قل یا
ایُّھا الکٰفِرُون" چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) سورۂ "اذا زلزلت" میں قیامت کا بیان اور اس کی منظر کشی نہایت ہی مؤثر انداز میں کی گئی ہے اور اسی طرح اس کی آخری آیت "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ" میں جزا و سزا کا بیان اختصار کے باوجود ایسے مؤثر پیرایہ میں کیا گیا ہے کہ اگر اس موضوع پر پوری کتاب بھی لکھی جائے تو اس سے زیادہ مؤثر نہ ہوگی۔ غالباً اس سورت کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس حدیث میں اس کو نصف قرآن کے برابر بتایا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ اخلاص (قل ھو اللہ احد) میں انتہائی اختصار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی تنزیہہ، اور اس کا صفاتی کمال جس معجزانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی اس سورت کی خصوصیت ہے اور غالباً اسی کی وجہ سے اس کو تہائی قرآن کے برابر فرمایا گیا ہے۔ اور "قل یا ایُّھا الکٰفِرُون" میں واشگاف طریقہ پر شرک اور اہل شرک سے برائت اور بیزاری کا اعلان کر کے جس طرح خالص توحید کی تعلیم دی گئی ہے جو دین کی جڑ بنیاد ہے وہ اس سورت کی خصوصیت ہے اور غالباً اسی کی وجہ سے اس سورت کو اس حدیث میں چوتھائی قرآن کے برابر کہا گیا ہے واللہ اعلم۔

عَنْ فَرْوَةَ بْنِ نَوْفَلٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِّمْنِيْ شَيْئًا اَقُوْلُهٗ اِذَا اَوَيْتُ اِلٰى فِرَاشِيْ فَقَالَ اِقْرَأْ "قُلْ يَا اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" فَاِنَّهَا بَرَاءَةٌ مِّنَ الشِّرْكِ۔

—— رواہ الترمذی، ابوداؤد والنسائی

فروہ بن نوفل اپنے والد ماجد نوفل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ
انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی چیز پڑھنے کو

بتا دیجئے جس کو میں سوتے وقت بستر پر پڑھ لیا کروں۔ آپ نے فرمایا "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ" پڑھ لیا کرو، اس میں شرک سے برارت ہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی)

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيَعْجِزُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَقْرَأَ فِي لَيْلَةٍ ثُلُثَ الْقُرْآنِ قَالُوا وَكَيْفَ يَقْرَأُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ قَالَ قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ يَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ ـــــ رواہ مسلم و رواہ البخاری عن ابی سعید (و روی الترمذی عن ابی ایوب الانصاری بمعناہ)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی اس سے بھی عاجز ہے کہ ایک رات میں تہائی قرآن پڑھ لیا کرے! صحابہ نے عرض کیا کہ رات میں تہائی قرآن کیسے پڑھا جا سکتا ہے ـــ حضور نے ارشاد فرمایا کہ "قل ھو اللہ احد" تہائی قرآن کے برابر ہو (تو جس نے رات میں وہی پڑھی اس نے گویا تہائی قرآن پڑھ لیا) (صحیح مسلم)

اور امام بخاری نے یہی حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور امام ترمذی نے اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي أُحِبُّ هٰذِهِ السُّورَةَ قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ قَالَ إِنَّ حُبَّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ ـــ

ـــــــــ رواہ الترمذی و روی البخاری معناہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت مجھے یہ سورت "قل ھو اللہ احد" خاص طور سے محبوب ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اس سورت کے ساتھ تمہاری یہ محبت تم کو جنت میں پہونچا دے گی۔ (جامع ترمذی)

(الفاظ و عبارت کے کچھ فرق کے ساتھ اسی مضمون کی حدیث امام بخاری نے بھی روایت کی ہے)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلاً یَقْرَأُ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ فَقَالَ وَجَبَتْ قُلْتُ وَمَا وَجَبَتْ قَالَ الْجَنَّةُ ـــــــ رواہ مالک والترمذی والنسائی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو "قل ھو اللہ احد" پڑھتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا "اس کے لیے واجب ہوگئی" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا چیز واجب ہوگئی؟ آپ نے فرمایا جنّت ۔ (موطا امام مالک، جامع ترمذی، امام نسائی)

(تشریح) صحابۂ کرام جنھوں نے تعلیم و تربیت براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی اور جو ہر عمل میں آپ کی تقلید اور پیروی کے حریص تھے، ظاہر ہے کہ جب وہ قرآن پاک کی اور خاص کر ان سورتوں اور آیتوں کی تلاوت کرتے ہوں گے جن میں اللہ کی توحید اور صفات کا بیان نہایت مؤثر انداز میں کیا گیا ہے تو دوسروں کو بھی صاف محسوس ہوتا ہوگا کہ یہ ان کے دل کا حال ہے اور ان کی زبان پر اللہ بول رہا ہے۔ اس حدیث میں جن صحابی کے "قل ھو اللہ احد" پڑھنے کا ذکر ہے ان کا حال اس وقت یہی ہوگا اور حضور کو محسوس ہوا ہوگا کہ یہ پوری ایمانی کیفیت اور ایمانی ذوق کے ساتھ "قل ھو اللہ احد" پڑھ رہے ہیں ـــ ایسے شخص کے لیے جنت واجب ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس نعمت کا کچھ حصہ ہم کم نصیبوں کو بھی نصیب فرمائے۔

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّنَامَ عَلٰی فِرَاشِهٖ ثُمَّ قَرَأَ مِائَةَ مَرَّةٍ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اِذَا كَانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ یَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ یَا عَبْدِیْ اُدْخُلْ عَلٰی یَمِیْنِكَ الْجَنَّةَ ـــــــ رواہ الترمذی

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بستر پر سونے کا ارادہ کرے پھر وہ (لیٹنے سے پہلے) سو دفعہ سورۂ "قل ھو اللہ احد" پڑھے تو جب قیامت قائم ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا اے میرے بندے اپنے داہنے ہاتھ پر جنت میں چلا جا۔

(جامع ترمذی)

تشریح) "علی یمینک" (اپنے داہنے ہاتھ پر) کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بندہ حساب کے موقف میں جہاں ہوگا وہاں سے جنت اس کے داہنی جانب ہوگی اور اس سے فرمایا جائے گا کہ "اپنے داہنے رُخ پر چل کر جنت میں چلا جا"۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود جنت کا جو داہنی جانب کا حصہ ہوگا وہ بائیں جانب کے حصہ سے افضل ہوگا اور اس بندہ سے فرمایا جائے گا کہ تو داہنی جانب والی جنت میں چلا جا۔ — بلاشبہ بڑا سستا ہے یہ سودا کہ سونے سے پہلے صرف سو دفعہ قل ھو اللہ شریف پڑھنے پر یہ دولت نصیب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کوئی بڑی بات نہیں ہے اللہ کے بعض بندوں کو دیکھا ہے کہ ان کا رات کو سونے سے پہلے کا روزمرہ کا معمول اس سے بہت زیادہ ہے۔

معوذتین :-

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَمْ تَرَ آيَاتٍ اُنْزِلَتِ اللَّيْلَةَ لَمْ يُرَ مِثْلُهُنَّ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ——— رواہ مسلم

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں آج رات جو آیتیں مجھ پر نازل ہوئی ہیں، (وہ ایسی بے مثال ہیں کہ) اُن کے مثل نہ کبھی دیکھی گئیں نہ سنی گئیں، "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس"۔ (صحیح مسلم)

تشریح) یہ دونوں سورتیں اسی لحاظ سے بے مثال ہیں کہ ان میں اوّل سے آخر

تک نعوذ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ لی گئی ہے ظاہر کے شرور سے بھی اور باطن کے شرور سے بھی اور اللہ تعالیٰ نے ان میں شرور سے حفاظت کی بے پناہ تاثیر رکھی ہے گویا ہر قسم کے شرور سے حفاظت کے لیے یہ حصن حصین ہیں اور دونوں اختصار کے باوجود نہایت جامع اور کافی وافی ہیں۔

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ بَيْنَا أَنَا أَسِيرُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ الْجُحْفَةِ وَالْأَبْوَاءِ إِذْ غَشِيَتْنَا رِيْحٌ وَظُلْمَةٌ شَدِيْدَةٌ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَعَوَّذُ بِأَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَأَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ وَيَقُوْلُ يَا عُقْبَةُ تَعَوَّذْ بِهِمَا فَمَا تَعَوَّذَ مُتَعَوِّذٌ بِمِثْلِهِمَا ـــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جحفہ اور ابواء کے درمیان (یہ دونوں دو مشہور مقام تھے مدینہ اور مکہ کے درمیان) اچانک سخت آندھی آگئی اور سخت اندھیری چھا گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دونوں سورتیں (معوذتین) پڑھ کر اللہ سے پناہ مانگنے لگے اور مجھ سے ارشاد فرمانے لگے عقبہ تم بھی یہ دو سورتیں پڑھ کر اللہ کی پناہ لو، کسی پناہ لینے والے نے ان کے مثل پناہ نہیں لی۔ (یعنی اللہ کی پناہ لینے کے لیے کوئی دعا ایسی نہیں ہے جو ان دونوں سورتوں کے مثل ہو، اس خصوصیت میں یہ بے مثل اور بے مثال ہیں۔) (رواہ ابوداؤد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی مصیبت اور خطرہ کا سامنا ہو تو معوذتین پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی پناہ لینی چاہیے۔ اس سے بہتر بلکہ اس جیسا بھی کوئی دوسرا تعوذ نہیں ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا أَوَى إِلَى فِرَاشِهِ كُلَّ لَيْلَةٍ جَمَعَ كَفَّيْهِ ثُمَّ نَفَثَ فِيْهِمَا فَقَرَأَ فِيْهِمَا قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ وَقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ثُمَّ يَمْسَحُ بِهِمَا مَا اسْتَطَاعَ مِنْ جَسَدِهِ يَبْدَأُ بِهِمَا عَلَى رَأْسِهِ وَ

وَجْهِهٖ وَمَا أَقْبَلَ مِنْ جَسَدِهٖ يَفْعَلُ ذَالِكَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ۔

—— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر رات کو جب آپ آرام فرمانے کے لیے اپنے بستر پر تشریف لاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا لیتے (جس طرح دعا کے وقت دونوں ہاتھ ملائے جاتے ہیں) پھر ہاتھوں پر پھونکتے اور قل ہو اللہ احد اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھتے پھر جہاں تک ہو سکتا اپنے جسم مبارک پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرتے سر مبارک اور چہرۂ مبارک اور جسد اطہر کے سامنے کے حصے سے شروع فرماتے (اس کے بعد باقی جسم پر جہاں تک آپ کے ہاتھ جا سکتے وہاں تک (ہاتھ پھیرتے) یہ آپ تین دفعہ کرتے ۔ (صحیح بخاری)

(**تشریح**) رات کو سونے سے پہلے کا یہ مختصر معمول نبوی تو بہت آسان ہے ۔ کم از کم اس کا اہتمام ہم سب کو کرنا چاہیئے ۔ اس کی برکات بیان سے باہر ہیں ۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے ۔

چند مخصوص آیات کی فضیلت اور امتیاز :-

مندرجۂ بالا احادیث میں جس طرح خاص خاص سورتوں کے فضائل بیان ہوئے ہیں اسی طرح بعض احادیث میں بعض مخصوص آیات کی فضیلت اور ان کا امتیاز بھی بیان فرمایا گیا ہے ۔ اس سلسلہ کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھی جائیں ۔

آیۃ الکرسی :-

عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا أَبَا الْمُنْذِرِ أَتَدْرِي أَيُّ آيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى مَعَكَ أَعْظَمُ ؟ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ أَعْلَمُ قَالَ يَا أَبَا الْمُنْذِرِ

أَتَدْرِي أَيُّ آيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللهِ تَعَالَى مَعَكَ أَعْظَمُ؟ قُلْتُ اللهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ" قَالَ فَضَرَبَ فِي صَدْرِي وَ قَالَ لِيَهْنِكَ الْعِلْمُ يَا أَبَا الْمُنْذِرِ ——— رواہ مسلم

حضرت اُبیؓ بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کی کنیت ابوالمنذر سے مخاطب کرتے ہوئے) ان سے فرمایا اے ابوالمنذر تم جانتے ہو کہ کتاب اللہ کی کونسی آیت تمہارے پاس سب سے زیادہ عظمت والی ہے؛ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے آپ نے (مکرر) فرمایا اے ابوالمنذر تم جانتے ہو کہ کتاب اللہ کی کونسی آیت تمہارے پاس سب سے زیادہ عظمت والی ہے۔ میں نے عرض کیا "اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم" تو آپ نے میرا سینہ ٹھوکا (گویا اس جواب پر شاباش دی) اور فرمایا اے ابوالمنذر تجھے یہ علم موافق آئے اور مبارک ہو۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کے جواب میں اُبیؓ بن کعب نے پہلے عرض کیا کہ "اللہ ورسولہ اعلم" (اللہ اور اس کے رسول کو اس کا علم زیادہ ہے کہ کونسی آیت کتاب اللہ میں زیادہ عظمت والی ہے) یہ جواب ادب کے تقاضے کے مطابق تھا، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وہی سوال فرمایا تو اُبیؓ بن کعب نے اپنے علم و فہم کے مطابق جواب دیا کہ میرے خیال میں تو "اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ" یعنی آیۃ الکرسی قرآن مجید کی سب سے زیادہ عظمت والی آیت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب کی تصویب فرمائی اور شاباش دی اور اس شاباش میں ان کا سینہ آپ نے غالباً اس لیے ٹھوکا کہ قلب جو محل علم و معرفت ہے وہ سینہ ہی میں ہوتا ہے ــــ بہرحال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آیات قرآنی میں آیۃ الکرسی سب سے زیادہ باعظمت آیت ہے، اور یہ اسلئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید و تنزیہہ اور صفات کمال اور اس کی شان عالی کی عظمت و رفعت جس طرح بیان کی گئی ہے وہ اس میں منفرد اور بے مثال ہے۔

سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں:

عَنْ أَيْفَعَ بْنِ عَبْدِ الْكَلَاعِيِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللهِ أَيُّ

سُوْرَةِ الْقُرْآنِ اَعْظَمُ؟ قَالَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، قَالَ فَاَيُّ اٰيَةٍ فِي الْقُرْآنِ اَعْظَمُ؟ قَالَ آيَةُ الْكُرْسِيِّ " اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ" قَالَ فَاَيُّ آيَةٍ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ تُحِبُّ اَنْ تُصِيْبَكَ وَ اُمَّتَكَ؟ قَالَ خَاتِمَةُ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فَاِنَّهَا مِنْ خَزَائِنِ رَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ تَحْتِ عَرْشِهِ اَعْطَاهَا هٰذِهِ الْاُمَّةَ لَمْ تَتْرُكْ خَيْرًا مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ اِلَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ ۔ ——— رواہ الدارمی

ایفع بن عبد الکلاعی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ قرآن کی کون سی سورت سب سے زیادہ عظمت والی ہے؟ آپ نے فرمایا " قل ھو اللہ احد" اس نے عرض کیا اور آیتوں میں قرآن کی کون سی آیت زیادہ عظمت والی ہے؟ آپ نے فرمایا آیۃ الکرسی " اللہ لا الہ الا ھو الحیّ القیوم" اس نے عرض کیا اور قرآن کی کون سی آیت ہے جس کے بارہ میں آپ کی خاص طور سے خواہش ہے کہ اس کا فائدہ اور اس کی برکات آپ کو اور آپ کی اُمّت کو پہونچیں؟ آپ نے فرمایا سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں (آمن الرسول سے ختم سورۃ تک ___ پھر آپ نے فرمایا) یہ آیتیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ان خاص الخاص خزانوں میں سے ہیں جو اس کے عرش عظیم کے تحت ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ آیاتِ رحمت اس اُمت کو عطا فرمائی ہیں۔ یہ دنیا اور آخرت کی ہر بھلائی اور ہر خیر کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ (مسند دارمی)

تشریح ؎ قل ھو اللہ احد، اور آیۃ الکرسی کی عظمت اور امتیاز کے بارہ میں اوپر عرض کیا جا چکا ہے، سورۂ بقرہ کی آخری آیات کے متعلق جیسا کہ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے بلاشبہ یہ آیتیں اللہ تعالیٰ کے خاص الخاص خزائن رحمت میں سے ہیں، شروع میں " اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ " سے " لانفرق بین احد من رسلہ " تک ایمان کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اس کے بعد " سمعنا واطعنا " میں اسلام اور اطاعت و فرمانبرداری کا عہد لیا گیا ہے اس کے بعد " غفرانک ربنا و

الیک المصیر" میں ان کوتاہیوں کی معافی اور مغفرت کی استدعا ہے جو ایمان اور عمل طاعت کے بعد بھی ہم بندوں سے سرزد ہوتی ہیں، اس کے بعد "لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا" میں کمزور بندوں کو تسلی دی گئی ہے اور اطمینان دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا بوجھ بندوں پر نہیں ڈالا جاتا اور کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا جاتا جو انکی حد استطاعت سے باہر ہو، اس کے بعد "ربنا لا تؤاخذنا" سے آخر سورت تک نہایت جامع دعا کی تلقین فرمائی گئی ہے ——— بلاشبہ یہ آیتیں بجائے خود رحمت الٰہی کا خزانہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قدرشناسی اور ان سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَتَمَ سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ بِاٰيَتَيْنِ اُعْطِيْتُهُمَا مِنْ كَنْزِهِ الَّذِيْ تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَعَلَّمُوْهُنَّ وَعَلِّمُوْهُنَّ نِسَاءَكُمْ فَاِنَّهَا صَلٰوةٌ وَقُرْبَانٌ وَدُعَاءٌ ——— رواہ الدارمی مرسلاً

جبیر بن نفیر تابعی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کو ایسی دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے جو اس نے اپنے اُس خاص خزانے سے مجھے عطا فرمائی ہیں جو اُس کے عرشِ عظیم کے تحت ہے۔ تم لوگ ان کو سیکھو اور اپنی خواتین کو سکھاؤ کیونکہ یہ آیتیں سراپا رحمت ہیں اور اللہ تعالیٰ کے تقرب کا خاص وسیلہ ہیں اور ان میں بڑی جامع دعا ہے۔

(مسند دارمی)

(فائدہ) واضح رہے کہ جبیر بن نفیر جنھوں نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے تابعی ہیں۔ انھوں نے ان صحابی کا ذکر نہیں کیا جن سے ان کو یہ حدیث پہونچی، اس لیے یہ حدیث مرسل ہے۔ اسی طرح سے پہلی حدیث بھی مرسل ہے کیونکہ اس کے راوی ایفع بن عبد کلاعی بھی تابعی ہیں انھوں نے بھی کسی صحابی کا حوالہ دیئے بغیر اس کو روایت کیا ہے۔

عَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اَلْاٰیَتَانِ مِنْ اٰخِرِ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ مَنْ قَرَأَ بِہِمَا فِیْ لَیْلَۃٍ کَفَتَاہُ۔

ــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ بقرہ کے آخر کی دو آیتیں جو کوئی کسی رات میں ان کو پڑھے گا وہ اس کے لیے کافی ہوں گی۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ جو شخص رات کو بقرہ کی یہ آخری آیتیں پڑھ لے گا وہ انشاءاللہ ہر شر سے محفوظ رہے گا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص تہجد میں صرف یہی آیتیں پڑھ لے تو اس کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا۔ واللہ اعلم۔

آل عمران کی آخری آیات:-

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ مَنْ قَرَءَ آخِرَ آلِ عِمْرَانَ فِیْ لَیْلَۃٍ کُتِبَ لَہٗ قِیَامُ لَیْلَۃٍ ــــــــــ رواہ الدارمی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جو شخص کسی رات کو آل عمران کی آخری آیات پڑھے گا اس کے لیے پوری رات کی نماز کا ثواب لکھا جائے گا۔ (مسند دارمی)

(تشریح) "آخر آل عمران" سے مراد "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" سے ختم سورت تک کی آیات ہیں۔ صحیح روایات میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جب تہجد کے لیے اُٹھتے تو سب سے پہلے، وضو کرنے سے بھی پہلے یہی آیات پڑھتے تھے۔

ـــ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو یہ فرمایا کہ جو شخص رات کو یہ آیتیں پڑھے اس کے لیے پوری رات کے نوافل کا ثواب لکھا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سنی ہوگی، حضور سے سنے بغیر کوئی صحابی اپنی طرف سے ایسی بات نہیں کہہ سکتے، اس لیے یہ حدیث مرفوع ہی کے حکم میں ہے۔

(فائدہ) اُمت مسلمہ مرحومہ پر اللہ تعالیٰ کی جو خاص رحمتیں ہیں ان میں سے ایک

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ

(از۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

(۳)

حضرت خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادیؒ سے استفیض عـ۵

حضرت حافظ سید عبداللہؒ کے وصال کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ بہت محزون و غمگین رہنے لگے اور ایسے درویش کی تلاش ہوئی جسکی صحبت سے مستفیض ہوتے رہیں، ایک شخص نے حضرت خلیفہ ابوالقاسمؒ کا ذکر خیر کیا اسی شخص کے ہمراہ اُن کی خدمت میں پہونچے۔ خود بیان فرمایا کرتے تھے کہ پہلے دن ملاقات ہوئی تو حضرت خلیفہؒ اپنے مکان کی تعمیر میں مشغول تھے۔ معمار کو ہدایات فرما رہے تھے ــــ ایک موقع پر گفتگو کے دوران میں آپ نے ایک شعر پڑھا جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔ ع

ہر کرا "ذرّۂ وجود" بود

شعر پڑھ کر فرمایا کہ میں نے صحیح نسخوں میں دیکھا وہاں "ذرّۂ وجود" ہی مرقوم ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ فقیر نے بھی صحیح نسخے دیکھے ہیں اُن میں تو "ذرّۂ شہود" لکھا ہوا ہے ــــ

عـ۵ - آپ ملا ولی محمد ابوالعلائیؒ خلیفۂ اعظم سید ابوالعلیٰؒ کے شاگرد رشید، مرید اور خلیفہ تھے۔ حضرت سید ابوالعلیٰؒ بانی سلسلۂ ابوالعلائیہ کی صحبت بھی اٹھائی تھی ــــ ماہ رمضان ۱۰۸۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ مزار مبارک آگرے میں ہے۔ تذکرہ سا... اکبرآباد کے مؤلف کو آپ کے مزار کا بھی پتہ نہیں چلا۔ تحفۃ الواصلین میں یہ قطعۂ تاریخ وفات لکھا ہے۔

رفت ازیں دار فنا جانب خلد آنکہ بود ست بسے نیک سرشت
سال نقلش بہمہ صوم خرد گفت ــ ابوالقاسم مصباح بہشت
۱۰۸۹ھ

یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے تم علم سے بہرہ یاب ہو اس کے بعد میرے ایک استفسار کے جواب میں یہ شعر پڑھا ؎

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

یعنی علم کو اگر تن پروری میں استعمال کروگے تو سانپ بن جائے گا۔ دل کو سنوارنے کے لیے استعمال کروگے تو یار و مددگار ثابت ہوگا۔

یہ پہلی ملاقات مختصر رہی بس چند باتوں ہی پر مجلس ختم ہوگئی۔ فرماتے تھے کہ دوسرے دن پھر میرے دل میں آیا کہ حضرت خلیفہؒ کی خدمت میں جانا چاہیے۔ چنانچہ حاضر ہوا۔ بہت ہی بشاشت سے پیش آئے اور فرمایا کہ کل تعمیر کے سلسلے میں مشغول تھا بات ناتمام رہ گئی اچھا اب یہ بتاؤ کہ "ذرۂ شہود" اگر شعر میں ہو تو معنیٰ کیا ہوں گے۔ میں نے اس صورت میں جو معنیٰ بنتے ہیں وہ بیان کیے۔ پھر فرمایا کہ بعض کتابوں میں "وجود" لکھا ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہوگا، میں نے اس کا بھی مطلب بتایا۔ بہت ہی خوش ہوئے ـــ پھر تو مزاج کی موافقت کی بنا پر صحبت اقدس بہت راس آئی، محبت و عقیدت کے ساتھ برابر خدمت اقدس میں حاضری دیتا رہا۔ اور انھوں نے بھی مجھے "التفات ہائے بیکراں" سے نوازا حتیٰ کہ بعض قدیم خدام حسد کرنے لگے۔

فتاویٰ عالمگیری پر نظر ثانی کا وظیفہ اور اس سلسلے میں حضرت خلیفہ کا حکم

خود فرمایا کرتے تھے کہ تدوین فتاویٰ عالمگیری کے بعد بحکم حضرت عالمگیرؒ اس پر نظر ثانی کی گئی۔ شیخ حامد (جو مرزا محمد زاہد کے درس میں میرے شریک تھے) فتاویٰ کا کچھ حصہ ان کے سپرد ہوا ـــ وہ میرے پاس آئے کہ اس کام میں میری رفاقت کرو ہر روز اتنا وظیفہ تم کو بھی ملا کرے گا۔ میں نے قبول نہیں کیا۔ میری والدہ نے جب سُنا تو انھوں نے اصرار کرکے مجھے اس کام پر لگا دیا۔ جب حضرت خلیفہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ اس وظیفے کو ترک کردو ـ میں نے عرض کیا کہ والدہ ناخوش ہوں گی۔ فرمایا جب اللہ کے اور بندے کے حق کا مقابلہ ہو تو اللہ کے حق کو ترجیح دی جائے گی۔ میں نے عرض کیا دُعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسی شکل پیدا فرمادے کہ یہ وظیفہ خود بخود موقوف ہو جائے تاکہ والدہ بھی ناخوش نہ ہوں۔ آپ نے دعا فرمائی۔ چند روز نہ گزرے تھے کہ بادشاہ

نے اہلِ وظیفہ کے نام طلب کیے اور اُن میں عزل و نصب کے طور پر کچھ تغیر و تبدل کیا۔ جب میرے نام پر پہونچے تو میرا وظیفہ موقوف کیا اور حکم لکھا کہ یہ شخص چاہے تو اس قدر زمین اسکو دے دی جائے۔ مجھ سے معلوم کیا گیا کہ کیا زمین لینا چاہتے ہو، میں نے انکار کر دیا ـــ اور وظیفہ موقوف ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ـــ فرماتے تھے کہ میری اس خدمت سے معزولی کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ ایک دن نظر ثانی کرتے ہوئے میری نظر سے ایک عبارت گذری جس میں گڑبڑ تھی، صورتِ مسئلہ نہیں بنتی تھی، میں نے ان کتابوں کو دیکھا جو اس مسئلے کا ماخذ تھیں تحقیق سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ مسئلہ دو کتابوں میں جدا جدا عبارت کے ساتھ مذکور ہے۔ مؤلفِ فتاویٰ نے دونوں عبارتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جس کی وجہ سے اختلال رونما ہو گیا ہے ـــ میں نے حاشیہ پر لکھ دیا ھٰذا غلط صوابہ کذا ـــ (یہ عبارت غلط ہے صحیح اس طرح ہی) اس زمانے میں حضرت عالمگیرؒ کو فتاویٰ کی جمع و تدوین کی طرف بہت توجہ تھی، روزانہ ملا نظامؒ ایک دو صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھتے تھے۔ جب وہ فتاویٰ سناتے سناتے اس مقام پر پہونچے اتفاقاً میرے حاشیہ کو بھی متن کے ساتھ پڑھ گئے۔ بادشاہ چونک پڑے اور فرمایا کہ یہ کیا عبارت ہے؟ ملا نظامؒ نے اس وقت تو اپنی جان چھڑالی اور کہا کہ میں نے اس کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا ہے کل کو تفصیل سے عرض کروں گا۔ جب گھر آئے تو ملا حامد پر ناراض ہوئے کہ فتاویٰ کے ایک حصے کو میں نے تمہارے اعتماد پر چھوڑا تھا تم نے بادشاہ کے سامنے مجھے بہت خفیف کرایا آخر یہ کیا لکھا تھا؟ ـ ملا حامد نے اُن سے تو کچھ نہیں کہا، میرے پاس آکر مجھ پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ـ میں نے وہ تمام کتابیں جو اس مسئلے کا ماخذ تھیں پیش کر دیں اور عبارت کے اختلال و انتشار کو واضح کیا۔ بس چپ ہو گئے ـ یہی بات میری موقوفی کا باعث بن گئی ـ

فرمایا ـــ ایک دن میں حضرت خلیفہؒ کی خدمت میں گیا۔ تعمیرِ مکان کا سلسلہ چل رہا تھا ـ میری حاضری سے بہت خوش ہوئے ـ میں نے ارادہ کیا کہ مٹی گارا بہا کر کے دیواروں پر اپنے ہاتھ سے کہگل کر دوں اس خیال کو ظاہر بھی کر دیا، آپ نے فرمایا کہ کبھی اس سے پہلے بھی تم نے یہ کام کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں، لیکن قیاس سے انجام دے لوں گا ـ فرمایا یہ کام بغیر مشق و تجربہ کے محض قیاس سے اچھی طرح نہیں ہوا کرتا ـ میں نے تمہارے لیے

ایک اور کام تجویز کیا ہے، یہ فرما کر ایک خادم کو حکم دیا کہ چارپائی لاؤ اور زیر دیوار سائے میں بچھا دو، جب چارپائی آگئی تو مجھ سے فرمایا کہ اس پر آرام کرو اور سو جاؤ دور سے چل کر آئے ہو ___ حکم کی تعمیل میں چارپائی پر لیٹ گیا مگر نیند کہاں؟ (جب مجھے دیکھا کہ جاگ رہا ہوں سوتا نہیں ہوں تو) فرمایا کہ نیند تو فقیر کی اختیاری چیز ہے یعنی حق میں مشغول ہو جائے اور ماسوا کو بھول جائے (اسی عمل سے نیند کی کیفیت پیدا ہو جائے گی) اسی اثنا میں ایک اور خادم آئے اُن سے فرمایا بہت اچھے وقت آئے۔ میری طرف اشارہ کرکے فرمایا دیکھو اس چارپائی پر بیٹھ جاؤ اور ان کے پاؤں دابو یہ دور سے چل کر آئے ہیں تھک گئے ہوں گے ___ غرضکہ اس طرح کی مہربانیاں فرماتے رہتے تھے اور یہ مہربانیاں روزانہ بڑھتی ہی جاتی تھیں ___

ایک دن کا ایک دلچسپ واقعہ سُنایا کہ میں ایک دن خدمت حضرت خلیفہؒ میں حاضر ہوا اس وقت آپ گھر سے باہر آ رہے تھے اور حمام میں جانے کا ارادہ تھا۔ جب مجھے دیکھا تو گھر میں چلے گئے اور چمچہ، پیالہ، عرق گلاب اور بتاسے ہمراہ لائے ___ فرمایا اگر جی چاہے تو فقط بتاسے کھا لو اور جی چاہے تو گلاب اور بتاسوں کا شربت بنا کر پی لو، تمھیں اختیار ہے۔ آپ کا ایک مرید جلدی سے بول اُٹھا کہ وقت سرد ہے۔ شربت پینے کے مقابلے میں بہتر یہ ہوگا کہ فقط بتاسے کھا لیے جائیں۔ اس بات کو سُن کر حضرت خلیفہ رحمۃ اللہ علیہ معنی خیز انداز میں اوّل تو خاموش ہو گئے، پھر مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم بتاؤ۔ کیا پسند کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا شربت ___ فرمایا کس وجہ سے؟ میں نے کہا اجمالی بات تو یہ ہے کہ حضرت والا بتاسوں کے ساتھ چمچہ، پیالہ اور گلاب بھی لائے ہیں، اب اگر خالی بتاسے کھاتا ہوں تو یہ باقی چیزیں بیکار ہو جائیں گی ___ حالانکہ فعلِ اولیاء کسی نہ کسی حکمت کو ضرور متضمن ہوتا ہے۔ اور تفصیلی بات یہ ہے کہ حضرت والا اس وقت حمّام کی طرف متوجہ ہیں (فارغ ہو کر خود بھی نوش فرمائیں گے) حمّام کے بعد شربت تسکین دیتا ہے اور فقیر بھی فاصلہ طے کرکے آیا ہے۔ خفقان و وحشت کا کچھ اثر ہے، شربت تسکینِ خفقان کرتا ہے ___ جب یہ اجمالی و تفصیلی توجیہ سُنی تو اُس درویش کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت غصہ ہو کر فرمایا ___ کہ میں نے

تم سے کب دریافت کیا تھا تم نے گفتگو میں بیجا دخل کیوں دیا؟ بے ادب لوگ میری مجلس کے لائق نہیں ہیں۔ میری مجلس سے اُٹھ جاؤ ــــ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ درویش مجھ کو بددعا دے گا کہ میری وجہ سے آپ کی صحبت اقدس سے محروم و مہجور ہو گیا۔ اس مرتبہ تو بس ازراہ کرم معاف ہی فرما دیجئے، آئندہ احتیاط رہے، چنانچہ آپ نے معاف فرما دیا۔

فرماتے تھے کہ جب حضرت خلیفہ ابوالقاسمؒ نے چاہا کہ مجھے اجازت ارشاد عطا کریں تو یہ اہتمام فرمایا کہ ایک مخلص خادم کو حکم دیا کہ کھانا تیار کرو۔ بہت سے لوگوں کی دعوت کر دی اور فقیر کو بھی مدعو کیا، پھر دستار میرے سر پہ باندھی، میں نے عرض کیا کہ حضرت میں اس عظیم منصب کی اہلیت نہیں رکھتا اور اس کے حقوق بھی ادا نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ تم دوسری جگہ سے بھی تو اجازت رکھتے ہو۔ آخر سید عبداللہ کے ساتھ تمہارا معاملہ کیا تھا؟ میں نے عرض کیا انھوں نے تو اپنے تمام حقوق معاف فرما دیئے تھے۔ فرمایا کہ میں نے بھی اپنے تمام حقوق ظاہری و باطنی معاف کیے ــــ

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت خلیفہؒ فرمایا کرتے تھے ــ "لوگوں کو کیا ہو گیا ہو کہ اپنے آرام کے لیے بھی فقیری اختیار نہیں کرتے" ــ یعنی جب دل یکسو ہو گیا اور تمام خطرات و وساوس برطرف ہو گئے تو درحقیقت آرام کلی حاصل ہو گیا۔ اگرچہ ظاہر میں کوئی نقصان نظر آئے۔

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے فرمایا کہ حضرت خلیفہؒ مجھ سے ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ شہر آگرہ کے درویشوں سے ملاقات کرو۔ میں ٹال دیتا

سے اجازت

۵۵۔ شاہ عظمت اللہ بن عبدالرحیم بن سید جلال قادری متوکل اکبرآبادی۔ سادات حسینی ترمذی میں سے ہیں۔ سلسلۂ قادریہ چشتیہ [illegible] میں مرید کرتے تھے۔ تمام عمر گوشہ قناعت میں بسر کی۔ ۷۰ سال کی عمر ہوئی۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۱۰۴ھ [illegible] دہیں مدفون ہوئے (انفاس العارفین) آپ کے مزار کے متعلق بھی برہان احمد [illegible] اکبرآباد تم ہوتاہ کر آپ کے مزار کا پتہ نہیں چلا۔

تھا۔ اس لیے کہ میری پوری توجہ آپ ہی کی جانب تھی۔ ایک روز اس بات کو تاکید سے فرمایا۔ جب میری ٹال دیکھی تو ایک خادم کو حکم دیا کہ ان کو سید عظمت اللہ چشتیؒ کے پاس لے جاؤ۔ ان سے میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ ایک درویش کو آپ کی ملاقات کے لیے بھیج رہا ہوں۔ جب میں سید عظمت اللہؒ کے محلے میں پہونچا تو خادم کو ان کا مکان یاد نہ رہا۔ اتفاقاً وہاں بچے کھیل رہے تھے میری نظر ایک بچے پر پڑی میں نے کہا کہ یہ بچہ بزرگ زادہ معلوم ہوتا ہے اس سے دریافت کرنا چاہیئے۔ اتفاق کی بات وہ بچہ، سید عظمت اللہؒ کا تھا۔ وہ مجھ کو اپنے ساتھ مکان لے گیا اور اندر جاکر حضرت خلیفہ کا پیغام (جس کا میں نے اس بچے سے ذکر کردیا تھا) پہونچایا۔ سید صاحبؒ نے اندر سے یہ کہلا کر بھیجا کہ میں صاحب فراش ہوں، چلنے کی طاقت نہیں رکھتا (اس لیے باہر نہیں آسکتا)۔ کنبے کی عورتیں گھر میں آئی ہوئی ہیں اس لیے اس وقت یہ وہ ہونا مشکل ہے مجھے ملاقات سے معذور رکھا جائے ـــ پھر اس کے فوراً بعد ایک دوسرے شخص کو یہ فرما کر اندر سے بھیجا کہ خلیفہ کے مریدوں کو بٹھاؤ پھر خادموں سے فرمایا کہ مجھے چارپائی پر اٹھا کر دروازے تک لے جاؤ۔ چنانچہ دروازے میں تشریف لے آئے اور فرمایا کہ اگرچہ میں معذور تھا مگر دوبارہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ خلیفہ کا کسی کو بھیجنا بے حکمت نہیں ہوگا ـــ اس کے بعد انھوں نے میرا نام و نسب دریافت کیا اور اس سلسلے میں خوب تحقیق فرمائی۔ میں نے شیخ عبدالعزیز شکر بار دہلویؒ سے اپنا رشتہ چھپا لیا تھا۔ اس کو اس لیے بیان نہیں کیا کہ جانتا تھا ان کا سلسلہ ان تک پہونچتا ہے، اس نسبت کی بنا پر وہ ایسے ضعف کے عالم میں بھی تواضع فرمائیں گے جس سے ان کو تکلیف ہوگی۔ لیکن انھوں نے اپنی فراست سے اس رشتے کو سمجھ لیا ـــ بعد ازاں آپ نے ایک اشکال کی تقریر کی اور اس کا جواب مجھ سے طلب فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ استفادے کے لیے حاضر خدمت ہوا ہوں نہ کہ افادے کے لیے۔ فرمایا کہ میں اس سوال کے کرنے پر مامور ہوں ـــ یہ سن کر میں نے اس وقت جو کچھ میرے ذہن میں تھا جواب دیا ـــ وہ بہت خوش ہوئے اور چارپائی سے نیچے اتر آئے اور بیحد تواضع فرمائی ـــ پھر فرمایا کہ مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی، مجھے معلوم نہ تھا۔ ازاں بعد فرمایا کہ شیخ عبدالعزیز

مشائخ بار قدس سرہٗ نے ہمارے دادا صاحب کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر کوئی ہماری اولاد میں سے تمہارے پاس آئے اور اس اشکال کا جواب اس طرح دے دے تو اس کو میری یہ امانت پہونچا دینا ـــ یہ امانت اجازتِ طریقہ اور بعض تبرکات ہیں۔ میرے دادا تمام عمر تلاش کرتے رہے مگر ایسے شخص کو نہ پایا، آخر میرے والد کو وصیت کر گئے انھوں نے بھی تجسس کیا نہ پایا۔ اب میری نوبت آئی میں نے بھی تمام عمر جستجو کی نہ پایا اور اب پایا ہے۔۔ میرا آخری وقت ہے کوئی ایسا فرزند جو اس نسبت کی اہلیت رکھتا ہو نہیں رکھتا ہوں اس وجہ سے افسوس کرتا تھا۔ الحمد للہ کہ اس وقت آرزو پوری ہوئی۔ یہ فرما کر عمامہ میرے سر پر باندھا اور اجازت دی ـــ بہت سی مٹھائی اور نقد کی ایک مقدار بھی میرے ہمراہ کر دی۔ جب یہ سب چیزیں لے کر حضرت خلیفہؒ کی خدمت میں واپس آیا تو انتہائی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا خوب کامل اور مالا مال ہو کر آئے ہو، میں نے وہ سب چیزیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رکھ دیں تو فرمایا یہ نقدی اشارہ ہے جمعیتِ ظاہر کی طرف اور عمامہ اشارہ ہے اجازت اور جمعیتِ باطن کی طرف، میں ان دونوں چیزوں میں تو شرکت نہیں کر سکتا ـــ پھر کچھ مٹھائی قبول فرمائی ـــ

معارف الحدیث ـــ بقیہ صفحہ ۱۵

یہ بھی ہے کہ تھوڑے عمل پر بڑے اجر و ثواب کی بہت سی صورتیں اور بہت سے طریقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس اُمت کو بتلائے گئے ہیں تاکہ جو لوگ اپنے خاص حالات کی وجہ سے بڑے بڑے عمل نہ کر سکیں وہ یہ چھوٹے چھوٹے عمل کر کے ہی اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات کے مستحق ہو سکیں۔ مندرجہ بالا حدیثیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض خاص سورتوں اور مخصوص آیتوں کے فضائل بیان فرمائے ہیں یہ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ان کا مقصد یہی ہے کہ بہت سے بندے جو اپنے خاص حالات کی وجہ سے قرآن مجید کی بہت زیادہ تلاوت نہیں کر سکتے۔ وہ ان مخصوص سورتوں اور آیتوں کی تلاوت کے ذریعہ بڑے اجر و ثواب اور اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات کے قابل ہو جائیں۔ اس لیے ان حدیثوں کا حق ہے کہ ان پر یقین کر کے ان سورتوں اور آیات کی تلاوت کا اہتمام

نسبتِ صوفیہ

(از افادات عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب مدظلہم العالی)

(۲)

اسی طرح سے حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مقام پر نورِ باطن کی تحصیل کے لیے اتباعِ سنت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس مسئلہ پر کتنا زوردار کلام فرماتے ہیں، کسی طالب کو لکھتے ہیں کہ:-

مخدوما وحدت وکثرت ضد یک دیگر اند طالبِ وحدت را ترکِ کثرت ناگزیر است ہر قدر تعلقاتِ کثرت با خود دارد ہماں قدر از وحدتِ حقیقی دور و مہجور است وحدانی باید	مخدوم من! وحدت و کثرت ایک دوسرے کی ضد ہو۔ طالب وحدت کے لیے ترک کثرت ناگزیر ہے۔ جس قدر کثرت کے علائق اپنے سے رکھے گا اسی قدر وحدتِ حقیقی سے دور اور مہجور رہے گا۔
بود ہم از روئے طلب و محبت وہم از روئے علم و ارادت تا مناسبت پیدا آید و مرآۃ وحدت گردد و بتوحید حقیقی رسد التوحید اسقاط الاضافات	سالک کو وحدانی ہونا چاہیے طلب اور محبت کے اعتبار سے بھی اور علم و ارادت کے اعتبار سے بھی۔ تاکہ مناسبت پیدا ہو جائے اور آئینۂ وحدت بن جائے اور توحید حقیقی تک سالک کی رسائی ہو جائے کیونکہ توحید تعلقات کے ساقط ہی کرنے کا نام ہے۔
اوقات را بذکر و فکر معمور دارند و در تنویرِ باطن کوشند کہ محل نظر مولی است و تنویرِ باطن منوط بدوامِ ذکر و مراقبہ است و مربوط باد ائے وظائف بندگی و ادائے فرائض و سنن و واجبات و اجتناب از بدعات و محرمات و مکروہات ہر قدر کہ در اتباعِ شریعت و سنت و اجتناب از بدعت کوشیدہ آید نورِ باطن بیفزاید و راہے	اپنے اوقات کو ذکر و فکر سے معمور اور آباد رکھو اور باطن کو روشن کرنے میں کوشش کرو اس لئے کہ وہی نظر مولیٰ کا محل ہے اور یہ سمجھ لو کہ تنویر باطن کا تعلق ان امور کے ساتھ ہے۔ دوام ذکر، مراقبہ۔ وظائف بندگی کی ادائیگی یعنی ادائے فرض و سنن و واجبات نیز بدعات و دیگر محرمات و مکروہات سے اجتناب۔

بجناب قدس بکشاید اتباع سنت البتہ نجی است ونتیجہ بخش دررفع درجات۔

احتمال تخلف ندارد وماورائے آں خطر درخطرات وراہ شیطان فالحذر رکال الحذر فماذا بعد الحق الا الضلال

دین قویم را کہ بوحی قطعی ثابت شدہ است بترہات اوہام وخیال نمی توان گزاشت وما علی الرسول الا البلاغ۔

چنانچہ جو شخص جس قدر بھی اتباع سنت اور عمل بالشریعۃ اور اجتناب بدعت میں زیادہ کوشش کریگا اتنا ہی زیادہ اسے نور باطن حاصل ہوگا اور حق تعالیٰ کی راہ اس پر کھلے گی۔

بلاشبہ اتباع سنت نجات دینے والی چیز ہے ہر صورت نفع بخش اور درجات کو بلند کرنے والی اس میں خلاف کا تو احتمال ہی نہیں ہے۔

لیکن اسکے ماسوا جو چیزیں ہیں ان میں خطرہ ہی خطرہ ہے بلکہ وہ شیطانی راستہ ہے لہٰذا ان سے بہت اجتناب کرو اور احتیاط کلی رکھو اسلئے کہ حق کے بعد بجز گمراہی کے اور رہ ہی کیا جاتا ہے دین متین کو جو کہ وحی قطعی سے ثابت ہے محض لغو باتوں اور اوہام وخیالات سے تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔

بر رسولاں بلاغ باشد وبس

حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ کا کلام آپنے ملاحظہ فرمایا۔ سبحان اللہ کیا کلام ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طریق کو کتنا سمجھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ کیسا ہی کوئی شخص کم ہمت ہو۔ حضرت کے بیان کے بعد اگر تبہ تو کم ہمت کس کر راہ خدا میں کھڑا ہی ہو جائے گا تاہم طریق کی غرض وغایت کی وضاحت کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا جو کلام القول الجمیل سے نقل کیا گیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ جس کا حاصل یہی تھا کہ سارے طرق کا مرجع ہیئت نفسانیہ (یعنی نسبت) کی تحصیل ہے۔ اسلئے کہ اسکے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو ارتباط وانتساب حاصل ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرات صوفیاء نے جو اشغال ومراقبات تعلیم کیے اُن سے مقصود نفس میں اسی ملکہ کو پیدا کرنا اور راسخ کرنا تھا۔ اگرچہ نسبت کی تحصیل کچھ ان اشغال پر موقوف بھی نہیں۔ کیونکہ حضرات صحابہ وتابعین اس نسبت وسکینہ کو دوسرے طرق سے حاصل کیا کرتے تھے مثلاً صلوٰۃ وتسبیحات پر حضور قلب کے ساتھ مواظبت

نیز طہارت پر مداومت، موت کی یاد، جنت، دوزخ کا پیش نظر رکھنا اسی طرح تلاوت قرآن پر مواظبت اور اس کے معانی میں تدبر وغیرہ کرنا۔

غرض ان سب امور پر یہ سب حضرات ایک مدت تک مواظبت فرماتے تھے جس کی وجہ سے قلب میں ایک ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور تا دم آخر اس کی محافظت فرماتے تھے اور یہی وہ نسبت مسلسلہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ مشائخ متوارث چلی آرہی ہے جس میں کوئی شک نہیں، اسی کو شاہ صاحب نے طریق کا مرجع اور اس کا حاصل کہا ہے اور ایک اور مقام پر اس کو غنیمت کبریٰ فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نسبتہائے صوفیا غنیمتے است کبریٰ و رسوم ایشاں ہیچ نمی ارزد۔

آخر میں صوفیا کے اشغال و مراقبات کے متعلق ایک بات میں بھی کہتا ہوں وہ یہ کہ یہ تو بالکل صحیح ہے کہ ان حضرات نے نسبت ہی کی تحصیل اور اس کی تکمیل کے لیے بطور معاون کے اشغال وغیرہ تجویز فرمائے۔ اگرچہ حضرات صحابہ اسی نسبت کو صرف اعمال شرعیہ ہی سے حاصل کر لیتے تھے تو جب اعمال شرعیہ کو تحصیل نسبت کے لیے بعد کے لوگوں نے کافی نہ پایا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اشغال کی بھی ضرورت سمجھی گئی کیونکہ دیکھا گیا کہ لوگوں میں نماز و روزہ موجود ہے مگر نسبت غائب تو اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مشائخ نے جن چیزوں کا اضافہ فرمایا تھا اب ہو سکتا ہے کہ ان کی بھی صرف صورت ہی صورت رہ گئی ہو اور اثر اور مقصود ان سے ختم ہو چکا ہو۔ چنانچہ اس زمانہ میں لوگوں کا حال بھی دیکھ رہا ہوں کہ طریق کی چیزوں کے صرف ظاہر کو لے رکھا ہے اور اس کے باطن سے نظر پھیرے ہوئے ہیں جس طرح سے کہ عام لوگوں کا حال ہے کہ نماز و روزہ پر تو عمل ہے مگر اس سے جو مقصود تھا تحصیل نسبت اور اس پر مواظبت اور اس کی محافظت ان سب باتوں کی جانب ذرا بھی توجہ نہیں۔ اور وجہ کلی اس کی یہ ہے کہ مقصود اور غیر مقصود میں امتیاز نہیں باقی رہا، مقصود کو غیر مقصود اور غیر مقصود کو مقصود بنا لیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی کی جزئی یہ بھی ہے کہ مشائخ کو مقصود سمجھا جاتا ہے اور اُن کے پاس جو دولت ہے یعنی نسبت مسلسلہ اور نور اور سکینہ اُس کے تحصیل کی فکر نہیں۔ اس زمانہ میں طریق کے اندر یہ ایک بہت بڑی بدعت

داخل ہو گئی ہے جس نے طریق کو فاسد کر دیا اور وہ یہی کہ نہ مقصود کی خبر ہے اور نہ غیر مقصود کا علم۔

اسی چیز کو آپ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ اگر اس ایک بات کو سمجھ لیجئے گا تو بہت بڑے مخمصہ سے نکل جائیے گا اور دین خالص سے بقدر مقدر نصیب یا ہی جائیے گا ورنہ ساری عمر بھی کہیں آئیے جائیے گا اور کچھ بھی کشود کار نہ ہوگا۔

احوالِ رفیعہ

یہاں تک تو کلام نسبت کی تشریح و تفصیل اور اس کے ذریعۂ تحصیل سے متعلق تھا۔ اب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے دوسرے جزء کی بھی کچھ توضیح کرنا چاہتا ہوں، یعنی یہ کہ مداوم علی السکینۃ کو جو احوال رفیعہ ملا کرتے ہیں وہ کیا ہیں اور اس مضمون کو میں ایک عجیب وغریب مضمون سمجھتا ہوں۔ یوں تو یہ مضمون قرآن و حدیث میں آیا ہے اور علماء نے بھی اس کو بیان فرمایا ہے اس لیے ایسا کچھ عجیب بھی نہیں ہے۔ لیکن ہماری معلومات چونکہ محدود ہیں اور نظر سطحی ہے اس لیے اس کو عجیب وغریب ہی کہا جائے گا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمانے کے بعد کہ سکینہ پر مداومت کرنے والے کے لیے کچھ حالات رفیعہ ہوتے ہیں جو اسے نوبت بنوبت ملتے ہیں۔ بس سالک کو چاہیے کہ ان حالات کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ حالات اس کی طاعت کے عنداللہ مقبول ہونے اور باطن نفس میں سویدائے قلب میں اثر کرنے کے علامات ہیں۔) آگے بعض احوال رفیعہ کو شمار کرایا ہے جو کہ مداوم علی السکینہ کو حق تعالیٰ کی جانب سے مرحمت فرمائے جاتے ہیں۔

(۱) مثلاً ایک حال اس کو یہ ملتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کو تمام ماسوا پر ترجیح دیتا ہو۔

(۲) اسی طرح سے ایک حال اسکو یہ ملتا ہے کہ اس پر خوف وخشیت کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ قلب سے نکل کر بدن اور جوارح پر بھی اس کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۳) اسی طرح سے ایک انعام مواظب علی السکینہ کو اس دنیا میں یہ ملتا ہے کہ اسے عمدہ عمدہ خواب نظر آتے ہیں جس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ رجل صالح کا رویا صالحہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

میرے بعد نبوت سے صرف مبشرات رہ جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ مبشرات کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا اچھا خواب جسے کوئی رجل صالح دیکھے یا اس کے واسطے کسی دوسرے نیک اور صالح شخص کو دکھایا جائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کے قول لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا میں بشریٰ کی تفسیر رؤیا رصالحہ ہی سے کی گئی ہے۔

(۴) اسی طرح سے ایک حال صاحب سکینہ کو اس دار دنیا میں یہ ملتا ہے کہ اس کو فراست صحیحہ حاصل ہوتی ہے۔ یعنی ایسا خاطر جو واقع کے مطابق ہو۔ اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ یعنی مومن کی فراست سے ڈرو اس لیے کہ وہ نور خدا سے دیکھتا ہے۔

صاحب شفاء العلیل نے فراستِ صادقہ کے معنی لکھے ہیں ٹھیک اٹکل یعنی مداوم علی السکینۃ کو ایک انعام یہ ملتا ہے کہ جس چیز کے متعلق کچھ غور کرنا چاہتا ہے تو اس کے قلب میں واقعہ کے مطابق القاء کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کے بے شمار واقعات ہیں جو اسلاف کے حالات میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں دو واقعات بیان کرتا ہوں۔

۱۔ رسالہ قشیریہ میں حضرت ابراہیم خواص کا یہ واقعہ منقول ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں بغداد کی جامع مسجد میں تھا وہاں فقراء کی بھی ایک جماعت موجود تھی اتنے میں ایک جوان نہایت ہی حسین مکھ۔ باوقار۔ خوبصورت اور نہایت ہی عمدہ خوشبو لگائے ہوئے سامنے سے آتا ہوا نظر آیا میں نے اپنے اصحاب سے کہا کہ میرے قلب میں یہ آرہا ہے کہ یہ شخص یہودی ہے حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ فَكُلُّهُمْ كَرِهُوْا ذٰلِكَ یعنی میری اس بات کو تقریباً سب ہی نے ناپسند کیا۔ تاہم میں تو یہ کہہ کر مجلس سے اُٹھ گیا اور وہ جوان آیا اور حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ میرے متعلق شیخ نے کیا فرمایا اس پر بھی لوگوں کی ہمت شیخ کے مقولہ کو اس سے نقل کرنے کی نہیں ہوئی بلکہ اس کی ظاہری وجاہت سے مرعوب ہو گئے۔ اس نے اصرار کیا کہ بتلائیے شیخ نے کیا فرمایا ہے اس پر لوگوں کو کہنا پڑا کہ شیخ نے یہ فرمایا ہے کہ تم یہودی ہو۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی وہ جوان میرے پاس آیا اور میرے ہاتھوں پر سر رکھ دیا اور مسلمان ہو گیا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہارے اسلام کا سبب کیا ہوا اس نے کہا ہم اپنی کتابوں میں لکھا

ہوا پاتے تھے کہ صدیق کی فراست خطا نہیں کرتی۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ مسلمانوں کا امتحان کروں گا۔ میں نے غور و تأمل کیا تو یہ سمجھ میں آیا کہ اہلِ اسلام میں بھی صدیق اگر ہو سکتے ہیں تو اسی طائفہ صوفیہ ہی میں ہو سکتے ہیں اس لیے کہ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی باتیں بیان کرتے ہیں چنانچہ میں نے تمھارے اوپر التباس کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی باوجود اس کے جب تمھارے شیخ نے اپنے نورِ فراست سے مجھ کو تاڑ لیا اور پہچان لیا کہ میرے اس ظاہر میں باطن کچھ اور ہے تو مجھے اب یقین ہو گیا کہ یہی صدیق ہیں۔ چنانچہ وہ جوان ان کی خدمت میں رہا اور کبار صوفیہ میں سے ہوا۔

۲۔ اسی کے مثل ایک اور واقعہ سُنئے مالابد میں کتاب الاحسان میں ہے کہ :۔

نورِ باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جست و بداں نورِ سینۂ خود را روشن باید کرد تا ہر خیر و شر بفراست صحیحہ دریافت شود۔	پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ باطن کو درویشوں کے سینے میں تلاش کرنا چاہیے اور اس نور سے اپنا سینہ روشن کرنا چاہیے تاکہ فراست صحیحہ حاصل ہو اور اس کے ذریعہ ہر خیر و شر کو معلوم کیا جا سکے

رسالہ مالابد منہ صہ ۱۷۳

اس فراست صحیحہ پر حاشیہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے اور اس پر یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ :۔

ایک شخص درویشوں کا جبہ اور دلق پہنے ہوئے حضرت خواجہ عبد الخالق غجدوانیؒ کی مجلس میں آ کر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ جب حضرت لوگوں کو پند و نصیحت کرنے سے فارغ ہو چکے تو اُس شخص نے اُٹھ کر حضرت سے یہ سوال کیا کہ اتقوا فراسۃ المومن کا کیا مطلب ہے اور رہ فراست کیا چیز ہوتی ہے حضرت نے فرمایا کہ وہ فراست یہ ہے کہ تم اپنا زنّار توڑ ڈالو یہ ... کہا کہ معاذ اللہ مجھے زنّار سے کیا مطلب۔ اسی اثنا میں ایک ... کے دلق ریائی کو اس کے بدن سے الگ کر دیا تو اس کے نیچے ... مسلمان ہو گیا۔ اصل واقعہ تو ختم ہوا اس کے بعد شیخ نے

اپنے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا دوستو! آؤ جس طرح اس نے اپنے ظاہری زنار کو توڑا ہے اور مسلمان ہوگیا ہے یارو آؤ ہم سب بھی اپنے اپنے باطنی زنار کو توڑ ڈالیں اور اس وقت سے حق تعالیٰ کے ساتھ نیا عہد باندھیں۔ شیخ کے اس کہنے پر لوگوں کے درمیان سے ایک شور اٹھا اور سب نے اسی وقت بیعت کی تجدید کی۔ (حاشیہ الابریز)

سبحان اللہ! عجیب واقعہ ہے ظاہر ہے کہ پھر اس کے بعد ان لوگوں نے کیسا کچھ عہد باندھا ہوگا۔

۶۔ اسی طرح سے منجملہ ان احوال رفیعہ کے جو حق تعالیٰ کی جانب سے مداوم علی السکینہ کو مرحمت فرمائے جاتے ہیں۔ ایک عظیم الشان حال اجابت دعا بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک ایسی نسبت اور ایسا تعلق بندہ کا قائم ہو جائے کہ اب اس کے بعد اپنی جس ضرورت کو یہ طالب اپنی جہد ہمت اور قلب کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمادیں جس طرح حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی تھے جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ مستجاب الدعوات ہیں۔ ایک مرتبہ کسی جنگ میں یہ بھی شریک تھے۔ آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے دل میں رعب ڈال دیا اور سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ بھی اجابت دعا جو مومن کو ملا کرتی ہے۔

۷۔ اسی طرح سے اس کو یہ مرتبہ بھی عطا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے کسی بات پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں تاکہ اس کا صدق ظاہر ہو جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رُبَّ اَغْبَرَ اَشْعَثَ ذِی طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَہُ لَہٗ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ یعنی بہت سے شخص غبار آلود۔ پراگندہ بال۔ پھٹے پرانے کپڑے والے جن کو کوئی خاطر میں بھی نہ لاتا ہو (یعنی لوگوں کی نظروں میں بے وقعت ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا مرتبہ رکھتا ہو کہ) اگر اللہ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا فرمادیں۔ مطلب یہ کہ ظاہر حال تو اس کا ایسا ردی کہ لوگ اپنے پاس بٹھانا تک گوارا نہ کریں مگر خدا کے نزدیک اس کا ایسا درجہ کہ وہ جو کچھ زبان سے نکال دے تو اس کے تعلق و مقبولیت کی لاج رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ ویسا ہی معاملہ فرمادیں۔ سبحان اللہ کیا مرتبہ ہے

اور اللہ تعالیٰ اس دار دنیا میں اپنے بندوں کو کیا کیا دیتے ہیں۔

اس توکل اور لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ کی ایک مثال حدیث شریف کے ایک واقعہ سے دیتا ہوں:

ابن ماجہ میں حضرت انس سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ میری پھوپھی رُبیّع نے ایک باندی کے سامنے کے دانت توڑ دیئے لوگوں نے کوشش کی کہ وہ معاف کر دے مگر اس کے قبیلے والوں نے صاف انکار کر دیا پھر لوگوں نے چاہا کہ ارش یعنی اس کی قیمت ہی لے لے اور قصاص سے باز آ جائے مگر خاندان والوں نے اسے بھی نہ مانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ پیش کر دیا۔ حضور نے شرعی حکم یعنی قصاص کا فیصلہ فرما دیا۔ یعنی یہ کہ اس کے بدلے میں ان کے بھی دانت توڑے جائیں آپ کا یہ فیصلہ سن کر انس بن نضر نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا میری پھوپھی کے دانت ٹوٹ ہی جائیں گے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے اس کے دانت تو نہیں ٹوٹ سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے انس! یہ بات (کیا کہتے ہو) کتاب اللہ میں قصاص کا حکم موجود ہے۔ مراد اس سے آپ کی یہ آیت تھی۔ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ پھر اس جاریہ کی قوم راضی ہو گئی اور انھوں نے قصاص معاف کر دیا۔ اور میری پھوپھی کے دانت صحیح و سالم رہ گئے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کے مطابق معاملہ فرما دیں۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بعد حضرت انس کا کہنا کہ دانت تو نہیں ٹوٹیں گے اللہ اور رسول کے حکم کی مخالفت یا رد کرنا نہ تھا بلکہ محض توکل علی اللہ پر یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید اللہ تعالیٰ خصم کو راضی فرما دیں اور وہ قصاص کو معاف کر دے ایک آئندہ ہونے والی بات کی خبر دینا تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ان احوال اور صاحب سکینہ کو مرحمت فرمائے جانے والے انعامات کا ذکر کر کے حضرت شاہ صاحب آخر میں پھر پہلی بات کا اعادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں وبالجملة فهذه

الوقائع و امثالہا دالۃ علی صحۃ ایمان الرجل وقبول طاعاتہ وسرایۃ النور فی صمیم قلبہ فلیغتنمہا یعنی خلاصہ کلام یہ کہ ایسے حالات رفیعہ جو مذکور ہوئے اور انھیں کے مانند اور دیگر حالات عالیہ یہ سب دلالت کرتے ہیں کہ اس شخص کا ایمان صحیح ہے اور اس کی طاعات عند اللہ مقبول ہیں اور نور ایمان اس کے باطن میں سرایت کئے ہوئے ہے لہٰذا سالک کو چاہیئے کہ ان احوال کو غنیمت جانے کیونکہ یہ سب اس کے ایمان کی دلیل اور دنیا میں ہی اس کے لئے تسلی کا باعث بن سکتے ہیں ایمان کی صحت اور طاعات کا قبول ہونا یہ کیا کچھ کم رتبہ رکھتا ہے۔ یہ سب علامات مذکورہ اسی کی فرع ہیں۔

دیکھئے حضرت شاہ صاحبؒ نے کیسی عمدہ بات بیان فرمائی کہ اجابت دعا بھی انھیں احوال رفیعہ میں سے ہے جو صحت ایمان اور قبول طاعات پر ملتے ہیں اور ان کی اصل یعنی سکینہ کی تحصیل اور اس کی مداومت پر یہ عطا ہوتے ہیں جیسا کہ آپ نے صحابہ کے واقعات میں ملاحظہ فرمایا چنانچہ یہ اور اس قسم کے بیشمار واقعات اسلاف کے ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے صالحین بندوں کو ان کے دوام علی السکینہ کے صلہ میں اجابت دعا کا مقام عطا فرماتے ہیں۔ کس قدر قدردانی ہے ایمان مومن کی سبحان اللہ!

اسی مضمون کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ مثنوی میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مراد متقیں

یعنی تم یوں چاہتے ہو تو خدا بھی یوں ہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کی مراد پوری فرماتے ہیں۔ آخر میں ایک بات یہ کہتا ہوں کہ یہی وہ احوال تھے جن پہ اہل اللہ نے دنیا کو ترجیح دیا تھا چنانچہ ان کے حصول کے بعد دنیا کی کچھ بھی وقعت اور قدر ان کے قلوب میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حضرت مولانا قدس سرہٗ کبھی کبھی مجلس میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے (اور کچھ اس ذوق سے پڑھتے تھے کہ سامعین پر عجیب کیف طاری ہو جاتا تھا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بہ ماہ روئے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

اجابت دعا کے سلسلے کے یہ وہ واقعات ہیں جو مومنین صالحین سے متعلق ہیں۔ اب آپکے سامنے فرعون کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جسے صاحب روح المعانی نے ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات کے تحت لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی ہی عبرت اور نصیحت کا واقعہ ہے۔ وھی ھذا۔

اخرج الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول وابن ابی حاتم عن ابن عباس رضی قال لما اخذ اللہ تعالیٰ آل فرعون بالسنین یبس کل شئ لھم وذھبت مواشیھم حتی یبس نیل مصر فاجتمعوا الی فرعون وقالوا لہ ان کنت کما تزعم فأتنا فی نیل مصر بماءٍ فقال غدوۃ لیصبحکم الماء فلما خرجوا من عندہ قال ای شئ صنعت انا لا اقدر علی ذلک فغدا یکذبوننی فلما کان جوف اللیل قام واغتسل ولبس مدرعۃ صوف ثم خرج حافیا حتی اتی النیل فقام فی لطنہ فقال اللھم انک تعلم انی اعلم انک تقدر علی ان تملأ نیل مصر ماءً فاملأہ ماءً فما علم الا بخریر الماء یقبل فخرج واقبل النیل

حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کو قحط میں مبتلا کیا تو انکے یہاں کی ہر چیز خشک ہو گئی تمام جانور اور مویشی مر گئے یہاں تک کہ مصر کا مشہور دریا نیل بھی خشک ہو گیا یہ دیکھ کر قوم کے سب لوگ فرعون کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ اگر تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تیرا گمان ہے (یعنی معاذ اللہ خدا ہے) تو ہمارے دریائے نیل میں پانی لے آ۔ اس نے کہا اچھی بات ہے کل صبح اس میں پانی آجائیگا جب لوگ اس کے پاس سے واپس چلے گئے (اور فرعون تنہا ہوا) تو اس نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں کیا کرونگا میں تو پانی لانے پر قادر نہیں نتیجہ یہی ہوگا کہ لوگ کل صبح میری تکذیب کردینگے (اور میں رسوا ہو جاؤنگا) چنانچہ جب آدھی رات ہوئی تو فرعون اٹھا غسل کیا اور صوف کا جبہ پہنا اور ننگے پاؤں نیل کے پاس آیا اور دریا کے بیچ میں کھڑے ہو کر یہ دعا کی کہ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں تجھکو اس بات پر قادر سمجھتا ہوں کہ دریائے نیل کو تو پانی سے بھر سکتا ہے لہٰذا تو اسے پانی سے بھر دے اسکا اتنا کہنا تھا کہ اسے پانی کے آنے کا شور محسوس ہوا فوراً دریا سے باہر نکل آیا اور دریائے نیل پانی سے لبریز ہو کر رواں ہو گیا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں

مطرعًا بالماء علما ان ادالله بهم من المهلکة - (روح المعانی ص۲۳ پ۹)
فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت اسی نیل میں غرق ہو کر مقدر تھی۔

سبحان اللہ یہ روایت عجیب روایت ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کافر کی دعا بھی قبول فرما لیتے ہیں دیکھئے فرعون کی دعا کو بھی شرف قبول بخشا حالانکہ وہ خدائی کا مدعی تھا لیکن جب تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز کا اقرار کیا اور معاملہ کو اسی کے حوالے کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی شان قدرت دکھائی کہ دریا کو جاری فرما دیا۔ اور اس کی پردہ تک نہیں کی کہ یہ کافر ہے میری ہمسری کا دعویدار ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ خدائی ہی اخلاق تھے جو دشمن کے ساتھ بھی ایسا معاملہ روا رکھا گیا دوسرا کوئی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

یہاں میں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ جب کافر کی دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ فرما دیا تو اگر اللہ تعالیٰ سے کوئی مومن موحد اور اللہ تعالیٰ کا ماننے والا خلوص کے ساتھ صدق دل سے عالت اضطرار میں اپنی کوئی حاجت طلب کریگا تو کیا اللہ تعالیٰ اسے قبول نہ فرمائیں گے ضرور قبول کریں گے ؎

دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمناں نظر داری

میں اپنے احباب کو وصیت کرتا ہوں کہ اس قصہ کو بار بار پڑھیں اور اسے ذہن میں مستحضر کر لیں اسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و رحمت پر بھی نظر ہو جائے گی اور انشاء اللہ تعالیٰ معرفت کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہی نصیب ہو جائے گا۔

آخر میں ایک ضروری بات بیان کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مومن اخلاص کے ساتھ دعا کرتا ہے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دعا قبول نہیں ہو رہی ہے۔ اس وقت ظاہر ہے کہ انسان اس کی وجہ سے دل شکستہ ہوتا ہے پس اس تاخیر کا سبب مولانا روم رح نے مثنوی میں بہت ہی عمدہ بیان فرمایا ہے ایسا کہ ہر مومن کو اس کے سننے کے بعد تو بالکل تسلی اور اطمینان ہی ہو جاتا ہے ایک مقام پر یہ سرخی قائم فرمائی ہے کہ سبب تاخیر اجابت دعائے مومن اور اس کے تحت یہ فرمایا کہ :-

اے بسا مخلص کہ نالد در دعا تا رود دود اخلاصش بر آید تا سما

بسا مخلص ایسے ہیں کہ اپنی دعا میں اس طرح سے نالہ و فریاد کرتے ہیں کہ ان کے اخلاص کا دھواں آسمان تک پہونچ جاتا ہے۔

تا رود بالائے ایں سقف بریں　　بوئے مجمر ازانین المذنبیں

یہاں تک کہ گنہگاروں کی فریاد کرنے کی وجہ سے ان کے قلب کی انگیٹھی کی خوشبو اس آسمان سے اوپر تک جاتی ہے۔

پس ملائک باخدا نالند زار　　کائے مجیب ہر دعا و مستجار

یہ دیکھ کر فرشتے اللہ تعالیٰ سے زار زار نالہ کرتے ہیں کہ اے دعاؤں کی اجابت کرنے والے اور اے وہ ذات جس کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔

بندۂ مومن تضرع میکند　　او نمی داند بجز تو مستند

یہ مومن بندہ تجھ سے تضرع وزاری کر رہا ہے اور سوا آپ کے کسی اور کو تکیہ گاہ اور اپنا سہارا نہیں سمجھتا۔

تو عطا بیگانگاں را می دہی　　از تو دارد آرزو ہر مشتہی

آپ تو بیگانوں کو بھی عطا فرماتے ہیں اور آپ سے تو ہر خواہشمند آرزو رکھتا ہے۔

مومن مخلص کی دعا اور ملائکہ کی سفارش نقل کر کے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ آگے حق تعالیٰ کا جواب نقل فرماتے ہیں اور وہی سبب ہے تاخیر اجابت کا جو کہ مقصود بیان ہے فرماتے ہیں کہ ؎

حق بفرماید نہ از خواری او ست　　عین تاخیر عطا یاری او ست

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری یہ تاخیر اجابت کچھ اس کی بے قدری کے سبب سے نہیں بلکہ وہی تاخیر اس کے حق میں عین کرم ہے اور اس کی اعانت ہے۔

نالۂ مومن ہمی داریم دوست　　گو تضرع کن کہ ایں اعزاز او ست

بات یہ ہے کہ ہم کو مومن کی یہ آہ و فغاں پسند ہے اس سے کہو کہ اور گریہ وزاری کرے کیوں کہ اس میں اس کا اعزاز ہے۔

حاجت آورد ش زغفلت سوئے من　　آں کشیدش مو کشاں در کوئے من

اسلئے کہ وہ تو غفلت میں پڑا ہوا تھا اسکی حاجت ہی اس کو میری طرف لائی اسی نے اس کی چوٹی پکڑ

کر سیکر کوچہ میں پہونچایا۔

گر برآرم حاجتش او وا رود ہم در آں بازیچہ مستغرق شود

اگر میں فوراً اس کی حاجت پوری کر دوں تو پھر اپنی پرانی حالت پر لوٹ جاوے گا اور اسی سابقہ کھیل میں مشغول ہو جاوے گا۔

گرچہ می نالد بجاں یا مستجار دل شکستہ سینہ خستہ سوگوار
خوش ہمی آید مرا آواز او واں خدایا گفتن و آں راز او

یہ جانتا ہوں کہ جان و دل سے نالہ کر رہا ہے اور مجھے پکار رہا ہے دل اسکا شکستہ ہے اور سینہ خستہ ہے اور خود وہ غمزدہ ہے با ایں ہمہ دعا میں جو اس کی دعا قبول نہیں کر رہا ہوں تو اس لئے کہ مجھے اس کی آواز ہی بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کا یا خدا یا خدا کہنا اور مجھے ہمراز بنانا پسند آتا ہے۔

زانکہ اندر لابہ و در ماجرا می فریبانند بہر نوعے مرا

اور اس کی یہ بات بھی مجھے پسند ہو کہ وہ اپنے عرض مدعا میں طرح طرح سے تملق و چاپلوسی کرکے مجھے پھسلاتا ہے۔

طوطیاں و بلبلاں را از پسند ازخوش آوازی قفس در می کشند

دیکھو بلبل اور طوطی کو جو قفس میں بند کرتے ہیں تو اسی لئے کہ وہ اپنی خوش آوازی کی وجہ سے لوگوں کو پسند ہوتی ہیں۔

زاغ را و چغد را اندر قفص کے کنند ایں خود نیامد در قفص

اور الو اور کوے کے بارے میں کسی داستان میں یا کسی کی زبان سے نہ سنا ہوگا کہ کسی نے انہیں بھی پنجرے میں پالا ہو۔

آگے مولانا رومؒ تاخیر اجابت مومن بوجہ پسندیدگی کی ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ،۔

پیش شاہد باز چوں آید دو تن آں یکے کمپیر و دیگر خوش ذقن

دیکھو کسی حسن پسند کے سامنے جب دو شخص آویں ایک تو ان میں بڑھیا ہو اور دوسری قبول صورت ہو۔

ہر دو ناں خواہند او زوتر فطیر آرد و کمپیر را گوید کہ گیر

اور دونوں اس سے روٹی طلب کریں تو وہ جلدی سے روٹی لا دے گا اور بڑھیا کو تو دے کر رخصت کر دے گا۔

واں دگر راکہ خوشستش قد و خد کے دہد ناں بل بتاخیر افگند

اور اس دوسری کو جس کا قد اور رخ خوبصورت ہو اور اس کو پسند ہو اس کو روٹی دینے میں تاخیر کریگا۔

گو یدش بنشیں زمانے بے گزند — کہ بخانہ نان تازہ می پزند

یعنی اس سے کہے گا کہ آرام سے ذرا دیر بیٹھو۔ گھر میں تازی روٹی پک رہی ہو پک جائے تو دوں۔

چوں رسد آں نان گرمش بعد کد — گویدش بنشیں کہ حلوہ میرسد

پھر جب بہت دیر کے بعد گرم روٹی لے آوے گا تو اس سے کہے گا کہ اچھا تھوڑی دیر اور بیٹھ جاؤ حلوا آتا ہے اسکے ساتھ کھانا

ہم بدیں فن دار دارش میکند — وز رہ پنہاں شکارش میکند

غرض اسی تدبیر سے اس کو ذرا اور ٹھہرو ذرا اور ٹھہرو کہتا رہتا ہے اور مقصد پنہانی اس کو شکار کرنا ہوتا ہے۔

کہ مرا کاریست باتو یک زماں — منتظر می باش اے خوب جہاں

آخر میں کہتا ہے کہ مجھ کو تجھ سے ایک کام ہے تھوڑی دیر اور انتظار کر اے حسین جہاں

تا بدیں حیلت فریبا مذ ورا — تا مطیع و رام گرداند ورا

اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بہانہ سے اس کو پھسلا دے تاکہ اس کو اپنا مطیع و مسخر کرلے۔

اس کے بعد مولانا رومؒ دعائے مومن میں بھی حق تعالیٰ کی تاخیر اجابت کا اس مثال کے ساتھ انطباق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

مثل آں کمپیر داں بیگانگاں — شاہد خوش رو ئے مثل مومناں

بس اسی بڑھیا کی طرح بیگانوں کو سمجھو کہ ان کو ذرا دے کر دفع کر دیا جاتا ہے) اور شاہد خوش رو مثل مومنوں کے ہے (جس کو دینے میں تاخیر کی جاتی ہے اور مقصود اس کے جمال کا دیکھنا ہوتا ہے)

ایں جہاں زندانِ مومن زیں بود — کافراں را جنت ہائے شود

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا سجن مومن کہلاتی ہو کہ اس کی حاجات کم پوری ہوتی ہیں جس سے وہ تنگ بھی ہوتا ہے اور کافروں کے لئے جنت ہو کہ ان کی اکثر حاجات مرضی کے موافق پوری ہو جاتی ہیں۔

بہرادی مومناں از نیک و بد — تو یقیں میداں کہ بہر ایں بود

حاصل کلام یہ کہ مومن خواہ نیک ہو یا بد وہ جو کبھی اپنی مراد کو نہیں پاتا تو یقین کرلو کہ اس کی وجہ یہی ہے یعنی اس کی گفتگو کا پسند ہونا باقی حق تعالیٰ کی ناراضگی یا بندے کی خواری ہرگز اس کا منشا نہیں ہو۔

سبحان اللہ کیا تسلی بخش مضمون ہو اب اس کے دیکھنے کے بعد بجائے اس کے کہ تاخیر اجابت کی وجہ سے طبیعت ملول ہو حق تعالیٰ کے اس کرم اور عنایت پر نظر کرکے اور اس امر کا تصو

کر کے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی دعا کو سننا چاہتے ہیں۔ خدا ہونے کو جی چاہتا ہے اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان کے ماں باپ سے بھی زیادہ رحیم ہیں۔ قصور ہمارا ہی ہے کہ ہم کو مانگنے کا ڈھنگ نہیں آتا ورنہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے صالحین بندوں کو اس دار دنیا میں بھی بہت کچھ دیا ہے۔

اس وقت آپ کے سامنے دو واقعہ بیان کرتا ہوں اور اس میں شک نہیں کہ بڑے ہی عبرت کے واقعات ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی کی دعا ضرور قبول کرتے ہیں رسالہ قشیریہ میں ہے کہ حذیفہ مرعشی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابراہیم ابن ادھم کی خدمت میں بہت دنوں رہا مجھ سے دریافت کیا گیا کہ ان کا سب سے عجیب تر واقعہ جس کا تم نے مشاہدہ کیا ہو بیان کرو۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ مکہ شریف کے سفر میں تھے کئی دنوں سے کھانے کی کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی تھی کہ اس اثنا میں ہم کوفہ پہونچے اور ایک ویران اور شکستہ مسجد میں قیام کیا حضرت ابراہیم ابن ادھم نے میری جانب دیکھا اور فرمایا کہ حذیفہ تم پر تو بھوک کا اثر دیکھ رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت نے بجا ارشاد فرمایا۔ فرمایا کہ اچھا تو ذرا قلم، دوات اور کاغذ تو لے آؤ میں نے لاکر پیش کیا تو اس پر تحریر فرمایا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم انت المقصود الیہ بکل حال والمشار الیہ بکل معنی یعنی ہر حال میں آپ ہی مقصود ہیں اور ہر معنی سے آپ ہی مراد ہیں اور اس کے بعد یہ اشعار لکھے۔

انا حامد انا شاکر انا ذاکر　　　انا جائع انا نائع انا عاری

میں آپ کی حمد کرنے والا ہوں اور آپ کا شکر کرنے والا ہوں اور آپ کی یاد کرنے والا ہوں۔ میں بھوکا ہوں میں پیاسا ہوں اور میرے بدن پر کپڑا نہیں ہے۔

ھی ستۃ و انا الضمین لنصفھا　　　فکن الضمین لنصفھا یا باری

یہ کل چھ چیزیں ہیں یعنی حمد و شکر ذکر بھوک پیاس، عریانی تو میں ان میں اول تین کا ضامن ہوتا ہوں۔ لیکن اے باری بقیہ نصف کے آپ ضامن ہو جائیے۔

مدحی لغیرک لھب نار خضتھا　　　فاجر عبیدک من دخول النار

(اور آپ سے یہ درخواست اس لئے کرتا ہوں کہ) میرا آپ کے علاوہ کسی اور کی تعریف کرنا گویا آگ کی لپیٹ میں داخل ہونا ہے

لہٰذا اپنے اس مسکین بندے کو دخول نار سے بچا لیجئے۔

والنار عندی کالسوال فہل تری ان لا تکلفنی دخول النار

اور میں نے دخول نار اس لئے کہا کہ کسی سے سوال کرنا میرے نزدیک بمنزلہ دخول نار ہی کے ہے تو کیا آپ اپنے کرم سے مجھے دخول نار سے بچا لیں گے؟

یہ لکھ کر مجھے رقعہ دیا اور فرمایا کہ جاؤ اور خبردار اپنے قلب کو غیر اللہ سے متعلق نہ کرنا اور سب سے پہلے جس شخص سے تمھاری ملاقات ہو اسے یہ رقعہ دیدینا۔ خذیفہ کہتے ہیں کہ میں رقعہ لے کر چلا تو میری ملاقات سب سے پہلے ایک خچر سوار سے ہوئی میں نے اسی کو وہ پرچہ دیدیا اس نے لیا۔ پڑھا اور رونے لگا اور مجھ سے پوچھا کہ جن بزرگ نے یہ پرچہ لکھا ہے وہ کہاں ہیں میں نے کہا کہ وہ تو فلاں مسجد میں مقیم ہیں یہ سن کر اس نے مجھے ایک تھیلی دی جس میں چھ سو دینار رکھے اور دے کر چلدیا پھر میری ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ خچر پر جو شخص جا رہا ہے آپ بتا سکتے ہیں یہ کون ہے اس نے کہا کہ ہاں یہ تو ایک نصرانی ہے اس کے بعد میں حضرت ابراہیم ابن ادھم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا قصہ سنایا انھوں نے فرمایا کہ اچھا اس تھیلی کو اسی طرح سے رہنے دو ابھی وہ خود آتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ وہ نصرانی آیا اور منھ کے بل حضرت ابراہیم ابن ادھم کے سامنے گرا اور مشرف باسلام ہوگیا۔ سبحان اللہ ایمان تازہ کر دینے والا واقعہ ہے کبھی آپ کا ایسا بھی زمانہ تھا۔

دوسرا واقعہ سنیئے:۔

حضرت ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ میں ایک بستی میں پہونچا وہاں میں نے ایک نصرانی کو دیکھا جس کی کمر میں زنار بندھی ہوئی تھی اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس کو بھی اپنے ہمراہ لے لوں چنانچہ ساتھ ہولیا اس کے بعد ہم دونوں سات دن تک سفر کرتے رہے پھر ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ اے اسلام کے درویش ہمیں بھوک لگی ہے کچھ اپنی کرامت ظاہر فرمایئے۔ حضرت ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ اس کافر کے سامنے مجھے رسوا نہ کیجئے (اپنے فضل وکرم سے کھانا عطا فرمایئے) یہ دعا کرنا تھا کہ دیکھا کہ ایک طباق نازل ہوا جس میں روٹی، بھنا ہوا گوشت کچھ کھجوریں اور پانی کا کوزہ رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں

نے خوب سیر ہو کر کھایا پیا پھر سفینہ بھر چلتے رہے اس کے بعد اب کی دفعہ میں نے سبقت کی اور اس سے کہا کہ اے نصاریٰ کے راہب اب تیری باری ہے تو بھی اپنی بزرگی دکھلا یہ سن کر اس نے اپنی لاٹھی پر سر ٹیک لیا اور اللہ تعالیٰ سے کچھ دعا کی پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دو طباق سامنے رکھے ہوئے ہیں اور ان پر میرے طباق سے کہیں زیادہ کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں۔ ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ مجھے یہ منظر دیکھکر حیرت بھی ہوئی اور ندامت بھی (یہ خیال کر کے کہ یہ کافر سمجھے گا کہ نصرانیت اسلام سے بڑھ گئی) چنانچہ اسی رنج و غم میں میں نے کھانے سے انکار کر دیا اس نے بہت اصرار کیا مگر میں نے وہ کھانا نہیں کھایا بالآخر اس نے کہا (کہ میں آپکے نہ کھانے کی وجہ سمجھ گیا ہوں) اچھا کھائیے اور آپ کو میں دو خوشخبریاں سناتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور آپ کے سامنے کلمۂ اسلام پڑھتا ہوں۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمد ارسول اللہ یہ پڑھ کر زنار توڑ کر پھینکدی۔

اور دوسری خوشخبری یہ کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ یا اللہ اگر آپ کے اس بندے کا (یعنی آپ کا) تیرے نزدیک کوئی مرتبہ ہو تو اس کی برکت سے میرے اوپر فتح فرما دیجئے (چنانچہ یہ سب جو آپ دیکھ رہے ہیں آپ ہی کی برکت ہے)

ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ یہ سن کر ہم نے کھانا کھا لیا اور پھر ہم دونوں نے راستہ لیا۔ چنانچہ حج بیت اللہ کیا اور مکہ معظمہ میں ایک سال تک ہم دونوں مقیم رہے پھر اس شخص کا وہیں انتقال ہو گیا اور بطحا میں دفن ہوا۔

یہ ہے اجابت دعا جو اللہ تعالیٰ اپنے مداوم علی السکینہ بندوں کو مرحمت فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب صالحین کی برکات ہم سب کو بھی نصیب فرمادے۔

آمین

دربار عالمگیری

(۱۰)

شیخ عبداللطیف رح

از ڈاکٹر مولانا مصطفیٰ حسن علوی کاکوروی

برہان پور وطن تھا انھیں علوم مذہبیہ اور معارف دینیہ میں پوری دستگاہ حاصل تھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملات میں پورا پورا انہماک رکھتے یہاں تک کہ لوگوں کی نظروں میں ایک حد تک انھیں ان ہر دو امور میں پورا غلو اور مبالغہ حاصل تھا۔ چھوٹی موٹی تجارت سے روزی کماتے اور اس ذریعہ سے جو کچھ رزق حلال میسر آتا اسی پر بسر اوقات کرتے ۔ خورد و نوش جیسے مصارف ضروریہ ہی میں اپنی قلیل اور غیر مشتبہ آمدنی صرف کرتے۔ حوائج محدود اور ضرورتیں گنی چنی۔ جب اتنی آمدنی کی راہ نکل آتی پھر مزید آمدنی کے پیچھے نہ پڑتے مرجع خلائق تھے عقیدت مندوں اور خادموں کی بہتات تھی مگر کسی سے کوئی نذر یا ہدیہ قبول کرنے میں بڑے متشدد تھے۔ پیری مریدی کی راہیں بالکل مسدود اور بند رکھتے تھے گھر میں کوئی خادمہ نہ باہر کوئی نوکر، صرف زوجہ محترمہ تھیں جو اندرون خانہ رہائش کے لوازمات پورے کرتیں۔ اور اگر کوئی اپنی خدمت پیش بھی کرتا تو بہ لطائف الحیل اس سے محترز رہتے۔ شاہ عالمگیر کو اپنی شہزادگی ہی کے زمانہ میں جب جب موقعہ ملتا تو حاضری کے برکات سے استفادہ کرتے ۔

" خدیو حق پرست (عالمگیر) در ایام بادشاہ زادگی در برہان پور بارہا بمنزل آں مرحمت

گویں تشریف بردہ صحبت معنوی داشتہ اند و شیخ ہم بے ..... ؟ برائے امور دینی بخدمت می آمد"۔

اگرچہ شعر و سخن کا مشغلہ نہ تھا تاہم طبیعت شاعرانہ تھی۔ کبھی کبھی اشعار بھی کہہ لیتے تھے اور جو لوگ سنتے انھیں محفوظ کر لیتے۔ ۱۱۰۰ھ میں ان کی وفات ہوئی اور برہان پور ہی میں دفن کئے گئے۔ مرتے وقت وصیت کی تھی کہ جہاں دفن ہوں وہاں کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ بند رہیں۔ ہجوم خلائق ہرگز ہرگز نہ ہو اور قبر پرستی کے انواع اور مظاہر دیکھنے میں نہ آئیں۔

"وقت رحلت وصیت کرد کہ در محوطہ مرقدش باز نہ باشد تا مردم قبر پرست نباشد[1]"

ان کی تاریخ وفات

"آہ زاں شیخ کامل یافتہ اند"

سے نکلتی ہے۔

---

[1] نزھۃ الناظرین — یہ کتاب محمد اسلم بن محمد حفیظ انصاری قادری نے شاہ عالم کے عہد میں فارسی زبان میں لکھی تھی اس میں عام اسلامی تاریخ کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ بھی ۱۱۸۰ھ تک کی دی ہے۔ اس میں عہد عالمگیر کے مشیوخ علماء اور مشاہیر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ریاست کپورتھلہ کے خزائن مخطوطات میں محفوظ ہے مجھے بوساطت اس کے اقتباسات ہاتھ لگ گئے۔

"چوں از سوانح سلاطین عصر خاقان اعظم پرداختہ لابدست کہ از مشاہیر مشائخین عظام و علمائے کرام و شعرا نامدار و معاصر خلیفہ روزگار (عالمگیر) مجملے مذکور نمایم۔ اگرچہ بہ اکثرے ازیں ..... بصلہ خوارق عادات مشہور و کشف کرامات معروف بودند۔ لاجرم محرر ایں اوراق احوال جمیع از مشاہیر مشائخ عظام مرقوم می سازد۔ بہ عون رب المعبود۔

شیخ برہان شطار

یہ برہان پور کے رہنے والے تھے، دنیا و مافیہا سے بالکل بیگانہ رہ کے زندگی گزارتے رہے۔ رات دن عبادت اور ریاضت تزکیہ باطن و ظاہر کے سوا ان کا کوئی اور شغل نہ تھا۔ طریقت اور سلوک میں انھیں شیخ عیسیٰ سے خرقۂ خلافت ملا تھا۔ شیخ عیسیٰ سندھی کو شیخ محمد لشکر سے خاص ارادت تھی اور مشہور و معروف شیخ محمد غوث گوالیاری سے انھیں خلافت حاصل ہوئی تھی۔ ہزار ہا ان کے مرید تھے۔ عالمگیر کی ان کے حضور میں آمد و شد رہتی۔

"خدیو خدا پژوہ عالمگیر، در ایام بادشاہ زادگی مکرر بآں اہل طریقت ملاقات دست دادہ"

اسّی سے زائد عمر پائی اور ۲۲ سنہ جلوس عالمگیری مطابق ۱۰۸۹ھ ۱۰ شعبان کو وفات پائی۔ برہان پور ہی میں آپ کا مدفن ہے[۱]۔

سید محمد

انھیں تمام علوم دینیہ میں خواہ وہ منقولہ ہوں یا معقولہ ید طولیٰ حاصل تھا۔ فنون کی اصولی اور فروعی گتھیاں آن کے آن میں کھول کے رکھدیتے۔ سوائے درس و تدریس اور کوئی شغل ان کے جی کو نہ بھاتا، قنوج کے رہنے والے تھے اور شیخ محب اللہ الہ آبادی سے انھیں بیعت اور خلافت دونوں ملی تھیں۔ شروع شروع شاہجہاں نے اپنے آخری دور حکومت میں انھیں اپنے وطن قنوج سے بلا کے بڑے اعزاز اور اکرام کے ساتھ اپنا شریک بزم بنایا اور تقرب شاہی کے انھیں امتیازات اور اختیارات حاصل رہے شاہجہاں کی وفات کے بعد عالمگیر کی ان پر نظر التفات پڑی اور ان کو مجالست اور قربت بارگاہ سے نوازا گیا

---

[۱] - فرحۃ الناظرین۔

"حضرت ظلِ الٰہی (عالمگیر) سید را از مستقر الخلافۃ اکبر آباد بکمال توقیر و احترام طلب حضور فرمودہ شرف تقرب و مجالست اقدس بلند پایگی بخشیدند"

عالمگیر اپنے اوقات کا ایک حصہ ان کے ساتھ برابر گزارتا اور امام غزالی کی تصانیف بالخصوص احیاء العلوم کے خاص خاص ابواب کا ہفتہ میں تین روز ضرور ہی ان کے مابین مذاکرہ رہا کرتا۔ سید صاحب کا سب سے محبوب اور دل پسند شغل درس اور افادۂ طلاب تھا۔

"فتاویٰ عالمگیری کہ در زمان سعادت نشان تالیف یافتہ و دیگر کتب سلوک را در ہفتہ سہ روز با سید مذکور مذاکرہ میکردند"[۱]

عالمگیر کا پندرھواں سال جلوس تھا کہ رحلت گرائے عالم جاودانی ہوئے رحمہ اللہ۔ صاحب تحفۃ الکرام نے بھی ان کے متعلق تقریباً یہی معلومات فراہم کر کے لکھے ہیں لیکن قدرے اضافۂ عبارت کے ساتھ

"مصنفات حجۃ الاسلام غزالی خصوصاً احیاء العلوم پیش دیدہ در ہفتہ سہ روز بمذاکرہ علوم در خدمت شاہی مجلس افادہ گرم داشتے و در فتاویٰ عالمگیری سعیہا کردہ"

ملّا شاہ بدخشی

یہ شیخ میر قادری قدس اللہ سرہٗ مشہور و معروف صوفی عہد اور سر آمد عرفاء زمانہ کے خلفاء میں سے تھے۔ چال ڈھال مانند وبود و اور شعار بالکل عارفانہ تھا۔ باتوں میں توحید کا رنگ غالب اور اشعار جو لکھتے وہ موحدانہ ہوتے۔ خاص جذبات میں ہر وقت مگن اور ڈوبے رہتے جس کی سے انقباض خاطر کے آثار کبھی ظاہر نہ ہوتے۔ داراشکوہ ان کے محاسن کا دلدادہ اور قدر دان رہا اور معاملات میں ان پر کلیتہً اعتماد کرتا جب تک شیخ میر قادری ان کے مرشد بقیدِ حیات رہے تو ان کی گرمیاں کشمیر میں گزرتیں اور جاڑے لاہور میں لیکن ان کے انتقال کے بعد مستقل قیام کشمیر میں ہی اختیار کر لیا نواب بیگم اور دارا شکوہ کی غیر معمولی توجہات اور عنایات کی بدولت بلند پایہ مکان

[۱] فرحۃ الناظرین و مراۃ العالم صہ۴۸۳ و مآثر الامرا۔ تحفۃ الکرام جلد ۲ صہ۹۳

بھی تعمیر کرالیا۔

"بعد ازاں بموجب اشارۂ آں رہنمائے سرگشتگان وادی طلب دمیر قادری قدس سرہ در کشمیر رخت اقامت انداخت و باغات نواب بیگم صاحبہ و داراشکوہ عمارات عالیہ طرح نمود"

فردوس مکانی (عالمگیر) ان کی زیارت اور ان کے برکات سے استفادہ کے لئے ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے تھے۔ ان کی شعر گوئی کا نمونہ یہ ہے ؎

آں ابروئے کجش را تیغ خمیدہ گفتم
زاں تیغ اشارتے کرد "بالائے دیدہ" گفتم

جب عالمگیر تخت نشین ہوا تو انھوں نے تاریخ جلوس یوں نکالی [1]

صبحے دل من چوں گل خورشید شگفت　　حق پیدا شد غبار باطل زارفت
تاریخ جلوس شاہ اورنگ مرا　　ظل الحق گفت الحق ایں راحق گفت

غالباً جلوس میں شرکت کے لئے کشمیر سے لاہور آئے تھے اور وہاں قیام طویل ہو گیا تھا سن چہارم جلوس کا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا اور وصیت میں لکھا یہ تھا کہ اپنے پیر مرشد کے جوار میں دفن ہوں [2] ان کی تاریخ وفات ایک لوح پر کندہ ہے۔

"داد ملا شاہ در توحید جان"

ملا آخوند

صوبہ بہار کے ایک بڑے خانوادہ کے فرد تھے۔ اور ایک خاص طرز زندگانی برتا کرتے۔ نہ لباس کی طرف کوئی اعتنا جو کچھ بھی موٹا جھوٹا مل گیا پہن لیا نہ خورد و نوش کا شوق بدمزہ اور مزہ دار جو سامنے آیا کھالیا۔ شادی بیاہ ساری عمر نہ کیا مجرد ہی رہے۔ حالاں کہ مرجع خلائق تھے لیکن جب کہیں آتے جاتے تو یکہ و تنہا۔ نہ خدام کا ساتھ نہ جلو میں مریدین اور معتقدین کبھی بازاروں میں اور کبھی کوچہ و برزن میں۔ بے نیازی کی یہ شان تھی کہ عالمگیر جب ان کی اقامت گاہ پر ملاقات کرنے گیا تو ملاقات سے انکار کردیا لیکن خود کبھی

---

[1] خافی خاں [2] فرحتہ الناظرین

کئی بار حضور سلطانی میں حاضر ہوئے اور عالمگیر کو شرف ملاقات بخش کے مسرور کرتے رہے۔ ملا اسعد اللہ خاں کو ان سے غیر معمولی رابطہ و تعلق رہا کیا۔ یہ ان کے بڑے ہی معتقد تھے ۱۰۶۸ھ میں جب کہ عالمگیر کے جلوس کا پہلا سال تھا اور خطبہ اور سکہ ان کے نام کا اس جلوس میں نہیں ہوا تھا ایک روز باغ فیض بخش لاہور میں سیر کی غرض سے تشریف لے گئے چلتے چلتے کئی بار بلا ارادہ اور بے تکلف زبان مبارک سے "مرا می طلبند" نکل گیا۔ اور اسی وقت داعی حق کو لبیک کہہ کے زندگانی ختم کر دی اور وہاں ہی مدفون بھی ہوئے۔

روزے بہ سیر باغ فیض بخش لاہور رفتہ بود در آنجا در مصرع گفت
"مرا می طلبند" و بعد رآں از آنجا داعی حق را لبیک گفتہ در مقبرہ
مدفون گردید۔[۲]

---

[۲] خافی خاں جلد دوم ص ۳۹ طبع … نولکشور

ابن خلدون

بحیثیت ایک مفکر تعلیم

ابو الفتوح محمد التونسی

حالاتِ زندگی | ابن خلدون ۷۳۲ھ میں تیونس میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان اسپین کے مشہور شہر اشبیلیہ سے ترک وطن کر کے یہاں آباد ہو گیا تھا۔ ابن خلدون کے زمانے میں اسپین سے آنے والے علماء کی ایک کثیر تعداد تیونس میں موجود تھی۔ نیز خود ابن خلدون کا اپنا بڑا علمی خاندان تھا اور صدیوں سے اس کے افراد مختلف اسلامی حکومتوں میں عالی عہدوں پر سرفراز ہوتے چلے آرہے تھے۔ یہ ماحول تھا جس میں ابن خلدون نے آنکھیں کھولیں اور نشو و نما پائی، ابن خلدون نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے اسپین سے آنے والے علماء سے پورا استفادہ کیا۔ وہ ابھی بیس سال کا ہی تھا کہ تیونس کے حکمراں کا کاتب بن گیا۔ لیکن یہاں وہ زیادہ دیر نہ ٹھیرا۔ تیونس سے وہ شمالی افریقہ کی دوسری امارتوں میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اندلس پہونچا۔ اندلس کے فرمانروا شاہ غرناطہ نے اسے اپنے اہل دربار میں شامل کر لیا اور اپنا سفیر بنا کر اسپین کے ایک عیسائی فرمانروا کے پاس بھیجا۔ وہاں سے واپسی پر ابن خلدون کو اندلس بھی چھوڑنا پڑا اور وہ پھر شمالی افریقہ آگیا، اس دفعہ پھر شمالی افریقہ میں اُسے کہیں چین نہ ملا اور وہ ایک امارت سے دوسری امارت میں قسمت آزمائی کرتا پھرا۔ آخر میں وہ اس سیاسی زندگی سے تنگ آگیا اور اس نے علمی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۷۷۶ھ میں ابن خلدون اپنے ایک دوست قبیلہ بنو عریف کے ہاں پہونچا اور ۷۸۰ھ تک وہیں رہا۔ اس عرصے میں اس نے اپنا وہ مقدمۂ تاریخ لکھا جس نے اس کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اتفاق سے یہ پُرسکون زندگی بھی ابن خلدون کو راس نہ آئی اور وہ گوشۂ تنہائی سے

پھر قسمت آزمائی کو نکل پڑا لیکن دشمنوں نے اس کو آرام نہ لینے دیا اور آخر وہ مجبور ہو کر حج کے ارادے سے شرق کی طرف چل دیا اور اس طرح ۷۸۴ھ میں وہ قاہرہ پہونچا۔

قاہرہ پہونچنے سے پہلے ابن خلدون علمی و سیاسی دونوں لحاظ سے کافی پختہ ہو چکا تھا اور اپنے وہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "مقدمہ تاریخ" بھی لکھ لی تھی جس زمانے میں وہ قاہرہ پہونچا قاہرہ تاتاریوں کے ہاتھ سے ۶۵۶ھ میں بغداد کی تباہی کے بعد اسلامی عربی ثقافت کا سب سے بڑا مرکز بن چکا تھا اور وہاں علم و علماء کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی۔ یہ مملوک سلطان برقوق کا زمانہ تھا قاہرہ میں جیسے ہی اس کے قدم جمے اس نے جامعہ ازہر میں درس دینا شروع کر دیا، اور اسکے ارد گرد اہل علم کا ایک حلقہ بھی جمع ہو گیا۔ پھر اسے مالکی قضا کا عہدہ مل گیا۔ لیکن یہاں بھی تقدیر کے نشیب و فراز نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا وہ کئی بار قاضی بنا اور کئی بار اسے برخاست کیا گیا۔ اسی زمانہ میں اسے ایک المناک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ اسکے اہل و عیال تیونس سے سمندری جہاز کے ذریعے مصر آرہے تھے کہ وہ راستے میں ڈوب گئے۔ ایک دفعہ تاتاری دمشق پر حملہ آور ہوئے تو وہ سلطان مصر کے ساتھ محاذ جنگ پر گیا، اور جب سلطان مذکور بغیر لڑے قاہرہ لوٹ گیا تو دمشق کو حملہ آوروں کی غارت گری سے بچانے کے لیے وہ تاتاریوں کے فرمانروا امیر تیمور سے ملا۔ اور اس سے دیر تک گفتگو کی۔ ابن خلدون نے اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

ابن خلدون نے کافی لمبی عمر پائی جو آخر میں تمام تر درس و تدریس و تصنیف و تالیف میں گزری۔ اس نے کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب منطق پر تھی، ایک کتاب میں فلسفۂ ابن رشد کا اختصار کیا۔ اس نے فقہ، ادب اور حساب پر بھی تصنیفات کیں، لیکن سوائے اس کی تاریخ کے باقی تمام کتابیں ضائع ہو گئیں۔

تعلیم و تربیت پر بحث فلسفۂ تاریخ کے اصول وضع کرنے میں ابن خلدون کو اولیت حاصل ہے اور اسی طرح وہ پہلا مورخ ہے جس نے علم عمرانیات کی طرح ڈالی اس کے علاوہ ابن خلدون نے اپنے زمانے کے طریقۂ تعلیم و تربیت پر بھی بڑی غائر بحثیں کی ہیں اور اس ضمن میں ایسے افکار پیش کیے ہیں جن کی مدد سے ایک جدید طریقۂ تعلیم و تربیت ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

اسلامی تعلیم و تربیت کے پیش نظر دو مقصد ہوتے تھے :۔ ایک دینی دوسرا دنیوی۔ قرآن کریم کی آیت "وابتغ فی ما اتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصيبك من الدنيا" (جو کچھ اللہ نے تمھیں دیا ہے اس میں دار آخرت کو طلب کرو اور اس دنیا کا بھی اپنا حصہ بھولو) میں ان دونوں مقاصد کی طرف بڑا جامع اشارہ ملتا ہے۔ اسی طرح رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث اعمل لدنياك كانك تعيش ابدا واعمل لآخرتك كانك تموت غدا (اپنی دنیا کے لیے اس طرح کام کرو جیسے تم ہمیشہ کے لیے زندہ رہوگے اور آخرت کیلئے اس طرح کام کرو جیسے تم کل ہی مر جاؤگے") میں اسی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ غرض اسلامی تعلیم و تربیت میں ان دونوں مقاصد کو بڑی خوبی سے جمع کیا جاتا تھا۔

تعلیم میں قرآن کی مرکزی حیثیت گو مختلف اسلامی ملکوں میں وہاں کے ماحول کے مطابق تعلیم و تربیت کے طریقے مختلف رہے ہیں، لیکن اسکے باوجود تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق تھا کہ قرآن ہی تعلیم دین اور تمام علوم اسلامیہ کا منبع و مصدر ہے چنانچہ جہاں تک عربی ممالک کا تعلق ہے ان میں سے ہر ایک میں قرآن ہی تعلیم کا اصل اصول ہوتا تھا اور اسی مرکز کے اردگرد دوسرے علوم کی تعلیم گھومتی تھی۔ ابن خلدون اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

> اس سے مقصود بچے کے اندر عقائد ایمانی کو راسخ کرنا اور دین کے ذریعے اچھے اخلاق کے اصولوں کو جاگزیں کرنا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دین نفوس کو مہذب بناتا، اخلاق کو ٹھیک کرتا اور نیکی کے کاموں پر ابھارتا ہے۔

مسلمانوں کے ہاں تعلیم کے دو درجے ہوتے تھے۔ ایک ابتدائی، دوسرا عالی، شمالی افریقہ میں بچوں کو ابتدائی درجے میں صرف قرآن حفظ کرایا جاتا تھا۔ اور اسکے ساتھ کچھ اور نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اہل اندلس بچوں کو قرآن مجید کے ساتھ ساتھ عربی ادب، نظم و نثر اور اصول و قواعد بھی پڑھاتے تھے اور انھیں خوشنویسی بھی سکھائی جاتی تھی۔ باقی رہے اہل مشرق یعنی بغداد اور اسکے آس پاس کے ملکوں کے باشندے ان کے ہاں بچوں کی تعلیم کا وہی طریقہ رائج تھا، جو اہل اندلس میں تھا۔ وہ قرآن مجید حفظ کرانے کے ساتھ ساتھ دوسرے مضامین بھی پڑھایا کرتے تھے۔ البتہ اہل اندلس کے مقابلے میں قرآن مجید

کی تعلیم پر زیادہ زور دیتے تھے۔ مزید برآں اُن کے ہاں عام درس سے الگ خوشنویسی سکھلانے کا انتظام ہوتا تھا اور اس کے لیے مستقل ادارے تھے۔ چنانچہ جنھیں خاص طور سے خوشنویسی سیکھنی ہوتی وہ ان اداروں کا رُخ کرتے۔

ابن خلدون کی تنقید ابن خلدون ان طریقہ ہائے تعلیم پر تنقید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اہل مغرب افریقہ کا شروع میں بچوں کو صرف قرآن مجید ہی پڑھانے پر اکتفا کرنا انھیں اپنے خیالات کو اچھی طرح ادا کرنے سے قاصر رکھتا ہے۔ یہ اسلئے کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن تو حفظ کرا دیتے ہیں لیکن انھیں انکی عقلی استعداد کے مطابق قرآن کے اسلوبوں سے واقف نہیں کراتے اور یہی طریقۂ تعلیم اس وقت مصر میں رائج ہے۔ اہل شمالی افریقہ کے برعکس جیسا کہ اوپر بیان ہوا اہل اندلس بچوں کو قرآن کے ساتھ ساتھ ادب عربی نظم و نثر اور خوشنویسی کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ اس ضمن میں ابن خلدون قاضی ابوبکر بن العربی کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ان کا اپنا ایک طریقہ تھا جس میں انھوں نے بڑی جدت کی تھی۔ ان کے طریقے کا خلاصہ یہ ہے۔ شعر عربوں کا تاریخی صحیفہ ہے چنانچہ تعلیم میں اسے مقدم رکھنا چاہیے۔ اسی طرح درس و تدریس میں عربی زبان مقدم ہے۔ جب بچے کو اس پر قدرت حاصل ہو جائے تو وہ حساب سیکھے، اس کی مشق کرے اور اسکے قوانین کو جانے اسکے بعد وہ قرآن پڑھے ابن العربی کی رائے میں اگر بچے کی اس طرح تعلیم ہو گی تو وہ قرآن مجید زیادہ اچھی طرح سمجھے گا اور اسکے مطالب بھی بچے کے ذہن نشین ہوں گے۔ ابن خلدون نے ابن العربی کے اس طریقۂ تعلیم کو بہت سراہا ہے۔ لیکن وہ لکھتا ہے کہ شمالی افریقہ والے اپنے بچوں کو اس طرح تعلیم دینے کے عادی نہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید سے تعلیم کی ابتدا ثواب و برکت کا موجب ہے اور وہ ڈرتے ہیں کہ اگر بچے نے صغیر سنی میں جبکہ وہ ان کے دباؤ میں ہوتا ہے قرآن نہ پڑھا تو ممکن ہے وہ بڑا ہو کر اس سے محروم رہے اور بعد میں قرآن نہ پڑھ سکے۔

تعلیم کا درجۂ عالی ابتدائی درجے کے بعد درجۂ عالی ہوتا تھا۔ اس میں جو علوم پڑھائے جاتے تھے ابن خلدون نے ان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک تو وہ علوم جو مقصود بالذات ہیں اور یہ شرعی علوم ہیں جیسے فقہ، تفسیر، حدیث، کلام، طبیعیات، الٰہیات اور فلسفہ، دوسرے وہ علوم جو مقصود بالذات نہیں اور ان کی حیثیت پہلے علوم کے لیے ذریعہ اور آلے کی ہے جیسے عربی

حساب اور منطق۔ ابن خلدون کی رائے میں پہلی قسم کے علوم کی تعلیم کے دائرے کو وسیع اور ان کی جزئیات کا احاطہ کرنے کی ضرورت ہو۔ البتہ جہاں تک علوم کی دوسری قسم کا تعلق ہو ان کی تعلیم کا دائرہ صرف اتنا ہی وسیع ہونا چاہیے جتنا کہ اصل مقصد کے لیے ضروری ہو چنانچہ اس نے ان علماء پر سخت نکتہ چینی کی ہو جو آخر الذکر علوم یعنی علوم آلیہ پر کے دائرۂ تعلیم کو بہت زیادہ وسیع کر دیتے ہیں اس طرح طالب علموں کا وقت ضائع کرتے ہیں اور انھیں اصل مقصد سے بھی محروم رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ابن خلدون نے علم نحو میں طرح طرح کی موشگافیاں کرنے والوں پر سخت اعتراض کیے ہیں۔ اسکے زمانے میں نظام تعلیم میں علم نحو کو ان علوم پر جو مقصود بالذات ہیں زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ لکھتا ہے۔

علم نحو کی تعلیم نظری نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس سے اصل غرض تو بچوں کو اس قابل بنانا ہو کہ وہ اپنے دلی خیالات کو اچھے انداز میں پیش کر سکیں، صحیح عبارت پیش کر سکیں اور جو پڑھیں اسے سمجھ لیں۔ علم نحو اور علم بلاغت کے بارے میں ابن خلدون کی رائے یہ ہو کہ جب تک بچہ مناسب عمر کو نہ پہونچ جائے ان علوم کی اسے تعلیم نہیں دینی چاہیے۔

اخوان الصفا کا طریقۂ تعلیم

اخوان الصفا درجۂ عالی کے نصاب تعلیم میں علوم فلسفہ کا بھی اضافہ کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کا اپنا ایک مشہور تعلیمی مکتب فکر تھا جو بہت حد تک جدید تعلیمی مکتب فکر سے ملتا ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ تعلیم کی ابتدا معقولات کے بجائے محسوسات سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ وہ محسوسات ہی کو عقلی و الٰہیاتی موضوعات کے درس و تدریس کا ذریعہ بناتے تھے۔ چنانچہ اس طرح وہ اپنے زمانے میں اسلامی عقائد کو ایک اچھوتے اسلوب میں دقیق علمی طریقہ پر پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے طریقۂ تعلیم کا بنیادی فکر دین اور عقل میں باہم مطابقت پیدا کرنا تھا۔ جب ابن خلدون کو نظام تعلیم کے بارے میں اخوان الصفا کے ان خیالات کا علم ہوا تو اس نے ان کے نقطۂ نظر کی حمایت کی اور ان ہی خطوط پر خود ایک نظام تعلیم تجویز کیا۔ وہ کہتا ہے کہ تعلیم کا نصاب مقرر کرتے وقت یہ دو بنیادی نکات ملحوظ رہنے چاہئیں۔

۱۔ بچوں کی ذہنی استعداد

۲۔ حسی معرفت کو مقدم رکھا جائے اور اسے غیر حسی معرفت تک پہونچنے کی اساس بنایا جائے۔

تعلیم کے متعلق ابن خلدون کی آراء ابن خلدون لکھتا ہے کہ معلم کا معلم بننے کے لئے صرف صاحب علم ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی جاننا چاہیئے کہ وہ کس طرح بچوں کو پڑھا سکتا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ بچوں کی نفسیات سے واقف نہ ہو، اور ان کی استعداد اور ذہنی صلاحیت کو نہ جانے اسی صورت میں وہ بچوں کی فکری سطح پر نیچے اتر کر ان سے ذہنی اتصال پیدا کر سکتا ہے۔

ابن خلدون محض لفظی تعلیم پر سخت اعتراض کرتا ہے اور بغیر سمجھائے کسی چیز کو حفظ کرانے کے خلاف متنبہ کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس طرح رٹنے سے ملکۂ فہم کی ترقی رک جاتی ہے۔ وہ ان معلموں کی مذمت کرتا ہے جو رٹانے پر تمام تر اعتماد کرتے ہیں اس کے نزدیک اس سے بچوں کے ذہنوں کے اندر کوئی چیز نہیں جاتی۔ اپنے اس دعوے کی دلیل میں وہ مراکش کے شہروں کی مثال دیتا۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ وہاں تعلیم کی مدت ۱۶ سال ہے لیکن اس کے باوجود نہ تو بچوں میں علمی مہارت پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ ملکۂ فہم حاصل کر پاتے ہیں اور یہ اس لئے کہ ان کے مدارس میں تمام تر حفظ کرانے اور رٹانے پر زور دیا جاتا ہے اس کے برعکس تیونس کا مروجہ نظام تعلیم ہے۔ وہاں مدت تعلیم اگرچہ پانچ سال ہے لیکن اس کے باوجود بچے علم میں ملکہ حاصل کر لیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں استاد رٹانے کے بجائے بچوں کو سمجھاتے ہیں اور ان سے سوال و جواب کر کے موضوع کو ذہن نشین کراتے ہیں۔ ابن خلدون استادوں کو بچوں کی عقلی نشو و نما پر نگاہ رکھنے کی ضرورت بتاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بچے کے ذہن میں ابتدا میں پختگی نہیں ہوتی۔ اس بارے میں ابن خلدون لکھتا ہے۔

> ہم نے اپنے اس زمانے میں اکثر استادوں کو دیکھا ہے کہ وہ تعلیم کے طریقوں اور اس کی افادیت سے ناواقف ہیں چنانچہ وہ تعلیم کے شروع ہی میں بچے کے سامنے مشکل مسائل پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کو حل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اسے وہ مشق سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یہ صحیح طریقۂ تعلیم ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بچے میں علم حاصل کرنے کی استعداد بتدریج پیدا ہوتی ہے۔ شروع میں بچہ محسوس مثالوں کے ذریعہ اور صرف اجمالی طور پر ہی چیزوں کو سمجھتا ہے اس کے بعد اس کی ذہنی استعداد بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔

ابن خلدون بچوں کی تعلیم کے بارے میں رائے دیتا ہے کہ شروع میں اس کا انحصار اجمالی معلومات

پر ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد تدریجاً انھیں تفصیلات سے واقف کرایا جائے اور وہ اس طرح کہ پہلے بچوں کو مضمون کے ہر باب کے بنیادی مسائل بتلائے جائیں۔ پھر استاذ بچوں کی عقلی نشوونما کا خیال رکھتے ہوئے شرح و توضیح کے ذریعے ان مسائل کو بچوں کے ذہن کے قریب کرے۔ ابن خلدون تعلیم میں محسوس مثالوں سے کام لینے کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بچہ حصول علم کی ابتدا میں ضعیف الفہم اور قلیل الادراک ہوتا ہے اور محسوس مثالوں کے ذریعے جو کچھ اسے پڑھایا جاتا ہے وہ اس کو سمجھ لیتا ہے۔ ابن خلدون اس پر زور دیتا ہے کہ بچہ شروع میں حواس کے ذریعے سیکھتا ہے اور معرفت حاصل کرتا ہے اسی سلسلے میں وہ طلب علم کے لئے سفر کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس سے طالبعلموں کو بہت سی چیزوں کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

طلب علم اور مشائخ ماہرین فنون اور علم و تعلیم کے بڑے لوگوں سے ملاقات کے لئے سفر کرنا کمال علم میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان علم و معرفت نیز اخلاق اور مذاہب و فضائل کبھی تو علم و تعلیم اور تربانے سے سیکھتے ہیں اور کبھی دوسروں کو دیکھنے اور ان کے ساتھ ملنے جلنے سے نیز استادوں سے ملنے جلنے اور ان کی زبان سے سننے سے خاص طور پر جب کہ ایک سے زیادہ اور مختلف الانواع استادوں سے علم و معرفت کی زیادہ اچھی طرح تحصیل ہوتی ہے۔

ابن خلدون کی رائے میں بچے کو ایک وقت میں دو علم نہیں پڑھانے چاہئیں۔ کیونکہ اس طرح وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی حاصل نہیں کر پاتا۔ کیونکہ دونوں طرف اس کا خیال بٹا رہتا ہے اور وہ کسی ایک طرف بھی پوری طرح توجہ نہیں کر پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ناکام رہتا ہے بہتر یہ ہے کہ بچہ پہلے ایک علم کی طرف پوری طرح متوجہ ہو اور اس کے مسائل کو سمجھے پھر وہ آگے بڑھے۔

ابن خلدون کے نزدیک بچے کو اس کے ایک خاص فکری سطح پر پہنچنے کے بعد قرآن مجید کی تعلیم ہی شروع کرنی چاہیئے۔ وہ اپنے زمانے کے استادوں اور تربیت دینے والوں کے اس طریقے کی جو اس زمانے میں رائج تھا مذمت کرتا ہے جس میں کہ بچے کی تعلیم حفظ قرآن سے شروع کی جاتی تھی اس خیال سے کہ اس طرح شروع ہی میں قرآن حفظ کرنے سے وہ صحیح عربی لکھنے اور بولنے کا عادی ہو جائے گا اور قرآن بچے کو برائیوں سے بچائے گا۔ ابن خلدون کے زمانے میں عام طور پر تعلیم دینے والوں کا یہ عقیدہ تھا۔ اس لئے وہ اصرار کرتے تھے کہ بچے کی تعلیم کا آغاز حفظ قرآن سے ہو بغیر اس کے معانی سمجھا

شکل ہو۔ ان کا خیال تھا کہ ایام طفولیت میں قرآن حفظ کرنے سے انھیں عربی سیکھنے میں مدد ملے گی۔ اس طریقۂ تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے ابن خلدون لکھتا ہے:-

> بیشک قرآن اللہ کا کلام ہے جسے اس نے بندوں کے لیے اتارا ہے لیکن جب تک بچہ اس کے معانی نہ سمجھے اور اس کے اندر قرآن کے اسالیب بیان کا ذوق نہ پیدا ہوا ہو کا زبان سیکھنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قرآن کی لغوی و معنوی تاثیر صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب بچہ اپنی پختگی میں ایک خاص درجے پر پہونچ جائے اور جو وہ پڑھے اسکے معانی سمجھنے لگ جائے۔

قرآن کے دوسری زبانوں میں ترجمے کے بارے میں ابن خلدون کی رائے ہے کہ ان القرآن والسنۃ عربیان ولا یمکن ترجمتھما وبخاصۃ القرآن الکریم (بے شک قرآن اور سنت عربی میں ہیں اور ان کا ترجمہ ممکن نہیں اور خاص طور پر قرآن کریم کا۔)

ابن خلدون کی رائے میں دو عوامل جو تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں ان میں سے پہلی کتابوں کے اختصار کا رواج بھی ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ علمائے متاخرین کو اس طریقۂ اختصار سے خاص شغف رہا ہے۔ اسی لیے مختصرات اور متون کی بڑی کثرت ہو گئی ہے۔ ان علماء متاخرین میں سے وہ فقہ اور اصول میں ابن الحاجب اور نحو میں ابن مالک کا نام لیتا ہے۔ ان مختصرات پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:-

> یہ تعلیم کے لیے وجہ فساد، تحصیل علوم کے لیے باعث اختلال، اور مختصر اور عسیر الفہم عبارت کے الفاظ کو حل کرنے اور ان سے مسائل کے استخراج کیلئے متعلم کے وقت کو ضائع کرنے کا سبب ہیں۔ اور یہ چیز تعلیم سے جو ملکہ حاصل ہوتا ہے اسکی راہ میں ایک روک بنگئی ہے۔ متاخرین کا مختصرات کی طرف اسلئے رجحان ہوا کہ انھوں نے متعلمین کیلئے ان کا حفظ کرنا آسان دیکھا چنانچہ انھوں نے متعلمین کو اس سخت راہ پر ڈال دیا جو ان میں اور نفع بخش ملکات کے حصول میں حائل ہو گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بعد کے زمانے میں علماء ترک امراء سے تقرب حاصل کرنے کے لیے متون مرتب کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی اولاد کے لیے ان متون کے ذریعے علوم کا حفظ کرنا ممکن ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مختصرات کی ترتیب اور متعلمین کو متون حفظ کرانے میں جو اس قدر اہتمام کیا جاتا تھا یہ ایک بڑا قوی محرک تھا اس جمود کا جو ان زمانوں میں ثقافت کے اندر واقع ہوا۔

ابن خلدون بچوں کے ساتھ نرمی برتنے اور اُنپر سختی نہ کرنے کی نصیحت کرتا ہو۔ وہ لکھتا ہو کہ تعلیم کے معاملے میں متعلم پر جبر کرنا اسکی جسمانی صحت کیلئے مضر ہو اور خاص طور سے بچوں پر اس کا برا اثر ہوتا ہو۔ اگر لڑکے پر سختی کی جائے اور اسے دبایا جائے تو وہ تنگ آجاتا ہو اور اسکی چستی و مستعدی ختم ہو جاتی ہو۔ اس کا جھوٹ، تساہل، اور مکر و فریب کی طرف رجحان ہو جاتا ہو۔ اور اس صورت میں وہ ظاہر کرنے لگتا ہو جو اسکے ضمیر میں نہیں ہوتا اور اس طرح صغیر سنی ہی سے اسکے دل میں انسانیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ اس ضمن میں ابن خلدون یہود کی مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے:۔

تم یہود کی طرف دیکھو کہ ان میں (اس سختی اور جبر کی وجہ سے) کتنے برے اخلاق پیدا ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں وہ مکر و فریب کے ساتھ موصوف کیے جاتے ہیں۔

ابن خلدون معلمین اور والدین کو نصیحت کرتا ہو کہ وہ تعلیم و تربیت میں بچوں کے ساتھ سختی نہ کریں اس سلسلہ میں وہ کہتا ہو۔ بہترین طریقہ تعلیم وہ ہو جسکی کہ ہارون رشید نے اپنے بیٹے امین کے اُستاد اور مربی کو نشاندہی کی تھی۔ ہارون نے کہا تھا:۔ اے احمر! امیر المومنین نے اپنی جان اور اپنے دل کا ٹکڑا تمھارے حوالے کیا ہو۔ اس پر اپنا ہاتھ نرم رکھو، اسکے لیے تمھاری اطاعت لازمی ہو۔ امیر المومنین نے اسکے معاملے میں تمھیں جس مقام پر بٹھایا ہو تم اسی مقام پر رہو۔ اسے قرآن پڑھاؤ، تاریخ سے باخبر کرو، اسے شعر سناؤ اور شعر کی تعلیم دو۔ کلام شروع کرنے کے آداب اور اسکے موقع و محل کا اسکے اندر ذوق پیدا کرو جب بنو ہاشم کے بزرگ آئیں تو ان کی تعظیم کرنا اسے سکھاؤ، جب اس کی مجلس میں فوجی سردار آئیں تو انھیں باعزت جگہ دو۔ جو بھی لمحہ گزرے اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اس میں اسے کچھ سکھاؤ۔ لیکن اس طرح نہیں کہ یہ اس پر بار ہو اور اس کا ذہن جامد ہو جائے۔ اس سے زیادہ درگذر نہ کرو، اس سے اسے فراغت اچھی لگنے لگے گی اور وہ اس سے مالوف ہو جائے گا۔ جہاں تک ممکن ہو اسے اپنے سے قریب کر کے اور نرمی سے راہ راست پر رکھو، اور اگر یہ دونوں چیزیں کام نہ دیں تو اس پر سختی کرو۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ بچے وعظ و نصیحت سے زیادہ دوسروں کو جو کچھ کرتا دیکھتے ہیں اس سے سیکھتے ہیں۔ ابن خلدون نے یہ رائے عمرو بن عتبہ کے اس خط سے لی ہو جو اس نے ایک معلم کے نام لکھا تھا۔ عمرو بن عتبہ نے لکھا تھا:۔

تمہارا سب سے پہلا قدم بیٹوں کی اصلاح کی طرف یہ ہونا چاہیئے کہ تم خود اپنی اصلاح کرو کیونکہ ان کی آنکھیں تمہاری آنکھ سے مربوط ہیں ان کے نزدیک اچھا وہ ہے جو تم کرو اور برا وہ ہے جس کو تم ترک کرو۔ انھیں اللہ کی کتاب کی تعلیم دو لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ وہ اسے ناپسند کرنے لگیں اور نہ انھیں اللہ کی کتاب کی تعلیم سے اتنا دور رکھو کہ وہ اسے یکسر چھوڑ دیں۔ انھیں اشرف ترین حدیثیں اور پاکیزہ اشعار سناؤ ان کو ایک علم سے دوسرے علم میں اس وقت تک نہ جاؤ جب تک وہ پہلے میں پکے نہ ہو جائیں۔ دل میں بہت سی باتوں کا جمع ہو جانا فہم کو مصروف رکھتا ہے انھیں حکماء کے طریقے سکھاؤ اور عورتوں سے باتیں کرنے سے روکو۔ میں نے تمہاری استعداد و قابلیت پر بھروسہ کیا ہے تم میری طرف سے کسی عذر کا خیال نہ کرنا۔"

ابن خلدون کے نزدیک تعلیم ایک اجتماعی عمل ہے اس بارے میں وہ کہتا ہے" چونکہ علم و تعلیم ان اجتماعی اعمال میں سے ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لئے ان کا عمل دخل بدویانہ زندگی سے زیادہ شہری زندگی میں ہے۔ کیونکہ ان کی حاجت اس وقت ہوتی ہے جب اجتماعی زندگی ترقی کرتی ہے ایک اور بڑے پتے کی بات جو ابن خلدون نے کہی وہ یہ ہے کہ تعلیم اپنی زبان میں ہونی چاہیئے وہ کہتا ہے کہ ان الدرس بلغة اجنبية لنصف الدرس (اجنبی زبان میں درس نصف درس کے برابر ہے) کسی ایک فن میں مہارت سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس مہارت کا دائرہ صرف اسی فن تک محدود ہے بلکہ اس فن سے مشابہ جو اور فنون ہوں ان میں بھی انسان کو دسترس ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں ابن خلدون لکھتا ہے:۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے خوش خطی میں مہارت حاصل کی ہے تو جب وہ دیوار دل پر نقش و نگار بنانا سیکھے گا تو اس کی یہ خوش خطی کی مہارت ادھر منتقل ہو جائے گی۔ اس طرح اگر ایک شخص حساب میں مہارت رکھتا ہے تو وہ جبر و مقابلہ بڑی آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔

زبان سیکھنے کے متعلق ابن خلدون نے یہ گر بتایا ہے کہ متعلم اس زبان کے فصحاء و بلغاء اور ادباء کے اقوال کثرت سے یاد کرے اور انھیں ازبر کرے لیکن اس کے بعد وہ یہ رائے دیتا ہے۔

وعلى الناشئ بعد الحفظ ان ينسى ما حفظ

(نوعمر متعلم یہ سب حفظ کرنے کے بعد جو کچھ اس نے حفظ کیا ہو اسے بھلا دے)

(الرحیم حیدرآباد)

(معرفی تنہ ترجمہ)

ALFURQAN.(Regd N. L.353)LUCKNOW.

Cover Printed at A.O. Press Aminabad Park Lucknow

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

مسئول

محمد منظور نعمانی

الفرقان لکھنؤ
ماہنامہ

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ہندستان سے ۶/-		غیر ممالک سے
پاکستان سے ۸/-		۱۲ شلنگ
ششماہی		ہوائی ڈاک کے لیے مزید
ہندستان سے ۳/۵۰		محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا
پاکستان سے ۴/-		

فی کاپی .... ۶۰ پیسے

جلد ۳۴ | بابت ماہ صفر المظفر ۱۳۸۶ھ مطابق جون ۱۹۶۶ء | شمارہ ۲

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جون تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاک خانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

اعلان تاشقند سے ہند و پاک تعلقات میں خوشگواری کی جو امیدیں باندھی گئی تھیں افسوس ہو کہ تھوڑی ہی مدت میں وہ سراب نظر آنے لگیں۔ امیدیں بیجا نہ تھیں اسلئے کہ تعلقات کی نوعیت نے جس غیر معمولی انداز (بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں) جس تاریخی غیر معمولیت کے ساتھ پلٹا کھایا تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ سوچنا بہت مشکل تھا کہ یہ گرمجوشی محض ملمع کاری بھی ثابت ہو سکتی ہے جس کی آب و تاب چند دن ہی میں ماند پڑ جائے۔ مگر معلوم ہوا کہ ارباب سیاست کی فسوں طرازیاں، الامان الحفیظ! صفائے قلب، عفو و درگزر اور خلوص و محبت کی ایکٹنگ کرنے پر آویں تو درویشانِ باصفا بھی شرما جائیں اور ساری خدائی عش عش کرتی رہ جائے! کیسی نادر المثال صلح ہوئی تھی کہ جیسے دل ملنے کیلئے بیتاب تھے اور جو کچھ وقت تعلقات کی خرابی میں گزر گیا تھا اس سب کی تلافی میں کوئی لمحہ جانے نہیں دینا تھا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ حال ہو کہ جیسے ؏

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اصل بات یہ ہے کہ سیاست، خصوصاً بین الاقوامی سیاست میں ایمانداری اور حق و انصاف نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ اصل چیز اقتدار یا قوم و وطن کا مفاد ہے چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز۔ کسی دوسری قوم یا ملک کا کوئی مطالبہ ماننے میں اگر اپنے ملک کے مفاد پر کوئی آنچ آتی ہے تو خواہ وہ مفاد بالکل ناجائز اور حق و انصاف سے خالی کیوں نہ ہو وہ مطالبہ مانا نہیں جائے گا۔ اور اگر کہیں یہ احساس بھی پیدا ہو جائے کہ اس مفاد سے بڑا مفاد اس میں ہے کہ جھگڑا عدل و انصاف کی بنیاد پر ختم کر دیا جائے، مگر ایسا کرنے میں ملک کی اندرونی سیاست کے نقطۂ نظر سے اپنا اور اپنی جماعت کا اقتدار خطرہ میں نظر آتا ہو تو اس اقتدار کی خاطر عدل و انصاف ہی کو نہیں ملک کے حقیقی اور برتر مفاد کو بھی قربان کیا جائے گا ــــ ساری دنیا میں جس طرف بھی نظر ڈالئے بین الاقوامی سیاست کی یہی تصویر ہے۔

ایک خاص اصطلاح اس بین الاقوامی سیاست میں "وقار" کی چلی ہوئی ہے۔ اصلیت کے اعتبار سے کسی کے ناحق مطالبات یا زور دستی کے مقابلہ میں "وقار" کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ مگر اب کھلی ہوئی ہٹ دھرمی، زبردستی، اور بیجا ضد کا جواز بھی اس پاکیزہ لفظ سے نکالا جاتا ہے۔ موقف آپ کا انتہائی غلط اور نامنصفانہ ہے مگر اس سے ہٹنے میں آپ کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ لہٰذا تصفیہ بھی ہو تو ایسا ہو کہ آپ کی بات رہ جائے۔ یعنی آپ کا ناجائز مفاد یا ناجائز قبضہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہ جائے۔

یہ "وقار" کا سوال آج کے بین الاقوامی معاملات میں "مفادات" سے بڑھ کر باعث فساد بن گیا ہے۔ ناجائز مفادات چھوڑنے کو دل تیار ہو سکتا ہے مگر اس بس کی گانٹھ "وقار" کے پھندے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ "مفادات" کی قیمت ادا کرتے کرتے قومیں عاجز ہونے لگتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ چھوڑ بیٹھیں، مگر یہ وقار وہ گلے کا پھندا اور وہ پاؤں کی بیڑی ہو کہ اس سے چھٹکارا کسی طرح حاصل نہیں ہوتا ۔۔۔ "سب کچھ ٹھیک ہے مگر "وقار" کا سوال ہے، اس کا کیا کیا جائے"۔

یہ "وقار" جو جو فساد دنیا میں پیدا کیے ہوئے ہے اور جیسی جیسی گت مشرق و مغرب میں اس کے ہاتھوں بنی نوع انسان کی بن رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بے خدا اور بے ایمان سیاست کی پاداش میں یہ اللہ کا عذاب ہے جو دنیا پر مسلط کر دیا گیا ہے۔

اور سب کو چھوڑ کر ہندوستان و پاکستان کی طرف آ جائیے کہ بات انھیں کے تعلقات سے چلی تھی۔ اٹھارہ دن کا وہ ہولناک تصادم جس کے لیے سوچ سمجھ کر دونوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے نتائج کا تحمل دونوں میں سے کسی کے بھی بس کی بات نہ تھی۔ کیوں پیش آیا؟ صرف کشمیر کے سوال پر! ۔۔۔ اور پھر میل ملاپ کی نسیم خوشگوار کو کس چیز نے کشیدگی کی گرم ہواؤں میں بدل کر رکھ دیا؟ اسی کشمیر کے سوال نے! کیا ضمانت ہے کہ ستمبر ۶۵ء کی دردناک کہانی ایک بار پھر نہ دہرائی جائے گی؟ اور دونوں ملکوں میں کون ہے جو اس کہانی کے نتائج کو جانتے ہوئے بھی یہ کہنے کی ہمت لا سکے کہ ہاں ایک بار اور سہی؟ مگر زندہ باد ارباب سیاست! کہ چاہے دونوں ملکوں کا کچھ ہی حشر کیوں نہ ہو جائے، مسئلہ کا تصفیہ وقار ہی کے ترازو سے منظور کیا جائے گا اور محض حق و انصاف کو ماننے کی خاطر نہیں بلکہ اپنی بھلائی کی خاطر بھی حق و انصاف کے تقاضوں پر کان نہیں دھرا جائے گا۔

دُنیا کا کون سا جھگڑا ہے جسمیں حق و انصاف کو حکم مان لیا جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے حل نہ ہو جائے مگر ارباب سیاست تو ارباب سیاست عام طور پر قوموں کا رجحان ایسی قوم پرستی اور وطن پرستی کا ہو گیا ہے کہ حق اور انصاف کا شعور ہی بین الاقوامی معاملات میں ختم ہو گیا ہے۔ کوئی قوم اپنے ارباب قیادت کو نہیں ٹوکتی کہ کیوں بے ایمانی پر کمر بستہ ہو اور حق و انصاف کا خون کرنے کے ساتھ ساتھ سارے ملک کو بھی اس کے بوجھ سے مصیبت میں مبتلا کیے ہوئے ہو۔ ہاں وہ مغرب جس سے قوم پرستی اور وطن پرستی کا یہ نامبارک سبق ہم مشرقی قوموں نے لیا ہے اس میں ضرور اب اس انسانیت دشمنی کا ردعمل ہونے لگا ہے اور وہاں کچھ لوگ اب سامنے آجاتے ہیں جو اس طرز کے اپنے "قومی مفاد" اور "ملکی وقار" کے خلاف بیباکی سے زبان کھولتے اور اس جرأت کے لیے خطرات تک مول لیتے ہیں۔ یعنی۔ ؎

ہوئے گر کچھ تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

. . . .

. . . .

. . . .

ہندوستانی قومی تحریک کے رہنما گاندھی جی کی کوشش تھی کہ یہاں وطن دوستی کے جذبے میں وطن پرستی کا یہ غیر حق پسندانہ عنصر شامل نہ ہونے پائے اور وطن دوستی کے ساتھ ساتھ حق دوستی بھی ہندوستانی سیاست کا مزاج ہو۔ لیکن یہ بات حصولِ آزادی کے بعد گاندھی جی کی زندگی کے ڈیڑھ سال ہی میں سامنے آگئی تھی کہ اُن کی یہ کوشش کامیاب نہیں رہی ہے اور سیاست کے مغربی تصوّرات میں مشرق کی اخلاقی قدروں کی قلم کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرسکی۔ گاندھی جی رخصت ہو گئے تو کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں رہا۔ سیاست کا اصل مغربی رنگ کھلتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ گاندھی جی کے انداز کی بات کان میں پڑنا بھی اہلِ سیاست اور عام قوم کو ناگوار ہونے لگا۔ گاندھی جی کے بعض چیلوں نے ایک آدھ موقع پر ایسی بات کہی تو اربابِ اقتدار کی پیشانی پر شکنیں پڑیں اور قوم کے جوشیلوں نے قتل کی دھمکیاں دے ڈالیں۔ عمر بھر کی جھکتی ہوئی قوم پروری اور وطن دوستی پر خاک اُڑائی جانے لگی اور کہا گیا کہ یہ غداری اور ملک دشمنی ہے —— غرض ساری دُنیا میں حب الوطنی کے جس مفہوم کا سکہ چل رہا ہے وہی ہمارے ملک میں بھی معتبر ہے۔ اور جو کوئی حب وطن کے

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

معارفُ الحدیث

(مُسلسل)

ذکر اللہ کی عظمت اور اُس کی برکات

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے" ذکر اللہ" اپنے وسیع معنیٰ کے لحاظ سے نماز، تلاوتِ قرآن اور دعا و استغفار وغیرہ سب ہی کو شامل ہے اور یہ سب اس کی خاص خاص شکلیں ہیں۔ لیکن مخصوص عرف و اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس، توحید و تمجید، اس کی عظمت و کبریائی اور اس کی صفات کمال کے بیان اور دھیان کو" ذکر اللہ" کہا جاتا ہے، اور جیسا کہ آگے درج ہونے والی بعض احادیث سے صراحۃً معلوم ہوگا یہ اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا اور انسان کی روحانی ترقی اور ملاءِ اعلیٰ سے اس کے ربط کا خاص الخاص وسیلہ ہے۔

شیخ ابن القیمؒ نے" مدارج السالکین" میں ذکر اللہ کی عظمت و اہمیت اور اس کی برکات پر ایک بڑا بصیرت افروز اور روح پرور مضمون لکھا ہے۔ اس کے ایک حصے کا خلاصہ ہم یہاں بھی درج کرتے ہیں ـــ آگے درج ہونے والی احادیث میں ذکر اللہ کی جو عظمت بیان ہوگی.... اس مضمون کے مطالعہ کے بعد اس کا سمجھنا انشاء اللہ آسان ہوگا ـــ فرماتے ہیں:۔

قرآن مجید میں ذکر اللہ کی تاکید و ترغیب کے ہم کو مندرجہ ذیل دس عنوانات ملتے ہیں۔

(۱) بعض آیات میں اہلِ ایمان کو تاکید کے ساتھ اس کا حکم دیا گیا ہے ـــــ مثلاً ارشاد فرمایا گیا ہے :-

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ○ احزاب ع ۵

اے ایمان والو اللہ کو بہت یاد کیا کرو اور صبح شام اس کی پاکی بیان کرو۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً ـ اعراف ـ ع ۲۴

اور اپنے رب کا ذکر کرو اپنے جی میں (یعنی دل سے) گڑگڑا کر اور خوف کی کیفیت کے ساتھ۔

(۲) بعض آیات میں اللہ کو بھولنے اور اس کی یاد سے غافل ہونے سے بہ شدت کے ساتھ منع فرمایا گیا ہے۔ یہ بھی ذکر اللہ کی تاکید ہی کا ایک عنوان ہے ـــ مثلاً ارشاد ہے :-

وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ ○ اعراف ـ ع ۲۴

اور نہ ہونا تم غفلت والوں میں سے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :-

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ـ الحشر ـ ع ۳

اور تم ان میں سے نہ ہو جاؤ جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا پھر (اس کی پاداش میں) اللہ نے ان کو ان کے نفس بھلا دیئے (اور خدا فراموشی کے نتیجہ میں وہ خود فراموش ہو گئے)

(۳) بعض آیات میں فرمایا گیا ہے کہ فلاح اور کامیابی اللہ کے ذکر کی کثرت کے ساتھ وابستہ ہے ـــ ارشاد ہے :-

وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا

اور کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ پھر تم فلاح و کامیابی کی امید کر سکتے ہو۔

(سورۃ الجمعہ۔ ع ۲)

(۴) بعض آیات میں حق تعالیٰ کی طرف سے اہل ذکر کی تعریف کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ذکر کے صلہ میں ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص معاملہ کیا جائے گا اور ان کو اجر عظیم سے نوازا جائے گا۔ چنانچہ سورۃ احزاب میں ایمان والے بندوں اور بندیوں کے چند دوسرے ایمانی اوصاف بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

...... وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا	...... اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے
وَّالذّٰكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ	والے اس کے بندے اور اس کی بندیاں،
لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○	اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں اور
(الاحزاب۔ ع ۵)	بندیوں کے لیے تیار کر رکھی ہے خاص بخشش اور عظیم ثواب۔

(۵) اسی طرح بعض آیات میں آگاہی دی گئی ہے کہ جو لوگ دنیا کی بہاروں اور لذتوں میں منہمک اور مست ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہو جائیں گے وہ ناکام اور نامراد رہیں گے۔ مثلاً سورۂ منافقون میں ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا	اے ایمان والو تمہاری دولت اور
تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ	تمہاری اولاد تم کو اللہ کے ذکر سے
عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ	غافل نہ کرے اور جو لوگ اس غفلت
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○	میں مبتلا ہوں گے وہ بڑے گھاٹے
(المنافقون۔ ع ۲)	اور نقصان میں رہیں گے۔

یہ تینوں عنوان بھی ذکر اللہ کی تاکید اور ترغیب کے لیے بلاشبہ بڑے مؤثر ہیں۔

(۶) بعض آیات میں فرمایا گیا ہے کہ جو بندے ہمیں یاد کریں گے ہم ان کو یاد کریں گے اور یاد رکھیں گے۔

فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا	میرے بندو تم مجھے یاد کرو میں تم کو

لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ ۝ یاد رکھوں گا۔ اور میرا احسان مانو اور
(البقرہ۔ ع ۱۸) ناشکری نہ کرو۔

سبحان اللہ وبحمدہ۔ بندہ کی اس سے بڑی سعادت وکامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس پوری کائنات کا خالق ومالک اس کو یاد کرے اور یاد رکھے۔

(۷) بعض آیات میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے ذکر کو ہر چیز کے مقابلہ میں عظمت اور فوقیت حاصل ہے اور اس کائنات میں وہ ہر چیز سے بالاتر اور بزرگ تر ہے۔

وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ اور یقین کرو کہ اللہ کا ذکر ہر چیز سے
(عنکبوت۔ ع ۵) بزرگ تر ہے۔

بیشک اگر بندہ کو عرفان نصیب ہو تو اللہ کا ذکر اس کے لیے اس ساری کائنات سے عظیم تر ہے۔

(۸) بعض آیات میں بڑے اونچے درجے کے اعمال کے بارہ میں ہدایت فرمائی گئی ہو کہ ان کے اختتام پر اللہ کا ذکر ہونا چاہیے، گویا ذکر اللہ ہی کو ان اعمال کا "خاتمہ" بنانا چاہیے ـــــ مثلاً نماز کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ (النساء۔ ع ۱۵)
جب تم نماز ادا کر لو تو اللہ کا ذکر کرو (ہر حال میں) کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں کے بل لیے۔

اور خاص جمعہ کی نماز کے بارہ میں ارشاد ہے۔

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الجمعہ۔ ع ۲)
جب جمعہ کی نماز ختم ہو جائے تو اجازت ہے کہ تم (مسجد سے نکل کر اپنے کام کاج کے سلسلہ میں) زمین میں چلو پھرو اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اس حالت میں بھی اللہ کا خوب ذکر کرو، پھر تم فلاح کی امید کر سکتے ہو۔

اور حج کے بارہ میں ارشاد ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ۔ ع ۲۵)	پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر کے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کا ذکر کرو جیسے کہ تم (تفاخر کے طور پر) اپنے باپ داداؤں کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ اللہ کا ذکر کرو۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نماز اور حج جیسی اعلیٰ درجہ کی عبادات سے فارغ ہونے کے بعد بھی بندہ کے لیے اللہ کے ذکر سے غافل ہونے کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ ان سے فراغت کے بعد بھی اس کے دل میں اور اس کی زبان پر اللہ کا ذکر ہونا چاہیے اور اس کو ان اعمال کا خاتمہ بننا چاہیے۔

(۹) بعض آیات میں ذکر اللہ کی ترغیب اس عنوان سے دی گئی ہے کہ دانشمند اور صاحب بصیرت بندے وہی ہیں جو ذکر اللہ سے غافل نہیں ہوتے جس کا لازمی مفہوم یہ ہے کہ جو ذکر اللہ سے غافل ہوں وہ عقل و بصیرت سے محروم ہیں۔ مثلاً سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ (آل عمران۔ ع ۲۰)	یقیناً زمین و آسمان کی تخلیق میں اور رات اور دن کی تبدیلیوں میں کھلی نشانیاں ہیں۔ اُن ارباب دانش کے لیے جو کھڑے بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں بھی اللہ کو یاد کرتے ہیں (اور اس سے غافل نہیں ہوتے)

(۱۰) بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اونچے سے اونچے اعمال صالحہ کا مقصد اور اُن کی رُوح ذکر اللہ ہے۔ مثلاً نماز کے بارہ میں ارشاد ہے۔

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي (طٰہٰ۔ ع ۱)	میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

اور مناسک حج کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اِنَّمَا جُعِلَ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ وَالسَّعْيُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَرَمْيُ الْجِمَارِ لِاِقَامَةِ ذِكْرِ اللّٰهِ۔	بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی اور جمرات کی رمی یہ سب چیزیں ذکر اللہ ہی کے لیے مقرر ہوئی ہیں۔

اور جہاد کے بارہ میں ارشاد خداوندی ہے :۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (انفال ع ۶)	اے ایمان والو جب تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے کسی دشمن فوج سے ..... تو ثابت قدم رہو اور قدم جما کے جنگ کرو، اور اللہ کا ذکر کرو، امید ہے کہ تم فلاح یاب ہوگے۔

اور ایک حدیث قدسی میں ہے،

اِنَّ عَبْدِيْ كُلَّ عَبْدِيْ الَّذِيْ يَذْكُرُنِيْ وَهُوَ مُلَاقٍ قِرْنَهٗ	میرا بندہ مکمل بندہ وہ ہے جو اپنے حریف مقابل سے جنگ کے وقت بھی مجھے یاد کرتا ہے۔

قرآن و حدیث کے ان نصوص سے ظاہر ہے کہ نماز سے لے کر جہاد تک تمام اعمال صالحہ کی روح اور جان ذکر اللہ ہے .... اور یہی ذکر اور دل و زبان سے اللہ کی یاد وہ پروانۂ ولایت ہے کہ جس کو عطا ہوگیا وہ واصل ہوگیا اور جس کو عطا نہیں ہوا وہ دور اور مہجور رہا۔ یہ ذکر اللہ والوں کے قلوب کی غذا اور ذریعۂ حیات ہے اگر وہ ان کو نہ ملے تو جسم ان قلوب کے لیے قبور بن جائیں۔ اور ذکر ہی سے دلوں کی دنیا کی آبادی ہے۔ اگر دلوں کی دنیا اس سے خالی ہو جائے تو بالکل ویرانہ ہو کر رہ جائے۔ اور ذکر ہی اُن کا وہ ہتھیار ہے جس سے وہ روحانیت کے راہزنوں سے جنگ کرتے رہیں، اور وہی اُن کے لیے وہ ٹھنڈا پانی ہے جس سے وہ اپنے باطن کی آگ بجھاتے ہیں، اور وہی اُن کی بیماریوں کی وہ دوا ہے کہ اگر ان کو نہ ملے تو ان کے دل گرنے لگیں، اور وہی

وسیلۂ ربط ہے اُن کے اور اُن کے علام الغیوب رب کے درمیان۔ کیا خوب کہا گیا ہو۔

اِذَا مَرِضْنَا تَدَاوَیْنَا بِذِکْرِکُمْ فَنَتْرُكُ الذِّکْرَ اَحْیَانًا فَنَنْتَکِسُ

جب ہم بیمار پڑ جاتے ہیں تو تمھاری یاد سے اپنا علاج کرتے ہیں اور جب کسی وقت یاد سے غافل ہو جائیں تو مرنے لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح بینا آنکھوں کو روشنی اور بینائی سے منور کیا ہے اسی طرح ذکر کرنے والی زبانوں کو ذکر سے مزیّن فرمایا ہے۔ اسی لیے اللہ کی یاد سے غافل زبان اُس آنکھ کی طرح ہے جو بینائی سے محروم ہے اور اُس کان کی طرح ہے جو شنوائی کی صلاحیت کھو چکا ہے اور اُس ہاتھ کی طرح ہے جو مفلوج ہو کر بیکار ہو گیا ہے۔

ذکر اللہ ہی وہ راستہ اور دروازہ ہے جو حق جل جلالہٗ اور اس کے بندہ کے درمیان کھلا ہوا ہے اور اس سے بندہ اُس کی بارگاہِ عالی تک پہونچ سکتا ہے۔ اور جب بندہ اللہ کے ذکر سے غافل ہوتا ہے تو یہ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے کہنے والے نے۔

فَنِسْیَانُ ذِکْرِ اللّٰہِ مَوْتُ قُلُوْبِھِمْ وَاَجْسَامُھُمْ قَبْلَ الْقُبُوْرِ قُبُوْرُ

وَاَرْوَاحُھُمْ فِیْ وَحْشَۃٍ مِنْ جُسُوْمِھِمْ وَلَیْسَ لَھُمْ حَتّٰی النُّشُوْرِ نُشُوْرُ

[اللہ کی یاد سے غافل ہو جانا اور فراموش کر دینا ان کے قلوب کی موت ہے اور اُن کے جسم زمین والی قبروں سے پہلے اُن کے مردہ دلوں کی قبریں ہیں]

[اور ان کی روحیں سخت وحشت میں ہیں اُن کے جسموں سے۔ اور اُن کے لیے قیامت اور حشر سے پہلے زندگی نہیں۔]

(ملخصاً من کلام الشیخ ابن القیمؒ فی مدارج السالکین)

ناچیز راقم سطور عرض کرتا ہے کہ مندرجۂ بالا اقتباس میں ذکر اللہ کی تاکید و ترغیب کے جن دس عنوانات کا ذکر کیا گیا ہے قرآن مجید میں ان کے علاوہ بھی بعض عنوانات سے ذکر اللہ کی ترغیب دی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے کہ قلوب کو یعنی

اللہ سے رابطہ رکھنے والوں کے دلوں اور ان کی روحوں کو اللہ کے ذکر ہی سے چین و اطمینان حاصل ہوتا ہے ـــــ الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب ○ (جان لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو چین اور سکون ملتا ہے

ذکر اللہ کی تاثیر اور برکت کے بارہ میں ایک دوسرے ربانی محقق اور صوفی صاحب "ترصیع الجواہر المکیہ" کے چند فقروں کا ترجمہ بھی پڑھ لیا جائے۔ آگے درج ہونے والی اس باب کی احادیث کے سمجھنے میں ان شاء اللہ اس سے بھی خاص مدد ملے گی۔ فرماتے ہیں۔

"قلب کو نورانی بنانے اور اوصاف ردیہ کو اوصاف حمیدہ میں تبدیل کر دینے میں سب طاعات و عبادات سے زیادہ زود اثر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔

بلاشبہ نماز گندی اور ناشائستہ باتوں سے روکتی ہے اور یہ یقینی حقیقت ہے کہ اللہ کا ذکر بہت ہی بڑی چیز ہے۔

اور اکابر نے فرمایا ہے کہ ذکر کا عمل قلب کو صاف کرنے میں بالکل ویسا ہی کام کرتا ہے جیسا کہ تانبے کو صاف کرنے اور مانجھنے میں بالو، اور باقی دوسری عبادات کا عمل قلوب کی صفائی کے بارے میں ویسا ہے جیسا کہ تانبے کے صاف کرنے میں صابون کا عمل۔ (ترصیع الجواہر المکیہ)

اس تمہید کے بعد ذکر اللہ کی عظمت اور برکات کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پڑھیے!

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ وَاَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ ـــــ رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب بھی اور جہاں بھی بیٹھ کے کچھ بندگان خدا اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو لازمی طور پر فرشتے ہر طرف سے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ان کو گھیر لیتے ہیں اور رحمت الٰہی ان پر چھا جاتی ہے اور ان کو اپنے سایہ میں لے لیتی ہے۔ اور ان پر سکینہ کی کیفیت نازل ہوتی ہے اور اللہ اپنے ملائکہ مقربین میں ان کا ذکر فرماتا ہے۔　　(صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہوا کہ اللہ کے کچھ بندوں کے ایک جگہ جمع ہو کر ذکر کرنے کی خاص برکات ہیں، صوفیائے کرام کے حلقہائے ذکر کی یہی خاص بنیاد ہے ۔۔۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث کی شرح میں فرمایا ہے

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مسلمانوں کا جمع ہو کر ذکر وغیرہ کرنا رحمت و سکینت اور قرب ملائکہ کا خاص وسیلہ ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۷)

اس حدیث میں اللہ کا ذکر کرنے والے بندوں کے لیے چار خاص نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ ہر طرف سے اللہ کے فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ رحمت الٰہی ان کو اپنے آغوش اور سایہ میں لے لیتی ہے۔ اور ان دونوں نعمتوں کے لازمی نتیجہ کے طور پر تیسری نعمت ان کو یہ حاصل ہوتی ہے کہ ان کے قلب پر "سکینت" نازل ہوتی ہے جو عظیم ترین روحانی نعمتوں میں سے ہے ۔۔۔ یہاں سکینت سے مراد خاص درجہ کا قلبی اطمینان اور روحانی سکون ہے جو اللہ کے خاص بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی عطیہ کے طور پر نصیب ہوتا ہے۔ اسی کو اہل سلوک "جمعیۃ قلبی" بھی کہتے ہیں۔ اس دولت اور نعمت کا صاحب سکینہ کو احساس اور شعور بھی ہوتا ہے ۔۔۔ اور ذاکر بندوں کو ملنے والی چوتھی نعمت جس کا اس حدیث میں سب سے آخر میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ مقربین کے حلقہ میں ان ذاکر بندوں کا ذکر فرماتے ہیں، مثلاً فرماتے ہیں کہ دیکھو آدم ہی کی اولاد میں سے میرے یہ بھی بندے ہیں جنھوں نے مجھے دیکھا نہیں غائبانہ ہی ایمان لائے ہیں اس کے باوجود محبت و خشیت کی کیسی کیفیت اور کیسے

ذوق و شوق اور کیسے سوز و گداز کے ساتھ میرا ذکر کر رہے ہیں ــــ بادشاہ مالک الملک کا اپنے مقرب فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں کا اس طرح ذکر فرمانا وہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے آگے کسی نعمت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ــــ اللہ تعالیٰ اس سے محروم نہ رکھے۔

(فائدہ) اس حدیث سے یہ بھی اشارہ ملا کہ اگر اللہ کا کوئی ذاکر بندہ اپنے قلب و باطن میں "سکینت" کی کیفیت محسوس نہ کرے (جو ایک محسوس کی جانے والی چیز ہے) تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ ابھی وہ ذکر کے اس مقام تک نہیں پہونچ سکا ہے جس پر یہ نعمتیں موعود ہیں۔ یا اس کی زندگی میں کچھ ایسی خرابیاں ہیں جو ثمار ذکر کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ بہرحال اسے اپنی اصلاح کی فکر کرنا چاہیے۔ رب کریم کے وعدے برحق ہیں۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يَقُولُ أَنَا مَعَ عَبْدِي إِذَا ذَكَرَنِي وَتَحَرَّكَتْ بِي شَفَتَاهُ ــــ رواہ البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس وقت بندہ میرا ذکر کرتا ہے اور میری یاد میں اس کے ہونٹ حرکت کرتے ہیں تو اس وقت میں اپنے اُس بندہ کے ساتھ ہوتا ہوں۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) اللہ تعالیٰ کی ایک معیت وہ ہے جو اس کائنات کی ہر اچھی بُری چیز کو اور ہر مومن و کافر کو ہر وقت حاصل ہے، کوئی چیز بھی کسی وقت اللہ سے دور نہیں، اللہ ہر چیز کو محیط ہے، ہر جگہ اور ہمہ وقت حاضر و ناظر ہے۔ اور ایک معیت رضا اور قبول والی معیت ہے۔ اس حدیث قدسی میں جس معیت کا ذکر ہے وہ یہی رضا اور قبول والی معیت ہے اور حدیث کا مدعا یہ ہے کہ جب میرا بندہ میرا قرب اور میری رضا حاصل کرنے کے لیے میرا ذکر کرتا ہے تو اس کو میرے قرب و رضا کی دولت فوراً حاصل ہو جاتی ہے، وہ میری چاہت میں میرا ذکر کرتا ہے اور میں اُس وقت اس کے بالکل

ساتھ ہوتا ہوں، اس طرح اسے وہ دولت نقد مل جاتی ہے جو وہ ذکر کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتا ہے ــــ اللہ تعالیٰ اس دولت کی طلب، اس کا ذوق و شوق اور پھر وہ دولت نصیب فرمائے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسِيْرُ فِيْ طَرِيْقِ مَكَّةَ فَمَرَّ عَلٰى جَبَلٍ يُقَالُ لَهٗ جُمْدَانُ فَقَالَ سِيْرُوْا هٰذَا جُمْدَانُ سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ قَالُوْا وَمَا الْمُفَرِّدُوْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ اَلذَّاكِرُوْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتُ ــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں مکہ مکرمہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے راستہ میں جُمدان نامی پہاڑ پر سے گزر ہوا، تو آپ نے فرمایا یہ پہاڑ جمدان ہے "مُفَرِّدُوْن" سبقت لے گئے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ مُفرّدون کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا "اللہ کا زیادہ ذکر کرنے والے بندے اور زیادہ ذکر کرنے والی بندیاں" (صحیح مسلم)

(تشریح) جُمدان ایک پہاڑی کا نام ہے جو مدینۂ طیبہ کے قریب ہی ایک دن کی مسافت پر ہے ــــ متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے جس حصہ پر اللہ کا نام لیا جاتا ہو اس کا شعور و احساس اس زمین کو ہوتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ سے پوچھتا ہے کہ کیا آج اللہ کا نام لینے والا کوئی بندہ تجھ پر سے گزرا؟ جب وہ بتاتا ہے کہ ہاں گزرا تو وہ کہتا ہے کہ تجھے بشارت ہو مبارک ہو! ــــ معلوم ہوتا ہے کہ جُمدان پہاڑ پر سے گزرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات منکشف ہوئی کہ جو زیادہ ذکر کرنے والے بندے اور بندیاں ہیں انھوں نے قبول و رضا کے بڑے مقامات حاصل کر لئے اور وہ بہت آگے بڑھ گئے تو آپ نے یہ بات فرمائی کہ "مُفرّدون" یعنی بہت زیادہ ذکر کرنے والے سبقت لے گئے "مُفرّدون" کے لغوی معنی ہیں اپنے کو سب سے الگ اور اکیلا اور ہلکا پھلکا کر لینے والے، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے قرب و رضا کی طلب میں اپنے کو اس دُنیا کی الجھنوں سے ہلکا کر لیں اور سب طرف سے کٹ کے اکیلے اللہ کے ہو جائیں، یہی مقام تفرید ہے

اور یہی قرآن مجید کی خاص اصطلاح میں "تبتل" ہے (وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا) پس "الذاکرون اللہ کثیراً والذاکرات" کے مصداق وہی بندے ہیں جن کا یہ حال ہو اور جنھوں نے ہر طرف سے کٹ کر اللہ جل جلالہٗ کو اپنا قبلہ مقصود بنا لیا ہو۔

دوسرے تمام اعمال کے مقابلہ میں ذکر اللہ کی فضیلت:-

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ أَعْمَالِكُمْ وَأَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيكِكُمْ وَأَرْفَعِهَا فِي دَرَجَاتِكُمْ وَخَيْرٌ لَكُمْ مِنْ إِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ وَخَيْرٌ لَكُمْ مِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوا أَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوا أَعْنَاقَكُمْ؟ قَالُوا بَلَى قَالَ ذِكْرُ اللّٰهِ۔

رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تم کو وہ عمل بتاؤں جو تمھارے سارے اعمال میں بہتر اور تمھارے مالک کی نگاہ میں پاکیزہ تر ہے اور تمھارے درجوں کو دوسرے تمام اعمال سے زیادہ بلند کرنے والا ہے۔ اور راہِ خدا میں سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بھی زیادہ اس میں خیر ہے اور اس جہاد سے بھی زیادہ تمھارے لیے اس میں خیر ہے جس میں تم اپنے دشمنوں اور خدا کے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارو اور وہ تمھیں ذبح کریں اور شہید کریں۔ ؟ صحابہ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! ایسا قیمتی عمل ضرور بتلایئے! آپ نے فرمایا وہ اللہ کا ذکر ہے۔　(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(**تشریح**) یہ حدیث دراصل قرآن مجید کی آیت "وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ" کی تشریح و تفسیر ہے بیشک "ذکر اللہ" اس لحاظ سے کہ وہ اصلاً و بالذات مقصد اعلیٰ ہے اور اللہ کی رضا اور اس کے تقرب کا سب سے قریبی ذریعہ ہے۔ وہ دوسرے تمام اعمال سے بہتر اور بالاتر ہے اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ کسی خاص حالت میں اور کسی ہنگامی موقع پر صدقہ اور

انفاق لوجہ اللہ یا جہاد و قتال فی سبیل اللہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عمل ایک اعتبار سے افضل و اہم ہو اور دوسرے اعتبار سے کوئی دوسرا عمل زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔ آگے درج ہونے والی حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیثوں کا مطلب و مدعا بھی قریب قریب یہی ہے اور ان میں سے ہر حدیث سے دوسری حدیث کی شرح اور تائید ہوتی ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ اَیُّ الْعِبَادِ اَفْضَلُ؟ وَاَرْفَعُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ؟ قَالَ الذّٰكِرُوْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرَاتُ، قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمِنَ الْغَازِیْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ لَوْ ضَرَبَ بِسَيْفِهٖ فِی الْكُفَّارِ وَالْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يَنْكَسِرَ وَيَخْتَضِبَ دَمًا فَاِنَّ الذَّاكِرَ لِلّٰهِ اَفْضَلُ مِنْهُ دَرَجَةً ——— رواہ احمد والترمذی

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ بندوں میں کون (یعنی کس عمل کا کرنے والا) سب سے افضل ہے اور قیامت میں کس کو اللہ کے ہاں زیادہ بلند درجہ ملنے والا ہے؟ — آپ نے فرمایا — "اللہ کو زیادہ یاد کرنے والے بندے اور زیادہ یاد کرنے والی بندیاں"۔ (یعنی افضلیت اور قیامت میں درجہ کی بلندی انہیں کے لیے ہے) — عرض کیا گیا یا رسول اللہ کیا ان لوگوں کا درجہ اس بندہ سے بھی اونچا ہے جو (سر بکف ہو کر) راہِ خدا میں جہاد کرے؟ آپ نے فرمایا اگر کسی بندہ نے (اس طرح جہاد میں جانبازی کی کہ) دشمنانِ حق کفار و مشرکین کی صفوں میں گھس کر تلوار چلائی یہاں تک کہ اس کی تلوار ٹوٹ گئی اور وہ دشمنوں کے ہاتھوں سے زخمی ہو کر خون میں شرابور ہو گیا، جب بھی اللہ کا ذکر کرنے والا بندہ درجہ میں اُس سے افضل ہے۔

(مسند احمد۔ جامع ترمذی)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ لِکُلِّ شَیْئٍ صِقَالَۃٌ وَ صِقَالَۃُ الْقُلُوْبِ ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا مِنْ شَیْئٍ اَنْجٰی مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ، قَالُوْا وَلَا الْجِہَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ وَلَا اَنْ یَّضْرِبَ بِسَیْفِہٖ حَتّٰی یَنْقَطِعَ۔

—————— رواہ البیہقی فی الدعوات الکبیر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ہر چیز کی صفائی کے لیے کوئی صیقل ہے اور قلوب کی صیقل (یعنی ان کی صفائی کا خاص سالہ) ذکر اللہ ہے، اور اللہ کے عذاب سے بچانے اور نجات دلانے میں اللہ کا ذکر جس قدر مؤثر ہے اتنی کوئی دوسری چیز مؤثر نہیں — لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں، آپ نے ارشاد فرمایا ہاں وہ جہاد بھی عذاب خداوندی سے نجات دلانے میں ذکر کے برابر مؤثر نہیں جس کا کرنے والا ایسی جانبازی سے جہاد کرے کہ تلوار چلاتے چلاتے اس کی تلوار بھی ٹوٹ جائے۔ (دعوات کبیر للبیہقی)

(**تشریح**) اصل حقیقت یہی ہو کہ سارے اعمال صالحہ کے مقابلہ میں "ذکر اللہ" افضل اور عند اللہ محبوب تر ہو (وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ) بندہ کو اللہ تعالیٰ کا جو قرب اور اسکی وجہ سے جو سعادت اور شرف ذکر کے وقت حاصل ہوتا ہو وہ کسی دوسرے عمل کے وقت نہیں ہوتا بشرطیکہ یہ ذکر عظمت اور محبت وخشیت اور دل کی توجہ کے ساتھ ہو — اللہ تعالیٰ کا ارشاد "فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ" (تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا) اور حدیث قدسی "اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ"، "وَاَنَا مَعَ عَبْدِیْ اِذَا ذَکَرَنِیْ وَتَحَرَّکَتْ بِیْ شَفَتَاہُ" (میں اپنے ذکر کرنے والے بندے کے ساتھ اور اس کا ہم نشین ہوتا ہوں — اور میرا بندہ جب میرا ذکر کرتا ہے اور اس کے لب میرا ذکر کرنے سے حرکت کرتے ہیں تو میں اس کے بالکل پاس اور ساتھ ہوتا ہوں)

—— بہر حال قرآن و حدیث کے ان واضح نصوص کا مدعا یہی ہے کہ تمام اعمال صالحہ میں ذکر اللہ ہی افضل اور عند اللہ محبوب تر اور اس کے قرب و رضا کا خاص الخاص وسیلہ ہے۔

—— البتہ یہ ملحوظ رہے کہ اس ذکر میں نماز اور تلاوت قرآن وغیرہ اس قسم کی عبادات سب داخل ہیں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ

از — مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

(۴)

مجاذیب سے ملاقات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے انفاس العارفین میں اس عنوان کے تحت بہت کچھ ارقام فرمایا ہے اور عجیب عجیب واقعات قلمبند فرمائے ہیں — ایک مجذوب سے حضرت شاہ عبدالرحیم کا ایک دلچسپ مکالمہ بھی نقل کیا ہے۔

شیخ لعلؒ سے ملاقات شیخ لعلؒ کی ملاقات کا بھی انفاس العارفین میں تذکرہ ہے اور ان کی دو ایک باتیں بھی ذکر کی گئی ہیں — یہ شیخ لعلؒ عملیات کے ماہر تھے۔ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے ایک دن کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ شیخ لعلؒ میرے پاس آئے اور کہا کہ میری عمر کا آفتاب لب بام آگیا ہے، مناسب یہ ہے کہ ان عملیات کو تم مجھ سے سیکھ لو۔ میں نے کہا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم حاصل کرنا نہیں چاہتے تو میں ان عملیات کے دفتر کو دریا میں ڈالے دیتا ہوں اس لیے کہ مجھے اور کوئی ان عملیات کا اہل نظر نہیں آتا، میں نے کہا شوق سے دریا میں ڈال دیجئے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا تمام عملیات کی کتابیں دریا میں ڈال دیں۔

واقعات کشف و مشاہدہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ اسماء الٰہیہ مثلاً حی، علیم، سمیع، بصیر — روشن دائروں کی شکل میں شمس و قمر کی طرح میرے سامنے متمثل ہو رہے ہیں...... فرمایا کرتے تھے کہ ایک رات بہشت کو خواب میں دیکھا گویا

اس کے وسط میں کھڑا ہوا ہوں اور حور و قصور کو دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میرے دل میں آیا کہ حور و قصور کو تو میں نے اپنے دل سے نکال دیا تھا اور طلب حضرت حق میں یکجہت و یکسو ہو گیا تھا پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ یہاں مقصود حقیقی کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت گریہ اور وجد میرے اوپر غالب آیا۔ اہل بہشت آتے تھے اور میرے دامن کو پکڑ کر کہتے تھے کہ یہ جگہ تو خوشی کی ہے یہاں رونے کا کیا موقع ہے؟ میں سختی سے اپنے دامن کو چھڑاتا تھا اور ان سے اعراض کرتا تھا۔ پھر اہل بہشت نے کہا کہ تمھیں مقصود و معبود کی قسم ہے یہ بتاؤ کہ سبب گریہ کیا ہے؟ میں نے مجبور ہو کر اپنے دل کی بات کہی ـــ اسی وقت مجھے الہام ہوا کہ تم نے ہماری کتاب میں یہ نہیں پڑھا ـــ کانت لھم جنّٰتُ الفردوس نُزُلاً۔ (مومنین[عہ] و صالحین کے لیے باغہائے بہشت بطور مہمانی یا پیش کش ہوں گے، نُزُل یہ ہے کہ اولاً مہمان کے لیے کچھ چیزیں مہیا کر کے اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں تاکہ ان سے شغل کرے بعد ازاں فکر ضیافت کرتے ہیں ـــ پھر آخر یہ گریہ و بکا کیوں ہے؟ ـــ

فرماتے تھے کہ میں نے ایک صاحب کشف کی بڑی تعریف سنی تھی۔ میں نے چاہا کہ میں اُس کے پاس جاؤں میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ بدعتی ہے اس کے مکان پر نہیں جانا چاہیئے۔ مگر میں نے اس دل میں ڈالی ہوئی بات کی نفی کر دی اور ملاقات کا ارادہ کیا پھر وہی بات دل میں ڈالی گئی میں نے پھر نفی کر دی اور بالآخر چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جوں ہی کھڑا ہو کر چلا ہوں میرا پاؤں پھسل گیا اور تعجب یہ ہے کہ وہاں کوئی دلدل یا پھسلن کی جگہ بھی نہ تھی ـــ میں گر گیا اور بڑی چوٹ آئی۔ پھر میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ اگر اول مرتبہ کی بات مان لیتا تو اتنی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑتی۔

فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو الہام ہوا کہ تیرا سلسلہ تا قیام قیامت باقی رہے گا۔ فرماتے

عہ نُزُل کے معنی مہمانی و ضیافت یا جائے مہمانی کے ہیں تفسیر حسینی میں نُزُل کے معنی پیش کش کے دیئے ہیں... اور اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مومنین و صالحین کو ایک ایسی نعمت عطا ہو گی جس کے مقابلے میں نعیم فردوس کی ماحضر سے زیادہ حیثیت نہیں۔ وہ نعمت دیدار باری تعالیٰ ہے۔ پھر یہ شعر لکھا ہے۔

نعمت فردوس زاہد را و ما را روئے دوست ـــ قیمت ہر کس بقدر ہمت والائے اوست

تھے کہ ایک دن رمضان میں زیادہ چلنے کی وجہ سے بہت زیادہ ضعف غالب ہو گیا تھا قریب تھا کہ اس ضعف کی وجہ سے روزہ توڑ دوں، ساتھ ہی ساتھ فضیلتِ صوم کے فوت ہو جانے کا اندوہ وغم بھی تھا ـــ اسی غم کی حالت میں کچھ اونگ آگئی ـــ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے ایک انتہائی لذیذ وخوشبودار کھانا جس کو بزبانِ ہندی (اردو زبان میں) زرد پلاؤ کہتے ہیں ـــ مجھ کو مرحمت فرمایا، میں نے اس کو کھایا اور خوب کھایا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھنڈا پانی بہت اعلیٰ درجے کا عنایت فرمایا میں نے اس کو بھی خوب ڈٹ کر پیا۔ اس کے بعد میری بھوک اور پیاس بالکل زائل ہو گئی اور شکم سیری اور سیرابی حاصل ہو گئی ـــ جاگنے کے بعد بھی میرے ہاتھ میں اس زرد پلاؤ کے زعفران کی خوشبو موجود تھی۔ میرے بعض مخلصین نے میرے ہاتھ کو پانی سے دھویا اور تبرکاً وتیمناً اس پانی سے روزہ افطار کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عیادت کے لیے تشریف لانا اور موئے مبارک عطا فرمانا

فرماتے تھے کہ ایک بار مجھ کو بخار نے گھیر لیا اور وہ بڑھتا ہی گیا تا آنکہ امیدِ حیات منقطع ہو گئی۔ ایک دن اسی حالت میں غنودگی طاری ہوئی اور حضرت شیخ عبدالعزیز شکربارؒ ظاہر ہوئے وہ فرما رہے ہیں اے لڑکے حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام تمہاری عیادت کے لیے تشریف لا رہے ہیں اور شاید اس طرف سے تشریف لائیں جس طرف تمہارے پلنگ کی پائنتی ہے لہذا اپنی چارپائی کو اس طرح بچھواؤ کہ تمہارے پاؤں دوسری طرف کو ہو جائیں (یہ سن کر میں کچھ دیر کے لیے ہوش میں آگیا) قوتِ تکلم میرے اندر بالکل نہیں تھی۔ میں نے حاضرین کو اشارہ کیا کہ میری چارپائی گھما دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ـــ (پھر میرے اوپر پہلی کیفیت طاری ہوئی) ـــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کیف حالک یا بُنَیَّ ـــ (اے بیٹے کیا حال ہے؟) اس وقت ایک عجیب وجد اور گریہ واضطراب میرے اوپر طاری ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اپنی آغوشِ مبارک میں لے لیا اس طرح کہ آپ کی ریشِ مبارک میرے سر کے اوپر تھی، میں اس قدر رو رہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرہن مبارک میرے آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ آہستہ آہستہ یہ کیفیت ختم ہو گئی پھر میرے

دل میں یہ بات آئی کہ مدتوں سے موئے مبارک کی تمنا رکھتا ہوں کسقدر کرم ہوگا اگر اسوقت موئے مبارک مجھے عنایت فرمادیں۔ اس آرزو پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطلع ہوگئے۔ ریش مبارک پر اپنا دست مقدس پھیرا اور دو موئے مبارک مجھے عطا فرمائے۔ معاً میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ عالم شہادت (دنیا) میں بھی یہ دو موئے مبارک باقی رہیں گے یا نہیں؟ میرے اس خطرہ پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطلع ہوئے اور فرمایا کہ ہاں یہ عالم شہادت میں بھی باقی رہیں گے۔ اس کے بعد آپ نے مجھے صحت کلی اور درازی عمر کی بشارت عطا فرمائی۔ پھر میں ہوش میں آگیا۔ میں نے چراغ منگوایا، ان دونوں موئے مبارک کو اپنے ہاتھ میں نہ پایا کر دوبارہ جانب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب متوجہ ہوا، ایک بیہوشی طاری ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متمثل ہوئے اور ارشاد فرمایا اے لڑکے آگاہ ہوجاؤ کہ ہمیں نے وہ دونوں بال از روئے احتیاط تمہارے تکیے کے نیچے رکھ دیئے ہیں وہیں تم کو مل جائیں گے۔ پھر مجھے ہوش آیا اور تکیے کے نیچے ہی وہ موئے مبارک میں نے رکھے پائے۔ اس کے بعد الحمدللہ بخار رخصت ہوگیا مگر ساتھ ہی ساتھ ضعف کا شدید غلبہ ہوا جس سے اقربا نے سمجھا کہ یہ موت کی کیفیت ہے۔ سب کے سب رونے لگے، میں بولنے کی طاقت نہ رکھتا تھا، سر سے اشارہ کرتا تھا۔ کچھ دنوں بعد قوت بحال ہوئی اور صحت کلی بھی پائی۔

فرماتے تھے کہ ان دونوں مقدس بالوں کے خواص میں سے ایک تو یہ ہے کہ یہ دونوں باہم لپٹے ہوئے رہتے ہیں جب درود شریف پڑھا جاتا ہے تو ایک دوسرے سے جدا ہوجاتے ہیں۔ دوسری خاص بات یہ فرمائی کہ ایک مرتبہ تین اشخاص جو بداعتقاد اور منکر قسم کے تھے ان مبارک بالوں کے امتحان کے لیے آئے۔ میں بے ادبی کے اندیشے سے اس امتحان پہ راضی نہ ہوا جب انھوں نے بہت کچھ ضد کی تو میں مجبوراً راضی ہوگیا۔ وہ ان دونوں مبارک بالوں کو دھوپ میں لے گئے۔ اسی وقت ایک بادل کا ٹکڑا آیا اور سایہ فگن ہوگیا۔ حالانکہ بڑی تیز دھوپ پڑ رہی تھی اور بارش کا موسم بھی نہ تھا۔ ان تین میں سے ایک نے تو فوراً توبہ کرلی۔ اب دو منکر باقی رہ گئے، انھوں نے کہا کہ یہ بادل کا سایہ فگن ہونا اتفاقی بات تھی دوبارہ بالوں کو دھوپ میں لایا جائے۔ چنانچہ وہ دوبارہ دھوپ میں لائے گئے

دوسری بار پھر بادل کا ٹکڑا نمودار ہوا۔ اب ان دو میں سے ایک غائب ہوگیا تیسرا باقی رہا۔ اُس نے کہا کہ یہ تو قضیۂ اتفاقیہ ہے۔ تیسری بار پھر دونوں مبارک بالوں کو دھوپ میں لے جایا گیا اس مرتبہ بھی ابر کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا ـــ بالآخر تیسرا شخص بھی تائب ہوا ـــ ان دونوں مبارک بالوں کی ایک تاثیر یہ بیان فرمائی کہ ایک مرتبہ زیارت کے لیے میں نے ان کو نکالنے کا ارادہ کیا وہ تالے میں مقفل تھے۔ میں نے ہر چند کوشش تمام کنجی سے تالا کھولنا چاہا تالا نہ کھلا ایک بڑا مجمع موجود تھا۔ اپنے دل کی طرف متوجہ ہوا تو منکشف ہوا کہ مجمع کے اندر ایک شخص متعین حالتِ جنابت میں ہے اس کی وجہ سے تالا نہیں کھل رہا ہے ـــ میں نے عیب پوشی کے پیش نظر سب کو مخاطب کرکے کہا کہ سب کے سب دوبارہ طہارت حاصل کرلیں۔ وہ جنبی بھی مجمع کے ساتھ باہر چلا گیا پھر تو سہولت کے ساتھ تالا کھل گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ حضرت والدِ ماجدؒ نے اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنے پاس رکھے ہوئے تمام تبرکات تقسیم فرما دیئے تھے۔ الحمدللہ ان دونوں مبارک بالوں میں سے ایک مجھے عنایت فرمایا ـــ

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے فرمایا کہ ایک دن خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا میں نے دیکھا کہ حاضرین میں سے ہر شخص ایک درود اپنی استعداد کے مطابق پیش کر رہا ہے، میں نے یہ درود پیش کیا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِنِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درود کو سماعت فرمایا تو آپ کے چہرۂ مبارک پر انتہائی بشاشت کے آثار نمایاں ہوئے ـــ

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے ذریعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں ملاقات

فرماتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ سیدنا حضرت حسن و سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا کہ وہ یاقوت سرخ کی ایک ایسی بہلی میں سوار ہیں جس میں بیل نہیں ہیں۔ قدرتِ الٰہی سے وہ گاڑی خود بخود چل رہی ہے ـــ میں بھی ان کی ہمرکابی میں پیدل سفر کر رہا ہوں، دونوں بزرگ فرماتے ہیں کہ آؤ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں ادب کی وجہ سے اس میں نہیں بیٹھ رہا ہوں آخر کار ان دونوں حضرات نے از روئے مزاح فرمایا اچھا اس بہلی کا پردہ اوپر سے نیچے کو

چھوڑ دو۔ میں یہ کام انجام دینے کے لیے پائدان پر چڑھ گیا اور چاہا کہ پردہ چھوڑ دوں، اتنے میں میرا ایک ہاتھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اور دوسرا ہاتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے خوب مضبوطی سے پکڑ لیا اور دونوں نے مسکرا کر فرمایا اب بتاؤ تمھارا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا اُس شخص کا حال کیا پوچھنا جس کے دونوں ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرۃ العین اور نور چشم کے ہاتھوں میں ہوں۔ پھر وہ مجھے بہلی میں بٹھا کر انبساط تمام کے ساتھ اپنے گھر تک لائے وہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملاقات کی دولت نصیب ہوئی میں نے حضرت علی رضؓ سے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ یہ نسبت جو ہم فقرا حاصل کرتے ہیں کیا وہی نسبت ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارکہ میں اصحاب کرام حاصل کیا کرتے تھے یا زمانے کے گزر جانے کے باعث نسبت بدل گئی؟ — فرمایا کہ تھوڑی دیر اپنی نسبت میں مستغرق ہو جاؤ تاکہ میں معائنہ کر لوں۔ چنانچہ میں اپنی نسبت میں مستغرق ہو گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعد ملاحظہ فرمایا کہ تمھاری نسبت وہی نسبت ہے بلا فرق اور بے تفاوت۔

خواب میں اکابر اولیاء سے ملاقات

فرماتے تھے کہ میں نے ابتدائے سلوک میں اصحاب طرق کو خواب میں دیکھا اور ان سے اجازت حاصل کی، منجملہ ان کے حضرت خواجہ نقشبندؒ کو دیکھا کہ انھوں نے مجھے لکڑی کے پیالے میں پانی عنایت فرمایا میں نے خوب اچھی طرح پیا۔ پھر آپ نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں اور آخر میں اجازت تلقین طریقہ مرحمت فرمائی — فرماتے تھے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری قدس سرہٗ کو دیکھا کہ وہ ایک مکان میں بیٹھے ہوئے ہیں وہاں ایک چراغ روشن ہے مگر ضرورت اس بات کی پیش آرہی ہے کہ اُس چراغ کی بتی کو ابھارا جائے تاکہ خوب اچھی طرح روشنی ہو، حضرت خواجہؒ نے مجھ کو اس خدمت کا حکم فرمایا میں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد حضرت خواجہ اجمیریؒ نے اپنی نسبت خاص کا افاضہ فرمایا — اس خواب کی تعبیر بالکل ظاہر ہے کہ حضرت خواجہؒ کی طرف سے اجازت حاصل ہوئی —

فرماتے تھے کہ ایک خواب میں اہل اللہ کے سلاسل مجھے دکھائے گئے گویا ایک وسیع بازار ہے وہاں پختہ دوکانیں بنی ہوئی ہیں، ہر ایک دوکان پر ایک ایک صاحب طریقہ

اپنے اصحاب و خلفاء کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس بازارِ معرفت سے گزر رہا ہوں تا آنکہ حضرت محبوب سبحانی شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دکانِ معرفت پر جا پہونچا اور ان کی جماعت کے درمیان بیٹھا وہاں فصوص الحکم (مؤلفہ شیخ اکبرؒ) کی ایک عبارت پڑھی گئی۔ ہر ایک اس کے علیحدہ علیحدہ معنیٰ بیان کرنے لگا جب میری باری آئی تو ایک معنیٰ میں نے بھی بیان کیے اس پر حضرت شیخ جیلانیؒ نے خوش ہو کر فرمایا "غرضِ آں بیچارہ ہمیں بود" (بیچارے شیخ محی الدین ابن عربی کی غرض یہی تھی)۔

فرماتے تھے کہ اس خواب کو دیکھے مدت گزر گئی مگر حضرت شیخ جیلانی قدس سرہ کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا مذکورۂ بالا جملہ ابھی تک میرے حافظے میں موجود ہے۔ فرمایا کہ اس کے بعد حضرت محبوب سبحانیؒ مجھ کو تنہائی میں لے گئے اور فرمایا کہ میری جانب سے تمھارے دل میں کیا کوئی وسوسہ رہتا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں ــــ ہر ایک صاحب طریقہ نے تو بے واسطہ مجھے اجازت مرحمت فرمادی مگر حضرت والا نے بے واسطہ اجازت ابھی تک نہیں عنایت فرمائی، حضرت محبوب سبحانیؒ نے فرمایا کہ ہمارے خلفاء ہمارے ہی حکم میں ہیں جب اُن سے تم کو اجازت ہے تو گویا ہم سے ہی اجازت حاصل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بے واسطہ اجازت کا لطف ہی کچھ اور ہے فرمایا اچھی بات ہے ہم نے بھی تم کو اجازت دی۔ میرے طریقہ پر بھی لوگوں کو تلقین کیا کرو ــــ

فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ زیارتِ مرقدِ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے گیا اُن کی روحِ مبارک ظاہر ہوئی مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تمھارے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا اس کا نام قطب الدین احمد رکھنا ــــ چونکہ میری زوجہ[1] ایسی عمر کو پہونچ گئی تھیں جس عمر میں اولاد کی امید نہیں رہتی اس لیے میں نے گمان کیا کہ شاید پوتا مراد ہے۔ اس پر مطلع ہو کر فرمایا نہیں میری مراد پوتا نہیں ہے بیٹا ہی مراد ہے جو تمھارے صلب سے ہوگا۔ چنانچہ ایک مدت بعد (پہلی زوجہ کا انتقال ہوجانے پر) دوسری شادی کا داعیہ

---

[1] حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی پہلی زوجہ سے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام صلاح الدین تھا۔

پیدا ہوا (دوسری زوجہ[۱] سے حضرت شاہ ولی اللہ اور بعدہٗ حضرت شاہ اہل اللہؒ پیدا ہوئے)

حضرت محدث دہلویؒ اس موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ میرے پیدا ہونے پر حضرت والد ماجدؒ اس واقعہ کو فراموش کر چکے تھے اس لیے میرا نام ولی اللہ رکھا۔ کچھ مدت کے بعد یہ واقعہ یاد آیا تو قطب الدین احمد نام رکھا ـــــ

حضرت شاہ عبدالرحیم فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک بار حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو خواب میں دیکھا کہ وضو فرما رہے ہیں اور نماز کی تیاری کر رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ جس عالم میں آپ ہیں وہ عالم تکلیف نہیں ہے پھر وضو اور نماز کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا چونکہ دنیا میں وضو اور نماز سے بہت زیادہ تعلق رکھتا تھا اس لیے وضو اور نماز سے ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے پس ان امور کا ادا کرنا لذت کی بنا پر ہے مکلف ہونے کی بنا پر نہیں ـــــ

شیخ سعدی شیرازیؒ سے عالمِ بیداری میں ملاقات

فرماتے تھے کہ جب میں آگرے میں تھا ایک دن مرزا محمد زاہد کے درس سے فارغ ہو کر واپس آ رہا تھا ایک لمبی گلی میرے راستے میں آئی میں اس وقت شیخ سعدیؒ کے یہ اشعار آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا اور ایک کیفیت طاری تھی۔

جز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است[۲]
جز سرِّ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوئے لوحِ دل از نقشِ غیرِ حق
علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است

---

[۱] ان دوسری زوجہ محترمہ کا اسم مبارک خیر النساء تھا، حضرت شیخ محمد پھلتیؒ کی صاحبزادی تھیں۔

[۲] یارِ دوست کے علاوہ تو جو شغل بھی اختیار کرے گا عمر ضائع کرے گا ـــــ اسرارِ عشقِ الٰہی کے علاوہ جو کچھ تو پڑھے گا باطل ہے ـــــ اے سعدی تو اپنی لوحِ دل سے غیرِ حق کے نقش دھو ڈال۔ جو علم بھی حق کی جانب رہنمائی کرنے والا نہ ہو وہ محض جہالت ہے۔

اتفاق سے اس وقت مجھے جو تھا مصرعہ یاد نہیں آ رہا تھا جس کی وجہ سے مجھے بڑا قلق و اضطراب تھا۔ ناگاہ ایک شخص فقیر وضع، ملاحت آمیز چہرے کا میری داہنی جانب سے آیا اور کہا ـــــ علمے کہ رہ بحق نہ نماید جہالت است۔ میں نے کہا جزاک اللہ خیر الجزاء آپ نے میری کتنی بڑی پریشانی کو میرے دل سے دور کر دیا ـــــ اس کے بعد میں نے ان درویش کی خدمت میں پان پیش کیا۔ انھوں نے تبسم کیا اور فرمایا کہ کیا مصرعہ یاد دلانے کی اجرت دی جا رہی ہے؟ میں نے کہا نہیں بلکہ یہ شکرانہ ہے ـــــ انھوں نے فرمایا کہ میں پان نہیں کھاتا ہوں۔ میں نے کہا آپ شریعت کی رو سے پان سے پرہیز کرتے ہیں یا طریقت کی رو سے جو بات ہو اسکو بیان کیجئے تاکہ میں بھی پان سے پرہیز کروں انھوں نے فرمایا کہ ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے بس میں کھاتا نہیں ہوں ـــــ پھر اس درویش نے کہا مجھے جلد چلنا چاہیئے میں نے کہا میں بھی جلدی جلدی چلتا ہوں انھوں نے کہا کہ میں بہت زیادہ تیز رفتاری سے چلنا چاہتا ہوں یہ کہہ کر انھوں نے اپنا قدم اٹھایا اور گلی کی انتہا پر رکھا میں سمجھ گیا کہ یہ روح مجسم ہے میں نے آواز دی کہ اپنے نام سے آگاہ کیجئے تاکہ میں ایصال ثواب کروں جواب میں فرمایا سعدی ہمیں فقیر است۔ (سعدی اسی فقیر کو کہتے ہیں)

تغلق آباد (دہلی) کی ایک قبر

فرمایا کرتے تھے کہ شیخ بایزید اللہ گو[ؒ] نے قصد سفر حرمین اس حال میں کر لیا کہ اُن کے پاس زاد و راحلہ کا کوئی انتظام نہ تھا اور دہلی سے چل پڑے ان کے ساتھ بہت سے ضعفاء بھی ہو گئے میں نے اور بھائی ابو الرضا محمد[ؒ] اور چند دوستوں نے مجتمع ہو کر یہ طے کیا کہ اُن کو واپس لایا جائے چنانچہ ہم ان کی تلاش میں نکلے جب تغلق آباد (دہلی کہنہ) میں ہم پہونچے تو دھوپ بہت تیز ہو گئی تھی ایک درخت کے سایے کے نیچے ہم اترے سب ساتھی سو گئے اور میں اُن کے کپڑوں کی حفاظت میں جاگتا رہا۔ میں نے اسی اثنا میں قرآن مجید کی چند سورتیں تلاوت

ؒ آپ تصور کے پٹھانوں میں سے تھے۔ ہمیشہ مشاہدہ محبوب حقیقی سے مسرور رہتے تھے اور دہلی کے کوچہ و بازار میں اللہ اللہ کہتے ہوئے پھرتے تھے ایک جماعت آپکے ساتھ رہتی تھی۔ جو کچھ ملتا فی الفور حاضرین کو دیدیتے تھے اور کوئی بیمار آپکے پاس آتا اس کا علاج کرتے تھے۔ آپنے ۹ جمادی الاولی ۱۰۹۵ھ میں بعہد اورنگ زیب عالمگیر انتقال فرمایا۔

(مزارات اولیائے دہلی و چہار گلشن مؤلفہ رائے چترمن)

تلاوت کیں وہاں پر نزدیک ہی چند قبریں تھیں۔ مجھ سے ایک قبر والے نے کہا کہ مدت ہو گئی تھی کہ میں نے قرآن نہیں سنا تھا (بڑی مدت کے بعد آج سنا ہے) میں قرآن مجید کی قرأت کا بہت ہی مشتاق ہوں اگر قرآن ابھی اور پڑھو تو بڑا احسان ہو گا میں نے پھر تلاوت شروع کی۔ جب پڑھ کر خاموش ہو گیا تو اس نے پھر استدعا کی کہ کچھ اور پڑھو میں نے تیسری بار پڑھا۔ اس کے بعد مخدومی بھائی صاحب کو خواب میں وہی صاحب قبر ظاہر ہوا اور اس نے کہا کہ میں نے ان صاحب سے مکرر التماس قرأت کیا انہوں نے قبول کیا مجھے بار بار التماس کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے مگر شوق ابھی باقی ہے آپ ان سے کہئے کہ اس مرتبہ کچھ زیادہ پڑھیں۔ بھائی صاحب بیدار ہوئے اور مجھ سے خواب بیان کیا میں نے اس مرتبہ قرآن کچھ زیادہ پڑھا میں نے اس صاحب قبر سے انتہائی سرور مشاہدہ کیا اور اس نے مجھ سے کہا جزاک اللہ عنی خیر الجزاء ——

میں نے اس مقبور سے عالم برزخ کے واقعات کا سوال کیا اس نے کہا کہ میں دوسری قبروں کی تو کچھ اطلاع نہیں رکھتا البتہ اپنا حال بیان کروں گا وہ یہ ہے کہ جس وقت سے میں دنیا سے منتقل ہوا ہوں میں نے کوئی عتاب و عذاب اپنے اوپر نہیں دیکھا اگرچہ بہت زیادہ عیش و آرام بھی نہیں ہے —— میں نے کہا کہ کچھ معلوم ہے کہ کس عمل کی برکت سے تم نے نجات پائی؟ اس نے کہا کہ میں دنیا میں برابر یہ نیت رکھتا تھا کہ دنیا کے تمام دھندے چھوڑ دوں گا اور طاعت و اذکار کی راہ میں جتنی رکاوٹیں ہیں ان سے دست بردار ہو جاؤں گا —— اگرچہ تمام عمر یہ بات حاصل نہیں ہوئی مگر اللہ تعالے نے محض اپنے فضل و کرم سے میری اس نیت ہی کو قبول فرما لیا اس کی برکت سے اتنا ہوا کہ نجات مل گئی ——

منطق الطیر کا ادراک فرماتے تھے ایک مرتبہ رمضان کے آخری روزے کے بعد عید کے چاند میں گڑبڑ ہوئی —— میں مسجد جحو میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک چڑیا آئی اور اس نے مجھ سے کہا کہ کل کو عید ہے۔ میں نے حاضرین سے یہی کہدیا —— حاضرین میں ایک صاحب فرہاد بیگ نام کے تھے انھوں نے کہا سخن حیوانات کا کیا اعتبار ہے اس پر اس چڑیا نے کہا کہ جھوٹ تو خاصۂ بنی آدم ہے ہماری جنس کے اندر جھوٹ کا رواج نہیں ہے پھر وہ چڑیا اڑ گئی بعدہٗ ایک دوسری چڑیا اس کے ہمراہ آگئی اس نے بھی اگلے دن عید ہو جانے کے متعلق کہا —— اسی اثناء میں قاضی شہر

کے پاس گواہ آئے اور انھوں نے شہادت دی کہ ہم نے چاند دیکھا ہے ــــ حضرت شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے والد ماجدؒ سے جِنّات کے تکلم کی کیفیت معلوم کی فرمایا کہ اسکی آواز تو چڑیوں کی سی تھی دوسرے لوگ کچھ ادراک نہیں کر سکتے تھے مگر مجھے اللہ کی طرف سے اس کا ادراک ہو گیا۔

جنات کی عقیدتمندی | فرماتے تھے کہ اوائلِ حال میں تمام رات یا رات کا اکثر حصہ ذکرِ حق سبحانہ میں گذارتا تھا۔ کبھی ذکرِ جہری کرتا کبھی ذکرِ سرّی۔ اسوقت ایک نیک مزاج جن آدمی کی شکل میں متشکل ہو کر شریکِ ذکرِ جہری ہوتا تھا جب اس سے ہمارے بعض دوستوں نے دریافت کیا کہ تو کون ہے؟ تو اس نے سختی سے جواب دیا کہ اس سوال سے کیا فائدہ؟ جب جمعہ کے دن میں وعظ کہتا تھا تو وہ وعظ سننے کے لئے آتا تھا ــــ فرماتے تھے کہ ایک جن مجھ سے بیعت ہوا اور اشغال سیکھے ــــ ایک دن میں گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہا تھا وہ متشکل ہوا اور صلوٰۃ التسبیح کی ترکیب دریافت کی میں نے بیان کر دی ــــ جو بات اسکو یاد نہ رہی تھی اس کو دوبارہ دریافت کیا یہاں تک کہ خوب سمجھ گیا ــــ

نگاہِ اوّلیں ——— بقیہ صفحہ (۴)

معاملے میں اپنا کوئی جداگانہ تصور رکھتا ہو، یا ملک کے ارباب قیادت یا قوم کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اُن سے بھی بڑھ کر یا کم از کم ان کے برابر کا محب وطن ہے تو اُس کی اس یقین دہانی کا مطلب اُسی معروف و معتبر مفہوم سے لیا جائے گا چاہے اس کے دل میں ان الفاظ کا کچھ بھی مطلب ہو۔

ٹھیک ہے کہ بعض وقت حالات صاف صاف بات کہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور نہ ہر موقع پر حق بات کا کہنا ہر آدمی یا ہر انفرادی گروہ کی ذمہ داری ہے مسلمان اس ملک میں دستوری طور پر دوسروں کے برابر ہی کے شہری ہیں۔ اور اس لحاظ سے ہر قومی پالیسی میں برابر کے ذمہ دار لیکن واقعاتی حقیقت یہ نہیں ہے۔ قومی پالیسی کے معاملات میں وہ قوم کی اکثریت کی رائے پر صاد کرنے کا تو حق رکھتے ہیں اور اس حق کا استعمال نہایت تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن اظہار اختلاف کا حق استعمال کرنے لگیں تو مؤثر تو (کم از کم فی الحال) ذرا بھی نہیں ہو سکتے البتہ غدار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ اور ایسی حالت میں یقیناً اُن کی ذمہ داری نہیں کہ جن معاملات کا تعلق اُن سے نہیں ہے اُن میں بھی محض شہادت حق کی خاطر حق گوئی کریں۔ اسی طرح وہ اگر متعین معاملات سے ہٹ کر محض نظریاتی سطح پر بھی کوئی ایسی بحث چھیڑنا پسند نہ کریں جس کے وہ اللہ کی طرف سے مکلف نہیں ہیں اور خواہ مخواہ ایک فتنہ ان کے خلاف برپا ہو سکتا ہے تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اور حب وطن کے معاملے میں اپنے تصورات کی بحث بھی ہندوستان کے خاص حالات میں اسی زمرہ میں داخل کی جا سکتی ہے۔ مگر اس کی اجازت یقیناً کسی حال میں نہیں نکل سکتی کہ ہم اپنی مصلحتوں اور معذوریوں کی خاطر حق کو بھی مشتبہ کرنے لگیں اور بلا کسی وضاحت کے کی جانے والی اپنی حب الوطنی کی یقین دہانیوں میں زور پیدا کرنے کے لیے پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو بھی اپنے ساتھ لے کر کھڑے ہو جائیں کہ یہ مسلمانوں میں حب وطن کی قدر و منزلت کے لیے سب سے بڑی سند ہیں۔ حالانکہ یہ حب وطن کے اس تصور سے ہزار بار بری ہیں جس کی مانگ ہمارے ملک میں ہے اور جس کی تردید کیے بغیر اسلام میں حب الوطنی ثابت کرنے کے لیے ان کا زبان پر لانا گناہ ہے۔

ہمارے لیے انتہائی رنج، کرب اور شرمندگی کی بات ہو کہ بعض مؤقر علمائے اسلام تک اس معاملے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کر رہے ہیں، اور جن زبانوں سے دینِ حق کے بارے میں ہر اشتباہ و التباس کی کاٹ ہونا تھی وہ خود اشتباہ و التباس کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ فیا غربۃ الاسلام و واکربتاہ!! ———

"لبرل اسلام" پر تبصرہ

(از جناب وحیدالدین خاں صاحب)

فیضی صاحب نے اپنی کتاب کے دوسرے باب میں نقل کیا ہے کہ فولر نے ایک بار درمیانی عمر کی ایک انگریز خاتون سے پوچھا کہ وہ اللہ کے پیغمبر کے نام کا تلفظ کس طرح کرے گی، اور اس نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا ــــ مہومت (MAHOMET) اس کے بعد فیضی صاحب لکھتے ہیں کہ خاتون اپنے جواب میں صحیح بھی تھی اور غلط بھی۔ "مہومت" بہت عمدہ انگریزی ہے یا کم از کم تھی۔ مگر بڑھتی ہوئی معرفت کی وجہ سے ہم کو (Muhammad) کہنا چاہیے۔

(A Modern Approach to Islam. 27)

مطلب یہ ہے کہ انگریزی زبان کے اپنے لب و لہجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو "مہومت" بہت عمدہ تلفظ ہے مگر نام کی جو اصل ہے اس کا لحاظ کیا جائے تو صحیح ترین تلفظ صرف "محمد" قرار پائے گا نہ کہ کچھ اور!

فیضی صاحب کے لبرل اسلام کا معاملہ بھی ٹھیک اسی نوعیت کا ہے۔ محمد کے تلفظ کے لیے انھوں نے انگریز خاتون کے جس طریقہ کو قابل تنقید سمجھا ہے اسلام کی تشریح و تعبیر کے لیے ٹھیک اسی طریقہ پر اعتماد کر لیا ہے۔ ان کی پوری کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کے مطالعہ کے لیے ایک ایسے طریقہ کو اختیار فرمایا ہے جو کسی اور پہلو سے خواہ صحیح ہو مگر اسلام کے مطالعہ کے لیے صحیح نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے عجیب و غریب نتائج تک پہونچے ہیں جن کا

اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ان کے طریق مطالعہ کی غلطی کیا ہے، یہ ہم کو خود انھیں کے الفاظ میں مل جاتی ہے، اپنی کتاب کی نوعیت بتاتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:-

It is an endeavour to apply 20 century legal and historical Principles to the understanding of the fundemental Problem in eslam, and to Propose a tenative method for a modern critique of the sharia P. 58

یعنی یہ اسلام کے بنیادی مسئلہ کو سمجھنے کے لیے بیسویں صدی کے قانونی اور تاریخی اصولوں کو استعمال کرنے کی ایک کوشش ہے اور شریعت کے تنقیدی جائزہ کے لیے ایک تجربی اور آزمائشی طریقہ کو تجویز کرنا ہے۔ اسی بات کو دوسری جگہ انھوں نے ان الفاظ میں کہا ہے —— "مذہب اور قانون کی تشریح بیسویں صدی کے فکر کی اصطلاحات میں کرنا" (۸۸)۔ اب ظاہر ہے کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے جب ایسے اصول اور طریقے اختیار کیے جائیں جو اسلام سے باہر دوسرے نظریات کے تحت بنائے گئے ہوں تو ایسے مطالعہ سے حاصل شدہ نتائج پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے یورپ میں کوئی عربی زبان کی ڈکشنری چھپے جس میں اللہ کے معنی عقل اور رسول کے معنی شاعر لکھے ہوئے ہوں۔ اب اگر کوئی شخص اس ڈکشنری کو لے کر اس کی روشنی میں قرآن کا مطالعہ کرے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ نور السموات والارض کے معنی ہیں "عقل زمین و آسمان کی روشنی ہے"۔ اور وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل کا مطلب ہو کہ "محمد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ ایک شاعر ہیں جیسے دنیا میں اور بہت سے شاعر ہوتے ہیں"۔ اس شخص کا دعویٰ مذکورہ ڈکشنری کے لحاظ سے صحیح ہو سکتا ہے مگر کیا وہ اصل عربی زبان کی رو سے بھی صحیح ہے؟ یہی حال فیضی صاحب کا ہے۔ انھوں نے جدید تاریخی، مذہبی اور سماجی اصولوں کی روشنی میں اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ اصول اولاً تو خود قابل چیلنج ہیں دوسرے بالفرض

اگر وہ صحیح ہوں جب بھی ان سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی روشنی میں جو مطالعہ کیا گیا ہو اس کو صحیح مطالعہ قرار دیا جائے اور اس سے حاصل شدہ نتائج کو صحیح سمجھا جائے۔

فیضی صاحب کی غلطی کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ انھوں نے اسلام کے مطالعہ کے لیے، اس تصور مذہب کو صحیح فرض کر لیا ہے جو یورپ کے علمائے سماجیات نے وضع کیا ہو اور جس کے مطابق مذہب کے مطالعہ کا طریقہ بالکل بدل دیا گیا ہے، موجودہ زمانہ میں سائنسی طریقہ مطالعہ نے جو بلند مقام حاصل کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اسی کو معیاری طریقہ سمجھا جانے لگا ہے اور ہر مسئلہ کے بارے میں اہل علم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کو سائنسی طریق مطالعہ کے ڈھانچہ میں لایا جائے، اس کوشش نے مذہب کے مطالعہ کا ایک نیا انداز پیدا کیا ہے۔ اس انداز مطالعہ سے دور جدید کے علماء کو یہ تسکین مل گئی کہ مذہب کو بھی سائنسی طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر اس کوشش نے مذہب کے حلیہ کو اسی طرح بگاڑ دیا جیسے لوہے کے کارخانے میں لوہے ڈھالنے کا جو اصول ہوتا ہے اس کو انسان کی تربیت اور تہذیب کے لیے استعمال کیا جائے۔

مذہبی مطالعہ کے اس نئے طریقہ کی وضاحت کے لیے میں یہاں جولین ہکسلے کا ایک پیراگراف نقل کروں گا۔

> مذہب کا مطالعہ دوسرے تمام موضوعات کی طرح ایک معروضی مسئلہ (objective Problem) کے طور پر کیا جا سکتا ہے اور سائنسی طریقہ سے اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ پہلا کام یہ ہے کہ ان عقائد و اعمال کی ایک فہرست تیار کی جائے جو مختلف مذاہب سے وابستہ رہے ہیں۔ دیوتا اور بھوت پریت، قربانی، پوجا، دوسری زندگی پر اعتقاد، محرمات اور موجودہ زندگی کے لیے اخلاقی ضوابط۔ مگر یہ صرف پہلا مرحلہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جانوروں اور پودوں کی اقسام جمع کرنا۔ سائنسی مطالعہ ہمیشہ اسی ڈھنگ سے شروع ہوتا ہے مگر وہ یہیں رکتا نہیں، وہ ناگزیر طور پر زیادہ گہرائی میں جانا چاہتا ہے اور جمع شدہ معلومات کا تجزیہ (ANALYSIS) کرنا چاہتا ہے۔"
>
> Man in the Modern world P. 129

اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کے نام سے جو کچھ بھی دنیا میں کبھی پایا گیا ہے یا آج پایا جاتا ہے

ان سب کو جمع کیا جائے اور پھر ان میں ترتیب قائم کر کے سمجھا جائے کہ مذہب کیا ہے اور کیسے کیسے اس کے اندر تبدیلی اور ارتقاء ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح کسی خاص قوم کے مذہب کو سمجھنا ہو تو اس قوم کے تمام مذہبی مظاہر کا مطالعہ کر کے متعین کیا جائے گا کہ وہ کیا چیز ہے جس کو ہم اس قوم کا مذہب کہہ سکیں۔ اس طریق مطالعہ کے خانہ میں مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک سماجی عمل بن جاتا ہے نہ کہ کوئی الہامی حقیقت جو سماجی عمل سے ماوراء اپنا وجود رکھتی ہو جس کے مطابق سماج کی صورت گری کی جائے اور جس کی روشنی میں سماج کے عمل کو جانچ کر طے کیا جائے کہ کیا چیز مذہب ہے اور کیا چیز مذہب نہیں ہے۔

معروضی مسئلہ کے طور پر مذہب کے مطالعہ کا یہ طریقہ کیونکر پیدا ہوا، اس کا جواب ہم کو نفسیات کے اسی سے ملتے جلتے کیس میں ملتا ہے۔ یہاں میں وکٹوریہ یونیورسٹی ولنگٹن (نیوزی لینڈ) میں نفسیات کے سینیر لکچرر سی، جے، اڈکاک (C. J. ADCOCK) کا ایک پیراگراف نقل کروں گا۔

> "عمومی تصور یہ ہو کہ علم نفسیات دماغ کے مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ لفظ (PSYCHOLOGY) کے اشتقاق سے ہم آہنگ ہے جس کی اصل یونانی ہے اور جس کے معنی یونانی زبان میں دماغ یا روح کے ہوتے ہیں۔ آکسفرڈ ڈکشنری میں اس لفظ کی جو تعریف دی گئی ہے وہ بھی بنیادی طور پر یہی ہے۔ مگر خود علمائے نفسیات دماغ کی نوعیت کے بارے میں کسی مفروضہ (ASSUMPTION) سے بچنا پسند کرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ لوگ انسانی روش (Behavior) کی اصطلاح میں نفسیات کی تعریف کرنا پسند کریں گے، روش ایک خارجی (objective) اور قابل مشاہدہ (observable) چیز ہے۔ دماغ ایک مفروضہ (Assumption) ہے اور اگر بالفرض وہ ایک صحیح مفروضہ ہو جب بھی وہ ہمارے نفسیاتی مطالعہ کے لیے کوئی اولین شے (Primary objective) نہیں ہے۔"
>
> Fundamentals of Psychology, P. 11

"انسان" کا قدیم تصور یہ تھا کہ وہ ایک دماغ رکھتا ہے اور اس کے سارے افعال

دماغ ہی کے واسطے سے سرزد ہوتے ہیں، مگر دماغ چونکہ مادی اصطلاحوں کے تحت سمجھ میں نہیں آتا اس لیے جدید مادیت پسندی نے یہ صورت اختیار کی کہ انسان کے مطالعہ کے لیے "دماغ" کے تصور کو الگ کرکے محض انسان کے ظاہری اعمال کا مطالعہ شروع کردیا، اگرچہ یہ ایسی ہی بات تھی جیسے کوئی انجینیر کسی مشین کو سمجھنے کے لیے اس کے انجن کو الگ کرکے صرف ظاہری کارگزاری کو دیکھ لینا کافی قرار دے۔ مگر انسانی تاریخ کی یہ ٹریجڈی ہے کہ انسان کا عمل بہت کم منطق کے تابع ہوتا ہے۔ اس طریق مطالعہ کی یہ خصوصیت کہ اس طرح انسانی زندگی کے ایک غیر مادی عنصر (دماغ) کو ماننے کا جھنجھٹ ختم ہوجاتا ہے۔ جدید علمائے نفسیات کے مادی ذوق کے لیے اس کو اختیار کرنے کے لیے کافی تھی۔

کچھ ایسی ہی صورت مذہب کی بھی ہے، مذہب اپنی اصل کے اعتبار سے خدا کا حکم ہے اور مذہب کا یہی تصور ہزاروں برس سے چلا آرہا ہے مگر "خدا کا حکم" کے عنوان کے تحت مذہب کا مطالعہ کرنے کا مطلب یہ ہوا گویا خدا بھی کوئی وجود ہے اور وہ حکم دیا کرتا ہے اس لیے یہاں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا جس کا نفسیات کے دائرہ میں تجربہ کیا جارہا ہے یعنی مذہب کا مطالعہ خدائی قانون کے بجائے انسانی عمل کے طور پر کیا جانے لگا۔ بالکل ویسے ہی جیسے نفسیات میں دماغ کو الگ کرکے صرف روش اور طرز عمل کے دائرے میں انسان کا مطالعہ کیا جارہا ہے اسی کا نام ہو مذہب کا معروضی مطالعہ ـــــ

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ فیضی صاحب نے اپنی کتاب کے آغاز میں طریق مطالعہ کی جو دو قسمیں کی ہیں اس کا کیا مطلب ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اسلام کے مطالعہ کا ایک طریقہ وہ ہوسکتا ہے جس کو تاریخی طریقہ (Historical Method) کہا جاتا ہے اور دوسرا وہ جس کو اعتقادی طریقہ (Dogmatic Method) کہتے ہیں۔ تاریخی طریق مطالعہ کا مطلب ہے سادہ الفاظ میں اسلام کو اس کی تاریخ سے سمجھنا اور اعتقادی طریق مطالعہ سے مراد ہے اسلام کو اس کے اعتقادات کی روشنی میں سمجھنا۔ فیضی صاحب کا خیال ہے کہ اسلام کے مطالعہ کا صحیح اور علمی طریقہ تاریخی طریقہ ہے۔ اس ترجیح کی وجہ سے انھیں یہ کہنے کی بنیاد مل گئی کہ "اسلام سے کیا مراد ہے" کا جواب کوئی ایک نہیں ہوسکتا ان کے الفاظ میں "اس کا انحصار

اس وقت پر ہے جب وہ پوچھا گیا، اس ملک پر ہے جہاں اس سوال کا جواب دینا ہو اور اس شخص پر ہے جو یہ جواب دے رہا ہو" ظاہر ہے کہ جب اسلام کا ماخذ خود اسلام نہیں بلکہ تاریخ ہو تو جو تاریخ بتلائے گی اسی کو اسلام سمجھا جائیگا۔ چنانچہ فیضی صاحب کے نزدیک اسلامی معاشرہ کی تازہ ترین تعبیر بے پردگی ہے۔ کیوں کہ "اب مسلم سوسائٹی میں پردہ تیزی سے اٹھ رہا ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہاں اسلام کے نام سے جو چیز برآمد کی گئی ہے وہ اسلام نہیں بلکہ ایک غلط طریق مطالعہ کے نتائج ہیں۔ اسلام ایک اصول اور معیار ہے نہ کہ کوئی سماجی عمل۔ اس لیے سماجی عمل کو اسلام کی روشنی میں جانچا جائے گا نہ یہ کہ خود اسلام کا مفہوم سماجی عمل کی روشنی میں متعین کیا جائے، مثال کے طور پر ڈیماکریسی کو سمجھنے کے لیے اگر تاریخی طریق مطالعہ اختیار کیا جائے تو ہر وہ چیز ڈیماکریسی قرار پائے گی جو ڈیماکریسی کا دعویٰ کرنے والی کسی قوم میں پائی جائے۔ جیسے فرانس جو ڈیماکریسی کی جنم بھومی ہے اس کا مطالعہ ہمیں بتائے گا کہ فوجی ڈکٹیٹر شپ بھی ڈیماکریسی ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے کیونکہ فرانس میں بالآخر ڈیماکریسی نے یہی شکل اختیار کی ہے، مگر ظاہر ہے کہ مطالعہ کا یہ طریقہ صحیح نہیں کیونکہ ڈیماکریسی ایک اصول اور معیار کا نام ہے نہ کہ محض کسی سماج کے طرز عمل کا۔ اسی مثال کی روشنی میں اسلام کے کیس کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

مذہبی مطالعہ کے بارے میں اس غلطی کا رشتہ بھی ایک اور غلطی سے بندھا ہوا ہے اور وہ ہے مذہب کے ماخذ کے بارے میں جدید تصور۔ یہاں پھر میں پچھلے کا ایک ٹکڑا نقل کروں گا:۔

> تاریخی طریق مطالعہ کے مطابق یہ واضح ہے کہ مذہب دوسری سماجی سرگرمیوں (SOCIAL ACTIVTIES) کی طرح ارتقاء کرتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کا ارتقاء دو بنیادی قسم کے عوامل سے متعین ہوتا ہے ایک اس کی اپنی جذباتی اور ذہنی تحریک، اس کی اندرونی منطق (INNER LOGIC) ہے۔ دوسری قسم کا عامل ہے اپنے زمانے کے مادی اور سماجی حالات کا اثر۔ اول الذکر کی ایک مثال شرک سے توحید کی طرف رجحان ہے۔ خدائی مفروضہ کو مانتے ہوئے یہ رجحان زمانے کے اندر اپنے کو ظاہر کرتا رہا ہے۔ دوسری قسم کے عامل کی مثال کفارہ کی قربانی ہے جو بیرونی دنیا (EXTERNAL NATURE) کے مقابلہ میں اپنے کو بے یار و مددگار

دیکھ کر وجود میں آئی۔ (صفحہ ۱۲۹)

اس نقطۂ نظر کے مطابق مذہب کسی خارجی طاقت کی طرف سے شعوری طور پر القاء کی ہوئی صداقت نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی اپنی ایک چیز ہے جو اس کی اندرونی تلاش اور خارجی عوامل سے مختلف شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ مذہب اگر کوئی الہامی حقیقت نہیں بلکہ محض ایک انسانی تلاش ہے تو اس کے بعد دوامی طور پر اور ہر ایک کے لیے کسی ایک نقطۂ نظر پر اصرار کرنے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی، اس تصور مذہب نے اگر تعدد حقیقت (Maninees of Reality) کا عقیدہ پیدا کیا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں فیضی صاحب کا تصور مذہب بھی یہی ہے۔ انھوں نے اسلام کو ایک تاریخی منظر کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مذہب کی بنیاد عظیم معلمین کے شخصی تجربات پر ہے۔" (۸۹) ان کے نزدیک "مذہب کی بنیاد روحانی تجربہ ہے۔" (۸۷) انھوں نے اپنے کو غیر مقلد مسلمان کہا ہے (۹۱) جو ان کے الفاظ میں "مذہب میں اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق اعتقاد رکھتا ہے نہ کہ روایتی تصورات کے مطابق۔ ان کے نزدیک مذہب کا آغاز توحید سے نہیں ہوا بلکہ پانچ ہزار برس کی لمبی دکھ بھری تلاش کے بعد انسان توحید کی عظیم دریافت تک پہونچا ہے (۹۲) مذہب کو وہ شاعرانہ صداقت سمجھتے ہیں نہ کہ حقیقی صداقت (۱۰۱) ان کا کہنا ہے کہ "ہمیں قرآن کو ایک ایسی کتاب نہیں بنا دینا چاہیئے جس نے خدا کے کلام کو بس ایک کتاب میں بند کر دیا ہو۔" (۱۰۰) انھوں نے پروفیسر ہمایوں کبیر کا یہ جملہ اپنی تائید میں نقل کیا ہے "اب ہمارے عقیدے کو الہام یا کسی پر اسرار ذریعہ پر مبنی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو شخصی حدود سے پار کر جانا چاہیے۔" انھوں نے جواہر لال نہرو کا یہ خیال بھی نقل کیا ہے کہ "مذہب نے جن باتوں کی تعلیم دی ہے وہ اچھی ہو سکتی ہیں۔ مگر جب یہ دعویٰ کیا جائے کہ آخری بات کہی جا چکی ہے تو سوسائٹی جمود میں مبتلا ہو جاتی ہے۔" (۱۰۷) ان کے الفاظ میں "محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے عظیم معلمین کی طرح تھے، نہ ان سے بڑے اور نہ ان سے چھوٹے" (۱۱۰) انھوں نے اپنے عقیدے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:-

"اپنشد، بدھا، موسیٰ اور عیسیٰ کی تعلیمات مجھے گہرے طور پر متاثر کرتی ہیں، میں

تمام مذہبوں اور تمام عقائد کا احترام کرتا ہوں، میں اسلام کے بڑے بڑے علماء کی عزت کرتا ہوں مگر ان کا اندھا مقلد نہیں ہوں۔ میرا عقیدہ میرا اپنا ہے، ایک ایسا عقیدہ جو زندگی کے بارے میں میرے اپنے نقطۂ نظر، میرا اپنا فلسفہ، میرا اپنا تجربہ، میرے اپنے وجدان کے تحت بنا ہے۔ میں ہر مسلمان بلکہ درحقیقت ہر انسان کو یہ حق دیتا ہوں کہ وہ اپنا عقیدہ بنائے۔ لکم دینکم ولی دین۔ میں یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ قرآن خدا کا ایک پیغام ہے۔ یہ خدا کی آواز ہے جس کو محمد نے سنا، محمد نے اس کو محمد کے الفاظ میں اور محمد کی تقریروں میں، عربی زبان میں ہمیں دیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر دور میں ان الفاظ کی نئی تشریح کی جائیگی اور انھیں از سر نو سمجھا جائیگا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس پیغام کو اپنے آپ کے لیے سمجھے۔ میں اسلام کے عظیم علماء اور مفسرین کی قدر کرتا ہوں مگر ادب کے ساتھ ان سے اختلاف کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں، اگر میں ان کے عقائد کو پوری طرح قبول نہ کر سکوں کیونکہ عقیدہ درحقیقت ایک شخص کے ذاتی ضمیر کا معاملہ ہے۔ میں اپنا ضمیر دوسروں کے قبضہ میں نہیں دے سکتا۔ ہر دور کے اہل علم کا فرض ہے کہ وہ اپنے دور کے لحاظ سے اسلام کی تشریح کریں۔"

اب اگر فیضی صاحب یہ کہتے ہیں کہ "قرآن کی تشریح اس کے تاریخی ماحول کے اندر ہونی چاہیئے" تو اپنے تصور مذہب کے اعتبار سے بالکل صحیح کہتے ہیں۔ کیونکہ مذہب جب تاریخی حالات کی پیداوار ہے تو ہر دور کے جو حالات ہوں گے اسی کے مطابق مذہب بھی بنے گا۔ یہ تصور مذہب لازمی طور پر چاہتا ہے کہ ہر دور کا مذہب الگ ہو کیونکہ ہر دور کے تاریخی حالات الگ ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق مذہب کا کوئی ایسا معیار نہیں ہے جو ماورائے انسانیت ہو، ہر شخص کا اپنا تجربہ اور ہر دور کے حالات ہی مذہب گر ہیں۔ اس لیے ہر شخص اور ہر سماج کو بطور خود یہ طے کرنا ہے کہ وہ کس قسم کے مذہب کو اختیار کرے، گویا مذہب کی حیثیت جوتے اور لباس کی سی ہے جو ذوق یا جغرافیہ اور تمدنی حالات کے اعتبار سے کوئی شکل اختیار کرتا ہے اور بدلتا رہتا ہے۔

اس انقلابی نقطۂ نظر کی بنیاد وہ جدید تصور مذہب ہے جسکو ہم نے اوپر بیان کیا۔ اگر اس تصور مذہب کو مان لیا جائے تو بلاشبہ یہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ تصور مذہب

کیا کوئی ثابت شدہ چیز ہے۔ اس تصور مذہب کو صحیح ماننے کی آخر بنیاد کیا ہے، اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) یا تو قرآن نے اس تصور مذہب کی تصدیق کی ہو (۲) یا عقلی بحث کے ذریعہ اس کا واقعہ ہونا ثابت ہوتا ہو۔ جہاں تک فیضی صاحب کی زیر تبصرہ کتاب کا تعلق ہے پورے اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جو قرائن پیش کیے ہیں اُن سے ہرگز اس کی صداقت اور واقعیت ثابت نہیں ہوتی۔ نقلی دلائل میں مثال کے طور پر قرآن کی یہ آیت پیش کی گئی ہے۔ لکم دینکم ولی دین اور اس کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن ہر ایک کے لیے اس کے دین کو تسلیم کرتا ہے، جو شخص چاہے اپنے تجربات اور حالات کے لحاظ سے اپنا ایک دین بنائے۔ مگر اس آیت کا اس قسم کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں۔

آیت کو پوری سورہ میں رکھ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرے ادیان کی تصدیق کا نہیں بلکہ ان سے بیزاری اور وعید کا کلمہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تبلیغ کی ساری کوششوں کے باوجود جب تم نے میری بات نہیں مانی تو اب جاؤ اپنے بیہودہ دین پر پڑے رہو عنقریب تمھاری روش کا برا انجام تمھیں مل جائے گا۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو بہرحال اسی دین پر قائم رہیں گے جو اللہ نے اپنے فضل سے ہمیں مرحمت فرمایا ہے۔

جہاں تک عقلی دلائل کا سوال ہے بلاشبہ مغرب کے علمائے سماجیات نے اس پر سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں مگر وہ ساری کتابیں غیر متعلق دلائل کا انبار ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسی کوئی ایک دلیل بھی اب تک پیش کی گئی ہے جس سے ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہو کہ ہم قدیم تصور مذہب کو چھوڑ کر جدید تصور مذہب پر ایمان لائیں اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو وہ تمام دعاوی بے بنیاد رہیں گے جن میں فیضی صاحب نے اسلام کو قابل تبدیلی قرار دیا ہے۔ فیضی صاحب نے اپنی کتاب کے آغاز میں لکھا ہے "بنام خدا و خرد"۔ یہ نئے تصور مذہب کی بسم اللہ ہے، یہ جملہ درحقیقت "بنام خدا و رسول" کے بالمقابل بولا گیا ہے، یعنی ایک خدا وہ ہے جو رسول کی معرفت سے ملتا ہے اور ایک خدا وہ ہے جو انسانی عقل کے ذریعہ دریافت ہوتا ہے۔ اس دوسرے تصور مذہب میں رسول کی حیثیت بھی انھیں صاحبان خرد میں سے ہے جنھوں نے اپنی عقل سے خدا کی صحیح یا غلط معرفت حاصل کی تھی لیکن

اس تصورِ مذہب کا اگر مزید گہرائی کے ساتھ جائزہ لیں تو اس میں "خدا" کا نام بھی اس مفہوم میں نہیں ہے جس مفہوم میں کہ یہ لفظ حقیقی مذہب میں بولا جاتا ہے، —
مذہب خود کا خدا در حقیقت ایک مجہول اور ہنوز غیر دریافت شدہ سچائی کا ایک رمز (SYMBOL) ہے، وہ کوئی معلوم حقیقت نہیں، بلکہ نامعلوم حقیقت کا ایک نشان ہے۔
اس کتاب میں فیضی صاحب کا موضوع جدید تصورِ مذہب پر کوئی فکری بحث نہیں ہے، تاہم انھوں نے بعض ایسے قرائن پیش کیے ہیں جو ان کے نقطۂ نظر سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مذہب ایک تغیر پذیر حقیقت ہے اور جب وہ تغیر پذیر ہے تو اس سے آپ سے آپ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ ایک انسانی چیز ہو۔ کیونکہ اگر وہ حقیقی معنوں میں کوئی خدائی چیز ہوتی تو اس میں تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آتی۔
موصوف نے لکھا ہے کہ اسلام کو جدید دنیا کی سائنس، فلسفہ، نفسیات، مابعد الطبیعات اور دینیات کے تحت (in accadance with) سمجھنے کی ضرورت ہے وہ لکھتے ہیں:-

"قدیم مذہبی کتاب یا حدیث میں جہاں کہیں مظاہر فطرت یا سائنسی حقائق پر کلام کیا گیا ہو اس کو مقدس نہ قرار دینا چاہئے بلکہ علمی تنقید کے لیے کھلا رہنا چاہیے اور پھر جدید سائنس کی روشنی میں یا تو انھیں قبول کیا جائے یا ان کی اصلاح کی جائے، یا انھیں رد کر دیا جائے.......................... اس میں علم الانسان، حیاتیات، طبیعیات، ریاضیات، کیمیا، علم الادویہ سب شامل ہیں۔ عالم کا تصور اور وقت اور کائنات کا تصور جو کوپرنیکس کے زمانے میں تھا وہ اب انقلابی طور پر بدل گیا ہو۔ اسلام کو ان تبدیلیوں کا لحاظ کرنا ہوگا اور مذہب کے نقشہ سے سائنسی عدم مطابقت ختم کر دینی پڑے گی، مثال کے طور پر مسیح کی بے باپ کی پیدائش میں زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ یہی معاملہ قرآن میں جنت و دوزخ کی تشریحات کا ہے۔ ان چیزوں کی لفظی صداقت پر اصرار نہیں کرنا چاہیے، ان کی شاعرانہ صداقت زیادہ حقیقی اور اہم ہے۔ روزہ کے فائدے اور روحانی برکتیں اس کے تنگ اور سخت مسائل پر اصرار

کیے بغیر بتانا چاہیے، مشرقی عرب کے پورے علاقہ میں یہ حال ہے کہ رمضان کے مہینے کی راتوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ جشن، ملاقات، موسیقی اور رقص کے پروگراموں میں شرکت، وقت اور پیسے کے ضیاع کے لیے خاص ہے۔ بلاشبہ مذہبی اعمال میں لچک کا طریقہ اختیار کرنا اسلام کی روح سے زیادہ مطابق ہوگا" (۱۰۲-۱۰۱)

اس مثال میں چند باتیں پیش کی گئی ہیں۔ مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی علمی دلیل کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ کوپرنیکس کے زمانے کی طبیعیات اب بہت کچھ بدل گئی ہیں۔ مگر اس واقعہ کا اصل مسئلہ سے کیا تعلق۔ کیا قرآن نے کوپرنیکس کے زمانہ کے نظریات کی تائید و تصدیق کی ہے؟۔ اسلام کوپرنیکس یا اس سے پہلے اور بعد کے کسی عالم کا وکیل نہیں بلکہ قرآن کا وکیل ہے اور جب تک قرآن میں کوئی ایسی مثال نہ بتائی جائے جو جدید تحقیق میں غلط ثابت ہوگئی ہو اس وقت تک یہ دعویٰ بدستور باقی رہے گا کہ قرآن ایک غیر تغیر پذیر کتاب ہے۔ دوسری مثال حضرت مسیح کی بے باپ کی پیدائش ہے، بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ سائنس نے ابھی تک کوئی ایسا قانون دریافت نہیں کیا ہے جس سے باپ کے بالواسطہ یا براہ راست تعلق کے بغیر کوئی بچہ پیدا ہو سکے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ٹھیک اسی کے مقابل دوسری حقیقت یہ ہے کہ سائنس نے ایسا کوئی مخالف قانون بھی دریافت نہیں کیا ہے جس کے معنی یہ ہوں کہ کوئی انسان باپ سے تعلق رکھے بغیر نہیں پیدا ہو سکتا ہو اسلیے کم از کم ابتک باپ کے بغیر پیدا ہونا یا باپ کے بغیر پیدا نہ ہونا دونوں سائنسی طور پر یکساں حیثیت رکھتی ہیں ان میں سے ایک کو رد کرنے اور دوسری کو قبول کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔ نیز اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ کم از کم پہلی زندگی کے بارے میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ وہ باپ کے بغیر وجود میں آئی تو حضرت مسیح کی پیدائش محض ایک نظری امکان کا معاملہ نہیں رہتا بلکہ ایک ایسا واقعہ بن جاتا ہے جس کے لیے کائنات میں نظیر موجود ہے۔

تیسری چیز جنت دوزخ کا معاملہ ہے، مگر یہ اور زیادہ کمزور بات ہے کیونکہ آدمی نے ابھی تک نہ کائنات کی ساری حقیقت کو جانا ہے اور نہ اسکی تمام پہنائی کو، اسلیے کم از کم فلکیات کی زبان میں اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ واقعہ کہ ایک

مکمل کائنات اپنی پوری رعنائیوں اور انتظامات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے یہی یہ قیاس کرنے کے لیے کافی ہے کہ دوسرا نظام عالم بھی وجود میں آسکتا ہے، چوتھی بات روزہ سے متعلق ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ علمی بحث میں اس طرح کی بات پیش کرنے کے بھی کوئی معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ مشرقی عرب میں اگر رمضان کی راتوں میں وقت اور پیسے کا ضیاع کیا جاتا ہے تو اسلام سے کیا تعلق ہے کیونکہ اسلام تو قوموا لیلھا وصوموا نھارھا کا حکم دیتا ہے نہ یہ کہ دن کو روزہ رکھو اور رات کو جشن مناؤ۔

معلوم ہوا کہ ایسا کوئی نقلی یا عقلی قرینہ نہیں ہو جو یہ ظاہر کرتا ہو کہ مذہب ایک انسانی ساخت اور ہر انسانی چیز کی طرح وہ بھی تغیر پذیر ہے۔ اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اسلام پر نظر ثانی کا دعویٰ بھی علمی طور پر صحیح نہیں ہو سکتا۔

مذہب کی اصل بنیاد میں تو فیضی صاحب کو کوئی مضبوط دلیل یہ ثابت کرنے کے لیے نہیں ملی کہ وہ قابل تغیر ہے، البتہ اس کے قانونی ڈھانچہ کے بارے میں انھوں نے کچھ دلائل کا بار بار اعادہ کیا ہے، ان کا خیال ہو کہ مذہب اعتقادی پہلو سے تو کسی معنیٰ میں دوامی ہو سکتا ہے مگر اس کے قوانین اور عملی ڈھانچہ صرف وقت کے سماجی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں اس لیے کم از کم مذہب کا قانون لازمی طور پر تغیر پذیر ہے کیوں کہ وہ انسانی سماج ہمیشہ بدلتا رہتا ہے جس کے لیے قانون بنایا گیا ہے

مصنف محترم فرماتے ہیں ـــ "اسلام میں قانون کا معیاری تصور یہ ہے کہ وہ ایک حکم ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، فقہ کی عبارت انھیں الہٰی الفاظ پر قائم ہوتی ہے۔ اس طرح قانون کا ماخذ اور اس کا آخری [illegible] الگ ہو جاتے ہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون عملاً تو نافذ ہوتا ہے [illegible] زندگی پر مگر انسان اپنی زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر خود قانون بنانے کا حق نہیں رکھتا۔ مگر یہ کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ تو صرف قانون کا نہیں بلکہ ساری زندگی کا معاملہ ہے، غذا اور آکسیجن اور حرارت اور اس طرح کی بے شمار چیزیں جن کا تعلق ہماری زندگی سے ہے کیا ان کا قانون ہم نے خود وضع کیا ہے؟ عالم فطرت میں ہمارا طریقہ یہ ہے کہ مقررہ قوانین کو دریافت کر کے ہم ان کو

اپنے اوپر چپاں کرتے ہیں پھر اسی اصول کو اگر مذہب اخلاقی زندگی میں اختیار کرنے کا مدعی ہو تو کس بنا پر اس کو غیر علمی کہا جائے گا۔

مصنف فرماتے ہیں "قانون کی بنیاد اجتماع کی خواہش ہے جو اس کی مقننہ کے ذریعہ ظاہر ہوئی ہو، یا کسی ایسے حاکم کے ذریعہ ظاہر ہوئی ہو جو قانون سازی کا مجاز ہے"۔ (۸۶) اس لیے ان کا کہنا ہے کہ اسلام کے اصول قانون اور قانونی احکام کا مطالعہ سماجی حالات کے ذیل میں کیا جانا چاہیے۔ (۵۴) مگر اس دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ قانون کی بنیاد اجتماع کی خواہش ہونا جدید علمائے قانون کے ایک طبقہ کا نظریہ ہے، وہ کوئی سائنسی دریافت نہیں ہے جس کے بارے میں دو رائے ممکن نہ ہو۔ چنانچہ علمائے قانون کے متعدد اسکول ہیں اور ہر ایک قانون کی تعریف الگ الگ کرتا ہے، مثال کے طور پر ٹھیک اس وقت جبکہ فیضی صاحب قانون کی یہ تعریف کر رہے ہیں کمیونسٹ ملکوں میں قانون کی بالکل دوسری تعریف کی جاتی ہے اور خود سرمایہ دارانہ ممالک میں قانون کی تعریف کے بارے میں علماء کے درمیان سخت اختلافات ہیں۔ ایسی حالت میں ایک اور تعریف کے امکان سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔

فیضی صاحب کا کہنا ہے کہ عقیدہ اور شرعی قانون — دونوں کو یکساں حیثیت نہیں دی جا سکتی "ایک قانونی حکم جو بذریعہ ریاست نافذ کیا جا سکتا ہے اور ایمان: ضمیر جو تمام تر ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے، دونوں کے درمیان کھلا ہوا فرق ہے"۔ (۸۶) یہ فرق بجائے خود صحیح ہے مگر اس فرق سے جب وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ عقیدہ کو دوامی مان کر شریعت کو قابل تغیر چیز قرار دیا جائے تو وہ ایک غیر منطقی رویہ کا مظاہرہ کرتے ہیں کیونکہ یہاں مقدمہ اور نتیجہ میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس فرق کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ ریاست جس طرح قانون کے معاملہ میں جبر کر سکتی ہے عقیدے کے بارے میں نہیں کر سکتی۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ایک دوامی ہے اور ایک تغیر پذیر۔ اس قسم کا فرق اسلام ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ ہر قانونی نظام میں پایا جاتا ہے مثلاً ملک کے جھنڈے کو قابل تعظیم سمجھنا ایک قلبی معاملہ ہے، اس کا نہ تو کسی ریاست کو علم

ہو سکتا اور نہ اس کے بارے میں وہ کوئی کارروائی کر سکتی ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ریاست ایسے قوانین بھی نہیں بنا سکتی جن میں شہریوں کے لیے خارجی طور پر ملک کے مفاد کے خلاف کام کرنے کو جرم قرار دیا گیا ہو۔

ایک دلیل یہ دی گئی ہے کہ قانون ایک ترقی پذیر حقیقت ہے، مگر شریعت اپنی سابق شکل میں ایک جامد چیز ہے اس لیے وہ ہر دور کا قانون نہیں بن سکتی، مگر یہ بھی کوئی دلیل نہیں ہے اگر واقعہ یہ ہوتا کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق انسان سے ہے وہ سب کی سب تغیر پذیر ہوتیں تو اس دعوے میں کچھ وزن ہو سکتا تھا مگر صورت حال یہ نہیں ہے۔ سائنس نے جو دنیا دریافت کی ہے وہ سب کی سب جامد ہے یعنی ایک ہی متقرر شکل میں اربوں برس سے چلی آرہی ہے اس کے باوجود ہر دور کے انسانوں کے لیے وہ یکساں طور پر مفید ہے، اس لیے کم از کم سائنسی طور پر اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے کہ اخلاقی قوانین کو ہم لازماً تغیر پذیر سمجھیں، دوسرے یہ کہ فیضی صاحب یا اور کسی بزرگ نے اب تک ایسی کوئی دلیل نہیں دی ہے جس سے واقعاتی طور پر ثابت ہوتا ہو کہ جدید سماج میں قدیم قوانین نے اپنی معنویت کھو دی ہے۔

وقت کی صورت حال سے عدم مناسبت کی ایک مثال فیضی صاحب کے نزدیک یہ ہے کہ اسلام نے مردوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو مار سکتے ہیں، حالانکہ "بیسویں صدی میں مشکل ہی سے کوئی عدالت اس طرح کی جسمانی سزا کو حق بجانب قرار دے سکتی ہے" مگر افسوس کہ اس مثال سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ مارنے کی اجازت انتہائی مستثنیٰ حالات کے لیے ہے جبکہ اصلاح کا کوئی اور طریقہ کارگر نہ ہو رہا ہو اور حیاتیات یا سماجیات نے ابھی تک کوئی ایسی متعین حقیقت دریافت نہیں کی ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ مخصوص حالات میں اصلاح کی غرض سے مرد اپنی بیوی کو سرزنش نہیں کر سکتا ــــ یہ کسی خاص تہذیب کا ایک ذوق ہو سکتا ہے۔ مگر حیاتیات یا سماجیات کی دریافت کردہ کوئی ناقابل انکار حقیقت نہیں اور ہمیں دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔ حیاتیاتی تحقیق اور سماجی اداروں کی عملی تنظیم نے قطعی طور پر ثابت کیا ہے کہ مرد عقلی طور پر عورت کے اوپر تفوق رکھتا ہے اور مزاجی طور پر بھی نظرۃً زیادہ اہل ہے کہ صحیح فیصلہ کر سکے، پھر بعض انتہائی مستثنیٰ حالتوں میں اگر اسکو

سرزنش اور جبری اصلاح کا حق دیا گیا ہو تو اس میں عملی طور پر کس طرح کوئی اعتراض کیا جا سکتا ہو حقیقت یہ ہو کہ مرد اور عورت کے درمیان جزوی طور پر یہی نسبت خاندانی سطح پر ہو جو ساری دنیا کا قانون ریاست اور شہری کے درمیان سماجی سطح پر تسلیم کرتا ہے۔

اس سلسلے کی آخری مثال عملی صورت حال سے متعلق ہے مصنف فرماتے ہیں "مذہبی قانون کے عمر رفتہ تصورات جدید تمدنی قانون سے ٹکرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بیمہ یا وہ قرضے جو حکومت جاری کرتی ہے۔ بیمہ اور سود کا لینا یا دینا شریعت کے اعتبار سے ممنوع ہے جبکہ جدید ریاست میں صرف اسکی اجازت ہو بلکہ وہ اسکی حوصلہ افزائی کرتی ہو" (۸۸) اس مثال سے صرف یہ ثابت ہوتا ہو کہ آج عملی طور پر جو قانون رائج ہو وہ سود کو جائز کیے ہوئے ہو۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اگر اسلامی قانون کا نفاذ ہوا تو اس کو بھی سود کو جائز کرنا پڑے گا آخر موجودہ دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اشتراکی نظام بالفعل موجود ہے جہاں سود کا لین دین اسی طرح ممنوع ہے جیسے اسلامی نظام میں ہوتا ہے۔ یہ بات ایسی ہی ہے جیسے انگلینڈ میں نیشنلائزیشن کے خلاف یہ دلیل دی جائے کہ وقت کا قانون انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے اس لیے نیشنلائزیشن غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی دلیل سے جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ صرف قانونی عدم رواج ہو نہ کہ اس کی نظریاتی غلطی! —— اگر انگلینڈ میں کمیونسٹ برسر اقتدار آجائیں تو وہاں نیشنلائزیشن کا اصول اسی طرح رائج ہو جائے گا جیسے آج انفرادی ملکیت کا اصول رائج ہے۔ اسی طرح مصنف نے جو مثال دی ہے اس سے اسلامی قانون کی نظریاتی خامی ثابت نہیں ہوتی، اور اصل مسئلہ نظریاتی خامی ثابت کرنے کا ہے نہ کہ عملی طور پر نافذ شدہ ہونے یا نہ ہونے کا۔

پھر مصنف اسلامی ممالک کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "تمام اسلامی ملکوں میں دنیوی قانون شریعت کے قانون کو ختم کر رہا ہے"۔ (۸۸) مگر جیسا کہ ہم کہہ چکے ایک مسلم ملک کے کسی طرز عمل سے اسلام کے بارے میں کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ اگر ہندوستان کے عوام تشدد، بدنظمی یا بدعنوانی کریں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہندوستان کا دستور غلط ہو۔ مسلم ممالک کا طرز عمل ایک علیحدہ چیز ہے اور اسلام ایک علیحدہ چیز۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ملا کر کوئی نتیجہ نکالنا علمی طور پر صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی طرح ایک اور مثال ہمیں موصوف کے ان الفاظ میں ملتی ہے :-

"اسلام کے مطابق خدا ہر چیز کا مالک ہے، وہی کسی ریاست کا حقیقی حکمراں ہے۔ اسی طرح کا ایک نظریہ جدید دنیا میں ناقابل عمل ہے، اور واحد قابل عمل نظریہ صرف وہ ہے جو بے شمار جدید جمہوری دستوروں میں دیا گیا ہے، یعنی یہ کہ کسی ملک کے جو شہری ہیں وہی اس علاقہ کے حکمراں ہیں"

میں نہیں سمجھ سکا کہ اس مسئلہ کا جدید و قدیم سے کیا تعلق! — بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ بہت سی جدید ریاستوں کے دستور میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ملک کے شہری اس ملک کے حقیقی حکمراں ہیں۔ لیکن یہ تو صرف ایک علمی بات ہے ورنہ ملک میں اگر اسلام کی حکمرانی قائم ہو جائے تو دستور میں یہ لکھا جا سکتا ہے کہ اس ملک کا حقیقی حکمراں اللہ تعالیٰ ہے، اور اس اصول کو مانتے ہوئے ریاست کے نظام میں کسی قسم کا اختلال نہیں پیدا ہوگا، آخر آج بھی دنیا کے بڑے حصہ میں ایسی ریاستیں قائم ہیں جو ملک کے شہریوں کے لیے اقتدار کا حق تسلیم نہیں کرتیں، بلکہ ان کے نزدیک اقتدار کا سارا حق ملک کی "مزدور پارٹی" کو ہے۔ پھر اگر ان ملکوں میں جدید و قدیم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تو اسلام میں کیوں پیدا ہو جائے گا۔ مصنف کے استدلال کی سب سے زیادہ دلچسپ مثال یہ ہے:۔

"میں قرآن کو سمجھنا چاہتا ہوں مگر صرف اس کی تعبیر نو کے لیے اور اس پر اس حد تک عقیدہ رکھنے کے لیے جس حد تک وہ بیسویں صدی کے انسان کی حیثیت سے مجھے اپیل کرتا ہے۔ مجھ سے صحرا میں رہنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، اور یہ کہ میں اونٹ پر سواری کروں اور کیڑے مکوڑے کھاؤں، قبائلی لڑائیوں میں شریک ہوں، اور داڑھی رکھوں اور چغہ پہنوں اور ایک دقیانوسی عرب کی ذہنیت اپنے اندر پیدا کروں، مجھے فرق کرنا چاہیے شاعرانہ حقیقت اور حقیقی صداقت میں! — میں فرق کروں گا مذہب کے مغز اور اس کے چھلکے میں۔ قانون میں اور مذہبی افسانہ میں۔ مجھے اسلام کے پیغام کو ایک جدید انسان کے طور پر سمجھنا اور قبول کرنا ہوگا نہ کہ ایک ایسے شخص کی طرح جو صدیوں پہلے رہتا تھا۔"

اس اقتباس میں سات مثالیں دی گئی ہیں جو جدید انسان کے لیے ناقابل عمل ہیں۔

مگر داڑھی کو چھوڑ کر کسی ایک مثال کا تعلق بھی اسلام یا اسلامی تعلیمات سے نہیں ہے، اور داڑھی بھی سنّت ہے نہ کہ فرض، اسلام نے کب اور کہاں کہا ہے کہ لوگ صحرا میں رہیں، اونٹ کی سواری کریں، کیڑے مکوڑے کھائیں، قبائلی لڑائیاں لڑیں، حتیٰ کہ نہیں اور قبائلی عرب کی ذہنیت اپنا اندر پیدا کریں، یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ جدید علماء جو معروضی مطالعہ (objective study) کے دعویدار ہیں وہ عموماً مخالف نقطۂ نظر کی ترجمانی میں سنجیدگی اور دیانتداری سے کام نہیں لیتے۔ حالانکہ مخالف کی غلط ترجمانی کے بعد سارا استدلالی ڈھانچہ غیر یقینی اور ناقابلِ اعتبار رہ جاتا ہے۔

بلاشبہ داڑھی کی تعلیم اسلام نے دی ہے، اور یہ مسلمانوں کا شعار ہے، مگر اس کے لیے مجھے کوئی معذرت نہیں کرنی ہے، کیونکہ زمانہ کی جدت و قدامت کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ آج بھی ہر ملک میں بے شمار انتہائی مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ داڑھی رکھتے ہیں اور ان کا داڑھی رکھنا کسی بھی اعتبار سے ان کے دورِ جدید کا شہری ہونے میں مانع نہیں ہے۔

فیضی صاحب کے یہی دلائل ہیں جن کی بنیاد پر انھوں نے اتنا بڑا بیان دینے کی جرأت کی ہے۔

"یہ نظریہ کہ قانون خدا کا بنایا ہوا ہے (اور اس لیے ناقابلِ تغیر ہے) قانون کی زبان میں صرف ایک قانونی من گھڑت (legal Fiction) ہے جس کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ قانون کی مکمل اطاعت کے لیے اخلاقی فضا پیدا کی جائے، اس طرح ایک قانونی معیار سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، قدیم قومیں جن میں نظم اور سماجی احساس اس حد تک نہیں تھا کہ وہ خود اپنے فائدے کی خاطر قانون کی پیروی کریں۔ اس وقت یہ خوف دلایا گیا کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے پر خدا کا عذاب ہوگا تاکہ لوگ قانون کی پیروی کریں۔" (۳۲)

یہ الفاظ اگر کسی کہانی کے افسانوی کردار کی زبان سے ادا ہوئے ہوتے تو مجھے اس پر تعجب کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر یہ ایک علمی کتاب کا پیراگراف ہے اور اس بنا پر وہ باعث

تعجب ہے، سوال یہ ہے کہ علم و قانون جو ابھی تک حد درجہ ناقص اور اختلافی علم ہے اس کی وہ کون سی ثابت شدہ تحقیق ہے جس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ خدا کو قانون کا ماخذ ماننا اپنی نوعیت میں قانونی من گھڑت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، اور یہ کہ اس کے اندر اگر کوئی قدر ہے تو وہ صرف اخلاقی فضا قائم کرنے کی قدر ہے نہ کہ کوئی حقیقی قدر۔ پھر تاریخ اور سماجیات کا وہ کون سا مطالعہ ہے جس نے جدید اور قدیم کے اس فرق کو ثابت کیا ہے کہ پچھلے لوگ نظم اور سماجی احساس میں بے حد کمزور تھے اس لیے انھیں ڈرانے کے لیے خدائی قانون کا عقیدہ گھڑنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور موجودہ زمانے کے لوگ نظم اور سماجی احساس میں اتنے ترقی یافتہ ہو گئے ہیں کہ قانون کی پیروی کے لیے انھیں اپنے ارادہ سے باہر کسی خوف یا دباؤ کی ضرورت نہیں، اگر نیفی صاحب نے اس سلسلہ میں کچھ حوالے اپنی کتاب میں درج کر دیے ہوتے یا آئندہ درج کر دیں تو وہ ایک زبردست علمی کارنامہ ہوگا۔ کیونکہ جہاں تک مجھے علم ہے علمی دنیا ابھی تک اس طرح کے کسی واقعے سے باخبر نہیں ہے۔

ایک دلیل لسانیات کے حوالے سے دی گئی ہے فرماتے ہیں: "مذہبی صداقت کا علم ہمیں جس ذریعہ سے ہوتا ہے وہ ایک ناقص ذریعہ ہے یعنی زبان۔ زبان ایک انسانی چیز ہے، وہ تغیر پذیر ہے، وہ بدلتی رہتی ہے، کوئی زبان پانچ یا دس ہزار برس سے زیادہ پڑھی اور سمجھی نہیں جا سکتی، ہماری زمین پر ایسی بہت سی انسانی تحریریں موجود ہیں جن کا مطلب لامعلوم ہے۔" (۴۹)

پھر جب زبان ایک تغیر پذیر حقیقت ہے تو اس کے ذریعہ سے جس صداقت کا اعلان ہوا ہے وہ غیر تغیر پذیر کیسے ہو سکتی ہے۔ جس طرح زبان بدلتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح مذہب بھی تبدیلی کو قبول کرتا ہے اور زمانے کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے، یہ دلیل بھی علمی طور پر نہایت ناقص ہے۔ جہاں تک زبان کے عملی طور پر ختم ہونے کا تعلق ہے اس سلسلے کی تمام مثالیں غیر لٹریری زبانوں سے متعلق ہیں۔ ایسی کوئی ایک مثال بھی نہیں ہے کہ ایک زبان لٹریچر کی زبان بننے کے بعد فنا ہو گئی ہو۔ بلاشبہ زبانوں میں فرق تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مگر اس کا تعلق زبانوں کے قابل فہم رہنے یا نہ رہنے سے نہیں ہے۔

ہر زبان کا کلاسیکل لٹریچر ایسی زبان میں ہے جو موجودہ زبان سے مختلف ہے، مگر یہ صرف ایک ادبی فرق ہے اور اس سے کسی زبان کے کلاسیکل لٹریچر کو سمجھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اسی طرح قرآن بھی ادبی اور لسانی اعتبار سے عربی زبان کی ایک کلاسیکل کتاب ہے اور جدید عربی میں اسلوب بیان کے فرق کے باوجود وہ تمام عربی دانوں کے لیے آج بھی اتنا ہی قابل فہم ہے جتنا کبھی پہلے تھا۔

آخری بات یہ کہ اس استدلال کی بنیاد مستقبل کے ایک فرضی امکان پر ہے اور جبکہ ماضی میں اس نوعیت کی کوئی براہ راست نظیر موجود نہیں ہے۔ اس کو کم از کم آج کی حد تک علمی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک اندیشہ یا پیش گوئی ہے نہ کہ علمی دلیل ـــــــ جب ایسا واقعہ رونما ہو چکا ہو گا کہ قرآن کا تعلق انسانی زبانوں سے نہ باقی رہے اور اس کی حیثیت موہن جوداڑو کے کتبات کی سی ہو جائے، اس وقت اس دلیل پر غور کیا جائے گا آج کسی کو حق نہیں ہے کہ اس پیشگی مفروضہ کی بنیاد پر اصرار کرے کہ قرآن کا دائمی صداقت ہونا لسانی مطالعہ کے نتائج سے ٹکراتا ہے اس لیے اس قسم کے عقیدے کو ترک کر دو"۔

فیضی صاحب کے نزدیک جدید دنیا میں اسلام کے زندہ رہنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اس میں عقیدہ اور عمل کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے، عقیدہ دائمی چیز ہو اور عملی ڈھانچہ یا احکام کو زمانی فرض کیا جائے جن میں حالات کے تغیر سے تبدیلی کی جا سکتی ہو (۸۰) یہ تجویز اس مفہوم میں نہیں ہے جس مفہوم میں ہماری فقہ کی کتابوں میں کہا گیا ہے کہ "احوال و ظروف کی تبدیلی سے احکام بدل جاتے ہیں"، کیونکہ فقہائے اسلام کے منصوص احکام میں جس تبدیلی کے قائل ہیں وہ محض وقتی اور استثنائی ہے یعنی مخصوص صورت حال کی بنا پر ایک مستثنیٰ کیس میں وقتی طور پر ایک حکم روک دیا جاتا ہے، یا دوسرا کوئی حکم نافذ کیا جاتا ہے، جبکہ فیضی صاحب کی تجویز کا مطلب یہ ہے کہ عمومی طور پر شریعت کے پورے ڈھانچہ کو بدل دیا جائے، اور عملی دقت کی بنا پر نہیں بلکہ جدید عقلی معیار پر لانے کے لیے شرعی نظام پر مستقل نظر ثانی کی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ عقیدہ کو عمل سے الگ کرنے کی وجہ کیا ہے، اگر اس کی وجہ یہ ہو کہ عقیدہ کو دوامی مان لینے سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ عقیدہ تو ایک ذہنی اور قلبی

چیز ہے، اس لیے اگر کچھ روایتی ذوق کے لوگوں ایک عقیدہ کو ہر دور میں اپنے ذہن کا جزو بنائے رکھنے پر اصرار کریں تو ان کو معذور سمجھ کر اس کی اجازت دے دینی چاہیے، مگر عمل کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ عمل کا تعلق آدمی کی صرف اپنی ذات سے نہیں، بلکہ دوسروں سے بھی ہے، اگر اس نقطۂ نظر کی وکالت کی وجہ یہ ہو تو یہ مکمل طور پر ایک مصلحت پرستی ہے اور مصلحت پرستی کو علمی نقطۂ نظر کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

اور اگر اس کی حیثیت ایک علمی رائے کی ہو تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقیدہ کیوں دوامی ہے اور عمل کیوں زمانی۔ جس چیز کو ہم عقیدہ کہتے ہیں اگر وہ محض انسانی تلاش کے ذریعہ کوئی حاصل شدہ چیز ہے تو اس کو دوامی ماننے کی کوئی بنیاد ہمارے پاس باقی نہیں رہتی، پھر تو جس طرح عمل زمانی قدر کا حامل ہوتا ہے اسی طرح عقیدہ کو بھی صرف زمانی قدر کا حامل ہونا چاہیے، اور اگر عقیدہ کو دوامی مانا جائے تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ کسی ایسے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے جو علم کلی کی صفت اپنے اندر رکھتا ہے، پھر جب اس کے علم کلی سے حاصل ہونے کی وجہ سے عقیدہ دوامی ہوا تو عمل بھی، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ بھی اسی ذریعے سے حاصل ہوا ہے جس ذریعہ سے عقیدہ حاصل ہوا ہے، تو اس کو بھی لازماً دوامی ماننا پڑے گا۔ دوسرے لفظوں میں یا تو ہم عقیدہ اور عمل دونوں کو دوامی مانیں یا دونوں کو زمانی قرار دیں، ان کے درمیان تفریق کی ہمارے پاس کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔

دربارِ عالمگیری

(از مولانا ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی کاکوروی لکھنؤ یونیورسٹی)

(۱۱)

ابوطالب

یہ دلی میں پیدا ہوئے وہاں ہی نشو ونما پائی۔ ان کے والد ابوالحسن طہران سے آکے دلی میں آبسے تھے۔ علوم مروجہ کی تحصیل کے بعد ملٹری اور حربی ٹریننگ میں لگ گئے اور اس فن میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر بچپن ہی کا دور تھا کہ اس وقت کے رواج و دستور کے خلاف پانچ صدی منصب پر فائز ہوگئے۔ جہانگیر نے انھیں "شائستہ خاں" کے لقب سے نوازدیا، شاہجہاں کا عہد آیا تو ان کے مناصب میں وقتاً فوقتاً اضافے ہوتے رہے تاآنکہ چھ ہزار ذاتی اخراجات کے علاوہ مزید چھ ہزار سواروں کے رکھ رکھاؤ کے لئے عطا ہونے لگے۔ عالمگیر نے تخت شاہی پر بیٹھ کے سات ہزار ان کے اور مزید سات ہزار سواروں کے اخراجات کے لئے دینے کا فرمان جاری کردیا۔ "امیرالامراء" کا خطاب دیا اور ایک بڑی جاگیر کا مالک اور اس پر متصرف بنادیا جس کی آمدنی سالانہ لاکھوں تک پہنچی تھی گھر پر نقارخانہ رکھنے کی اجازت دی اور دکن اور بنگال جیسے طویل و عریض صوبہ جات کا انھیں والی اور گورنر مقرر کردیا۔ انکی زندگی کا یہ زمانہ بڑے ہی تزک و احتشام اور جاہ وجلال سے گذرا۔ حلم و وقار اور سنجیدگی میں وہ امتیاز رکھتے تھے۔ حسن معاشرت، داد و دہش اور عوام کو نفع پہنچانے میں اپنی نظیر آپ تھے۔ آفت رسیدہ، اپاہجوں اور بیواؤں، یتیموں کے لئے انکی ذات ایک سہارا تھی[1]۔ چند کتابوں کے اسباق علامہ محمود

---

[1] مآثر الامراء۔

جون پوری سے پڑھے۔ رفاہ عام کے کاموں سے خاص دلچسپی لیتے۔ مسافر خانے پل اور خدا ہی جانے کتنی مسجدیں بنا ڈالیں۔ انکی وفات ۱۱۰۵ھ میں ہوئی۔

شیخ نور الحق

یہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادے تھے۔ انھیں کے شاگرد، سلوک اور طریقت میں انھیں جانشین اور خلیفہ ہوئے۔ علوم دینیہ میں بحر ذخار تھے اور فن حدیث میں ایک سمندر ناپید اکنار سلسلۂ قادریہ اور شاذلیہ دونوں کی نسبت کے امین و وارث تھے ــــــ پوری صحیح بخاری کی مکمل شرح لکھی جس میں متن احادیث کے مشکلات اور اسناد کی معضلات کو حل کیا۔ حنفی مسلک کے پیرو اور موید تھے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے مذہب کی تقویت و ترجیح میں ان کی مساعی مشکور ہیں، جو احادیث بظاہر مذہب حنفی کے خلاف سمجھی جاتیں وہ انکی مناسب و معقول اور بڑی حد تک قابل قبول توجیہہ فرماتے دوسرے فنون میں بھی پورا پورا ادراک رکھتے، حسندی شرح مطالع اور فلسفہ کی کتاب ہدایۃ الحکمۃ اور دوسری کتب پر مفید حواشی اور نوٹ لکھے۔ شاعری کا بھی خاص ذوق رکھتے[1]۔ مندرجہ ذیل رباعی انکی ہی ہے۔

از شیوۂ ہمدمان این دور خلاف
گویم رمزے اگر نگیری بگزاف
چوں شیشۂ ساعتند پیوستہ بہم
دلہا ہمہ پر غبار و رو ہا ہمہ صاف

ان کا تخلص مشرقی تھا۔ خاقانی کی تحفۃ العراقین کے طرز پر ایک مثنوی بھی لکھی اور ایک ان کا دیوان بھی مرتب ہوا تھا جس میں تقریباً ۵ ہزار اشعار ہوں گے۔

باآنکہ مشرقی ہمہ تن دیدہ چوگل ست
باہیچ کس چو چشم حباب آشنا نبود

انھیں کا شعر ہے۔ شاہ عالمگیر کے حضور میں بارہا باریاب ہوئے اور شاہی عطایا اور نوازشات سے

---

[1] فرحۃ الناظرین۔

بہرہ یاب ہوتے رہے ۹۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

" در سنہ ہزار و ہفتاد و سہ کہ سنین عمرش

بہ نواد و دو رسیدہ بود عزیمت سفر آخرت کرد"

" قبض العلم " سے ان کی تاریخ وفات نکالی گئی رحمہ اللہ

ملا شیخ احمد بن ابی منصور خطیب

یہ قصبہ گوپامئو مضافات ضلع ہردوئی کے رہنے والے تھے وہیں پیدا ہوئے اور وہاں ہی انھوں نے نشو ونما پائی، شیخ احمد ابو سعید امیٹھوی سے علمی فیوض میں بہرہ یاب ہوئے، علمی تحصیل زیادہ تر اپنے والد بزرگوار سے کی۔ فقہ کے فن اور اس کے لواحقات اصول فقہ وغیرہ ان کے محبوب مشاغل تھے، ادب عربی سے پورا پورا ذوق رکھتے۔ فقہ میں ان کے کمال اور مہارت کے شہرے عالمگیر تک پہونچے تو فتاوی ہندیہ کے مرتبین اور مؤلفین میں یہ بھی شامل کر لئے گئے، ایک فرمان کے ذریعہ عالمگیر نے ان کے لئے کچھ نقد اور کچھ غلہ کی مقدار[۲] یومیہ معین اور مقرر کر دی تھی اور ایک فرمان کے مطابق جو ۱۱ ذیقعدہ ۱۰۸۰ھ کا ہے یہ وظیفہ انھیں شیخ وجیہ الدین گوپامئو کے واسطہ سے اور انکی توثیق کے بعد ملتا رہا۔ اپنے استاد شیخ احمد بن ابی سعید کی رفاقت میں انھوں نے سفر حج بھی کیا تھا۔ حج سے فراغت کے بعد بیمار پڑے اور وہاں ہی وفات پائی مؤرخین اس باب میں مختلف البیان ہیں کہ آپ شیخ احمد بن ابی سعید کے ساتھ پہلے سفر میں گئے تھے جو ۱۱۰۲ھ میں انھوں نے کیا تھا یا ۱۱۱۲ھ میں جب دوسری بار آپ حج کے لئے تشریف لے گئے۔

ملا ابو الفتح

یہ ٹھٹھہ سندھ کے متوطن تھے، اپنے وطن ہی میں پیدا ہوئے بڑھے چلے، اور یہ وہاں پڑھے

---

[۱] مصدر سابق [۲] مآثر عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اکبر آباد کا نرخ اجناس یہ تھا چاول سوکھداس ۲۴ مار گیہوں ۲۵ سیر چنا ۱ من ۴ مار گھی ۴ رمار صفحہ ۹۸ و قس علی ہذا

امرا وقت میں انکی ایک خاص پوزیشن تھی وطن سے نکل کے دہلی پہونچے، عالمگیر کی بارگاہ تک انھیں رسائی ہوئی پھر تدریجاً بادشاہ کے مقرب بن گئے، رفعت اور عظمت میں ان کے درجات بڑھتے ہی رہے۔ صیغۂ رسل و رسائل کے انچارج بنا دیئے گئے۔ بادشاہ عالمگیر کے دل میں انکی لیاقت اور قابلیت کا ایسا سکہ جما کہ بالآخر "قابل خاں" کے لقب سے نواز دیئے گئے۔ دن اور سن کے ساتھ قویٰ میں اضمحلال اور اختلاط پیدا ہو گیا اور آخر کار عزلت نشینی پر مجبور ہوئے ان کی مراسلت اور مکاتبت اس شان کی تھی کہ عالمگیر کو ان کی گوشہ نشینی کا احساس رہا اور ان کے بعد ان کے بھائی محمد شریف بن عبد الجلیل کو یہ صیغہ تفویض کر دیا۔ قابل خاں نے ایک مجموعہ ایسا مرتب کیا جس میں عالمگیر کے وہ تمام خطوط شامل ہیں جو انھوں نے اپنے والد اور اپنے بھائیوں کو مختلف اوقات اور مختلف موضوع پر لکھے تھے اس کے علاوہ ایسے وہ خطوط بھی ہیں جو اپنے عہد کے مشائخ اور عظما امرا کو لکھے تھے۔

مفتی ابوالفتح

یہ کشمیر کے رہنے والے تھے، فقہ حنفی میں خاص مہارت رکھتے تھے اور اس زمانہ کے اکابر فقہاء حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، کیا معقول اور کیا منقول دونوں قسم کے علوم میں ید طولیٰ انھیں حاصل تھا۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں بڑھے پلے مولانا حیدر بن فیروز چرخی سے انھیں تلمذ حاصل تھا، فقہ اصول فقہ اور ادبیات عربی کی تحصیل انھیں سے کی، بطون اوراق اور ضخیم مجلدات سے جزئیات مسائل ڈھونڈھ نکالنے میں یہ اپنے عہد میں ضرب المثل بن گئے تھے۔ آخر عمر میں قلمرو کشمیر کے مفتی کا منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا تھا اور بجائے "ابوالفتح" "مفتی کلو" کے نام سے مشہور تھے رد شیعہ میں انھوں نے "سیف السابقین" ایک کتاب بھی لکھی تھی کتب درسیہ اور رسائل متداولہ پر انھوں نے نوٹ اور حواشی بھی لکھے [1]۱۱۰۲ھ میں انکی وفات ہوئی اور سلطان زین العابدین کے مقبرہ میں جو کشمیر میں ہے دفن ہوئے

مولانا ابوالقاسم

یہ ٹھٹھ کے رہنے والے ہیں ان کے والد کا نام مفتی داؤد ہے۔ حنفی مذہب کے پیرو اور مقلد تھے۔

[1] روضۃ الابرار

فقہ اصول فقہ اور ادبیات عرب میں اپنے دور کے ممتاز افراد میں شمار ہوتے تھے۔ درس و تدریس ان کا دلکش مشغلہ تھا۔ طلبا کی ایک معتد بہ تعداد کو ان کے تلمذ کا فخر حاصل رہا۔ عالمگیر نے انھیں اپنے محکمہ قضا میں وکیل شرعی کا عہدہ دیدیا تھا ۱۱۱۳ھ میں ان کی وفات ہوئی انکی وفات پر ان کے کسی دوست نے "ذھب العلم من السند" سے تاریخ وفات نکالی[1]۔

شیخ محمد سعید[2]

اپنے عہد کے بڑے متشرع اور پائے کے عالم شمار ہوتے ہیں۔ بڑے صاحب زہد و تقویٰ تھے، یہ اپنے پدر بزرگوار شیخ احمد سرہندی سے بیعت اور ان کے خلیفہ تھے۔ طالبان خدا اور رسول کے لئے اپنے زمانہ میں بدرقہ راہ تھے، ارشاد و تربیت سالکین ہی ان کا محبوب ترین شغل تھا۔ درس و تدریس سے بھی شغف رکھتے تھے۔ جودت طبع اور انکی خیالات کی رفعت اور جولانی کا نمونہ حاشیہ شرح عقائد "خیالی" پر ان کے حواشی سے ظاہر و باہر ہے، عالمگیر کی تخت نشینی کے چوتھے سال ۱۰۷۰ھ راہئ عالم جاودانی ہوئے، ان کے معاصر شیخ عبد الاحد نے جو "میاں گل" کے نام سے مشہور تھے اور ظاہری اور باطنی کمالات اور فضائل سے متصف تھے انکی تاریخ رحلت نکالی۔

"قیل ادخلوھا بسلام آمنین"

دربار عالمگیر میں اکثر انکی آمد و شد رہتی اور عنایات شاہی سے مستفید ہوتے رہتے رحمہ اللہ

شیخ ممدوح و شیخ سعد الدین و شیخ عبد الاحد

مطرح مکرر بملازمت بادشاہ دین پناہ

(عالمگیر) رسیدہ مشمول عواطف و احسان

شدند[3]

شیخ محمد معصوم

اپنے پدر بزرگوار شیخ احمد سرہندی کے خلیفہ اور ان کے خاص جانشین ہوئے مرید دل کی

---

[1] تحفۃ الکرام [2] خزینۃ الاصفیا میں انھیں احمد سعید لکھا ہے۔ [3] فرحۃ الناظرین

تربیت وتعلیم اور اثنائے سلوک میں ان پر جو کوائف گزرتے اور جو حالات طاری ہوتے انکی حقیقت اور غایت بتانے اور سلوک وطریقت کی راہوں میں جو مشکلات اور دشواریاں پیش آتیں ان کے حل کرنے میں یہ اپنے عہد کے تمام شیوخ پر فوقیت اور امتیاز رکھتے تھے۔ ان کے مکتوبات کا مجموعہ جو انھوں نے اپنے مریدوں کے نام لکھے تین جلدوں میں ہے، یہ مکتوبات شریعت وطریقت کے عجیب وغریب نکات واسرار اور نادر علوم اور معارف سے بھرپور ہیں۔ عالمگیر کی پیہم اور مسلسل خواہش اور استدعا پر حضور شاہی کو رونق بخشتے رہے عالمگیر نے بھی انواع واقسام کی تکریم اور توقیر میں کسر اٹھا نہ رکھی ۱۰۷۹ھ میں انتقال فرمایا۔

در سنۂ ہزار وہفتاد ونہ ازیں
دار پُر ملال بہ نزہت سرائے وصال انتقال نمود

ان کی تاریخ رحلت ــــــ "رفتہ ز جہاں امام معصوم"[1] سے نکالی گئی ہے۔

---

[1] مصدر سابق

[illegible]

سوالات کا مفصل جواب

مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان کی [illegible]

رسالہ بشریت

[illegible]

تذکرۂ مجدد الف ثانیؒ

مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا تازہ کتابی ایڈیشن

[illegible]

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Cover Printed at A.O. Press Aminabad Park Lucknow.

سنہ آغاز ۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

مسئول

منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

سالانہ چندہ	ماہنامہ الفرقان لکھنؤ	سالانہ چندہ
ہندستان سے ۶/۰		غیر ممالک سے
پاکستان سے ۸/۰		۱۲ شلنگ
ششماہی		ہوائی ڈاک سے
ہندستان سے ۳/۵۰		ہوائی ڈاک کی شرح کے
پاکستان سے ۴/۰	فی کاپی .. .. ۶۰ پیسے	مطابق اضافہ

جلد ۳۴ | بابتہ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۶ھ مطابق جولائی ۱۹۶۶ء | شمارہ ۳

اگر اس دائرے میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو' براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں' یا خریداری کا ارادہ نہو تو مطلع فرمائیں' چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۸ جولائی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی' پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیں' ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں' اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان ، کچہری روڈ ، لکھنؤ

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

—————— عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہندستان و پاکستان کی جنگ کے بعد مسلمان لیڈروں کی زبان سے یہ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں کہ "مسلمانانِ ہند نے اس جنگ کے دوران وفاداری اور حب الوطنی کا وہ نمونہ پیش کیا ہے کہ اس کے بعد ان کی طرف سے تمام شکوک وشبہات دور ہو جانے چاہئیں۔" —— ہماری سمجھ میں قطعاً نہیں آتا کہ مسلمانوں کی عزت وسربلندی کی خواہش رکھنے والے کسی انسان کی زبان سے یہ الفاظ کس طرح نکلتے ہیں۔

جس جنگ کے دوران میں آپ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اعلیٰ درجہ کی وفاداری اور حب الوطنی کا ثبوت پیش کیا، میدانِ جنگ میں اپنا خون بہایا اور اندرونِ ملک حکومت کو ہر طرح کا تعاون پیش کیا، اسی جنگ کے زمانے میں ہزاروں مسلمان جن میں سیکڑوں پرانے آزمودہ کانگرسی اور جمعیۃ علمائی بھی تھے، احتیاطی طور پر قید خانوں میں ڈالے جا رہے تھے۔ اور جو اس سے بچے ہوئے تھے انھیں گھروں سے نکلنا مشکل ہو رہا تھا، ہر مسلمان شکوک نظروں سے دیکھا جاتا تھا، نقرے کسے جاتے تھے، خصوصاً وہ چند دن جن میں پاکستانی چھاتہ برداروں کا ہوّا کھڑا کر کے عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ ہر مشکوک آدمی کو پولیس کے حوالے کریں۔ ان دنوں میں کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی کیا گت بنی، بالخصوص مرکزی راجدھانی دہلی میں کس مصیبت کا انھیں سامنا ہوا، اور مسلمان ہونے کی کھلی ہوئی علامت، ڈاڑھی، اگر کسی کے چہرے پر تھی تو بس اس کی تو موت تھی۔ اتفاق کی بات ہو کہ ملک کے مشہور انگریزی روزنامے "ہندوستان ٹائمز" کے ایک حالیہ اداریئے میں یہ حقیقت رقم ہو گئی ہے۔ اپنی ۵ر جون ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں وہ ایک مثال کے طور پر لکھتا ہے کہ:-

"اور یہ تو ہم نے خود ہندوستان کے اندر دیکھا ہے کہ جن دنوں پاکستان سے جنگ چھڑی ہوئی تھی، کس طرح ہر ایک ڈاڑھی والا آپ سے آپ جاسوس سمجھ لیا جاتا تھا"

تو یہ تھی ہماری وفاداری اور حب الوطنی کی حقیقت حکومت اور اکثریت کی نگاہ میں! یعنی بے اعتباری کا ذہن بالکل برہنہ ہو کر خاص انہی دنوں میں سامنے آیا جن دنوں کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ ان کے بعد ہماری وفاداری اور حب الوطنی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنا چاہیے!

کیا کوئی غیرت مند قوم اور اس کے خوددار لیڈر کبھی گوارا کر سکتے ہیں کہ اُن کی وطن دوستی کے جن شواہد کو اس قدر توہین آمیز طریقوں سے ان کے منھ پر مارا گیا ہو انھیں نہایت فخر و اعتماد کے ساتھ سروں پر اُٹھائے آواز لگاتے پھریں کہ یہ ہیں ہماری وطن دوستی اور وفاداری کے جگمگاتے ہوئے ثبوت! کیا ان کے بعد بھی ہم پر اعتبار نہ کرو گے، اور وہ مقام ہمیں عطا نہ کرو گے جو ایسے محبانِ وطن کا حق ہے؟۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس جنگ کے دوران مسلمانوں کے وفادارانہ کردار کا بہت چرچا ہوا اور حوالدار عبد الحمید، میجر شیخ وغیرہ کی قربانیوں کا اس قدر شاندار اعتراف کیا گیا کہ گرو گولوالکر جیسے ہندو لیڈروں کو ارباب حکومت کا یہ رویہ برا معلوم ہونے لگا۔ مگر ہم سے زیادہ سادہ لوح کون ہوگا کہ ہم اس داد و تحسین پر رقص شروع کر دینے سے پہلے عمل کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں! زبان سے جس وقت یہ خوشنودی کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے عین اسی وقت ڈی، آئی، آر کا ڈنڈا بھی عبد الحمید اور میجر شیخ کے ہم قوموں پر گھوم رہا تھا، سرزمین وطن پر راستہ چلنا انھیں دشوار ہو رہا تھا، اور کوئی شخص بھی اپنے آپ کو اس تہمت سے بالاتر سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں رہ گیا تھا کہ وہ ایک پاکستانی ایجنٹ ہے۔

کیا اس سب کو نظر انداز کر کے ہمیں ناز کرنا چاہیے کہ بڑی داد ہماری حب الوطنی کی دی گئی ہے؟۔

ہم بڑے دھوکے میں ہیں کہ اس داد و تحسین کا سیدھا سادہ مطلب لے کر اسے اپنے اوپر اظہار اعتماد سمجھنے لگ گئے ہیں اور بڑے فخر سے حوالے دیتے ہیں کہ صدر جمہوریہ نے ہمارے حق میں یہ ارشاد فرمایا اور وزیر اعظم نے وہ فرمایا، حالانکہ ان کا مقصد تو تحسین و آفریں کے اس شور سے صرف باہر کی دُنیا کو یہ دکھانا تھا کہ کشمیر کے معاملہ میں ہندوستان کے مسلمان بھی پاکستان کے خلاف سربکف ہیں۔ نیز یہ کہ

ہندوستان کا سیکولرازم اس قدر سچا ہے اور یہاں کی مذہبی اقلیتیں اس قدر شکر گزاری کے جذبات سے معمور ہیں کہ مسلمانوں نے پاکستان کے مسلمان ہونے کی بھی پرواہ نہیں کی، اس لیے کشمیر کے معاملے میں بھی پاکستان کا پروپیگنڈا بالکل جھوٹ ہے! ۔۔۔ ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے جوانوں کے خون سے ہم کو سند دی جا رہی تھی کہ حکومت کی نظر میں پوری طرح قابل اعتماد اور وطن کے جاں نثار ہیں حالانکہ اس خون سے بھی سند بڑی خوبصورتی کیساتھ خود ہی لی جا رہی تھی کہ حکومت ہند اور اس کے سیکولرازم پر مکمل اعتماد کا ثبوت ہے۔ ورنہ آپ خود سوچ لیجئے کہ اگر مقصد ہم پر اظہار اعتماد ہوتا تو ملک میں بے اعتمادی کا وہ بھرپور مظاہرہ کیوں ہو رہا تھا جسے کسی شرح و بیان کی حاجت نہیں اور جس کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا جب تک کہ تاشقند میں صلح کی دستاویز نہیں مرتب ہو گئی؟

مسلمانوں کو حالات سے شکایت ہے۔ حق تلفیوں کے شکوے ہیں اور مستقبل میں بدترین احوال کے اندیشے ذہن پر سوار ہیں۔ مگر حالات کی سختی سے ہرگز نہیں لازم آتا کہ مستقبل تاریک ہی ہو۔ ہاں ایک چیز یقیناً ایسی ہے جس کے بعد مستقبل میں کسی روشنی کی امید نہیں رکھنی چاہیے اور وہ ہے خودداری سے محرومی اور خود اعتمادی و خدا اعتمادی کیساتھ حالات کو بدلنے کی خوددارانہ کوششوں کے بجائے غلامانہ گراوٹ اور خوشامد میں مشکلات کا حل ڈھونڈھنا! یہ وہ مقام ہے جہاں قوموں کی تقدیر پر مہر لگ جاتی ہے اور بجز ذلت و بیچارگی کچھ اور ان کا مستقبل نہیں ہو سکتا۔

ہم نے جس بات پر گفتگو چھیڑی ہے وہ اس وقت کا ایک عام ابتلا ہے۔ ایسے ایسے حضرات اس میں مبتلا نظر آ رہے ہیں جن کے متعلق ہم ہرگز نہیں سوچ سکتے کہ ان میں ملی غیرت و خودداری کے احساسات نہیں ہیں اور اس لیے قلم کو کچھ لکھتے ہوئے بڑی جھجک ہے مگر ہمارا مقصد ملامت یا مذمت نہیں ہے۔ ہم ملت کے تمام مخلص لیڈروں کو صرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ وہ خدا کے لیے اس معاملے میں ذرا سا ٹھہر کر ایک بار غور کریں کہ آخر انھیں ان لوگوں کے سامنے اپنی حب الوطنی کے ذکر سے عار کیوں نہیں آتی جو عمل کی زبان سے اعلان کر چکے ہیں کہ چاہے مسلمان پاکستان کے مقابلے میں بھی ہندوستان پر جان چھڑک کے دکھا دیں اور جبکہ ہندو عام حالات تک میں پاکستان کے لیے جاسوسی اور راز فروشی کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑے جا چکے ہوں ان کا کوئی فرد اس بحرانی دور میں بھی ایسی

لغزش کا گنہگار نہ ہوا ہو، مگر ان کی وطن دوستی پر بھروسہ نہیں کیا جائے گا۔ اور خاص طور پر پاکستان سے کشمکش میں تو وہ پاکستانی ہی سمجھے جائیں گے! ـــ اور پھر آخر یہ پریشانی ہے کیوں کہ مسلمانوں کو اکثریت کی بارگاہ سے حب الوطنی کی سند مل جائے؟ کیا اکثریت کو ہم نے حاکم اور خود کو محکوم مانا ہے آقا اور غلام کا رشتہ ہم یہاں تسلیم کر رہے ہیں کہ خوشنودی نہ ملی تو زندگی بے مزہ ہے! اگر رشتہ یہی ہو تو ہمیں "حب وطن" کا شریف لفظ زبان پر نہ لانا چاہیے، بلکہ "آقاؤں سے وفاداری" کی بات کرنا چاہیے۔ اور اس میں بے شک ہم محتاج ہیں کہ وہ بھی ہمیں وفادار مان لیں۔ لیکن اگر رشتہ برابری کا ہے اور وطن کی برائی بھلائی سوچنے کا ہمیں بھی وہی حق ہے جو اکثریت کو ہے تو اکثریت کو ہم کیوں یہ حق دیں کہ وہ ہماری حب الوطنی کا فیصلہ کرے؟ اور کیوں پریشان ہوں کہ وہ ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے؟۔

بے شک جمہوریت دستوری مساوات کے باوجود عملاً اقتدار اکثریت ہی کے ہاتھ میں دیتی ہے۔ اور اقتدار کی عام فطرت کے مطابق وہ ملک کے تمام معاملات کا اجارہ دار بھی اپنے آپ ہی کو سمجھنے لگتی ہے، اس لیے اس کے ذہن کی موافقت اور مخالفت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ موافقت تلاشی ایک حد تک ہی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ کھلی ہوئی کمتری اور غلامی کی پوزیشن اس کے لیے نہیں اختیار کی جا سکتی۔ مسلمانوں کو اکثریت سے سخت شکایتیں ہیں کہ وہ حکومتی اختیارات کے بل پر اُن کے حقوق مسلسل پامال کر رہی ہے۔ ان کی سیکڑوں عبادت گاہیں آج تک بے حرمتی کا شکار ہیں۔ اُن کے ایک فرد کی غلطی کی سزا پورے علاقے کے مسلمانوں کو اس طرح دی جاتی ہے جیسے وہ شودر اور غلام ہوں۔ غلطی کی بھی ضرورت نہیں صرف جھوٹی افواہیں اس بات کے لیے کافی ہوتی ہیں کہ پورے علاقے کے مسلمانوں پر ہلّہ بول دیا جائے، لاکھوں کروروں کی املاک جلا کر خاک کر دی جائیں۔ اور بوڑھوں، بچوں، عورتوں تک کی کسی تفریق کے بغیر سیکڑوں، ہزاروں جانوں کو خاک اور خون میں تڑپا دیا جائے۔ ملک کی کتنی ہی ریاستوں میں اُردو ان کی مادری زبان ہے۔ اور ملک کی تسلیم شدہ چودہ قومی زبانوں میں بھی وہ شامل ہے۔ مگر اس کو کہیں بھی سرکاری درجہ دینا تو درکنار اسکولوں میں اس زبان کی تعلیم تک کی سہولت نہیں دی جاتی۔ اور بالکل واضح طور پر اسے ایک حرف غلط کی طرح مٹا ڈالنے کی پالیسی چل رہی ہے۔ اُردو جن ریاستوں کے مسلمانوں کی مادری زبان نہیں ہے

اُن کے لیے بھی اپنے مذہب (اسلام) سے واقفیت کا سب سے بڑا ذریعہ رہی ہے۔ مگر ایک طرف اُردو کو مٹا کر وہ دروازہ بند کیا جارہا ہے جس سے مسلمانوں کی نئی نسلیں اپنے مذہبی اور تہذیبی ورثے سے رابطہ رکھ سکیں تو دوسری طرف سرکاری نصاب تعلیم میں اس بات کا بھرپور انتظام کیا گیا ہے کہ مسلمان بچے اکثریت کے مذہبی اور تہذیبی رنگ میں رنگ جائیں۔ یہ ساری شکایتیں ایسی ہیں کہ مسلمانوں نے کبھی ایک دن کے لیے بھی انھیں نہیں چھپایا۔ اپنی سخت تشویش اور غم و غصہ کا اظہار وہ تمام ممکن ذرائع سے ان معاملات میں کرتے رہے ہیں۔ کم سے کم اکثریت کے حکمراں افراد اچھی طرح جانتے ہیں کہ شکایات کے ان پھوڑوں سے مسلمانوں کے دل و دماغ پر کیا بیت رہی ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ پاکستان ان معاملات میں کس کس طرح مسلمانوں کی ہمدردی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ مگر اس سب کے باوجود کوئی ایک مثال نہیں کہ مسلمانوں نے پاکستان یا کسی دوسرے ملک سے ریشہ دوانیوں کا ارتکاب کیا ہو۔ اور حد یہ ہے کہ جنگ کا بھی ایک دن ہندوستان و پاکستان کے درمیان آگیا مگر اس میں مسلمان کوئی ایسا کام تو کیا کرتے جس سے پاکستان کو فائدہ اور ہندوستان کو نقصان پہونچے اُلٹے وہ عبدالحمید اور میجر شیخ کا کردار بن کر رونما ہوئے اور جو دفاعی خدمت بھی انھیں سونپی گئی اُس میں انھوں نے کہیں سے اپنے اعتبار پہ حرف نہیں آنے دیا —— یہ ہے ہندوستانی مسلمانوں کا کردار! اس پر بھی جب اُن سے علانیہ شورش یا خفیہ تخریب کاری کا اندیشہ کیا گیا اور ایک ایک ریاست میں ہزاروں با اثر لوگوں کو راتوں رات پکڑ کر جیل خانوں میں بند کر دیا گیا۔ اور معاہدہ تاشقند تک بندھی دکھا گیا، تو ان لوگوں کے سامنے اپنے حُبّ وطن کی بات غلامانہ گراوٹ کے سوا کچھ اور نہیں۔ اور اس سے اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا کچھ بھلا ہو گا تو خود داری کو اقتدار کے حضور پامال کر کے آج تک کسی قوم نے ذلت کے سوا کچھ نہیں پایا ہے۔

کیسا المیہ اور کیا سانحہ ہے کہ حکومت نے جنگ کے دوران میں احتیاط کے نام پر کیے گئے اقدامات سے مسلمانوں کی پوزیشن کو کس بُری طرح خراب کیا ہے، مگر ہم اس پر اپنے احساسات کو سامنے نہیں لاتے بلکہ اُلٹے سجدے بجا لا رہے ہیں کہ بڑا اعتراف ہماری وفاشعاری کا کیا گیا ہے۔ یعنی کوئی حرج نہیں کہ آپ ہماری آبرو کو مٹی میں ملا دیں۔ مگر بس دو دلفریب بول بھی اپنی زبان مبارک سے سُنا دیں! —— کیا حال ہوگا اُس حکومت کی غلط روی کا جو پانچ کروڑ

انسانوں میں اس قدر مسکینی پاوے؟ اور کیا حال ہوگا ان مسکینوں کا؟

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ الْمُشْتَکٰی وَ اَنْتَ الْمُسْتَعَانُ!

خریدارن پاکستان کو اطلاع

جن حضرات نے رجسٹری فیس نہیں بھیجی تھی اُن سب کو بھی الفرقان کا "حضرت مولانا محمد یوسف نمبر" ۲ر جون کو سادہ ڈاک سے روانہ کیا جا چکا ہے۔

جمادی الاخریٰ اور رجب ۸۵ھ کا الفرقان!

۸۵ھ کے یہ دونوں شمارے دفتر الفرقان میں بالکل ختم ہوگئے ہیں۔ اور بعض حضرات جو الفرقان کا پورا فائل اہتمام سے رکھتے ہیں اُن کو ان کی ضرورت ہے۔ جن صاحب کے پاس یہ شمارے ہوں اور وہ فائل نہ رکھتے ہوں، براہ کرم وہ دفتر الفرقان کو وہ شمارہ بلا قیمت یا بقیمت جس طرح پسند کریں روانہ فرمادیں ——— منیجر

قارئین "میثاق" کو خوشخبری

ایک عرصہ سے بعض نہایت ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے جو بے قاعدگی ماہنامہ "میثاق" لاہور کی اشاعت میں ہو رہی تھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں کہ وہ اب انشاء اللہ العزیز ختم ہو جائے گی اور جولائی ۱۹۶۶ء سے پرچہ باقاعدگی سے شائع ہوگا۔

جولائی ۱۹۶۶ء کا پرچہ انشاء اللہ یکم جولائی تک سپرد ڈاک کر دیا جائے گا۔

منیجر ماہنامہ "میثاق" لاہور

ایک ضروری اعلان

از محمد منظور نعمانی

لاجپور ضلع سورت کے ایک مخلص دوست نے اپنے تازہ خط میں اطلاع دی ہے کہ ایک مولوی صاحب جو اپنا نام ابوالقاسم بتاتے ہیں اور سورت کے قریب ہی ایک بستی میں ایک مشہور اہلحدیث عالم کے ہاں کافی عرصہ سے مقیم ہیں اور غالباً اُن سے کچھ تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے بارہ میں بہت سی دوسری عجیب و غریب اور ناقابل قیاس باتوں کے علاوہ ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اس عاجز (محمد منظور نعمانی) کے پوتے ہیں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں وہ اس عاجز کے درس حدیث میں شریک رہے ہیں اور وہیں انھوں نے سند فراغ حاصل کی ہے۔

خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ بہت سے لوگ ان کی اس بات کو باور کر کے ان کے ساتھ اسی کے مطابق معاملہ بھی کرتے ہیں — میں اپنا شرعی و اخلاقی فریضہ سمجھ کر یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر اس خط کی یہ اطلاع صحیح ہے تو یہ شخص کوئی پیشہ ور عیار اور دھوکہ باز ہے — میرے دور کے بھی کسی عزیز قریب کا نام ابوالقاسم نہیں ہے نہ میرا کوئی عزیز قریب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے میرے درس حدیث میں شریک رہا ہے — لہٰذا کوئی صاحب بھی اس عاجز کی نسبت اور تعلق کی بنیاد پر اس شخص سے کوئی معاملہ نہ کریں بلکہ دوسروں کو بھی اس سے خبردار اور ہوشیار کر دیں۔

اس سے پہلے بھی مختلف مقامات سے اس طرح کی خبریں ملیں کہ بعض لوگوں نے اس عاجز کے ساتھ اپنا خاص تعلق قرابت وغیرہ ظاہر کر کے اللہ کے بندوں کو دھوکا دیا۔

اس زمانہ میں اس قسم کی دھوکہ بازی ایک کاروبار اور پیشہ ہے۔ اس لیے جب تک تصدیق نہ کر لی جائے ہرگز باور نہ کیا جائے۔

محمد منظور نعمانی

كِتَابُ الْأَذْكَارِ وَالدَّعَوَات

مَعَارِفُ الْحَدِيث

(مُسَلسَل)

ذِکر کی فضیلت اہمیّت :-

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِيٌّ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ؟ فَقَالَ طُوْبٰى لِمَنْ طَالَ عُمُرُهٗ وَحَسُنَ عَمَلُهٗ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اَيُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ؟ قَالَ اَنْ تُفَارِقَ الدُّنْيَا وَلِسَانُكَ رَطْبٌ مِنْ ذِكْرِ اللهِ

—— رواہ احمد والترمذی

حضرت عبداللہ بن بُسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ یا رسول اللہ آدمیوں میں کون بہتر ہے؟ (یعنی کس قسم کے آدمیوں کا انجام زیادہ اچھا ہونے والا ہے) آپ نے فرمایا، وہ لوگ جن کی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں — پھر انھوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ اعمال میں کون عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا "یہ کہ تم دُنیا کو خیرباد کہو اور تمھاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو" (مسند احمد، جامع ترمذی)

(تشریح) پہلے سوال کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اُس کی وجہ ظاہر ہے کہ اچھے اعمال کے ساتھ عمر جتنی زیادہ ہوگی بندہ اتنی ہی ترقی کرے گا، اور

اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت کا اسی قدر زیادہ مستحق ہوگا۔ دوسرے سوال کے جواب میں آپ نے سب سے اچھا عمل یہ بتایا کہ مرتے دم تک اور خاص کر آخری وقت میں بندہ اللہ کے ذکر سے رطب اللسان ہو، یعنی اس کی زبان پر ذوق اور لذت کے ساتھ اللہ کا نام ہو، بلاشبہ یہ عمل اور یہ حال بڑا ہی عزیز اور قیمتی ہے اور جو بندہ اس کی قدر جانتا ہو وہ سب کچھ دے کے بھی اس کو لینے کے لیے خوشی سے آمادہ ہوگا۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ اَنَّ رَجُلاً قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَبْوَابَ الْخَيْرِ كَثِيْرَةٌ وَلَا اَسْتَطِيْعُ الْقِيَامَ بِكُلِّهَا فَاَخْبِرْنِيْ عَنْ شَيْءٍ اَتَشَبَّثُ بِهٖ وَلَا تُكْثِرْ عَلَيَّ فَاَنْسٰى قَالَ لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْباً مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ——————— رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن بُسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اے اللہ کے پیغمبر نیکی کے ابواب (یعنی ثواب کے کام) بہت ہیں اور یہ بات میری طاقت سے باہر ہے کہ میں ان سب کو بجا لاؤں، لہٰذا آپ مجھے کوئی ایک ایسی بات بتا دیجیے جس کو میں مضبوطی سے تھام لوں اور اس پر کاربند ہو جاؤں (اور بس وہی میرے لیے کافی ہو جائے) اسی کے ساتھ یہ بھی عرض ہے کہ جو کچھ آپ بتائیں وہ بہت زیادہ بھی نہ ہو کیونکہ خطرہ ہے کہ میں اس کو یاد بھی نہ رکھ سکوں ——— آپ نے فرمایا ——— بس اس کا اہتمام کرو اور اس کی عادت ڈالو کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ تمہاری فلاح و کامیابی کے لیے بس یہی کافی ہے کہ اللہ کے ذکر سے رطب اللسان رہو۔

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْثِرُوْا ذِكْرَ اللّٰهِ حَتّٰى يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ ——— رواہ احمد و ابو یعلیٰ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا ذکر اتنا اور اس طرح کرو کہ لوگ کہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔

(مسند احمد، مسند ابو یعلیٰ)

(تشریح) اہلِ دُنیا جو تعلق باللہ کی دولت سے محروم ہیں جب کسی ایسے اللہ والے کو دیکھتے ہیں جس کو یہ دولت نصیب ہے اور اس کی وجہ سے وہ دنیا کی طرف سے کسی قدر بے فکر اور اللہ کی یاد اور اس کی رضا طلبی میں منہمک ہے، تو اپنے خیال کے مطابق وہ اس کو دیوانہ کہتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ خود ہی دیوانے ہیں ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

ذکر اللہ سے غفلت کا انجام حسرت و محرومی اور دل کی قساوت :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ علیه وَسَلَّمَ مَنْ قَعَدَ مَقْعَدًا لَمْ یَذْکُرِ اللّٰهَ فِیْهِ کَانَتْ عَلَیْهِ مِنَ اللّٰهِ تِرَةٌ وَمَنِ اضْطَجَعَ مَضْجَعًا لَا یَذْکُرُ اللّٰهَ فِیْهِ کَانَتْ عَلَیْهِ مِنَ اللّٰهِ تِرَةٌ ۔ ——— رواہ ابوداؤد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کہیں بیٹھا اور اس نشست میں اُس نے اللہ کو یاد نہیں کیا تو یہ نشست اس کے لیے بڑی حسرت اور خسران کا باعث ہوگی اور اسی طرح جو شخص کہیں لیٹا اور اس میں اُس نے اللہ کو یاد نہیں کیا تو یہ لیٹنا اس کے لیے بڑی حسرت اور خسران کا باعث ہوگا۔

(سنن ابی داؤد)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُکْثِرُوا الْکَلَامَ بِغَیْرِ ذِکْرِ اللّٰهِ فَاِنَّ کَثْرَةَ الْکَلَامِ بِغَیْرِ ذِکْرِ اللّٰهِ قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ وَاِنَّ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْقَلْبُ الْقَاسِیْ

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کیا کرو کیونکہ اس سے دل میں قساوت (سختی اور بے حسی) پیدا ہوتی ہے اور لوگوں میں وہ آدمی اللہ سے زیادہ دُور ہے

جس کے قلب میں قساوت ہو۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اللہ کے ذکر کے بغیر زبان زیادہ چلانے کا عادی ہو گا اس کے دل میں قساوت یعنی بے حسی اور بے نوری پیدا ہو گی اور وہ اللہ کے قرب اور اس کی خاص رحمت سے محروم رہے گا۔ اعاذنا اللہ منہ۔

کلماتِ ذکر اور ان کی فضیلت و برکت:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اللہ کے ذکر کی ترغیب دی اور تاکید فرمائی اسی طرح اس کے خاص کلمات بھی تلقین فرمائے، اگر یہ نہ ہوتا تو اس کا امکان تھا کہ علم و معرفت کی کمی کی وجہ سے بہت سے لوگ اللہ کا ذکر اس طرح کرتے جو اس کے شایانِ شان نہ ہوتا۔ یا جس سے بجائے حمد و ثنا کے معاذ اللہ اس کی تنقیص ہوتی۔ عارف رومی نے اپنی مثنوی میں حضرت موسیٰ اور ایک چرواہے کی جو حکایت بیان کی ہے وہ اسی کی ایک مثال ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کلماتِ ذکر تلقین فرمائے ہیں وہ معنوی لحاظ سے مندرجہ ذیل چند قسموں میں سے کسی ایک قسم کے ہیں۔ یا تو ان میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور تقدیس ہے (یعنی اُن کا مفہوم اور مُدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اُس بات پر منزہ اور پاک ہے جس میں عیب و نقص کا شائبہ بھی ہو) "سبحان اللہ" کا یہی مفہوم اور مدعا ہے — یا اُن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے (یعنی ان کا مفہوم اور مدعا یہ ہے کہ ساری خوبیاں اور تمام کمالی صفات اللہ تعالیٰ میں ہیں اور اس لیے حمد و ثنا اسی کو سزاوار ہے) — "الحمد للہ" کی یہی خصوصیت ہے — یا اُن میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُس کی شانِ یکتائی کا بیان ہے۔ چنانچہ "لا الٰہ الا اللہ" کی شان یہی ہے — یا اُن میں اللہ تعالیٰ کی اس شانِ عالی کا اظہار ہے کہ ہم نے اس کے بارے میں نفی اور مثبت طور پر جو کچھ جانا اور سمجھا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے بھی بلند بالا اور وراء الوراء ہے — "اللہ اکبر" کا یہی مفہوم و مدعا ہے — یا اُن کلمات میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہی ہے اس کے سوا کسی کے بس میں کچھ نہیں لہٰذا وہی اس کا حقدار ہے کہ اس سے مدد مانگی جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے۔ لاحول

ولا قوۃ الا باللہ" کی یہی نوعیت اور خصوصیت ہے۔
اس طرح کے کلمات ذکر کے علاوہ مختلف اوقات اور مختلف حاجتوں کے لیے جو دعائیں آپ نے تعلیم فرمائیں اُن کے بارے میں انشاء اللہ آگے مستقلاً لکھا جائے گا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے درج ہونے والی حدیثوں میں جن کلماتِ ذکر کی تلقین فرمائی ہے وہ اختصار کے باوجود اللہ تعالیٰ کی تنزیہ و تقدیس و تحمید و توحید اور اس کی شانِ کبریائی و صمدیت کے بیان میں بلاشبہ معجزانہ شان رکھتے ہیں اور اس کی معرفت کے گویا دروازے ہیں۔
اس مختصر تمہید کے بعد اس سلسلہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ذیل میں پڑھیے!

عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الْكَلَامِ اَرْبَعٌ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ——— رواہ مسلم

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام کلموں میں افضل یہ چار کلمے ہیں۔ "سبحان اللہ" اور "الحمد للہ" اور "لا الٰہ الا اللہ" اور "اللہ اکبر"۔ (صحیح مسلم)

(**تشریح**) اسی حدیث کی ایک دوسری روایت میں "اَفْضَلُ الْكَلَامِ اَرْبَعٌ" کے بجائے "اَحَبُّ الْكَلَامِ اِلَى اللّٰهِ اَرْبَعٌ" کے الفاظ بھی نقل کیے گئے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ سب کلموں میں اللہ تعالیٰ کو زیادہ پیارے یہ چار کلمے ہیں۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ اَقُوْلَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ ——— رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔۔۔ اس دنیا کی وہ تمام چیزیں جن پر سورج کی روشنی اور اُس کی شعاعیں

پڑتی ہیں۔ ان سب چیزوں کے مقابلہ میں مجھے یہ زیادہ محبوب ہے کہ میں ایک دفعہ
"سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ" کہوں۔

(تشریح) ان چاروں کلموں کا اجمالی مفہوم اوپر کی تمہیدی سطروں میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوگیا ہوگا کہ یہ نہایت مختصر اور ہلکے پھلکے چار کلمے اللہ تعالیٰ کی تمام مثبت و منفی صفاتِ کمال پر کسقدر حاوی ہیں، بعض عرفاء کاملین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماءِ حسنیٰ جو اس کی تمام صفاتِ کمال کی ترجمانی کرتے ہیں ان میں سے کسی کا مفہوم بھی ان چار کلموں سے باہر نہیں ہے ___ مثلاً القدُّوس، السَّلام، الطَّاہر جیسے اسماءِ حسنیٰ جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک سے ہر عیب و نقص کی نفی کرتے ہیں، سُبحان اللہ کا مفہوم ان سب پر حاوی ہے، اسی طرح الرَّحمٰن، الرَّحیم، الکریم، العلیم، القدیر، السمیع، البصیر، العزیز، الحکیم جیسے وہ تمام اسماءِ حسنیٰ جو اللہ تعالیٰ کی ایجابی صفاتِ کمال پر دلالت کرتے ہیں، وہ سب "الحمد للہ" کے احاطے میں آجاتے ہیں۔ اسی طرح جو اسماءِ حسنیٰ اس کی وحدانیت و یکتائی اور اس کی شانِ لاشریکی و بے مثالی پر دلالت کرتے ہیں، جیسے الواحد، الاحد وغیرہ ان کی پوری ترجمانی کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کرتا ہے، علیٰ ہذا العلیّ، الاعلیٰ، الکبیر، المتعالی جیسے اسماءِ حسنیٰ جن کا مفہوم و مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو کچھ کسی نے جانا اور سمجھا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے بھی بلند و بالا اور وراء الوراء ہے۔ بلاشبہ کلمۂ "اللہ اکبر" اس حقیقت کی بہترین تعبیر ہے۔

پس جس نے دل کے شعور و یقین کے ساتھ کہا "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر" کہا اس نے اللہ کی ساری ثنا و صفت بیان کردی اور تمام اسماءِ حسنیٰ میں اللہ تعالیٰ کی جن ایجابی یا سلبی صفاتِ کمال کا بیان ہے دل سے ان سب کی شہادت دے دی، اس لیے یہ چار کلمے اپنی قدر و قیمت اور عظمت و برکت کے لحاظ سے بلاشبہ اس ساری کائنات کے مقابلہ میں فائق ہیں جس پر سورج کی روشنی یا اس کی شعاعیں پڑتی ہیں ___ جن قلوب کو ایمان کی دولت نصیب ہے اُن کے لیے یہ حقیقت بالکل وجدانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان کی یہ دولت نصیب فرمائے۔

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی

شَجَرَةٍ يَابِسَةِ الْوَرَقِ فَضَرَبَهَا بِعَصَاهُ فَتَنَاثَرَ الْوَرَقُ فَقَالَ اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ تُسَاقِطُ ذُنُوْبَ الْعَبْدِ كَمَا يَتَسَاقَطُ وَرَقُ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ ——— رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے درخت کے پاس سے گزرے جس کے پتے سوکھ چکے تھے۔ آپ نے اس پر اپنا عصائے مبارک مارا تو اس کے سوکھے پتے جھڑ پڑے (اور ساتھ والوں نے وہ منظر دیکھا) پھر آپ نے فرمایا کہ یہ کلمے (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ) بندے کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتے ہیں جس طرح تم نے اس درخت کے پتے جھڑتے دیکھے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) نیک اعمال کی اس خاصیت کا ذکر قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہے کہ ان کی برکت اور تاثیر سے گناہ مٹ جاتے ہیں ——— ارشاد ہے "اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ" (یقینی بات ہے کہ نیکیاں گناہوں کا صفایا کر دیتی ہیں)۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز، درصدقہ وغیرہ بہت سے اعمال صالحہ کی اس تاثیر کا خصوصیت سے بیان فرمایا ہے۔ اس حدیث میں آپ نے ان چار کلموں کی یہ تاثیر بیان فرمائی اور درخت کے سوکھے پتے عصا کی ایک ضرب سے جھاڑ کے صحابہ کرام کو اس کا ایک نمونہ بھی دکھایا۔ اللہ تعالیٰ ان حقیقتوں کا یقین نصیب فرمائے اور ان کلموں کی عظمت و تاثیر سے استفادہ کی توفیق دے۔

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ فِىْ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ حُطَّتْ خَطَايَاهُ وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے روزانہ سو دفعہ کہا "سبحان اللہ وبحمدہ" اس کے قصور معاف کر دیئے جائیں گے اگرچہ کثرت میں سمندر کے جھاگوں کے برابر ہوں۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) "سبحان اللہ وبحمدہ" کا مطلب وہی ہے جو "سبحان اللہ والحمد للہ" کا ہے یعنی

ہر اُس بات سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ و تقدیس جو اس کے شایانِ شان نہیں ہے اور جس میں ذرا بھی قصور یا عیب کا کوئی شائبہ ہے — اور اسی کے ساتھ تمام صفاتِ کمال کا اس کی ذاتِ عالی کے لیے اثبات اور اس کی بنا پر اس کی حمد و ثنا، اس طرح یہ مختصر کلمہ "سبحان اللہ وبحمدہٖ" اس سب پر حاوی ہے جو سلبی یا ایجابی طور پر اللہ تعالیٰ کی ثنا و صفت میں کہا جا سکتا ہے —

حدیث سابق کی طرح اس حدیث میں اس مختصر توصیفی کلمہ کی یہ تاثیر بیان کی گئی ہے کہ جو بندہ روزانہ یہ کلمہ سو دفعہ پڑھے تو اس کے سارے گناہ دور ہو جائیں گے اور وہ گناہوں کی گندگی سے پاک صاف ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کے گناہ سمندر کے جھاگوں کے برابر حد و حساب سے باہر ہوں۔ گویا جس طرح تیز روشنی اندھیرے کو ایک دم ختم کر دیتی ہے اور جس طرح سخت تپش بالخاصہ نمی اور رطوبت کو فنا کر دیتی ہے اسی طرح اللہ کا ذکر اور دوسری نیکیاں گناہوں کے گندے اثرات کو فنا کر دیتی ہیں — لیکن جیسا کہ اسی سلسلۂ (معارف الحدیث) میں کئی بار پہلے ذکر کیا جا چکا ہے قرآن مجید کی بعض آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکیوں کی برکت اور تاثیر سے صرف وہ خطائیں معاف ہوتی ہیں جو "کبیرہ" درجہ کی نہ ہوں اس لیے بڑے درجہ کے گناہ جن کو خاص اصطلاح میں گناہِ کبیرہ کہا جاتا ہے اُن کی معافی کے لیے توبہ و استغفار ضروری ہے۔ واللہ اعلم۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْکَلَامِ اَفْضَلُ؟ قَالَ مَا اصْطَفَی اللّٰہُ لِمَلٰٓئِکَتِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ ———— رواہ مسلم

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کلاموں میں کون سا کلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا وہ کلام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے لیے منتخب فرمایا ہے یعنی "سبحان اللہ وبحمدہٖ"

(صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کا خاص ذکر یہی "سبحان اللہ وبحمدہٖ" ہے۔ — اس حدیث میں اس کلمہ کو سب سے افضل کہا گیا ہے اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی

مندرجہ بالا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سب سے افضل یہ چار کلمے ہیں "سبحان اللہ، الحمدللہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر" اور ایک دوسری حدیث میں "لا الٰہ الا اللہ" کو افضل الذکر فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں باتوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کلمے دوسرے سب کلاموں کے مقابلہ میں افضل اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔

(رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو کلمے ہیں زبان پر ہلکے پھلکے، میزانِ اعمال میں بڑے بھاری اور خداوند مہربان کو بہت پیارے۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ (صحیح بخاری ومسلم)

تشریح) ان دو کلموں کا زبان پر ہلکا ہونا تو ظاہر ہے اور اللہ تعالیٰ کو محبوب ہونا بھی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے، لیکن میزان اعمال میں بھاری ہونے والی بات کا سمجھنا شاید بعض لوگوں کے لیے آسان نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح مادی چیزیں ہلکی اور بھاری ہوتی ہیں اور ان کا وزن معلوم کرنے کے لیے آلات ہوتے ہیں جن کو میزان کہا جاتا ہے اسی طرح بہت سی غیر مادی چیزیں بھی ہلکی اور بھاری ہوتی ہیں اور ان کا ہلکا اور بھاری پن بتلانے والا آلہ ہوتا ہے وہی اس کی میزان ہوتی ہے، مثلاً حرارت اور برودت یعنی گرمی اور ٹھنڈک ظاہر ہے کہ مادی چیزیں نہیں ہیں بلکہ کیفیات ہیں لیکن ان کا ہلکا اور بھاری پن تھرمامیٹر کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے ۔۔ اسی طرح قیامت میں اللہ کے نام کا وزن ہوگا، کلماتِ ذکر کا وزن ہوگا، تلاوتِ قرآن کا وزن ہوگا، نماز کا وزن ہوگا، ایمان کا اور اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی محبت کا وزن ہوگا۔ اس وقت یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ بعض بہت چھوٹے اور ہلکے پھلکے کلمے بے حد وزنی ہوں گے ۔۔ ایک دوسری حدیث میں ہے حضورؐ نے فرمایا کہ "اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھی بھاری اور وزنی نہ ہوگی۔" (لَا يَثْقُلُ مَعَ اِسْمِ اللّٰهِ شَيْئٌ)

اس کلمہ "سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم" کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں اس کی حمد وستائش کے ساتھ، میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں جو بڑی عظمت والا ہے۔

عَنْ جُوَيْرِيَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ مِنْ عِنْدِهَا بُكْرَةً حِيْنَ صَلَّى الصُّبْحَ وَهِيَ فِيْ مَسْجِدِهَا ثُمَّ رَجَعَ بَعْدَ اَنْ اَضْحٰى وَهِيَ جَالِسَةٌ قَالَ مَا زِلْتِ عَلَى الْحَالِ الَّذِيْ فَارَقْتُكِ عَلَيْهَا؟ قَالَتْ نَعَمْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ قُلْتُ بَعْدَكِ اَرْبَعَ كَلِمَاتٍ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتِ مُنْذُ الْيَوْمِ لَوَزَنَتْهُنَّ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَرِضٰى نَفْسِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ ——— رواہ مسلم

اُمّ المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن نماز فجر پڑھنے کے بعد ان کے پاس سے باہر نکلے، وہ اس وقت اپنی نماز پڑھنے کی جگہ بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں، پھر آپ دیر کے بعد جب چاشت کا وقت آچکا تھا واپس تشریف لائے حضرت جویریہ اسی طرح بیٹھی اپنے وظیفہ میں مشغول تھیں آپ نے اُن سے فرمایا میں جب سے تمھارے پاس سے گیا ہوں کیا تم اس وقت سے برابر اس حال میں اور اسی طرح پڑھ رہی ہو؟ انھوں نے عرض کیا جی ہاں! آپ نے فرمایا تمھارے پاس سے جانے کے بعد میں نے چار کلمے تین دفعہ کہے، اگر وہ تمھارے اس پورے وظیفے کے ساتھ تولے جائیں جو تم نے آج صبح سے پڑھا ہے تو ان کا وزن بڑھ جائے گا۔ وہ کلمے یہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَرِضٰى نَفْسِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ (اللہ کی تسبیح اور اس کی حمد اس کی ساری مخلوقات کی تعداد کے برابر اور اس کے عرش عظیم کے وزن کے برابر اور اس کی ذات پاک کی رضا کے مطابق اور اس کے کلموں کی مقدار کے مطابق۔ (صحیح مسلم)

عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ اَنَّهٗ دَخَلَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى امْرَاَةٍ وَبَيْنَ يَدَيْهَا نَوًى اَوْ حَصًى تُسَبِّحُ بِهٖ فَقَالَ

اَلَا اُخْبِرُكَ بِمَا هُوَ اَيْسَرُ عَلَيْكَ مِنْ هٰذَا اَوْ اَفْضَلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي السَّمَاءِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي الْاَرْضِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا بَيْنَ ذَالِكَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ مِثْلَ ذَالِكَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ مِثْلَ ذَالِكَ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِثْلَ ذَالِكَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مِثْلَ ذَالِكَ ـــــ رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہونچے ایک بیوی کے پاس اور اُن کے آگے کھجور کی کچھ گٹھلیاں تھیں (یا سنگ ریزے تھے) وہ ان گٹھلیوں (یا سنگ ریزوں) پر تسبیح پڑھ رہی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو وہ نہ بتا دوں جو تمھارے لیے اس سے زیادہ آسان ہے (یا فرمایا کہ اس سے افضل ہے) وہ یہ ہے کہ تم اس طرح کہو۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي السَّمَاءِ۔	سبحان اللہ ساری آسمانی مخلوق کی تعداد کے مطابق۔
سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي الْاَرْضِ	سبحان اللہ ساری زمینی مخلوقات کی تعداد کے مطابق
سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا بَيْنَ ذَالِكَ۔	سبحان اللہ زمین و آسمان کے درمیان کی ساری مخلوقات کی تعداد کے مطابق۔
سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ۔	سبحان اللہ اُس ساری مخلوقات کی تعداد کے مطابق جس کو وہ ابدالآباد تک پیدا فرمانے والا ہے۔

اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ اسی طرح اور الحمد للہ اسی طرح اور لا الٰہ الا اللہ اسی طرح، اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ اسی طرح۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ زیادہ ثواب حاصل کرنے کا ایک طریقہ جس طرح کثرتِ ذکر ہے اسی طرح ایک آسان تر طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ ایسے الفاظ شامل کر دیے جائیں جو کثرتِ تعداد پر دلالت کرنے والے ہوں، جیسا کہ مندرجۂ بالا دونوں حدیثوں

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حدیثوں میں کثرتِ ذکر کی ترغیب دی ہے اور قریب ہی وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں آپ نے روزانہ سو دفعہ "سبحان اللہ وبحمدہ" کہنے والے کو گناہوں کے معاف کیے جانے کی خوشخبری سنائی ہے، اس لیے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث اور اس سے پہلے والی حضرت جویریہؓ کی حدیث سے کثرتِ ذکر کی نفی یا ناپسندیدگی سمجھنا ہرگز صحیح نہ ہوگا۔ ان دونوں حدیثوں کا منشا اور مدعا دراصل یہ ہے کہ زیادہ ثواب حاصل کرنے کا ایک زیادہ آسان طریقہ یہ بھی ہے اور خاص کر وہ لوگ جو اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے ذکر اللہ کے لیے زیادہ وقت فارغ نہ کرسکیں وہ اس طرح سے بھی بڑا ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ جس شخص کا مقصد اپنے باطن اور اپنی زندگی کو ذکر کے رنگ میں رنگنا ہو اس کو کثرتِ ذکر کا طریقہ اختیار کرنا ناگزیر ہے، اور جس کا مقصد ذکر سے صرف ثوابِ اُخروی حاصل کرنا ہو اُس کو ایسے کلماتِ ذکر کا انتخاب کرنا چاہیے جو معنوی لحاظ سے زیادہ فائق اور وسیع تر ہوں جیسے کہ ان دونوں حدیثوں میں مذکور ہیں۔

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ کی اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عہدِ نبویؐ میں تسبیح کا رواج تو نہیں تھا لیکن بعض حضرات اس مقصد کے لیے گٹھلیاں یا سنگ ریزے استعمال کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس میں اور تسبیح کے دانوں کے ذریعہ شمار میں کوئی فرق نہیں، بلکہ تسبیح دراصل اسی کی ترقی یافتہ اور سہل شکل ہے۔ جن حضرات نے تسبیح کو بدعت قرار دیا ہے بلاشبہ انھوں نے شدت اور غلو سے کام لیا ہے۔

ایک عظیم داعی

(از جناب وحید الدین خاں صاحب)

۲ اپریل ۱۹۶۵ کی شب کو تین بجے ایک ہوائی جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ اسمیں ایک مسافر تھا جو لاہور سے دہلی لایا گیا تھا۔ مسافر کی آمد ٹھیک اپنے پروگرام کے مطابق ہوئی۔ مگر اس طرح کہ اس کا جسم تو دہلی آیا اور روح اپنے رب کے پاس ابدی آرام کے لئے پہونچ چکی تھی۔

یہ مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ وہ فروری ۱۹۶۵ کے دوسرے ہفتہ میں براستہ لاہور ڈھاکہ کے اجتماع میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کے مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہوئے دوبارہ مغربی پاکستان واپس آئے اور یہاں بھی مختلف شہروں میں ان کا بہت مصروف پروگرام رہا اس سفر کی آخری منزل لاہور تھی۔ وہاں کے اجتماعات کی کارروائیوں میں بھی مکمل شرکت کی۔ اس کے بعد ۲ اپریل کو جمعہ کے دن بذریعہ ٹرین سہارنپور کے لئے روانہ ہونے والے تھے کہ اسی دن اچانک قلب کا حملہ ہوا اور ۲ بجے دن میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے بعد جنازہ رات کو لاہور سے دہلی لایا گیا۔

مولانا محمد یوسف صاحب ۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد مرحوم مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء کو تبلیغ کا کام سنبھالا اور اکیس سال تک برابر اسی کام میں لگے رہے اور اس مختصر مدت میں اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ وہ تحریک جو "میوات کے ان پڑھ مسلمانوں کو کلمہ و نماز سکھانے کی تحریک" کے نام سے مشہور تھی اس کو پہلے ملکی اور پھر ایک بین الاقوامی تحریک بنا دیا اور ہر طبقہ اور ہر ذہنی سطح کے لوگوں کو اس کثرت سے متاثر کیا کہ ایک بزرگ کے الفاظ میں "اس کی نظیر قریب کی پچھلی صدیوں میں تلاش کرنے سے مشکل سے ملے گی"۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہ راوی ہیں کہ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے چند مہینے بعد مراد آباد میں ایک تبلیغی اجتماع ہو رہا تھا۔ تبلیغ کے لئے اوقات دینے کا

رواج اس وقت تک میوات سے باہر بہت ہی کم ہوا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب نے تقریر کی اور اس کے بعد اوقات کا مطالبہ شروع ہوا۔ مگر بہت کم لوگوں نے اپنے نام لکھوائے۔ بجنور، چاندپور اور رام پور جیسے قریبی مقامات کے لئے دس دس آدمیوں کی جماعتیں بھی نہیں بن سکی تھیں۔ کئی آدمی ترغیب دلانے میں مصروف تھے اور اپنا پورا زور لگا رہے تھے مگر ناموں میں بالکل اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ مولانا یوسف صاحب جو تقریر کرنے کے بعد مسجد کے اندرونی حصے میں چلے گئے تھے۔ لوگوں کی سرد مہری دیکھ کر یکایک اٹھے اور میکروفون ہاتھ میں لے کر فرمانا شروع کیا کہ "آج تم بجنور، چاندپور اور رام پور جیسے قریبی مقامات کے لئے اور صرف تین تین دن کا وقت دینے کے لئے تیار نہیں ہو رہے ہو، ایک وقت آئے گا جب تم شام جاؤگے، مصر جاؤگے، عراق جاؤگے۔ مگر اس وقت اجر گھٹ جائے گا۔ کیونکہ اس وقت اس کا عام رواج ہو چکا ہوگا" مولانا محمد یوسف کی یہ بات جو بیس برس پہلے ایک خیالی بات معلوم ہوتی تھی، آج واقعہ بن چکی ہے۔ تبلیغی جماعتوں کی نقل و حرکت آج نہ صرف شام وعرب بلکہ یورپ، جاپان، امریکہ، افریقہ اور اقصائے مشرق سے اقصائے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ رات دن کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جب تبلیغی جماعت کے وفود دنیا کے مختلف حصوں میں گشت نہ کر رہے ہوں۔

دعوت میں انہماک مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جن لوگوں نے بھی قریب سے دیکھا ہے (اور ایسے لوگ بلاشبہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہیں) وہ جانتے ہیں کہ مولانا کو اپنی دعوت میں کس قدر انہماک تھا۔ ایک صاحب جو لاہور میں نماز فجر کے بعد مولانا کی ایک تقریر میں شریک تھے، فرماتے ہیں کہ نماز کے بعد مولانا نے تقریر شروع کی اور پورے تین گھنٹے تک انتہائی جوش وخروش کے ساتھ مجمع کو خطاب کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لاوا پھوٹ پڑا ہے اور ماحول کو گرمائے نہیں بلکہ پگھلائے جا رہا ہے۔ ۸½ بجے خطاب ختم ہوا اور ناشتہ کا دسترخوان بچھایا گیا۔ مولانا نے دسترخوان پر بیٹھتے ہی پھر گفتگو شروع فرما دی اور اس انداز سے الفاظ زبان سے نکلنے لگے کہ گفتگو کے زور، استدلال کی ندرت اور مطالب کی آمد کو دیکھ کر کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی تین گھنٹے کے زوردار خطاب سے فارغ ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ایک بالکل تازہ دم خطیب ہے جو بول رہا ہے۔

یہ ناشتہ کی مجلس تھی۔ مگر مولانا اپنی دعوت کی وضاحت میں اسقدر مستغرق تھے کہ انھوں نے ناشتہ کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک رفیق نے چائے کی پیالی پیش کی تو آپ نے پکڑ لی۔ دس پندرہ منٹ تک وہ یونہی پیالی ہاتھ میں پکڑے رہے اور پھر ایک شریک مجلس کے توجہ دلانے پر آپ نے وہ چائے جواب پانی کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی، حلق میں انڈیل لی۔ دوسری پیالی یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ حضرت یہ گرم ہے، پی لیجئے اور یہ بسکٹ بھی تناول فرمائیے۔ مگر اللہ کے اس بندے نے اس پیالی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ گفتگو میں مستغرق رہے اور ۱۰-۱۵ منٹ بعد اسے بھی پانی کی طرح پی لیا۔

اس کے بعد اٹھے اور ایک دوسرے اجتماع میں تقریر کے لئے تشریف لے گئے۔ اور یہ پہلے سے معلوم تھا کہ دوپہر سے قبل ایک تیسرا خطاب بھی کرنا ہے۔ یہ کوئی استثنائی واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہی آپ کی روزانہ کی زندگی تھی۔

مولانا کے ایک رفیق خاص راوی ہیں:

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ تقریر شروع فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور مراقب ہوتے تھے اور اس کے بعد تقریر شروع فرماتے تھے اور پھر ان کو خود اپنی بھی خبر نہیں رہتی تھی۔ اب سے ۸-۱۰ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ بھوپال میں اجتماع تھا۔ ان دنوں حضرت مولانا مرحوم کی ران میں ایک بہت بڑا زخم تھا جس کا حال یہ تھا کہ حرکت کرنے سے اور زور سے تقریر کرنے سے اس میں خون جاری ہو جاتا تھا۔ مولانا اسی حال میں بھوپال تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق اجتماع میں تقریریں بھی فرمائیں۔ زخم کی تکلیف کافی بڑھ گئی۔ بھوپال سے فارغ ہونے کے بعد وہاں سے ۴۰-۵۰ میل کے فاصلہ پر ایک اور اجتماع طے تھا۔ حضرت مولانا وہاں بھی تشریف لے گئے۔ لیکن طے یہ ہوا کہ یہاں مولانا تقریر نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ فلاں ساتھی کی تقریر ہوگی۔ مگر ساتھی کی تقریر کے بعد مولانا کو احساس ہوا کہ دعوت، قوت کے ساتھ نہیں دی جا سکی۔ تو اپنے اندرونی جذبہ سے مغلوب ہو کر خود تقریر کے لئے اصرار فرمایا۔ حالت یہ تھی کہ بیٹھنے کے لائق بھی نہیں۔ چنانچہ لیٹ کر بولنا شروع کیا۔ ادھر زخم کی یہ حالت ہوئی کہ اس میں سے خون جاری ہو گیا۔ ایک کپڑا لگا دیا جاتا جب وہ بالکل تر بتر

ہو جاتا تو دوسرا کپڑا لگا دیا جاتا۔ اس طرح کئی کپڑے خون سے بھر گئے۔ اور مولانا نے عادت کے مطابق پوری تقریر فرمائی۔ اندازہ ہے کہ اس تقریر کے دوران کم ازکم آدھا سیر خون مولانا کے جسم سے ضرور نکل گیا ہوگا۔ مگر اللہ کے اس بندے کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

گھر کے لوگ، خاص طور پر بیوی کو جتنی خبر کسی شخص کی ہوتی ہے، اتنی دوسروں کو نہیں ہوسکتی۔ مولانا کی اہلیہ جو اب مرحومہ ہوچکی ہیں دق کی مریض تھیں۔ اور آخر میں حالت کافی خراب ہوگئی۔ مگر مولانا کے اوقات میں ان کا حصہ بہت کم ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک صاحب نے اپنی بیوی کو مولانا کی اہلیہ کے پاس بھیجا اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ اس بارے میں تم ان سے ایسی طرح کی جذباتی باتیں کرنا کہ ان کے دل کی بات زبان پر آجائے اور اگر مولانا سے انھیں کوئی شکایت ہو تو ظاہر ہوجائے۔ چنانچہ راوی موصوف کی اہلیہ نے مرحومہ سے بات کی۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے مولانا کی طرف سے خود معذرت کی اور کہا کہ" وہ دن رات دین کی فکر اور دین کے کام میں لگے رہتے ہیں، انھیں اپنا بھی ہوش نہیں ہے۔ میں نے خود ہی ان سے کہہ دیا ہے آپ میری فکر بالکل نہ کریں۔ دوا علاج ہو ہی رہا ہے۔ اگر اللہ نے جنت میں جمع فرما دیا تو وہاں اطمینان سے رہنے کا موقع ملے گا۔" چند مہینوں کے بعد اسی مرض میں خاص نماز کی حالت میں مرحومہ کا انتقال ہوگیا۔

آپ کی دعوت یہ تڑپ اور لگن کس کام کے لئے تھے۔ صرف اسلئے کہ لوگوں کے اندر دین کا صحیح تصور آجائے اور زندگیاں اس کے مطابق چل پڑیں۔ مولانا کے نزدیک ایمان کا مطلب ایک لفظ میں یہ تھا کہ — "اللہ سے سب کچھ ہوتا ہے، چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا۔" ایک مرتبہ فرمایا:

> کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کا اس ذات پر یقین قائم ہوجائے جس کے کرنے سے کام ہوتا۔ یعنی اللہ جل جلالہ کی ذات پر۔ اور اس کی حیثیت کام کرنے والے پر ایسی منکشف ہو کہ اپنی ذات اور کوئی دوسری ذات دکھائی نہ دے۔ دوسرا یقین یہ ہو کہ جب میں ظاہر و باطن سے حضورؐ کے طریقوں پر آجاؤں گا تو رب العزت دنیا و آخرت میں اچھے حالات لائے گا۔"

ایک تقریر میں فرمایا:

"محنت کے دو میدان ہیں۔ ایک زمین اور زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں۔ دوسرے ایمان اور ایمان والے اعمال۔ پہلی محنت کا معاوضہ دنیا میں ملتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ملتا کہ محنت کرنے والے اس پر خوش اور مطمئن ہوں۔ دوسری محنت کا معاوضہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ بھرپور دے گا۔" مولانا کے نزدیک دنیوی غلبہ اسلامی زندگی کا ایک نتیجہ تھا۔ فرمایا:۔

"تم حضورؐ کے نمونہ پر بننا شروع کر دو۔ جتنا بننا ہوگا بن جائے گا اور جو بننے والا نہیں ہوگا اور بننے والوں کے لئے رکاوٹ بنے گا، خدا اسے اس طرح توڑ دے گا جیسے انڈے کے چھلکے کو توڑ دیتا ہے۔ تم جن کو بڑی طاقتیں کہتے ہو، خدا کے نزدیک ان کی حیثیت مکڑی کے جالے کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس دنیا میں پاکیزہ انسانوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مکڑیوں کے بڑے بڑے جالے لگ گئے تھے، جب حضور کی سعی سے پاکیزہ انسان بن گئے تو خدا نے عذاب کی ایک جھاڑو سے روم و فارس کے جالے صاف کر دئے تھے۔ بالکل یہی صورت روس اور امریکہ کی ہوگی۔"

ایک طویل مکتوب کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"اللہ نے انسانوں کی تمام کامیابیوں کا دارومدار انسان کے اندرونی مایہ پر رکھا ہے۔ کامیابی اور ناکامی انسان کے اندر کے حال کا نام ہے . . . . اللہ جل شانہ ملک و مال کے ساتھ انسان کو ذلیل کرکے دکھا دیں اور فقر کے نقشہ میں عزت دے کر دکھا دیں۔ انسان کے اندر کا یقین اور اندر سے نکلنے والے عمل اگر ٹھیک ہوں گے تو اللہ جل شانہٗ کامیابی کی حالت پیدا فرما دیں گے خواہ چیزوں کا نقشہ کتنا ہی پست کیوں نہ ہو . . . . جو کچھ قدرت سے بنا ہے وہ قدرت کے ماتحت ہے . . . . ہر شکل پر خواہ ملک کی ہو یا مال کی، برق کی ہو یا بھاپ کی، ان کا ہی قبضہ ہے اور وہ ہی تصرف فرماتے ہیں۔ جہاں سے انسان کو تعمیر نظر آتی ہے وہاں سے تخریب لاکر دکھا دیں اور جہاں سے تخریب نظر آتی ہے وہاں سے تعمیر لاکے دکھا دیں . . . . اللہ جل شانہ کی ذات عالی سے تعلق پیدا ہو جائے اور ان کی قدرت سے براہ راست استفادہ ہو، اس کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے طریقے لے کر آئے ہیں۔ جب ان کے طریقے زندگیوں میں آئیں گے تو اللہ جل شانہٗ

ہر نقشے میں کامیابی دے کر دکھائیں گے ۔۔۔ آج امت میں کسی حد تک انفرادی اعمال کا رواج ہے گو ان کی حقیقت نکلی ہوئی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے طفیل پوری امت کو دعوت والی محنت ملی تھی ۔ اس کے بندوں کا تعلق اللہ جل شانہ سے قائم ہو جائے ۔ اس کے لئے انبیاء علیہم السلام نے اپنے طرز پر اپنی جان و مال کو جھونک دینا اور جن میں محنت کر رہے ہیں ان سے کسی چیز کا طالب نہ بننا ، اس کے لئے ہجرت بھی کرنا اور نصرت بھی کرنا ۔۔۔۔ اس راستہ میں محنت کرنے والوں کی دعائیں بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں کی طرح قبول ہوتی ہے ۔ یعنی جس طرح ان کی دعاؤں پر اللہ جل شانہٗ نے ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کو استعمال فرما کر ان کو کامیاب فرمایا اور باطل خداکوں کو توڑ دیا اسی طرح اس محنت کرنے والوں کی دعاؤں پر اللہ جل شانہٗ ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کے مظاہرے فرمائیں گے ۔ اور اگر عالمی بنیاد پر محنت کی گئی تو تمام اہل عالم کے قلوب میں ان کی محنت کے اثر سے تبدیلیاں لائیں گے ۔"

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "چیزوں میں سے چیزیں نکل رہی ہیں اور چیزوں میں سے اثرات و خواص ظاہر ہو رہے ہیں" مگر مولانا کے نزدیک انبیاء کے ذریعہ جو حقیقت انسانوں پر کھولی گئی ہے وہ یہ ہے کہ " جو کچھ چیزوں سے بنتا ہوا اور ظاہر ہوتا ہوا نظر آتا ہے ، یہ چیزوں سے نہیں بنتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور امر سے بنتا ہے ۔" اگر یہ حقیقت ذہنوں میں پوری طرح بیٹھ جائے تو مولانا کے الفاظ میں " بازار کے نقشوں سے اساس زندگی ہٹ کر دعاؤں پر آجاتی ہے اور بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل مرحلہ خداوند قدوس کی قدرت کاملہ سے آسان سے آسان بن جاتا ہے " مولانا کی تقریریں جن لوگوں نے سنی ہیں وہ جانتے ہیں کہ مولانا کا سب سے زیادہ زور اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے پر ہوتا تھا کہ محنت اور کوشش کا اصل میدان کیا ہے ۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زراعت ، تجارت ، ملازمت وغیرہ محنت کے میدان ہیں ۔ اسی طرح اجتماعی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے لوگ جن چیزوں پر انحصار کرتے ہیں وہ الکشن اور حکومت پر اثر ڈالنے اور اس پر قبضہ کرنے کی دوسری کوششیں ہیں ۔ مگر مولانا کا کہنا تھا کہ یہ چیزیں مثل بجلی کے بلب اور پنکھے کے ہیں ۔ بلب اور پنکھے پر عمل کر کے ہم نہ انھیں روشن کر سکتے ہیں اور نہ انھیں چلا سکتے ہیں ، بلکہ اس کے لئے بجلی کے بٹن تک

ہاتھ پہنچانے کی ضرورت ہے، اسی طرح اگر خدا سے تعلق پیدا ہو جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور اگر تعلق پیدا نہ ہو تو ساری کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

طریق کار | اس مقصد کے لئے مولانا کا طریق کار نہایت سادہ تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسجدوں کو ان کے اعمال کے ساتھ زندہ کرنے کی کوشش۔ گشت اور سفر جس پر مولانا بہت زور دیتے تھے، اس کا مقصد بھی حقیقۃً آدمی کو "مسجد والا" بنانا تھا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ لوگوں کو انکی روزمرہ کی دنیوی مصروفیتوں سے نکال کر کچھ دنوں کے لئے ایک خاص طرح کی دینی فضا میں رکھا جائے۔ جب کہ آدمی عبادات واذکار میں وقت گزارے دوسروں کو دینی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرے، اور اس طرح تربیت یافتہ ہو کر جب اپنے وطن واپس آئے تو آئندہ مسجد والی زندگی میں مصروف ہو جائے۔ مسجد والی زندگی ہی مولانا کے نزدیک دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضامن تھی۔

ایک جماعت کے نام خط میں اس طرح طریق کار کی وضاحت فرماتے ہیں:

"دین سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ہر شخص سے خواہ کسی شعبہ سے متعلق ہو، چار ماہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اپنے مشاغل، ساز و سامان اور گھر بار سے نکل کر ان چیزوں کی دعوت دیتے ہوئے اور خود مشق کرتے ہوئے ملک بہ ملک، اقلیم بہ اقلیم، قوم بہ قوم، قریہ بہ قریہ پھریں گے۔ حضور اقدس صلعم نے ہر امتی کو مسجد والا بنایا تھا۔ مسجد کے کچھ مخصوص اعمال ہوتے تھے، مسجد میں اللہ کی بڑائی کی، ایمان کی اور آخرت کی باتیں ہوتی تھیں، اعمال سے زندگی بننے کی باتیں ہوتی تھیں۔ عملوں کے ٹھیک کرنے کی تعلیمیں ہوتی تھیں۔ ایمان و عمل صالح کی دعوت کے لئے ملکوں اور علاقوں میں جانے کی تشکیلیں بھی مسجد ہی سے ہوتی تھیں۔ اللہ کے ذکر کی مجلسیں مسجدوں میں ہوتی تھی۔ یہاں تعاون، ایثار، ہمدردیوں کے اعمال ہوتے تھے، ہر شخص حاکم، محکوم، مالدار، غریب، تاجر، زارع، مزدور، مسجد میں آکر زندگی سیکھتا تھا۔ اور باہر جاکر اپنے اپنے شعبہ میں مسجد والے تاثر سے چلتا تھا۔ آج ہم دھوکے میں پڑ گئے کہ ہمارے پیسے سے مسجد چلتی ہے۔ مسجدیں اعمال سے خالی ہو گئیں اور چیزوں سے بھر گئیں۔ حضور صلعم نے مسجد کو بازاروں کے تابع نہیں کیا حضور صلعم کی مسجد میں نہ بجلی تھی، نہ پانی تھا، نہ غسل خانے تھے، خرچ کی کوئی شکل نہ تھی۔ مسجد میں آکر داعی

بنتا تھا، معلم اور متعلم بنتا تھا، ذاکر بنتا تھا، نمازی بنتا تھا، مطیع بنتا تھا، متقی زاہد بنتا تھا، خلیق بنتا تھا، باہر جاکر ٹھیک زندگی گزارتا تھا، مسجد بازار والوں کو چلاتی تھی۔
ان چار ماہ میں ہر جگہ جاکر مسجدوں میں ہر امتی کو لانے کی مشق کریں۔ مسجد والے اعمال کو سیکھتے ہوئے دوسروں کو یہ محنت سیکھنے کی لئے تین چلوں کے واسطے آمادہ کردیں۔ واپس اپنے مقام پر آکر اپنی بستی کی مسجد میں ان اعمال کو زندہ کرنا ہے۔ ہفتہ میں دو مرتبہ گشت کے ذریعہ بستی والوں کو جمع کر کے انھیں چیزوں کی طرف متوجہ کرتا اور مشق کے لئے فی گھر ایک نفر تین چلوں کے لئے باہر نکلنا ہے ایک گشت اپنی مسجد کے ماحول میں اور دوسرا گشت دوسری مسجد کے ماحول میں کریں۔ ہر مسجد میں مقامی جماعت بھی بنائیں ہر مسجد کے احباب روزانہ فضائل کی تعلیم کریں۔ اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے، اس کے لئے ہر مسجد سے تین یوم کے لئے جماعتیں پانچ کوس کے علاقے میں جائیں۔ ہر دوست مہینے میں تین یوم پابندی سے لگائے الحسنۃ بعشر امثالھا کے مصداق تین دن پر تیس دن کا ثواب ملے گا۔ پورے سال ہر مہینے تین دن لگائے تو سارا سال اللہ کی راہ میں شمار ہوگا۔"

اشاعت سے پرہیز | مولانا اشاعت کے عام طریقوں کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

"اس کام کی تعمیم کے لئے رواجی طریقوں۔ اخبار، اشتہار، پریس وغیرہ اور رواجی الفاظ سے بھی پورے پرہیز کی ضرورت ہے۔ یہ کام سارا کا سارا غیر رواجی ہے۔ رواجی طریقوں سے رواج کو تقویت پہونچے گی اس کام کو نہیں۔ اصل کام کی شکلیں، دعوت گشت، تعلیم، تشکیل وغیرہ ہیں۔"

مولانا کے ذہن میں لٹریچر کا جو تصور تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

"فضائل قرآن مجید پڑھ کر تھوڑی دیر کلام پاک کی ان سورتوں کی تجوید کی مشق کی جائے جو عموماً نمازوں پر پڑھی جاتی ہے۔ اللہ پاک توفیق دیں تو ہر کتاب میں سے تین چار صفحے پڑھے جائیں۔ تعلیم میں اپنی طرف سے تقریر نہ ہو۔ حدیث شریف پڑھنے کے بعد دو تین جملے ایسے کہے جائیں گے ان سے عمل کا جذبہ و شوق ابھر آئے۔ حضرت شیخ الحدیث

مولانا محمد زکریا صاحب دام برکاتہم کی تالیف فرمودہ فضائل قرآن مجید فضائل نماز، فضائل تبلیغ فضائل ذکر، فضائل صدقات حصہ اول دوم، فضائل رمضان، فضائل حج (ایام حج و رمضان میں) علاوہ مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی دام مجدہٗ کی (مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج) صرف یہ کتابیں ہیں جن کو اجتماعی تعلیم میں پڑھنا اور سننا ہے اور تنہا یکسوئی میں بیٹھ کر بھی انکو پڑھنا ہے۔"

اشاعت سے پرہیز کا یہ عالم تھا آپ کی وفات کے بعد آپ کے مکاتیب کی تلاش میں ایک صاحب نے دہلی کا سفر کیا مگر وہاں ایک مکتوب کی نقل بھی محفوظ نہیں مل سکی۔ حالانکہ آپ کثرت سے خطوط لکھتے تھے۔

غیر مسلموں میں تبلیغ | غیر مسلموں میں تبلیغ کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں میں دینی زندگی پیدا نہ ہو، اغیار میں دین کے لئے کشش پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک دفعہ فرمایا:

"جب تک یقین اور علم نبوت کے مطابق عبادات درست نہ ہو جائیں، اخلاق نہیں آتے، اور جب تک ہم میں اخلاق نہیں آئیں گے دوسروں میں دین نہیں پھیلے گا۔ اغراض کے لئے کسی سے سلوک کرنا اخلاق نہیں ہے بلکہ کوئی کام بھی جب تک اس میں اخلاص نہ ہو اس کی قطعاً کوئی قیمت نہیں ہے۔ عمل اخلاص کے بغیر مردہ ہے اور دیکھو، گھروں، بازاروں، دفتروں، یہاں تک کہ مدارس و مساجد میں بھی ایسے مرداروں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔"

اسی لئے آپ کم از کم پہلے مرحلہ میں اصلاح و تبلیغ کی زیادہ تر کوشش مسلمانوں پر صرف کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

اجتماعیت | مولانا اجتماعیت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اپنے رفقا کو آپکی ہدایت ہوتی تھی کہ "ہر کام کو اجتماعی کریں۔ حتی کہ سفر میں بھی یکجا رہنے کی بھرپور کوشش کی جائے" مگر اجتماعیت کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر عام تصور سے کچھ مختلف تھا۔ اس کو ہم شاید اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ آپ کے نزدیک اجتماعیت کی اہمیت تھی مگر جماعت بندی کی نہیں۔ فرماتے ہیں:

"ہم نے اس کام کے لئے کوئی انجمن نہیں بنائی۔ نہ اس کا کوئی دفتر ہے نہ رجسٹر ہے

نہ فنڈ ہے۔ یہ سارے ہی مسلمانوں کا کام ہے ہم نے مروجہ طریقہ پر کوئی علٰحدہ جماعت بھی نہیں بنائی ہے۔ جس طرح مسجد میں نماز کے عمل پر مختلف طبقوں اور مشغلوں والے مسلمان آکر جڑ جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں اور مشغلوں میں چلے جاتے ہیں اسی طرح ہم آپ سب سے کہتے ہیں کہ کچھ وقت کے لئے اپنے گھروں اور مشغلوں سے نکل کر یہ محنت اور مشق کر لیجئے۔ اور پھر اپنے گھروں اور مشغلوں میں آکر ان اصولوں کے مطابق لگ جائیے ــــ آپ نے اگر یہ چیز محنت کر کے حاصل کر لی تو دنیا بھر کے سائنس والے آپ سے یہ طریقہ سیکھنے آئیں گے اور خدا نے چاہا تو آپ دنیا کے امام ہوں گے۔"

حکمت تبلیغ ایک تقریر میں تبلیغی کارکنوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا:

خصوصی گشت میں اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب جن سے آپ ملنے گئے ہیں اس وقت توجہ سے بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں تو مناسب طریقہ سے جلدی سے بات ختم کر کے ان کے پاس سے اٹھ آنا چاہیئے۔ اور ان کے لئے دعا کرنی چاہیئے اور اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب متوجہ ہیں تو پھر پوری بات انکے سامنے رکھنی چاہیئے ...... خصوصی گشت میں جب دینی اکابر کی خدمت میں حاضری ہو تو ان سے صرف دعا کی درخواست کی جائے اور انکی توجہ دیکھی جائے تو کام کا کچھ ذکر کر دیا جائے۔"

دعا مولانا کی تقریروں کا خاتمہ ہمیشہ دعا پر ہوتا تھا۔ لفظ "دعا" اپنے عام استعمالی مفہوم کے لحاظ سے شاید اس کیفیت کو ادا کرنے سے قاصر ہے جو مولانا کی دعا میں ہوتی تھی۔ مولانا کی دعوت کا اصل اور مغز اللہ سے استعانت اور دعا کا تعلق پیدا کرنا تھا۔ اور یہ چیز انکی دعا میں اس طرح ابھر آتی تھی کہ اس وقت وہ اپنی دعوت کا مجسم نمونہ بن جاتے تھے۔ ایک واقف حال کے الفاظ میں "جب دعا کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ نہ اس سے پہلے دعا کی ہے نہ اس کے بعد کریں گے۔ سب کچھ اسی دعا میں مانگ لینا ہے اور سب کچھ اسی دعا میں کہدینا ہے۔" مولانا کی دعا کی کیفیت، اس کے مضامین، اس کی آمد اور جوش و خروش، اس کی رقت انگیزی اور اسکی تاثیر مولانا کے ان خصائص میں سے تھی جن کی مثال دور دور دیکھنے میں نہیں آئی۔ جب دعا کرتے، حاضرین کا عجیب حال ہوتا، خاص طور پر جب اردو میں دعا کے الفاظ ادا فرماتے تو آنسوؤں کا

سیلاب امنڈ پڑتا۔ دور دور سے رونے والوں کی ہچکیاں سننے میں آتیں"۔

ایک صاحب جو ایک اجتماع میں شریک تھے، لکھتے ہیں:

"مولانا محمد یوسف صاحب نے دعا کی۔ اپنے گناہوں کی توبہ، مغفرت، آخرت کی سرخروئی، دین کی عظمت، تمام انسانوں کے لئے ہدایت طلبی، یہ سب باتیں اللہ سے طلب کی گئیں۔ دعائیں مانگی گئیں جس طرح مانگنے کا حق ہوتا ہے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو روئی نہ ہو کوئی زبان نہ تھی جو ہلی نہ ہو، کوئی دل نہ تھا جو پھٹ پڑنے پر نہ آیا ہو۔ بس ایک ہی احساس تھا کہ اتنی زندگی جو گزری ناکامی میں گزری۔ میں ہی سراپا معصیت ہوں۔ سب بُرائیاں مجھ ہی میں ہیں۔ اے اللہ ان سب کوتاہیوں کو معاف فرما اور میری زندگی کو اپنے راستہ پر لگا دے۔"

ایک دعا جو اتفاق سے ٹیپ رکارڈر کے ذریعہ محفوظ ہو گئی ہے، اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

"اے اللہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما ..... اے خدا ہماری محنت کے بگڑ جانے کے اس جرم عظیم کو معاف فرما جس جرم عظیم سے ہزاروں خرابیاں ہم میں پیدا ہو گئیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس محنت پر ڈال کر گئے اس محنت کو چھوڑ کر ہم ان محنتوں میں الجھ گئے جن محنتوں سے نکال کر وہ گئے تھے ..... اے اللہ ہمیں عصیاں کی دریاؤں سے نکال دے اور ہمیں طاعت کی سڑکوں پر ڈال دے ...... اے خدا اونر قدوس جس قسم کے زمانے میں تو نے اس تبلیغ کے ذریعہ اس کلمہ و نماز پر محنت کی صورت پیدا فرما دی اور اپنی راہ میں نکلنے کی توفیق دی ..... اے رب کریم اپنے کرم سے سب کو قبول فرمالے اور ان سب کی ایسی تربیت فرما کہ یہ نقل و حرکت تجھے پسند آجائے ...... اے اللہ درندوں کی اور اژدہوں کی قسم سے جتنے انسان اور درندے ہیں اور جن کو تجھے انسانیت سے نوازنا ہی نہیں، اے خدا ایسے والیوں کو چن چن کر ہلاک فرما۔ ایسوں کی زمینوں کو، ان کے لئے پھاڑ دے، ایسوں کے مکانوں کو ان پر توڑ دے۔ ایسوں سے نعمتوں کو اپنی چھین لے ..... اے خدا لوٹ کھسوٹ کے ماحول کو ختم کر، ظلم و ستم کے ماحول کو ختم کر، عدل و انصاف کے ماحول کو قائم کر، علم و ذکر کے ماحول کو قائم کر، خدمت خلق کے ماحول پیدا کر تعاون و ہمدردی و محبت کے ماحول کو

قائم کر ...... اے اللہ ہماری دعاؤں کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔

مقبولیت | مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بجنور کے ایک اجتماع کے مشاہد فرماتے ہیں ــــــ "اس میں حضرت مولانا اپنے تمام رفقاء کے ہمراہ تشریف لائے تھے، عقیدت مندوں کے ہجوم نے بڑی دشواری پیدا کر دی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مولانا سے مصافحہ کر لوں۔ اتنظاماً قیام گاہ پر بعض میواتیوں کا پہرہ لگانا پڑا۔ پھر بھی قیام گاہ کے دروازہ کی چوکھٹ، داخلے کی بے محابا کوشش کرنے والوں کی وجہ سے اکھڑ گئی۔ جب مولانا قیام گاہ سے جلسہ گاہ میں تشریف لاتے، مجمع آپ کے گرد سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا نظر آتا۔"

مولانا شیخ طریقت بھی تھے۔ بیعت چاروں سلسلوں میں اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے نماسطے سے کرتے تھے۔ ایک صاحب رائے ونڈ کا حال بیان کرتے ہیں "ایک کثیر مجمع نے بیعت کی۔ بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں میں پگڑیاں اور چادریں وغیرہ تھیں اور اتنا کثیر مجمع تھا کہ کئی حضرات مکبر کی طرح پکار پکار کر الفاظ بیعت کو بیعت کرنے والوں تک پہنچا رہے تھے۔ عجیب دلکش منظر تھا۔ میرے ایک عزیز کہنے لگے کہ آج تو حضرت جی نے امام شہید (سید احمد صاحب رائے بریلوی) کی یاد تازہ کر دی۔"

تقریر | مولانا کو تقریر کا عجیب و غریب ملکہ تھا جو کچھ وہبی تھا اور کچھ ان کے دعوتی جذبہ نے انکے اندر پیدا کر دیا تھا۔ ایک عالم کے الفاظ میں آپکی تقریروں کو سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک علم عطا ہوا ہے (جو مدرسہ اور کتب خانہ کا علم نہیں ہے) اور اسی کا نام حکمت ہے اور قوت بیان مزید برآں ہے۔" بعض قریبی لوگوں کا اندازہ ہے کہ آخر میں مجموعی طور پر آٹھ آٹھ گھنٹے بولنے کی نوبت آتی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ سننے والے خواہ وہ جاہل ہوں یا عالم آپکی تقریریں سننے سے گھبراتے نہیں تھے بلکہ پوری تقریر کے دوران ہمہ تن گوش بنے رہتے تھے۔ اور ایک کثیر تعداد کا یہ عالم ہوتا تھا کہ شدت پسندیدگی میں وہ قلم کاغذ لے کر اسکو دوران تقریر ہی میں نوٹ کرنا شروع کر دیتے تھے۔ آپ تقریر پر تقریر کرتے رہتے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر بعد کی تقریر میں نئے سننے والوں کو یہ اندازہ ہوتا کہ بولنے والا ابھی وقت بولنے کھڑا

ہو ہلسہ اور اس سے پہلے اس کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس موقع پر اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے۔"

ایک صاحب مولانا کے ایک سفر کی روداد بیان کرتے ہیں۔ ہر جگہ جہاں آپ کا جانا ہوا، صبح و شام گھنٹوں خطاب فرماتے رہے۔ بولتے بولتے گلے میں سوجن پڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے اصرار سے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کے لئے بولنا چھوڑ دیا جائے۔ مگر حضرت مولانا اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ حسب عادت تقریروں اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا اور مرض ترقی کرتا گیا۔

تقریر کا انداز بھی عجیب تھا۔ بات کرتے کرتے آستین چڑھاتے پھر اتارتے۔ بیٹھ کر تقریر شروع کرتے اور پھر درمیان میں کھڑے ہو جاتے۔ کبھی درمیان کلام میں ایک آہ بھرتے جو درد و اثر میں ڈوبی ہوئی عجیب کیفیت پیدا کر دیتی۔ ایک صاحب فرماتے ہیں:

"حضرت جی گھنٹوں مسلسل بیان کرتے رہتے تھے بندہ نے خود ایک دن میں حضرت کے پانچ بیان سنے ہیں۔ جن میں سے ایک ساڑھے پانچ گھنٹے کا تھا۔ یہاں علوم اندر سے پھوٹ کر نکلتے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نہیں کہہ رہے ہیں، کہلوایا جا رہا ہے۔ علوم دینیہ کا فیضان موسلا دھار بارش کی طرح حضرت کے قلب پر ہوتا تھا۔"

ذوق علم | آپ کے علمی ذوق کے بارے میں آپ کے ایک قریبی واقف کار روایت کرتے ہیں کہ ایکبار مولانا نے فرمایا — "میں نے سوا ایک دفعہ کے بازار سے ایک آنہ کی بھی مٹھائی خرید کر نہیں کھائی۔ یہ وجہ نہ تھی کہ میرے پاس پیسے نہ ہوتے تھے، بلکہ بات یہ تھی کہ میں نے پیسے جمع کرنے کا ایک ڈبہ بنا لیا تھا اور اس میں جو پیسے مجھ کو ملتے ڈال دیا کرتا تھا کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتابیں خریدوں گا۔" تعلیم کے زمانے میں مولانا انعام الحسن صاحب آپ کے ساتھی اور ہم سبق تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ "ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ رات کے ابتدائی آدھے حصہ میں ہم میں سے ایک مطالعہ کرے گا اور دوسرا سوئے گا۔ اور آدھی رات ہو جانے پر مطالعہ کرنے والا چائے بنائے گا اور دوسرے ساتھی کو اٹھا کر اور اس کے ساتھ چائے پی پلا کر سو جائے گا۔ اور اسی دوسرے کے ذمہ ہوگا کہ فجر کی جماعت کے لئے سونے والے ساتھی کو اٹھائے۔ ایک دن حضرت مولانا مرحوم شروع رات میں مطالعہ کرتے تھے اور میں سوتا تھا۔ اور دوسرے دن برعکس ترتیب

جیتی جاگتی ہے۔

بستی نظام الدین کی زندگی میں آپ کا معمول تھا کہ روزانہ ایک خاص وقت میں آپ اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں مقرر وقت تک مطالعہ اور تحریر کا سلسلہ جاری رہتا۔

زبان | کسی تحریک کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ایک زبان پیدا کرتی ہے۔ مولانا یوسف صاحب نے بھی تبلیغی تحریک کو ایک مخصوص زبان اور طرز ادا دیا جو اس طرح رائج ہوا کہ ہزاروں افراد کی زبان سے بے تکلف ادا ہونے لگا۔ مثلاً مسجد میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہو رہا ہے اور اس میں شرکت کی دعوت دینی ہے تو اس طرح کہیں گے "بھائی مسجد میں کچھ فکر کی بات ہو رہی ہے، آؤ وہاں چلیں" مولانا یوسف صاحب اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "جب محلوں کی مساجد میں ہفتوں کی دو گشتوں کے ذریعہ فی گھر ایک آدمی تین چلے کے لئے نکلنے کی آواز لگ رہی ہوگی۔ تعلیموں اور تسبیحات پر احباب جڑ رہے ہوں گے۔ ہر مسجد سے تین دن کے لئے جماعتیں نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہوں گی تو شب جمعہ کا اجتماع صحیح نہج پر ہوگا اور کام کے بڑھنے کی صورتیں بنیں گی۔ ... مشورے سے ایسے احباب سے عموماً دعوت دلوائی جائے جو محنت کے میدان میں ہوں اور جن کی طبیعت پر کام کے تقاضے غالب ہوں۔ بہت ہی فکر و اہتمام سے تشکیلیں کی جائیں۔ اگر اوقات وصول نہ ہوں تو رات کو بھی محنت کی جائے، رو رو کر مانگا جائے ... تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں کسی نہ کسی نقشہ کے مقابلہ پر آئے اور بتایا کہ کامیابی کا اس نقشہ سے بالکل کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں "جزیرۂ عرب کو دین حیات کیلئے جان کھپانے کا مرکز قرار دے کر اس میں طریقہ جہد کے سیکھنے سکھانے کا رواج ڈال کر ہر طرف دین حیات کے لئے ٹھوکریں کھانے کے لئے مقامی احباب کے ساتھ مل کر روانہ کرنے کا رخ کر ڈالا جائے ...... تین تین چلہ کی جم کر عبت دیں ...... غرباء کس میرس طبقات میں کام کا ضرور پھیر ڈالیں۔"

اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے اس کے لئے ہر مسجد سے تین یوم کے لئے جماعتیں پانچ پانچ کوس کے علاقے میں جائیں" ماہ رمضان کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "کیا ہی اچھا ہو کہ اس مبارک زمانہ میں بھی تین تین چلوں کے لئے تشکیل کر کے جماعتیں روانہ کی جائیں تاکہ

ارکان اسلام کی حیات والی محنت کا حساب اس ماہ میں قائم ہو۔ اور اس ماہ میں چلہ کے لئے نکلنے کی برکت سے زیادہ وقت کے لئے اللہ رب العزت کے راستہ میں رواج پڑ جائے۔"

یہ نمونہ کے چند ٹکڑے ہیں۔ اس طرح مولانا نے ایک مستقل تبلیغی زبان پیدا کی جس کے اندر سادگی کے ساتھ گہرائی اور تحریکی شدت کے ساتھ مٹھاس کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔

آخر میں ایک واقعہ پر اس گفتگو کو ختم کروں گا۔ ندوہ کے ایک عالم نے مجھ سے بیان کیا۔ ایک جلسہ میں مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر ہو رہی تھی۔ پورے مجمع پر مسحور کن خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مقرر حکمت و معرفت کی بارش برسا رہا تھا۔ قبلہ محترم جناب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ بھی اس جلسہ میں تشریف رکھتے تھے۔ راوی کا بیان ہے کہ ایک موقع پر جبکہ تقریر اپنے عروج پر تھی۔ مولانا محترم کی زبان سے بے اختیار نکلا ——— "اگر میں قسم کھاؤں تو میں حانث نہیں ہوں گا کہ اس وقت پورے اسلامی عالم میں اس درجہ یقین و ایمان کے ساتھ بولنے والا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے۔"

یہ مولانا کے بارے میں ایک ایسے شخص کی شہادت ہے جس کو ذاتی طور پر اسلامی دنیا کو جاننے کے اتنے مواقع ملے ہیں جتنے موجودہ دور میں شاید ہی کسی دوسرے شخص کو ملے ہوں۔

دربارِ عالمگیری

(از مولانا ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی ایم اے پی ایچ ڈی کاکوروی)

(۱۲)

کہتے ہیں کہ شیخ محمد معصومؒ کے مریدوں کی تعداد ۹ لاکھ کے لگ بھگ تھی ۔ اور خلفاء جو کمالات ارشاد و ہدایت سے کامل و مکمل ہو چکے تھے یہ کوئی ۷ ہزار ہوں گے ۔ ایک صرف عالمگیر ہی نہیں بلکہ جہانگیر اور شاہجہاں بھی آپ سے پوری عقیدت رکھتے اور آپ سے ہی بیعت تھے اور پیر کی زیارت کے لیے سرہند حاضری دیا کرتے ۔ شہرۂ آفاق رسالہ منطق کے مصنف میرزاہد اور فارسی کے شاعر زمانہ ناصر علی سرہندی کو بھی ارادت کا فخر حاصل رہا ۔ آخر الذکر نے آپ کی شان میں یہ شعر لکھا ہے

چراغ ہفت محفل خواجہ معصوم
منور تا فروغش ہند تا روم

علوم اسلامیہ میں آپ کا یہ پایہ تھا کہ تفسیر بیضاوی ، مشکوٰۃ المصابیح ، ہدایہ عضدی ، اور توضیح تلویح کے اسباق پڑھنے کے لیے آپ کے گرد طلباء کا ہجوم رہتا ، منجملہ ان سالکین کے جو اپنے روحانی کوائف اور احوال سے شیخ کو مطلع کرتے رہتے اور آپ ان کی تربیت اور پرداخت کے لیے وقتاً فوقتاً اصلاحاً کچھ لکھتے ۔ ایک شاہ عالمگیر بھی تھے جنھوں نے ارشادات گرامی پر عمل پیرا ہو کے اپنی روحانی کیفیات لکھی ہوں گی ۔ ان کے جوابات بھی شیخ کے مکتوبات میں ملتے ہیں اور جن کا خلاصہ یہ ہے :۔

"اما بعد۔ ذرّہ احقر بعرض می رساند۔ بڑا اچھا حال ہے ان کا جو اس امر عظیم کے لیے کمر ہمت چست رکھے ہوئے ہیں اور اس سلسلہ کے مشکل اور دشوار سفر کو جو درحقیقت مثمر برکات اور وسیلۂ ترقی درجات ہے ..... ذوق شوق کے ساتھ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ حضرت انس نے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کسی نے کسی رات اللہ کے راستے میں مسلمانوں کی طمانیت اور امن و سکون کے لیے چوکیداری کی ان کو ان تمام کا اجر ملے گا جو مامون مقامات پر اطمینان سے روزے رکھ رہے ہیں اور نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ افسوس کہ یہ کاتب اس نعمت خوشگوار سے ظاہراً محروم اور بعض موانع کی بنا پر اس قسم کی فی سبیل اللہ خدمت سے مجبور۔ لیکن باطناً اپنے کو ساتھ پاتا اور دعا کی راہ سے معاون تصور کرتا ہے۔ اگر گوشہ نشین فقراء سالہا سال ریاضت کریں اور چلّے کھینچیں تب بھی اس عمل کو نہیں پہونچ سکتے جس میں آپ لگے ہیں۔ وہ عبادات جو دینی جد و جہد کے راستے میں ہوتی ہیں، طاعت صرف سے ان کا درجہ کہیں بڑھا چڑھا ہے۔ اس راہ میں بیماریاں آئیں تو ان کا ثواب بھی زائد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس مہم میں آپ لگے ہوئے ہیں وہ دراصل اللہ کے راستے ہی کی جد و جہد ہے۔

انسانی نفسِ امّارہ باوجود تصدیقِ قلبی اور اقرارِ لسانی اپنے کفر و الحاد پر ہی مُصر ہے احکامِ سماوی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ نفس چاہتا ہے کہ سب اس کے مطیع ہو جائیں اور وہ کسی کا مطیع نہ ہو "انا ربکم" کی ندا اس کے اندر سے نکل رہی ہے۔ نفسِ امّارہ کی مخالفت کرنا "جہادِ اکبر" ہے۔

ارحم الراحمین کا کرم ہے کہ اس نے حصولِ ایمان کے لیے تصدیقِ قلبی کو کافی قرار دیا اور "اذعانِ نفس" کی تکلیف نہیں دی۔

چشم دارم کہ دہد اشک مرا حسنِ قبول
آنکہ دُر ساختہ است قطرۂ بارانی را

ایک اور مکتوب میں یوں تحریر فرماتے ہیں :-

"کمترین دعاگویان نیاز مند ـــ حضرت سلطان الاسلام ظل اللہ تعالیٰ علی الانام باسط مهاد العدل والانصاف ہادم اساس الجور والاعتساف امیرالمومنین انار اللہ برہانہ کی خدمت میں لکھتا ہے اور اظہار نیازمندی اور خاکساری کرتے ہوئے نعمت امن وامان رونق اسلام اور قوت شعائر اسلامیہ کے ظہور پر شکر وثنا کرتا ہے۔ نیز آپ کے لیے درازیٔ عمر شوکت وظفر اور نصرت کی دعا اپنے زاویۂ نامرادی اور گوشۂ شکستگی میں درویشوں کے ساتھ کرتا رہتا ہو۔ یہ دعا خلوص دل سے ہے اور پس پشت اس لیے امید ہے کہ قرین قبولیت ہوگی۔" آفتاب دولت واقبال برافق مجد وعُلیٰ تاباں باد"

ایک اور مکتوب کا خلاصہ یہ ہے :-

کمترین دعاگویان حضرت ناصر الملۃ والدین مرجع الاسلام والمسلمین خلیفۃ اللہ تعالیٰ فی الارضین کی خدمت میں لکھتا ہے کہ یہ مسکین باوجود بے بضاعتی و دورافتادگی آنجناب کے لیے دعائے سلامتی جان وایمان سے فارغ اور طلب ترقی درجات وکمالات صوری ومعنوی سے غافل نہیں ہے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

ہمارے دینی شیخ عبدالعلیم نے ایک خط فقیر کو لکھا تھا جس میں آنجناب کی جمعیت باطنی اور اس "امر جلیل" کی تقیید کا ذکر کیا تھا اس کو پڑھ کے شکر بجالایا کہ باوجود ان اشتغال صوریہ کے آپ کے دل حقیقت بیں کو مطلوب حقیقی کے ساتھ ایک خاص تعلق اور مقصود تحقیقی کے ساتھ ایک مخصوص شوق ہے .... امید کہ یہ آتش شوق قوت پذیر ہوگی حتیٰ کہ ذکر سے مذکور دال سے مدلول اور لفظ سے معنیٰ تک معاملہ پہونچ جائے گا۔

تو مے ز وجود خویش فانی

رفتہ ز حروف در معانی

...... اللہ تعالیٰ کو لفظ ومعنیٰ سے اوراء طلب کرنا چاہیے اور اس کو وراء آفاق و انفس، وراء تجلیات، وراء توحید واتحاد، وراء مشاہدات ومکاشفات ڈھونڈھنا چاہیے۔

تو از خوبی نمی گنجی بعالم
مرا ہرگز کجا گنجی در آغوش

ایک اور مکتوب میں ہے :-

"کمترین دعا گویان محمد معصوم ..... امیر المومنین کی خدمت میں لکھتا ہے کہ مکتوب عالی ... جو بکمال ..... مہربانی قلم عنبریں رقم سے لکھا گیا تھا۔ خواجہ محمد شریف بخاری نے پہونچایا اور فقراء بے نوا کو تشریفات علیہ سے نوازا .. اس مکتوب سے راہِ طریقت کا شوق ہویدا تھا اسی لیے مقصد کے حاصل ہونے کی امیدواری ہے ایک درویش نے فرمایا۔

"اگر نخواستے داد ۔ ندا دے خواست"

اگر اللہ کچھ دینا نہ چاہتا تو طلب کا مادہ ہی پیدا نہ کرتا۔ صوفیا کا مقولہ ہے اذا بکی القلب من الفقد ضحک الروح من الوجد یعنی جب دل کچھ کھو جانے پر روتا ہے تو روح کچھ پا جانے پر خوش ہوتی ہے..... کیا عجب نعمت ہے کہ اس طرح بادشاہت کے ہوتے ہوئے کلمۂ حق سمع قبول میں آئے ..... جب کوئی سالک عنایاتِ ربانی کی برکت سے اپنی عدمیت ذاتی پر اطلاع پاتا ہے اور اپنے صفاتِ کمال کو حق تعالیٰ کے کمال کا پرتو یقین کرتا ہے ..... جب جا کے فنائے حقیقی سے مشرف ہوتا ہے اور انانیتِ امّارہ سے چھٹکارا پاتا ہے۔ پھر نفسِ امّارہ تدریجاً نفسِ مطمئنہ بن جاتا ہے اسی وقت نعمتِ حق اس کے حق میں کامل ہوتی ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

چوں بدانستی کہ ظلّ کیستی
فارغی گر مردیٔ ور زیستی

..... آپ کے مکتوب فصاحت انگیں ..... کا کیا بیان کروں۔

ففی کل لفظ منہ روض من المنیٰ — اس کے ہر لفظ میں تمناؤں کا ایک باغ
وفی کل سطر منہ عقد من الدرر — ہے اور ہر سطر میں موتیوں کا ایک ہار۔

آپ نے توجہ و دعا رغائبانہ کی طلب اس شکستہ سے کی ہے ہرچند پہلے ہی اکثر دعا کرتا رہتا تھا لیکن اس وقت جبکہ اس قسم کی مہربانیاں اور خصوصیات درمیان میں

آگئی ہیں۔ مزید محبت کے ساتھ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے طریق معہود پر ترقی باطنی، ازدیاد کیفیت، استقامت نیز نصرت ظاہرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ آپ نے بارگاہ بارہا الٰہی اور حسن خاتمہ کے متعلق اظہار کیا تھا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں خوف عنایت فرمایا اس لیے بہت کچھ امیدیں ہیں۔ خوف کا رہن مشکل کو آسان کردیتا ہے۔ حدیث ہے۔

لا یجتمع خوفان خوف الدنیا و خوف الاخرۃ — یعنی اگر کسی میں خوف آخرت ہوگا تو اسے خوف دنیا نہ ہوگا۔

آفتاب سلطنت و کوکب معدلت تابندہ و درخشاں باد۔[۱]

شیخ محمد سیف الدین

آپ خواجہ محمد معصوم سابق الذکر کے بیٹے ہیں۔ ملت اسلامیہ کو آپ کے واسطے سے بہت فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنے والد ماجد ہی سے کسب فیوض کیا اور سلوک کی راہیں طے کیں۔ طالبانِ رشد و ہدایت و طریقت گرد برابر جمع رہتے۔ پورے پورے اپنے پدر بزرگوار کے پرتو تھے۔ ۱۰۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی اولاد میں چھ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہوئیں۔ لڑکے ہندستان جیسے ملک میں تعلیمات اسلامیہ کی نشر و اشاعت میں برابر جد و جہد کرتے رہے۔ آپ بقول مرادین عبداللہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے معاملات میں اپنے عہد میں ممتاز رہے۔ بدعتوں کے قلع قمع کرنے میں آپ کو شہرت عام حاصل تھی۔ بزرگوار باپ نے آپ کو محتسب الامۃ کا لقب دے دیا تھا۔ اعلیٰ درجہ کا لباس استعمال میں رکھتے اور شوکت ظاہری آپ کے جلو میں رہتی۔ سلاطین اور امراء وقت آپ کی تعظیم میں سروقد کھڑے ہو جاتے اور بذل و سخاوت کا یہ عالم رہا تھا کہ آپ کے دسترخوان پر دونوں وقتوں میں لگ بھگ ہزار سو آدمی ماحضر تناول کرتے۔ شاہ وقت نے آپ کو قلعہ تشریف لانے کی دعوت دی اس کو آپ نے منظور فرمایا مگر اس شرط پر کہ دیوار قلعہ پر بنی ہوئی سب تصویریں نابود کردی جائیں۔[۲]
سلوک و طریقت میں بھی آپ کا وہ پایہ تھا کہ خواجہ معصومؒ آپ کے والد نے شاہ عالمگیر کی روحانی

---

[۱] ماخوذ از مکتوبات خواجہ محمد معصوم نشرہ کتب خانہ الفرقان لکھنؤ۔
[۲] نزہۃ الخواطر جلد ۵۔

تربیت وتعلیم آپ کو ہی تفویض کردی تھی۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں جو سیف الدینؒ کو لکھا اس میں لکھتے ہیں :-

"جو کچھ بادشاہ دیں پناہ سلمہ ربہ (اورنگ زیب) کے بارے میں مرقوم ہے یعنی اثرات ذکر در لطائف" "حصول سلطان ذکر در ابطہ" "قلت خطرات" "قبول کلمۂ حق" "رفع بعض منکرات" اور "ظہور لوازم طلب" یہ سب باتیں واضح ہوئیں، شکر خدا بجالاؤ۔ طبقۂ سلاطین میں اس قسم کے امور حکم عنقا رکھتے ہیں.... حدیث میں آیا ہے

من احیی سنتی بعد ما امیتت فلا اجر مأۃ شہید" جس نے میری کسی سنت کو اس کے مردہ ہونے کے بعد جلا دیا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

اللّٰھُمَّ زدہ توفیقا وطلبا وشوقا وترقیا فی مراتب قربک۔

فقیر دعا و توجہ سے فارغ نہیں ہے بادشاہ کی ظاہری و باطنی صلاحیت کا خواستگار ہوں ان کے باطن کو نسبت اکابر سے معمور پاتا ہوں اور امید وار ہوں کہ وہ جلد ہی "فنائے قلب" کی دولت سے مشرف ہو جائیں گے۔ یہ فنائے قلب درجات ولایت میں درجۂ اولیٰ رکھتی ہے۔

باکریماں کارہا دشوار نیست

ایک اور مکتوب میں جو شیخ نے خود اورنگ زیب عالمگیر کو لکھا اس میں رقمطراز ہیں۔

الحمد للہ والمنہ کہ فقیر زادہ منظور نظر ہو گیا ہے اور اس کی صحبت مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر جو کہ فقیر زادے کا شیوہ ہے اس پر آپنے اظہار تشکر و رضامندی کیا ہے میں اس عطیے پر شکر خداوندی بجا لایا اور یہ سبب ازدیاد دعا گوئی ہوا۔ کیا عجب نعمت ہے کہ اس طمطراق بادشاہت اور دبدبۂ سلطنت کے ہوتے ہوئے کلمۂ حق سمع قبول میں آئے اور ایک نامراد کا قول مؤثر ثابت ہو[۱]۔

صاحبزادے سیف الدین کے خط میں لکھتے ہیں۔

"مجالس سلطانی میں عجیب اسرار جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جوں ہی ان کی محفلوں میں داخلہ ہوتا ہے عروج و نزول کی کیفیات کے ساتھ ممتاز کر دیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے اہل کمال

[۱] مکتوبات خواجہ شیخ معصوم ص۲۸ وما بعد۔

ہر قطعۂ زمین سے وہ فیوض و اسرار جو ان کے مناسب حال ہیں مشاہدہ کرتے ہیں کسی زمین کو معاملات فنا کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اور کسی کو کمالات بقا کے ساتھ موافقت ہوتی ہے .... حرم مکہ کے کمالات جدا ہیں، حرم مدینہ کے فیوض اور کاروبار جدا۔"

اپنے والد ماجد کے حکم سے آپ نے دلی میں سکونت اختیار کی ۱۰۹۶ھ۔ ۲۰ رجمادی الاولیٰ ۴۷ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ سرہند کے حصہ "گنبد کلاں" کے احاطہ میں دفن ہیں۔

"ہے بے ستون دین فتاد"

سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ آپ کی اولاد میں آٹھ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہوئیں۔ آپ کے پانچ بھائی اور تھے۔ ان کے نام یہ ہیں

شیخ محمد صبغۃ اللہ، شیخ محمد عبید اللہ (مروج الشریعۃ و جامع مکاتیب)، شیخ محمد اشرف، شیخ محمد صدیق رحمہم اللہ اجمعین۔

مختلف نسلوں کے درمیان شادی

ہیتھر خلیق (HEATHER KHALIQUE) ایک اسکاٹ خاتون ہیں جن کی شادی ایک پاکستانی مسلمان سے ہوئی ہے۔ مختلف النسل افراد کے درمیان مناکحت ان کے لیے ایک ذاتی تجربہ ہے۔ انھوں نے اسلامک ریویو (ووکنگ۔ انگلینڈ) کے نام ایک مراسلہ میں اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں اس مسئلہ پر دلچسپ روشنی ڈالی ہے۔ ذیل کی سطریں ان کے اسی مراسلہ کا ترجمہ ہیں۔

ادارہ

مختلف النسل افراد کے درمیان شادی ان مؤثر طریقوں میں سے ایک ہے جو دنیا کے مختلف لوگوں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت واقعہ کی یاد اور صحیح تشریح کچھ شرائط کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

شادی دو افراد کے درمیان اتحاد کا وہ آخری مرحلہ ہے جب ان میں باہم کوئی غیریت باقی نہ رہ جائے۔ زوجین کے درمیان باہمی اتحاد کی نعمت اگر صحیح معنوں میں حاصل ہو جائے تو وہ صرف میاں بیوی تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے متعلقین تک کے لیے خیر و برکت ثابت ہوتی ہے۔ اسی مفہوم میں یہ کہا جاتا ہے کہ مختلف نسل کے لوگوں کے درمیان کامیاب شادیاں متعلقہ افراد کے حلقہ سے زیادہ وسیع حلقہ میں صحت مند اور مفید اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔

مختلف نسلوں کے درمیان شادی نسلی فرق کی بنا پر بالعموم کچھ مسائل پیدا کرتی ہے۔

مگر جب اسی کے ساتھ دونوں میں مذہب اور تمدن کا فرق بھی موجود ہو تو مسائل زیادہ سنگین نوعیت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مختلف یورپی ملکوں کے مردوں اور عورتوں کے درمیان شادی کے بعد زوجین کے لیے ایک دوسرے کے طریق زندگی اختیار کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا مشکل یہ کام یورپی عیسائیوں اور مشرقی مسلمانوں کے درمیان شادی کی صورت میں ہوتا ہے۔

مشرق سے میرا رابطہ پہلی بار اس وقت ہوا جب میرے والدین جو اسکاٹ لینڈ کے عیسائی ہیں، مجھے بچپن میں پاکستان لے گئے۔ میرے والد ایک انجینیر تھے اور مخصوص قسم کے اسکاٹ ہونے کی وجہ سے وہ پاکستانیوں سے آزادی سے ملتے جلتے تھے۔ اس نوعمری کے زمانے میں جس چیز نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا وہ یہ بات تھی کہ کس آسانی سے ہم غیر ملکیوں کو اس معاشرہ میں قبول کیا جاتا تھا۔ ایک دن اس موضوع پر میرے والد سے بات چیت کرتے ہوئے اُن کے ایک دوست نے کہا کہ اسلامی معاشرہ بنیادی طور پر آفاقی ہے اور نسلی امتیازات سے پاک ہے۔

پاکستان میں اپنے قیام کے دوران میری شناسائی درمیانی طبقہ کے ایک معزز گھرانے سے ہوئی۔ اس جان پہچان نے مجھے دیہی مسلم معاشرت کے ڈھانچہ کو اندر سے دیکھنے کا نادر موقع دیا۔ مشترکہ خاندانی نظام، خاندان کے ارکان کے ایک دوسرے سے تعلقات، مغربی اثرات کے مقابلے میں اپنے مذہب اور کلچر سے ان کی گہری وابستگی — ان چیزوں نے مجھ پر نہایت گہرے اثرات ڈالے۔ اس خاندان سے میرے تعلقات ہی کے نتیجے میں اسلام سے میری دلچسپی پیدا ہوئی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب میں ایک پاکستانی مسلمان کی بیوی ہوں۔

مجھے اس بات کا سخت خطرہ تھا کہ میرے شوہر کے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کی طرف سے ہماری شادی کی مخالفت کی جائے گی۔ بالخصوص میرے خسر کی طرف سے جو قرآن کے عالم اور ایک قدامت پسند مسلمان ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اسلام پچھلے الہامی مذاہب ہی کا ایک تسلسل (CONTINUATION) ہے اور اسلام کے مطابق عیسائیوں

یہودیوں، مسلمانوں اور تمام اہل کتاب کے درمیان شادی کرنے کی اجازت ہے[1]۔ یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میرا شوہر اور میں ایک خوش گوار زندگی کا آغاز کریں ہم کو باہمی انضباط (MUTUAL ADJUSTMENT) کی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میرا اسکاٹش خون اور میرے شوہر کا پاکستانی مزاج اکثر اوقات معاملات کو مشکل بنا دیتا۔ یہی تجربات ہیں جن کو میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کے اظہار کی بنیاد بنایا ہے۔

مشرق اور مغرب کے نقطۂ نظر میں سب سے زیادہ نمایاں اختلاف اُن کے خاندانی زندگی کے ڈھانچوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم مغرب کے لوگ کسی قیمت پر بھی اپنی انفرادیت کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سن شعور کو پہونچتے ہی ہمارے نوجوان مرد اور عورتیں اپنی نجی زندگی کے متعلق سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر مشرق میں ہر مرد اپنے آبائی خاندان کا لازمی حصہ ہوتا ہے اور ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ وہ بلاشبہ اپنے بیوی اور بچوں کا ذمہ دار ہوتا ہے مگر اس سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کردے۔ اس کی آمدنی میں اس کے ضعیف سرپرستوں، خاندان کی بیوہ عورتوں، چھوٹے بھائیوں اور بہنوں اور دوسرے لوگوں کا حصہ ہوتا ہے مغربی معاشرہ نے لائف انشورنس پالیسیوں اور کوآپریٹیو سوسائٹیوں کی شکل میں اپنے بعض مسائل کا جواب تلاش کرلیا ہے اور بلاشبہ یہ مسئلے کے حل کا زیادہ بہتر اور منظم طریقہ ہے۔ لیکن انسانی رشتوں میں کارگزاری اور تنظیم ہی سب کچھ نہیں ہیں بلکہ ذاتی لگاؤ اور متعلق ہونے کا احساس بھی ایک اہم اور نفسیاتی طور پر ناقابل شکست حصہ ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرا شوہر اپنی بیوہ ماں کو جو پاکستان میں ہے ہر ماہ خرچ بھیجتا ہے۔ یہ کام اس کے لیے عظیم روحانی مسرت کا ذریعہ ہے۔ اس کام کو کرکے ان کے اندر کامیابی کا ایک احساس پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی ماں کے لیے اپنے بیٹے کی طرف سے بھیجی ہوئی رقم اس سے زیادہ معنی رکھتی ہے جو کسی بیوہ کو وظیفۂ ضعیفی (OLD AGE PENSION) کے طور پر ایک سرکاری افسر کی طرف سے وصول ہو۔ ایک مغربی بیوی کے لیے خاندانی مالیات پر اس قسم کے بوجھ کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔ عام طور پر مغربی بیوی مشرقی شوہر کے اپنے رشتہ داروں کے

[1] یعنی ایک مسلمان مرد اہل کتاب عورت سے شادی کر سکتا ہو۔

اس قسم کی وفاداری پر برہم ہو جاتی ہے۔ تین رشتہ داروں سے اس کی ملاقات تک نہیں ہوئی۔ اس کش مکش میں بعض مغربی بیویاں اپنے مشرقی شوہروں کو اُن کے خاندان سے الگ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ کامیابی انھیں اپنے شوہر کی خوشیوں کا خاتمہ کرکے حاصل ہوتی ہے۔

مشرقی کنبوں کے ارکان مغربی کنبوں کے ارکان کے مقابلہ میں ایک دوسرے پر زیادہ انحصار کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہاں اب بھی "بزرگ خاندان" کا قدیم رومن تصور پایا جاتا ہے۔ متوفی باپ کی تمام ذمہ داریاں خود بخود بڑے بھائی کے سر آجاتی ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم، شادی اور بہبودی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ خاندانی نظام کسی طرح بھی غیر مرتب نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے متعلق کوئی سخت اور تحریری قانون موجود نہیں ہے۔ مگر رواجی طریقہ اور روایات اس قسم کی چیزوں میں مشرقی لوگوں کے رہنما ہیں۔

ایک مغربی بیوی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مشرقی آداب کے غیر تحریری ضابطہ کی پیچیدگیوں کو سمجھ سکے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لیے ایک بار پھر مجھے اپنے ذاتی تجربہ سے روشنی ہوئی۔ گزشتہ تین برسوں کے درمیان میرے شوہر نے اپنے تین چھوٹے بھائیوں کو انگلینڈ آنے میں مدد دی۔ پہلے انھوں نے یکے بعد دیگرے تینوں بھائیوں کو سفر خرچ بھیجا۔ پھر ان کے یہاں آنے کے بعد میرے شوہر کو وہی کچھ کرنا پڑا جو ایک باپ کو اپنے بیٹوں کی زندگی کی تعمیر کے لیے کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس صرف دو کمروں کا ایک فلیٹ تھا۔ مغربی نقطۂ نظر سے گھر میں کسی مہمان کو رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ مگر میرے شوہر کے نقطۂ نظر سے بھائی مہمان نہیں، بلکہ وہ خاندان کا ایک فرد ہے۔ اس کو کسی ہوٹل میں ٹھہرانا یا کسی دوسرے مکان میں رکھنا میرے شوہر کے لیے ایک غیر برادرانہ فعل ہوتا۔ میرے شوہر اور میرے دیوروں کیلئے مادی تکلیف (PHYSICAL DISCOMFORT) کا معاملہ ایک ثانوی اہمیت کی چیز ہے۔ وہ یہ فرض کرتے ہیں کہ چونکہ میں سب سے بڑے بھائی کی بیوی ہوں اس لیے میں ان تمام چیزوں میں بخوشی ان کے ساتھ اسی طرح تعاون کروں گی جس طرح ایک مشرقی عورت کو کرنا چاہیے۔

کھانا اور لباس ان بہت سی چیزوں میں سے ہیں جہاں مختلف نسل کے شوہروں اور بیویوں کے نقطۂ نظر ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ انگلینڈ میں اکثر اس بات پر نکتہ چینی

کی جاتی ہے کہ مشرقی مردوں نے تو مغرب کا لباس اپنا لیا ہے مگر ان کی عورتیں ایسا نہیں کرتیں ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ عام تاثر غلط ہے کہ وہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں کرتیں۔ مشرقی خواتین کا لباس بہت باوقار اور خوبصورت ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کہ ساڑی لمبوں وغیرہ پر چڑھنے اترنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے، ان کے نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ان کا کہنا ہے کہ عورتیں سڑکوں پر گھومنے کے لیے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں نقطۂ نظر کے درمیان حقیقی فرق نسوانیت کے متعلق دونوں کے الگ الگ نقطۂ نظر میں ہے۔ مشرق میں کسی عورت کے لیے یہ بہت زیادہ غیر نسوانی حرکت سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے جسم کا کوئی حصہ پبلک کو دکھائے۔ بالخصوص مسلمانوں میں ایسا نہیں کیا جاتا۔ ان تمام افواہوں کے باوجود جو مشرقی حرم کے درمیان عدم مساوات کے متعلق سنی جاتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی بیویوں کو ایک مقدس امانت سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ تقدس کا ایک تصور وابستہ ہے۔ یہ ابھی حال کی بات ہے کہ مغربی اثرات نے مسلم عورتوں کو پردہ سے باہر نکالا ہے۔ اس کے بعد کوئی مزید آزادی بے حیائی کے مترادف ہوگی۔ مشرقی تہذیب نے سینہ تک کھلے ہوئے گریبانوں اور عریاں ٹانگوں کو غیر شائستہ حرکت قرار دیا ہے۔ ایک مشرقی شوہر اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیوی جسم کو نمایاں کرنے والا لباس پہن کر گھومے۔ ایسا وہ بدگمانی یا رجعت پسندی کی وجہ سے نہیں کرتا۔ اس کی ناپسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ مغربی لباس اسلامی معیارِ شرافت پر پورا نہیں اترتا۔ ایسی مغربی عورتیں کم ہیں جو اس نازک تہذیبی فرق کو سمجھتی ہوں۔

کھانے سے متعلق مسائل قبل از شادی تعلقات (Courtship Period) میں زیادہ اہم نظر نہیں آتے۔ مگر بعد کو احساس ہوتا ہے کہ یہ زندگی بھر کے لیے روزانہ پیش آنے والا مسئلہ کسی بھی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ شوربہ، چاول اور چپاتی بہت لذیذ کھانے ہیں۔ مگر اتنے ہی لذیذ بھنی ہوئی پیاز اور گوشت کے قتلے بھی ہوتے ہیں۔ میں نے ایک ایسے جوڑے کو دیکھا ہے جس نے اس مسئلہ کا یہ حل نکالا ہے کہ اپنی اپنی پسند کے کھانے ایک دن کے وقفہ کے ساتھ باری باری استعمال کرتے ہیں۔ مگر اس جوڑے کی برطانی خاتون کو ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں ملا ہے کہ ایشائی کھانا پکانے میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔

ہم کپلنگ کی دنیا سے بہت آگے جا چکے ہیں[1]۔ بین الاقوامی مواصلاتی سلسلوں نے مشرق و

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

مغرب کو بہت قریب کر دیا ہے۔ ہم میں سے جن لوگوں نے اپنی نسل سے باہر کے فرد سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے انھوں نے ایک زبردست چیلنج قبول کیا ہے۔ ہر بڑے مقصد کی طرح اس راہ میں کامیابی کے لیے بھی زبردست کوشش کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر راستہ میں دشواریاں ہیں تو ان کا انعام بھی موجود ہے۔

اسلامک ریویو، اپریل ۱۹۶۵ء

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) [1] کپلنگ (۱۸۶۵ء - ۱۹۳۶ء) نے کہا تھا کہ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق۔ دونوں کبھی باہم مل نہیں سکتے۔ مترجم

Rudyard Kipling: East is east and West is west
Never the twain shall meet

اللہ کے دو بندے

حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ و حضرت مولانا شیر محمد سندھی مہاجر مدنیؒ

(محمد منظور نعمانی)

بلاشبہ زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ آدم کی اولاد اپنی دنیوی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھائے۔ اور خود آدمی کی تخلیق کا خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اور اس ساری کائنات کے خالق و مالک کو پہچانے اور اس کی عبادت و فرمانبرداری کے ذریعہ اس کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرے ــ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ"

پھر اس مقصد کی طرف دعوت اور اس راستہ کی رہنمائی کے لئے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا گیا، سارے پیغمبر اسی لئے آئے کہ خدا کو پہچنوائیں، اس کی ذات و صفات کے بارہ میں بندوں کو بتلائیں اور اس کی عبادت و فرمانبرداری کی دعوت و تعلیم دیں ــ جو بندے اپنی تخلیق کے اس خاص مقصد سے غافل ہو کر صرف دنیا کے کیڑے اور نفس کے بجاری بن جائیں ان کی قدر و قیمت ان کے خالق و مالک کی نگاہ میں مکھی اور مچھر سے کچھ بھی زیادہ نہیں رہتی اور ایسے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے ختم ہو جانے سے بھی اس دنیا کی قدر و قیمت اور معنویت میں کوئی کمی نہیں آتی، اور زمین و آسمان جو اس پوری دنیا کے لئے گویا ماں باپ کی طرح ہیں، کوئی رنج اور صدمہ محسوس نہیں کرتے، ایسے ہی بعض انسانی گروہوں کی ہلاکت و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ" (نہ تو ان پر زمین روئی اور نہ آسمان نے کوئی آنسو گرایا)

اس کے برعکس جو بندے اپنی تخلیق اور زندگی کے اس مقصد کو یاد رکھیں اور اللہ کے قرب و رضا کو اپنا نصب العین بنا کر اسکے تقاضوں کے مطابق زندگی گزاریں وہ اپنے خالق و مالک کی نگاہوں میں عزیز و محبوب ہوتے ہیں، انہیں کو عرف خاص میں "اَوْلِیَاءُ اللہ" اور "خُلَفَاءُ اَنْبِیَا" کہا جاتا ہے وہ ختم نبوت ختم ہونے کے بعد انہیں کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کے فیوض و برکات اس دنیا کو ملتے ہیں، وہ جب دنیا سے اٹھائے جائیں تو زمین و آسمان اور اللہ کے معصوم فرشتے احساس و تاثر اور رنج و غم میں ان کے متعلقین اور محبین کے شریک ہوتے ہیں۔ ان کی وفات خود ان کے حق میں محبوب حقیقی کا وصال اور ایک طرح کی معراج ہوتی ہے۔ لیکن ہماری اس دنیا کا ان کے انفاس کی برکات سے خالی ہوجانا دنیا کی روح کے لئے بڑا المناک حادثہ ہوتا ہے۔

پچھلے چند مہینوں میں ایسی ہی دو بابرکت ہستیوں سے ہماری یہ دنیا خالی ہوگئی۔ ایک حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری قدس سرہ دوسرے حضرت مولانا شیر محمد صاحب سندھی ثم المدنی۔ مہاجر نور اللہ مرقدہٗ۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ

ہندوستان اور پاکستان کے اہل علم میں سے شاید کوئی بھی نہ ہوگا جو حضرت مولانا سے واقف نہ ہو۔ مدت دراز تک ہندوستان کی عظیم دینی درسگاہ مظاہر علوم سہارنپور کے صدر مدرس رہے سلوک کی منزلیں اسی زمانہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کی رہنمائی میں طے کیں اور اس طرح کہ اس سلسلہ کی ان کی پوری خط و کتابت اس راہ کے سالکین کے لئے مشعل راہ قرار دے کر "اشرف السوانح" کا جز بنا دی گئی۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے مولانا مرحوم کو صرف خلافت ہی سے سرفراز نہیں فرمایا بلکہ بیعت ہونے والے اکثر علماء و فضلاء کو حضرت قدس سرہ تربیت کے لئے حضرت کاملپوریؒ ہی کے سپرد فرماتے تھے۔

اگست ۴۷ء میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے وطن کاملپور ہی میں تھے، ملک کی تقسیم جن حالات میں اور جس طرح ہوئی اور اسکے بعد جو کچھ ہوا اس نے اس کا امکان ہی ختم کردیا کہ حضرت ممدوح پھر سہارنپور تشریف لائیں۔ اور بلاشبہ اس میں بھی خیر کا یہ پہلو مضمر تھا کہ خطۂ پاکستان کو خاص

ضرورت تھی کہ ایسی بابرکت ہستیاں وہاں رہیں ـــــ حضرت مولانا شروع میں کئی سال تک "دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار" (حیدر آباد سندھ) میں صدر مدرس رہے، اسکے بعد اپنے وطن ہی میں قیام فرمایا اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جو امانت اور خدمت آپکے سپرد کی تھی اس کو انجام دیتے رہے۔ گزشتہ شعبان کے آخری ہفتہ میں اس وقت وصال فرمایا جب ہندستان و پاکستان کے درمیان ڈاک کی آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ اس لئے اس وقت تو یہاں کسی کو علم ہی نہ ہو سکا۔ رمضان مبارک کے آخری ہفتہ میں جب یہ عاجز شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہٗ کی خدمت میں سہارنپور حاضر ہوا تو حضرتؒ نے ذکر فرمایا۔ ان کو غالباً حجاز مقدس کے کسی خط سے چند ہی روز پہلے اس کی اطلاع ہوئی تھی ـــ پھر جب معاہدہ تاشقند کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کا سلسلہ جاری ہوا تو ماہنامہ "بینات کراچی" سے اور اسکے بعد گزشتہ مہینہ مئی کے شروع میں حضرت مولانا مرحوم کے صاحبزادہ مولانا سعید الرحمن صاحب کے گرامی نامہ سے کچھ تفصیل معلوم ہوئی۔

اہل اللہ کے لون مختلف ہوتے ہیں کسی پر کسی رنگ کا غلبہ ہوتا ہے کسی پر کسی صفت کا۔ اس عاجز کو حضرت مولانا مرحوم کی چند دفعہ صرف زیارت ہی نصیب ہوئی ہے۔ اپنا احساس اور تاثر یہ ہے کہ حضرت ممدوح اپنی صورت و سیرت کے لحاظ سے ان بندگان خدا میں سے تھے جو غلبۂ ملکیت کی وجہ سے ملائکہ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ حضرت کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کانّہ ملکٌ نزل من السماء۔ واللہ اعلم باحوال عبادہ۔

حضرت مولانا شبیر محمد مہاجر مدنیؒ

اب سے ۳۳ سال پہلے جب الفرقان بریلی سے جاری ہوا تو کچھ دنوں تک یہ عاجز خود ہی اس کا اڈیٹر تھا اور خود ہی اس کا محرر۔ اس ابتدائی دور میں گھوٹکی ضلع سکھر (سندھ) سے الفرقان جاری کرانے کیلئے سالانہ چندہ کا ایک منی آرڈر آیا۔ مرسل کا نام صرف "شبیر محمد" لکھا ہوا تھا۔ اور تحریر کی سادگی سے اس کا شبہ بھی نہیں ہوا کہ یہ کوئی صاحب علم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ خریداروں کے رجسٹر میں میں نے ان کا نام صرف "شبیر محمد صاحب" لکھ دیا۔ عرصہ کے بعد الفرقان کے ایک مضمون کے بارہ میں (جو غالباً مسئلہ سماع اموات سے متعلق تھا) ان صاحب کا ایک خط آیا جس

میں "امداد الفتاوی" کے حوالے سے اس مسئلہ کے متعلق حضرت تھانوی کی ایک خاص تحقیق کا ذکر کیا گیا تھا۔ جس سے میں اس وقت تک واقف نہیں تھا ـــــ اس خط سے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی عالم دین ہیں چنانچہ رجسٹر میں ان کے نام سے پہلے مولانا کا لفظ بڑھا دیا گیا۔ جب مولانا کے پاس "الفرقان" کا دوسرا پہلا شمارہ پہونچا جس میں ان کا نام "مولانا شبیر محمد صاحب" لکھا گیا تھا تو ممدوح نے مجھے لکھا کہ میں عالم نہیں ہوں عامی ہوں۔ اکابر کی کتابیں دیکھنے کا شوق ہے۔ ان سے کچھ باتیں معلوم ہوگئی ہیں۔ اس لئے میرے نام کے ساتھ مولانا نہ لکھا جائے ــــ ممدوح نے یہ بات ایسے انداز میں لکھی تھی جس سے دل میں ان کی خاص عقیدت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ ان کی زیارت حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی حیات میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں اور دوسری دفعہ ملک کی تقسیم سے کچھ ہی پہلے سکھر (سندھ) میں ہوئی۔ جبکہ اس عاجز نے ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ سندھ اور بلوچستان کے بعض مقامات کا دورہ کیا تھا جن میں سکھر بھی شامل تھا۔ ممدوح کو کسی طرح میری آمد کا علم ہوگیا تو ازراہ شفقت و عنایت خود ہی گھوٹکی سے سکھر تشریف لائے۔ ان دونوں ملاقاتوں سے عقیدت میں اضافہ ہوا۔ ـ قیام پاکستان کے کچھ مدت کے بعد مولانا مدینہ طیبہ ہجرت فرماگئے۔ جس کا مجھے بہت عرصہ کے بعد علم ہوا۔ پھر ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں مناسک حج پر ان کی ضخیم اور محققانہ تصنیف "عمدۃ المناسک" جس کو گجرات کے عالم دین مولانا غلام محمد نورگت نے شائع کیا تھا۔ مولانا غلام محمد صاحب ہی کے ہاتھ سے ملی۔ اس سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ممدوح کس پایہ کے صاحب نظر عالم اور محقق ہیں۔

پھر اب سے ۳ سال پہلے ۱۹۶۳ء میں جب اللہ تعالیٰ نے حج و زیارت کی نعمت نصیب فرمائی تو مدینہ طیبہ میں حضرت مولانا کی خدمت میں بار بار حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس حاضری میں مناسک کے بعض اہم مسائل کے بارہ میں حضرت سے جو استفادہ کیا گیا اور جو خاص عنایتیں ممدوح نے اس عاجز پر فرمائیں ان کا ذکر اسی زمانہ میں الفرقان کے شماروں میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد گزشتہ سال ۱۹۸۲ء کے حج کے موقع پر رابطہ عالم اسلامی کے تعلق سے جب پھر حرمین شریفین کی حاضری کی نعمت رفیق محترم مولانا علی میاں کی معیت میں نصیب ہوئی تو مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کی بھی الحمد للہ ہم دونوں کو بار بار توفیق ملی۔ ہمارا مشترک احساس و تاثر یہ تھا کہ

اللہ نے اپنے اس بندہ کو تجرید تفرید اور فنا تام کا خاص مقام نصیب فرمایا ہے، جو تھوڑا سا وقت حضرت کی خدمت میں گزرتا وہ ہمارے بہترین اوقات میں سے تھا حضرت ممدوح نے اپنے لئے فقر و مسکنت کی زندگی اختیار فرمائی تھی، مشہور حدیث ہے "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستفتح بصعالیک المہاجرین" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خستہ حال و مساکین مہاجرین کے وسیلے سے فتح کی دعا کرتے تھے) حضرت مولانا شیر محمد صاحب ہمارے اس زمانہ میں "صعالیک المہاجرین" کا ایسا نمونہ تھے کہ اس طرح کا کوئی دوسرا نمونہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، ان کے پاس بیٹھ کر دل دنیا سے سرد ہوتا تھا جو اہل اللہ کی خاص علامت ہے۔

پچھلے مہینہ محرم میں حسب معمول عبداللہ نودلی ایم جدہ کے خط سے معلوم ہوا، ذی الحجہ میں حضرت مولانا کا وصال ہوگیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) انکی روح اپنے رب جانی اور انکا جسم اس بقیع کے سپرد کردیا گیا جو سب سے پہلے مدفون مہاجر عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہ سے لیکر اس وقت تک کے لاکھوں مہاجرین اور مومنین صالحین کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ حضرت مولانا شیر محمد صاحب بھی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے خلفاء کبار میں سے تھے۔

اس عاجز بندہ پر اللہ تعالیٰ کے بے حساب احسانات و انعامات میں سے ایک عظیم احسان و انعام یہ بھی ہے کہ اسکے جن اچھے اور مقبول بندوں تک پہنچنا میسر ہوا بلا ادنیٰ استحقاق کے ان کی غیر معمولی عنایتیں اور شفقتیں نصیب ہوئیں اور اپنے گنہگار دل کو ان کی محبت و عظمت کا کچھ حصہ بھی ملا اگرچہ جو استفادہ ان سے کرنا چاہیئے تھا اپنے قصور ہمت اور محرومی نصیبی کی وجہ سے وہ نہ کیا جا سکا، لیکن ان کی عظمت و محبت کے جو ذرے نصیب ہیں انشاء اللہ وہ کام آئیں گے۔

احب الصالحین ولست منہم لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

ناظرین کرام سے گزارش ہے کہ وہ ان دونوں مرحوم بزرگوں کے لئے رحمت و مغفرت کی دعا فرمائیں اور حسب توفیق ایصال ثواب کریں۔ موت کے بعد خدمت اور تعلق کا یہی راستہ ہے اور اس میں انشاء اللہ اپنا بھی بڑا نفع ہے۔

حرم کعبہ کا ایک منظر

سید محمد عبد العزیز شرقی ملتان

اللہ اللہ تیرے دیوانوں کی شانِ بندگی ‖ کتنی دلکش اور حسیں ہے داستانِ بندگی
سر بسجدہ ہیں یہاں پر عارفانِ بندگی ‖ کھنچ کے کعبہ میں سمٹ آئی ہے جانِ بندگی
کل فرشتوں کو خلافت میں تھا جس کی کچھ کلام ‖ دیکھ کر حیران ہیں وہ آج آنِ بندگی
رومی و شامی بھی ہیں اور اسود و احمر بھی ہیں ‖ یک زباں ہیں سب یہاں پر نغمہ خوانِ بندگی
خوشہ چیں ہیں سب عرب والے عجم والے یہاں ‖ کس قدر پھیلا ہوا ہے تیرا خوانِ بندگی
قافلہ سالار نے حجت یہاں پر ختم کی ‖ کعبۃ اللہ کو بنا کر پاسبانِ بندگی
اس کے ہم قربان جس نے راہ دکھلائی ہمیں ‖ جس کی سنت پر رواں ہے کاروانِ بندگی
قافلہ سالار کی سنت نگہبان بن گئی ‖ مطمئن ہیں ہر طرف سے رہروانِ بندگی
سینکڑوں لذات مرے رستے میں گو حائل ہوئے ‖ کھینچ ہی لایا یہاں تک بادبانِ بندگی

مدینہ منورہ کی حاضری

میں پہنچا ہوں دیکھو کہاں اللہ اللہ ‖ زمیں ہے یہاں آسماں اللہ اللہ
ہے نورِ حقیقت نشاں اللہ اللہ ‖ کرے گی زباں کیا بیاں اللہ اللہ
منور ہیں قلب و نظر جس ضیا سے ‖ ہے گنبد سے وہ ضو فشاں اللہ اللہ
وہ مابینِ بیتی و منبر کی عظمت ‖ پر انوار وہ جالیاں اللہ اللہ
یہ نقشِ قدم ہے وہ محراب و منبر ‖ ہے محفوظ اک اک نشاں اللہ اللہ
فضا کی تجلی احد کے مناظر ‖ ہر اک کوچہ رحمت نشاں اللہ اللہ
کہیں نور و رحمت کے جلووں کی بارش ‖ کہیں گریۂ عاصیاں اللہ اللہ
امڈ آئے آنکھوں میں آہوں کے بادل ‖ مرے قلب کی گرمیاں اللہ اللہ

زباں رک گئی جا کے حدِ ادب پر
بنی چشمِ تر ترجماں اللہ اللہ

بہترین علمی و دینی کتابیں

درس قرآن

یعنی اردو میں قرآن پاک کی تعلیم کا ایک آسان سلسلہ

جسے اہل علم کے ایک بورڈ نے مرتب کیا ہے اب تک چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں ہر جلد ایک منزل پر مشتمل ہے۔ یہ سلسلہ ایک ایک صفحہ کے اسباق کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ پہلے آیت کے الفاظ کے الگ الگ معنی پھر ان کا بار بطا ترجمہ اور اس کے بعد مختصر تشریح۔

جلد اول -/۱۰ دوم -/۱۰ سوم -/۸
چہارم -/۸ پنجم -/۸ ششم -/۷

قاموس القرآن

یعنی مکمل قرآنی ڈکشنری

جس میں تمام الفاظ قرآنی کا اردو ترجمہ ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح نیز وضاحت طلب الفاظ پر آسان زبان میں مختصر اور جامع نوٹ لکھے گئے ہیں

از مولانا قاضی زین العابدین سجاد

۸۰۰ صفحات قیمت مجلد -/۹

بیان اللسان

(اردو عربی ڈکشنری)

(از مولانا قاضی زین العابدین سجاد)

عربی زبان کے طالبعلموں کے لیے ایک متوسط ڈکشنری جو جدید طرز پر مرتب کی گئی ہے اور کسی لفظ کے معنی دیکھنے کے لیے اس کے مادہ کی تلاش نہیں کرنا پڑتی

صفحات ۸۶۴ مجلد قیمت -/۱۰

زاد المعاد۔ سیرت آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم پر عربی زبان کی سب سے عظیم الشان کتاب۔ از علامہ حافظ ابن القیم رح کا اردو ترجمہ چار حصوں میں دنیائے اسلام کے اہل علم اس کتاب کو اسلامی کتب خانے کی ممتاز ترین کتابوں میں شمار کرتے ہیں اور سیرت آنحضور ﷺ پر دینی لحاظ سے یقیناً اس سے زیادہ مفید اور معتبر کتاب دوسری نہیں ہے

چار حصے مکمل مجلد -/۴۴

علم جدید کا چیلنج

از وحید الدین خاں

مغرب کے جدید علمی نظریات نے مذہبی اعتقادات کو جو چیلنج دیا ہے وحید الدین خاں صاحب نے مذہب کی طرف سے اس کا بھرپور علمی جواب اپنی اس کتاب میں دیا ہے۔ -/۵

الادب المفرد

یعنی معاشرتی زندگی سے متعلق امام بخاریؒ کے مرتب کردہ مجموعۂ حدیث کا اردو ترجمہ مع متن عربی جس کا مفید اور مستند ہونا ظاہر ہے۔ قیمت -/۱۲

زبدۃ البخاری

یعنی صحیح بخاری کی احادیث مع ترجمہ جس میں اسناد کا سلسلہ حذف کر دیا گیا ہے صرف متن حدیث باقی رکھا گیا ہے۔

قیمت .... -/۱۲

تاریخ اسلام

از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

مکمل تین حصوں میں

اردو زبان میں مکمل اسلامی تاریخ پر یہ پہلی کتاب ہے جو مغربی مورخوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا غبار بھی چھانٹ کر رکھ دیتی ہے مکمل سٹ -/۳۸

طبقات الاولیاء

علامہ عبد الوہاب شعرانی (م ۹۷۳ھ) کی عظیم کتاب الطبقات الکبریٰ کا اردو ترجمہ۔ جو اولیاء کرام کے حالات اور ان کی مبارک زندگیوں کا بہترین مرقع پیش کرتا ہے۔ قیمت /۱۳

البراملۃ قیمت =/ ۱۲

تاریخ الخلفاء

دسویں صدی ہجری کے مشہور محدث اور مورخ علامہ سیوطی کی مشہور کتاب کا ترجمہ جس میں مصر کے فاطمی خلفاء تک کی تاریخ آگئی ہو۔ قیمت -/۱۲

تاریخ فاطمین مصر

(از ڈاکٹر زاہد علی ڈی فل آکسفورڈ) یہ کتاب زیادہ تر فاطمی مصنفین کی قلمی کتابوں سے اخذ کرکے لکھی گئی ہے اور مصر کی فاطمی خلافت کی سب سے مستند تاریخ ہے (دو حصوں میں) -/۱۶

تاریخ فلاسفۃ الاسلام

مصر کے نامور مصنف ڈاکٹر لطفی جمعہ کی کتاب جس کا ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (عثمانیہ) نے کیا ہے جس میں کندی، فارابی، امام غزالی، ابن رشد وغیرہ تمام فلاسفہ اسلام کے حالات و افکار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت -/۹

تاریخ ابن خلدون

علامہ ابن خلدون کی جس تاریخ کا مقدمہ مشہور عالم ہے یہ اسی تاریخ کے حصہ اول کا اردو ترجمہ ہو۔ قیمت -/۱۵

کتاب الروح

اس کتاب میں علامہ ابن قیم نے روح کی حقیقت اور اس سے متعلق مسائل پر بڑے فاضلانہ اور دیدہ ورانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے تشنگان حقیقت جو عربی نہیں جانتے ان کے لیے یہ اردو ترجمہ حاضر ہے۔ قیمت -/۱۰

انسان کامل

تصوف کے اسرار و رموز پر مشہور صاحب علم صوفی سید عبدالکریم جیلی رح کی بلند پایہ کتاب کا اردو ترجمہ جو صوفیانہ نقطہ نظر کی مکمل ترجمانی کرتا ہو قیمت -/۱۱

پیغمبر عالم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر ایک نئی شاندار کتاب از مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی (نائب امیر شریعت بہار)۔ قیمت مجلد ۶/۷۵

نماز کی باتیں ۱/۳۷

فاطمہ کا چاند ۲/۲۵

حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی تصنیفات

رسول کی باتیں .... -/۲

رسول اللہ کے معجزات ۱/۷۵

صلوٰۃ و سلام .... -/۱

پہلی تقریر سیرت ۱/۷۵

دوسری تقریر سیرت ۲/۵۰

جنت کی کنجی ۳/۲۵

مشکل کشا ۲/۲۵

جنت کی ضمانت ...... -/۱

غدر کے چند علماء۔ از مفتی انتظام اللہ شہابی ۱/۵۰

حضرت تھانوی رح کی چند کتابیں

اصلاح الرسوم ۱/۶۲

تعلیم الدین ۱/۳۷

حیات المسلمین ۱/۳۷

اعمال قرآنی کامل ۱/۶۲

حضرت تھانوی کے علوم و معارف پر مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی تصنیفات

تجدید دین کامل ...... -/۵

تجدید تصوف و سلوک ...... -/۵

تجدید تعلیم و تبلیغ ...... -/۳

تجدید معاشیات ...... -/۵

نظام صلاح و اصلاح ... ۳/۵۰

انگریزی زبان میں اسلامی کتابیں

ROAD TO MECCA (از علامہ اسد) Rs 21/-

ISLAM AT THE CROSS ROADS (از علامہ اسد) Rs 4/50

IN TRODECTION TO ISLAM (ڈاکٹر حمید اللہ) Rs 5/-

WHAT ISLAM IS ? (مولانا محمد منظور نعمانی) ..... Rs 5/-

ISLAMIC FAITH AND RRACTIC (") 4/50

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

ALFURQAN.(Regd N. L.353)LUCKNOW.

Cover Printed at A.O. PressAminabad Park, Lucknow.

سنہ آغاز
۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

31 (4)

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

اردو زبان کے ــــ اسلامی لٹریچر میں

عظیم اضافہ

دینی روح اور علمی افادات سے بھرپور ــــ ایک

یعنی اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ ــــ احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب

معارف الحدیث

جس میں عوام اور خواص دونوں اپنی اپنی سطح کے مطابق بہتر افادیت پاتے ہیں

زمانے کی ضروریات کا لحاظ ــــ ترجمہ میں ــــ اور حدیث کی اصل مقصدیت پر زور

اور تشریحات کے علاوہ ہر باب کے شروع کے تمہیدی نوٹ شریعت کے نظام حکمت پر

"قل و ما دل" کی ایک مثال کہے جاسکتے ہیں

سائز 26×20 / ۸

تالیف

مولانا محمد منظور نعمانی

کتابت و طباعت

جلد اول ــــ ایمان اور آخرت کے بیان کی حدیثیں ــــ قیمت ــــ مجلد ۵/ غیر مجلد ۴/

جلد دوم ــــ تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں ــــ قیمت ــــ مجلد ۵/۵۰ غیر مجلد ۴/۵۰

جلد سوم ــــ طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں ــــ قیمت ــــ مجلد ۸/ غیر مجلد ۷/

اسلام کیا ہے؟ ... انگریزی ۲/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے ... آسان حج ۵۰/

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس ... تجلیات ... فیصلہ کن مناظرہ (زیر طبع)

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندستان سے ..... -/۶
پاکستان سے ..... -/۷
ششماہی
ہندوستان سے ... ۳/۵۰
پاکستان سے .... -/۴

الفرقان
لکھنؤ
ماہنامہ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا

فی کاپی ...... ۶۰ پیسے

شمارہ ۴	بابتہ ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۸۶ھ مطابق اگست سنہ ۱۹۶۶ء	جلد ۳۴

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۸ اگست تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں انکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہ اولیں

——————— محمد منظور نعمانی

آج اتفاق سے مولانا آزاد مرحوم کا ۱۹۲۱ء کا لکھا ہوا اور اسی زمانہ کا چھپا ہوا ایک مضمون ہاتھ آگیا، اس کا عنوان ہے — "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" — یہ اس وقت لکھا گیا ہے جب تحریک خلافت شباب پر تھی اور اس نے پورے ملک میں ایک نئی پُرشور زندگی پیدا کر دی تھی۔ مسلمان اس وقت بھی اقلیت میں تھے لیکن ان کے عوام سیاست کے میدان میں اکثریت کے عوام سے بہت آگے تھے بلکہ جیسا کہ مولانا آزاد مرحوم نے اسی مضمون میں تفصیل سے بتلایا ہے مسلمانوں ہی کی مساعی اور تیز روی نے کانگرس کی تحریک آزادی کو عوامی اور تیز رفتار بنایا تھا اور اپنا پورا بوجھ ڈال کر انڈین نیشنل کانگرس سے نان کو آپریشن (ترک موالات) کا نظام منظور کرایا تھا۔

اس مضمون میں تحریک خلافت کے پیش رفت کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ کتنا کام ہو چکا ہے اور کیا کرنے کے لیے باقی ہے — اس کے مطالعہ سے تین باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں

ایک یہ کہ اب سے صرف ۵۴ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں ملکی سیاست کے کاروبار میں مسلمانوں کا کیا مقام تھا — دوسرے یہ کہ ان کی فکرمندیوں اور عملی کوششوں میں ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں کا اس وقت کتنا حصہ تھا اور عالمی اسلامی رشتۂ اخوت ان کا کتنا عزیز سرمایہ تھا — تیسرے یہ کہ ان کی قومی اور سیاسی سرگرمیوں میں اس یقین اور عقیدہ کی کتنی کارفرمائی تھی کہ مسلمان اس دنیا میں بھی کامیاب اور سربلند نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ مومن صادق اور اللہ تعالیٰ کے وفادار و اطاعت شعار بندے نہ بنیں۔

یہ تینوں باتیں اب ناظرین کرام مولانا آزاد مرحوم کے الفاظ میں پڑھیں اور سوچیں کہ صرف ۴۵ سال پہلے ہم کہاں تھے اور اب کہاں ہیں۔

"خلافت کمیٹی نے ابتک کیا کیا؟" کا سوالیہ عنوان قائم کر کے مولانا لکھتے ہیں:۔

خلافت کمیٹی نے یہ کیا کہ نا امیدیوں سے امید کی اور نامرادیوں سے فتح و مراد کی بشارت پیدا کردی۔

(۱) تمام ملک عمل و مساعی سے بے پروا تھا۔ خلافت کمیٹی نے سب کو کام پر لگا دیا۔

(۲) اُس نے خلافت اسلامیہ اور جزیرۃ العرب کی حفاظت کے لیے ۸ کروڑ مسلمانوں کے جذبات کو متحد کر دیا۔

(۳) اس نے ہندوستان میں سب سے پہلے ایسی حرکت پیدا کی جو طبقۂ خواص سے گزر کر عامۃ الناس تک میں اثر کر گئی۔

(۴) اس نے سب سے پہلے ہندوستان کی دونوں قوموں میں عملی طور پر اتحاد قائم کیا اور ہندو مسلمان طلب حق کی راہ میں ایک دل اور ایک زبان ہو گئے۔

(۵) اس نے نون کو اپریشن (ترک موالات) کی دعوت ملک کے سامنے پیش کی اور بے سروسامان ہندوستان کے ہاتھ میں سب سے پہلے فتح و مراد کا ایک بے خطا ہتھیار نظر آیا۔

(۶) اسی کی جد و جہد سے ہندوستان کی بیداری سب سے پہلے قولی (نظری) درجہ سے گزر کر فعلی و عملی میدان میں گامزن ہوئی۔

(۷) اس نے باوجود نہایت مایوس کن اور مہیب مخالفتوں کے اپنی جد و جہد جاری رکھی اور بالآخر ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس سے ترک موالات کا نظام عمل منظور کرا لیا۔ حتیٰ کہ اب ترک موالات خود کانگریس کا موضوع عمل بن گیا ہے اور جو راہ ابتدا میں صرف خلافت کمیٹی کی ایک سیاسی بدعت سمجھی جاتی تھی وہ اب تمام ہندوستان کے لیے تنہا ذریعۂ نجات تسلیم کر لی گئی ہے — ابتدا میں صرف مہاتما گاندھی جی خلافت کمیٹی کی تجویز ترک موالات میں شریک و معاون تھے لیکن اب تمام برادران ہنود ہمارے ہم صفیر و ہمنوا ہیں۔"

اس کے بعد مولانا نے اس کی کچھ تفصیلات لکھی ہیں کہ ترک موالات کا پروگرام انڈین نیشنل کانگریس سے کس طرح منظور کرایا گیا اور اس سلسلہ میں کانگریس کے اسپیشل اجلاس کلکتہ، اور اس کے بعد سالانہ اجلاس ناگپور کے فیصلوں کا ذکر کیا ہے ——— اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں :-

"تحریک خلافت کے سلسلے میں مسلمانان ہند کے ذمے بیک وقت دو فرض عائد ہوتے ہیں۔ ایک داخلی اور ایک خارجی، داخلی فرض سے یہ مقصود ہے کہ ہندوستان کے اندر حصول مقاصد کے لیے جد وجہد کتا رہے، خارجی فرض سے یہ مقصود ہے کہ ہندوستان سے باہر مسلمانان عالم پر جو مصائب چھائے ہوئے ہیں ان کی بروقت خبر گیری کرنا اور حسب استطاعت مدد کرنا"

اس کے بعد مولانا نے "سب سے آخر مگر سب سے پہلے" کا عنوان قائم کر کے مسلمانوں اور خاصکر تحریک خلافت کے کارکنوں کو مسلمانوں کی دینی اصلاح اور ان میں رُوح ایمان اور عملِ صالح پیدا کرنے، اور اسلامی اتحاد و مواخات کو ترقی دینے کے کارِ عظیم کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کو سب سے اہم اور مقدم کام قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :-

"مسلمان اگر خلافت اور آزادی کے لیے آسمان کے تارے بھی توڑ لائیں اور ان کے ایک جانب چاندی سونے کا ڈھیر اور دوسری جانب توپوں کی قطاریں کھڑی ہو جائیں پھر بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ خود اپنے اندر ایک مضبوط اور سچی تبدیلی پیدا نہ کریں گے اور ان تمام گناہوں اور جرموں کے ارتکاب سے باز نہ آجائیں گے جن کی وجہ سے یہ تمام مصیبتیں ان کو گھیرے ہوئے ہیں ....

پس ہمارا کوئی فرد اور کوئی گروہ وقت کا اصلی کام انجام نہیں دے گا اگر وہ اس کام کی طرف سے غفلت کرے گا۔ خلافت کمیٹیوں کو چاہیئے کہ پورے اخلاص و صداقت کے ساتھ اس کام کو جاری کر دیں اور جہاں تک بھی ان کے امکان میں ہو اس کی دعوت و تبلیغ میں اپنی جانیں لڑا دیں۔

اس سلسلہ میں ان کا طریق کار یہ ہونا چاہیے!

(۱) مسلمانوں کو عموماً توبہ و انابت اور ترکِ معاصی و فسوق کی ہدایت کی جائے

اور اُن کے ذہن نشین کیا جائے کہ جب تک وہ اپنی عملی حالت درست نہ کریں گے اُس وقت تک موجودہ مصائب دور نہیں ہو سکتے۔

(۲) بیکاری ایک شرعی معصیت ہے پس کسی مسلمان کو اپنی زندگی بیکار نہیں کاٹنی چاہیئے۔

(۳) نماز کی پابندی اور جماعت نماز کے قیام پر زور دیا جائے اور اس سرگرمی سے اس کا ولولہ پیدا کر دیا جائے کہ ایک مسلمان بھی بے نمازی نظر نہ آئے۔

(۴) مسلمانوں میں باہم یگانگت اور اتحاد و مواخات کو ترقی دی جائے۔ تمام جھگڑوں اور اختلافوں کو دور کیا جائے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کے درد و غم کا شریک ہو جائے اور یہ حقیقت لوگوں کے دلوں پر نقش کر دی جائے کہ مسلمانوں کی کسی معصیت نے ان کو اس قدر نقصان نہیں پہونچایا جس قدر باہم اختلافات اور تفرقہ نے اور کوئی چیز بھی اب ان کو اس قدر نفع نہیں پہونچا سکتی جس قدر یہ چیز کہ سب مل کر ایک نفس واحدہ ہو جائیں" اذا اشتکی منہ عضو تداعیٰ لہ سائر الجسد بالسھر والحمی"۔

(۵) مسلمانوں کی عملی زندگی بالکل تباہ ہو چکی ہو اسلیے انکی برائیوں اور خرابیوں کے اسقدر بیشمار جزئیات ہیں کہ ان کو سمیٹنا اور بیان میں لانا آسان نہیں پس چاہیے کہ احکام شرع کے احترام اور اتباع کا مردہ ولولہ پھر از سر نو زندہ کر دیا جائے اور ایسا ہو کہ لوگوں کے دل اللہ اور اس کی شریعت کے آگے سربسجود ہو جائیں۔

(۶) سب سے بڑی اور مقدم بات یہ ہو کہ خلافت کمیٹیوں کے تمام ارکان اور کارکن سب سے پہلے خود اپنی زندگی کو شرعی پابندی اور ایمان و اخلاص کا نمونہ بنالیں اور جتنی باتیں اپنے منھ سے نکالیں اپنے وجود پر بھی ان کو طاری کر لیں۔ اگر صرف اتنی ہی بات پوری طرح انجام دے دی گئی اور ہر جگہ ایک ایسی کارکن جماعت پیدا ہو گئی جس کا قول و عمل یکساں ہو گیا تو خلافت کمیٹیوں نے اپنے وجود کا بہت بڑا کام انجام دے دیا۔

وَبَشِّرْ عِبَادِیَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

كِتَابُ الْاَذْكَارِ وَالدَّعَوَاتِ

مَعَارِفُ الْحَدِيث

(مُسلسل)

کلماتِ ذکر اور اُن کی فضیلت و برکت (۲) :-

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ـــــــــ رواه الترمذی و ابن ماجه

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے افضل ذکر "لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ" ہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) سمرہ بن جندبؓ والی وہ حدیث پہلے گزر چکی ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ سب کلموں میں افضل یہ چار کلمے ہیں، سبحان اللہ، اور الحمد للہ، اور لا الٰہ الا اللہ، اور اللہ اکبر۔ حضرت جابر والی اس حدیث میں لا الٰہ الا اللہ کو افضل ترین کلمہ فرمایا گیا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ دنیا بھر کے دوسرے سب کلموں اور کلاموں کے مقابلہ میں تو یہ چاروں کلمے افضل ہیں۔ لیکن ان سب میں نسبتہً لا الٰہ الا اللہ افضل ہے کیونکہ لا الٰہ الا اللہ باقی تینوں کلموں کے مدعا کو بھی ضمنی طور پر اپنے اندر لیے ہوئے ہے ـــــــ جب بندہ یہ کہتا ہے کہ معبود برحق صرف اللہ ہے اس کے سوا کوئی نہیں تو اس کے ضمن میں یہ بات خود بخود آجاتی ہے کہ وہ ہر نقص و عیب سے پاک اور منزہ ہے اور تمام صفاتِ کمال کا وہ جامع ہے اور عظمت و کبریائی میں وہ برتر ہے کیونکہ جو لاشریک معبود ہو اس میں یہ سب باتیں ہونا لازمی ہیں۔ اس لیے جس نے صرف لا الٰہ الا اللہ

کہا اس نے گویا وہ سب کچھ بھی کہہ دیا جو سبحان اللہ، اور الحمد للہ اور اللہ اکبر کے ذریعہ کہا جاتا ہے علاوہ ازیں لا الٰہ الا اللہ کلمۂ ایمان ہے اور اسی لئے سب پیغمبروں کی تعلیم کا پہلا سبق ہے۔ نیز اپنے اپنے تجربہ کی بنا پر عرفا اور صوفیا کا اس پر گویا اتفاق ہے کہ باطن کی تطہیر اور قلب کو ہر طرف سے موڑ کے اللہ تعالیٰ سے وابستہ کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر یہی کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمانی کیفیت کو قلب میں تازہ کرنے اور ترقی دینے کے لیے اس کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی کثرت کا حکم دیا ہے۔(۱)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا قَالَ عَبْدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا مِنْ قَلْبِهٖ اِلَّا فُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ السَّمَاءِ حَتّٰى تُفْضِیَ اِلَى الْعَرْشِ مَا اجْتَنَبَ الْكَبَائِرَ ـــــ رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ دل کے اخلاص سے کہے "لا الٰہ الا اللہ" اس کے لیے لازماً آسمانوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ کلمہ عرش الٰہی تک پہونچے گا بشرطیکہ وہ آدمی کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔　　(جامع ترمذی)

تشریح) اس حدیث میں کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کی ایک خاص فضیلت وخصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر اخلاص سے یہ کلمہ کہا جائے اور اللہ سے دور کرنے والے بڑے گناہوں سے بچنے کا اہتمام کیا جائے تو یہ کلمہ براہ راست عرش الٰہی تک پہونچتا ہے اور خاص مقبولیت سے نوازا جاتا ہے۔ اور ترمذی ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے۔

وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَیْسَ لَهَا حِجَابٌ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَتّٰى تَخْلُصَ اِلَیْهِ

کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں، یہ کلمہ سیدھا اللہ کے پاس پہونچتا ہے۔

---

(۱) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جددوا ایمانکم قیل یا رسول اللہ کیف نجدد ایماننا؟ قال اکثروا من قول لا الہ الا اللہ ـــــ رواہ احمد

معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کے دوسرے کلموں کے مقابلہ میں اس کلمہ کی یہ ایک مخصوص فضیلت اور خصوصیت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ "حجۃ اللہ" میں فرماتے ہیں کہ "لا الٰہ الا اللہ" میں بہت سے خواص ہیں پہلی خاصیت یہ ہو کہ وہ شرک جلی کو ختم کر دیتا ہو۔ دوسری خاصیت یہ ہو کہ وہ شرک خفی کو بھی ختم کرتا ہو۔ اور تیسری خاصیت یہ ہو کہ وہ بندے کے اور معرفت الٰہی کے درمیان حجابات کو سوخت کرکے حصول معرفت و قرب کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیْ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ یَا رَبِّ عَلِّمْنِیْ شَیْئًا اَذْکُرُکَ بِہٖ اَوْ اَدْعُوْکَ بِہٖ فَقَالَ یَا مُوْسٰی قُلْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَقَالَ یَا رَبِّ کُلُّ عِبَادِکَ ...... یَقُوْلُ ھٰذَا اِنَّمَا اُرِیْدُ شَیْئًا تَخُصُّنِیْ بِہٖ قَالَ مُوْسٰی لَوْ اَنَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعَ وَعَامِرَھُنَّ غَیْرِیْ وَالْاَرَضِیْنَ السَّبْعَ وُضِعْنَ فِیْ کِفَّۃٍ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فِیْ کِفَّۃٍ لَمَالَتْ بِھِنَّ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رواہ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا کہ اے میرے رب مجھ کو کوئی کلمہ تعلیم فرما جس کے ذریعہ میں تیرا ذکر کروں (یا کہا کہ جس کے ذریعہ میں تجھے پکاروں) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ لا الٰہ الا اللہ کہا کرو انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب یہ کلمہ تو تیرے سارے ہی بندے کہتے ہیں میں تو وہ کلمہ چاہتا ہوں جو آپ خصوصیت سے مجھے ہی بتائیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ اگر ساتوں آسمان اور میرے سوا وہ سب کائنات جس سے آسمانوں کی آبادی ہے اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور لا الٰہ الا اللہ دوسرے پلڑے میں تو لا الٰہ الا اللہ کا وزن ان سب سے زیادہ رہے گا۔ (شرح السنۃ للبغوی)

(تشریح) موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی اور محبت کا جو خاص تعلق تھا اور اس کی بنا پر قرب خصوصی کی جو قدرتی خواہش تھی اسی کی وجہ سے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ذکر کا کوئی خاص کلمہ تعلیم فرمایا جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کو "لا الٰہ الا اللہ" بتایا جو افضل الذکر ہے، انھوں نے عرض کیا کہ میری استدعا کسی خاص کلمہ کے لیے ہے جس سے مجھے ہی نوازا جائے۔ الغرض کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا عموم اس کی قدر و قیمت اور عظمت کے بارہ میں ان کے لیے حجاب

بن گیا، اس لیے ان کو بتایا گیا کہ لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت زمین و آسمان کی ساری کائنات کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی اور بھاری ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ ہے کہ اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ یہ نعمت عظمیٰ ہر عامی کو بھی پہونچا دی ہے۔ بہرکیف انبیاء و مرسلین کے لیے بھی کوئی کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے زیادہ قیمتی اور بابرکت نہیں ہے۔

اس بے بہا نعمت خداوندی کا شکر یہی ہے کہ اس کلمۂ پاک کو اپنا خاص ورد بنایا جائے اور اس کی کثرت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے خاص رابطہ قائم کیا جائے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ فِیْ یَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ كَانَتْ لَهٗ عِدْلَ عَشْرِ رِقَابٍ وَكُتِبَتْ لَهٗ مِائَةُ حَسَنَةٍ وَمُحِیَتْ عَنْهُ مِائَةُ سَیِّئَةٍ وَكَانَتْ لَهٗ حِرْزًا مِنَ الشَّیْطَانِ یَوْمَهٗ ذٰلِكَ حَتّٰی یُمْسِیَ وَلَمْ یَاْتِ اَحَدٌ بِاَفْضَلَ مِمَّا جَاءَ بِهٖ اِلَّا رَجُلٌ عَمِلَ اَكْثَرَ مِنْهُ۔

——— رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے سو دفعہ کہا

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝	نہیں ہے کوئی معبود سوا اللہ کے، وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا شریک ساجھی نہیں، بادشاہت اسی کی ہے اور اسی کے لیے ہر قسم کی ستائش ہے اور ہر چیز پر اس کی قدرت ہے۔

تو وہ دس غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب کا مستحق ہوگا اور اس کے لیے سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کی سو غلط کاریاں محو کر دی جائیں گی اور یہ عمل اس کے لیے اس دن شام تک شیطان کے حملہ سے حفاظت کا ذریعہ ہوگا اور کسی آدمی کا عمل

اس کے عمل سے افضل نہ ہوگا سوائے اُس آدمی کے جس نے اس سے بھی زیادہ عمل کیا ہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) بیشک یہ کلمۂ توحید جس میں کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" پر کچھ اور اضافہ ہے جس سے اس کے معنی و حقیقت مضمون کی مزید تشریح اور وضاحت ہوتی ہے اتنا ہی عظیم القدر اور بابرکت ہے جتنا کہ اس حدیث شریف میں بتایا گیا ہے مرنے کے بعد انشاء اللہ یہ چیز ہم سب کے مشاہدہ میں آجائے گی ——— بعض لوگوں کو ایسی حدیثوں کے بارہ میں شکوک و شبہات ہوتے ہیں جن میں کسی کلمہ کا اتنا بڑا ثواب بتایا جائے۔ حالانکہ خود انھیں اپنی زندگی میں بارہا اس کا تجربہ ہوا ہوگا کہ برائی اور فساد کا ایک کلمہ آگ لگا دیتا ہے اور اس کے منحوس اثرات برسہا برس تک کے لیے خاندانوں اور گروہوں کی زندگیوں کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح کبھی خلوص سے نکلا ہوا ایک اصلاحی کلمہ خیر و فساد کی بھڑکتی آگ کو بجھانے میں ٹھنڈے پانی کا کام کرتا ہے اور بےچینیوں اور تلخیوں کو دور کرکے زندگیوں کو باغ و بہار بنا دیتا ہے۔ انسان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک کلمہ کے جو اثرات ہماری اس دنیا ہی میں ہوتے ہیں ان میں غور و فکر کرکے آخرت کے ان سے بڑے اور دور رس نتائج و ثمرات کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں رہتا۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسیٰ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اَدُلُّکَ عَلٰی کَلِمَۃٍ مِنْ کَنْزِ الْجَنَّۃِ فَقُلْتُ بَلٰی فَقَالَ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ——— رواہ مسلم والبخاری

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک دن فرمایا میں تمھیں وہ کلمہ بتاؤں جو جنت کے خزانوں میں سے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں حضرت ضرور بتائیں۔ آپ نے فرمایا وہ ہے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" (صحیح مسلم و صحیح بخاری)

(تشریح) اس کلمہ کا "خزائن جنت" میں سے ہونے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو شخص یہ کلمہ اخلاص کے ساتھ پڑھے گا اس کے لیے اس کلمہ کے بےبہا اجر و ثواب کا خزانہ اور ذخیرہ جنت میں محفوظ کیا جائے گا جس سے وہ آخرت میں ویسا ہی فائدہ اٹھا سکے گا جیسا کہ ضرورت کے

موقعوں پر محفوظ خزانوں سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضور کا منشا اس لفظ سے اس کلمہ کی صرف عظمت اور قدر و قیمت بتانا ہے یعنی یہ کہ جنت کے خزانوں کے جواہرات میں سے ایک جوہر ہے۔ کسی چیز کو بہت قیمتی بتانے کے لیے یہ بہترین تعبیر ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کے لیے سعی و حرکت اور اس کے کرنے کی قوت و طاقت بس اللہ ہی سے مل سکتی ہے کوئی بندہ خود کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ دوسرا ایک مطلب جو اس کے قریب ہی قریب ہے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ "گناہ سے بازآنا اور طاعت کا بجالانا اللہ کی مدد و توفیق کے بغیر بندہ سے ممکن نہیں"۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَکْثِرْ مِنْ قَوْلِ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ " فَاِنَّهَا مِنْ کَنْزِ الْجَنَّةِ

——— رواه الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" زیادہ پڑھا کرو، کیونکہ یہ خزائن جنت میں سے ہے۔ (جامع ترمذی)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰی كَلِمَةٍ مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ مِنْ كَنْزِ الْجَنَّةِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَسْلَمَ عَبْدِیْ وَاسْتَسْلَمَ

——— رواه البیہقی فی الدعوات الکبیر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، میں تم کو وہ کلمہ بتاؤں جو عرش کے نیچے سے اُترا ہے اور خزانۂ جنت میں سے ہے؟ وہ ہے "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" (جب بندہ دل سے یہ کلمہ پڑھتا ہے تو) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بندہ (اپنی انانیت سے دستبردار ہو کر) میرا تابعدار اور بالکل فرمانبردار ہو گیا۔ (دعوات کبیر للبیہقی)

تشریح) اس حدیث میں کلمہ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کو "من کَنْزِ الْجَنَّةِ" کے علاوہ

"مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ" بھی فرمایا گیا ہے۔ یہ بھی دراصل اس کلمہ کی عظمت کے اظہار کا ایک عنوان ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجھ پر اس کا نزول عرشِ الٰہی سے ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

(فائدہ) بعض مشائخ طریقت کا ارشاد ہے کہ جس طرح شرکِ جلی و خفی اور قلب و نفس کی دوسری کدورتیں دور کرنے اور ایمان و معرفت کا نور حاصل کرنے میں کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" خاص اثر رکھتا ہے اسی طرح عملی زندگی درست کرنے یعنی معصیات و منکرات سے بچنے اور نیکی کی راہ پر چلنے میں یہ کلمہ "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" خاص اثر رکھتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ

(۵)

——— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

فراستِ مومن

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ انفاس العارفین میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت والد ماجدؒ اس فقیر کو معارفِ عجیبہ تعلیم فرما رہے تھے۔ بات اس مشہور حدیث تک پہونچی ــ اِتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ ــ (مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے) ـــ اس کی شرح میں دو واقعے بیان فرمائے ایک اپنا اور ایک شیخ رفیع الدین محمدؒ کا۔ وہ دونوں واقعے حسب ذیل ہیں۔

(۱) فرماتے تھے کہ ایک شخص فقیرانہ وضع رکھتا تھا، بڑا ہی دردمند معلوم ہوتا تھا ہر وقت کوئی شعر یا عاشقانہ دوہرہ پڑھتا رہتا تھا اور بہت روتا تھا ایک دن وہ میرے پاس آیا اور تلقین و ارشاد کا طالب ہوا۔ نیز زاویے میں ٹھہرنے کی درخواست کی، میں نے اس سے پورے طریقے سے روگردانی اور اعراض کا معاملہ کیا جب وہ چلا گیا تو میں نے حاضرین سے کہا کہ یہ شخص کالا ناگ ہے اس کی صحبت سے بہت زیادہ پرہیز کرنا چاہیئے۔ مجھے حاضرین کے چہروں کا مطالعہ کر کے محسوس ہوا کہ وہ میری اس بات سے متفق نہیں ہوتے ایک عرصے بعد جب کہ وہ عاقل خاں صوبہ دار دہلی کے مکان پر مشتبہ حالت میں پکڑا گیا اور قید میں ڈال دیا گیا تب یہ بھید کھلا کہ وہ ناجائز طریقے سے ایک عورت کو بھگا لایا تھا اور اس جرم کو چھپانے کے لئے اس نے زاہد فقیری اور درویشی اختیار کر لی تھی ـــ پھر

توحقیقت حال واضح ہوگئی کہ وہ تمام گریہ وزاری اور اظہار دردمندی اس کی فریب کاری تھی ۔

(۳) خانِ عالم جوکہ اپنے وقت کے امرا میں سے تھے میرے نانا شیخ رفیع الدین محمد کے معتقد تھے ۔ خانِ عالم کے مکان کے قریب ایک باغ تھا وہاں ایک شخص فقیرانہ وضع میں وارد ہوا بظاہر وہ بہت ہی مجذوب تھا دنیا داروں کے میل جول سے بہت ہی متنفر معلوم ہوتا تھا، اس کی زبان پر سوائے قال اللہ اور قال الرسول کے اور کچھ نہیں تھا۔ خانِ عالم اس شخص کے بہت معتقد ہوگئے۔ ایک دن میرے نانا کا گزر اس باغ میں ہوا۔ اس شخص کو دیکھا اور دیکھتے ہی خانِ عالم سے فرمایا دیکھو یہ شخص "مارسیاہ" ہے اس سے بچے رہنا۔ خانِ عالم نے خیال کیا کہ شیخ صاحب کی زبان سے یہ کلمہ شاید برنائے حسد جاری ہوا ہے اسی وجہ سے انھوں نے نانا صاحب کی اس بات پر دھیان نہیں دیا۔ کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ خانِ عالم کو ایک اہم کام کے لئے ایک رقم کثیر کی ضرورت پیش آگئی مطلوبہ رقم پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہ متحیر اور متردد تھے اس فقیر نے خانِ عالم کی سراسیمگی کو تاڑ لیا اور سبب پریشانی معلوم کیا جب اصل وجہ معلوم ہوگئی تو مشفقانہ انداز میں کہا کہ اس پریشانی کا علاج میرے پاس موجود ہے میں کیمیا بنانا جانتا ہوں کیمیا کے ذریعہ بڑی تعداد میں سونا حاصل ہوجائے گا۔ خانِ عالم اس کی باتوں میں آگئے اور ایک لاکھ سے زائد رقم اس فقیر کو دیدی تاکہ وہ کیمیا کا سامان مہیا کرے ۔ اس نے ان روپیوں کو خرچ کرنا شروع کیا اور کچھ دنوں بعد باغ سے چنپت ہوگیا ہرچند اس کو تلاش کیا نہ ملا۔ خان عالم بہت پشیمان ہوئے ۔ اس کے بعد خان عالم سفارت کے سلسلے میں ایران چلے گئے جب سفر ایران سے واپس ہوئے تو حافظ محمد حسن نے (جو کہ خانِ عالم کے کیا لک تھے) ایک شخص کو کسی جگہ دیکھا کہ وہ برہمن کی شکل میں بیٹھا ہوا ہے داڑھی مونچھیں بالکل صاف کئے ہوئے ہے اور سنسکرت بول رہا ہے ۔ جب غور سے دیکھا تو پہچانا کہ یہ تو وہی باغ والا دھوکے باز فقیر ہے ۔ اس کو گرفتار کرلیا گیا اور سختی سے سخت مار لگائی گئی بالآخر اس نے اقرار کیا کہ ہاں میں وہی شخص ہوں ۔ خان عالم کا کچھ مال تو اس کے پاس سے مل گیا باقی

رقم اس نے کھا پکا کر برابر کر دی تھی ــــــ ایک دوسرے مقام پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے والد ماجدؒ کی فراست کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ بعض دیہات بارہہ (ضلع مظفر نگر) میں حضرتِ والا تشریف لے گئے تھے (چونکہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ ایک حاذق طبیب اور کامیاب معالج بھی تھے اس لئے) ایک مریض کا قارورہ آپ کے سامنے لایا گیا اس کو دیکھ کر فی الفور نسخہ تجویز کر دیا۔ اس مجلس میں ایک ہندو طبیب بھی حاضر تھا اس نے دریافت کیا کہ جناب نے (نسخہ تجویز کرنے سے پہلے) اس مریض کے مرض کو بھی جان لیا یا نہیں اس بات کو سن کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ مسکرائے اور یوں فرمایا کہ یہ ایک عورت کا قارورہ تھا اس کی عمر اتنی ہے اس کے اخلاق یہ ہیں اور سبب بیماری یہ ہے۔

سبب بیماری بیان کرتے ہوئے حضرتِ والا کو حیا دامن گیر ہوئی (اور اس سلسلے میں زیادہ وضاحت نہیں فرمائی) غرضکہ سب باتیں بیان فرمادیں تو اس طبیب نے کہا جناب عالی یہ باتیں علم طب کی کتابوں میں کہاں لکھی ہوئی ہیں؟ ــ جواب میں ارشاد فرمایا کہ یہ طب کی بات نہیں ہے۔ یہ تو "فراستِ صادقہ محمدیاں" ہے یا اسی مضمون کا جملہ فرمایا ــــ

کراماتِ واستجابتِ دعا

انفاس العارفین میں حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی کرامات اور استجابت کے واقعات بڑی کثیر تعداد میں ہیں میں اس سلسلے کے صرف ایک واقعے پر اکتفار کرتا ہوں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت والد ماجدؒ ارشاد فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ جب میرا لڑکا صلاح الدین (جو آپ کی زوجۂ اولی کے بطن سے تھے) بیمار ہوا اور اتنا سخت بیمار ہوا کہ امید حیات منقطع ہو گئی حتیٰ کہ میں نے کفن خریدنے اور قبر کھودنے کو بھی کہہ دیا تھا اس وقت میرا دل جوش میں آیا ایک گوشے میں بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ سے خوب رو رو کر دعائے صحت کی۔

اس وقت مجھے فرشتۂ غیبی کے ذریعے صلاح الدین کی حیات وصحت کی بشارت دی گئی۔ صلاح الدین کو فوراً ایک چھینک آئی اور اس کو گویا از سر نو زندگی حاصل ہو گئی۔

دوسری شادی اور اولاد

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جب حضرت

والد ماجدؒ کی عمر ساٹھ سال کی ہوگئی ان پر منکشف ہوا کہ ایک اور فرزند پیدا ہوگا۔ نیز بعض اہلِ کشف حضرات کی زبانی یہ بشارت ملی تھی کہ وہ لڑکا صاحب مقامات ہوگا اور فلاں فلاں مقام پر فائز ہوگا تو حضرت والد ماجدؒ کے دل میں داعیۂ تزویج پیدا ہوا۔ جب میرے نانا حضرت شیخ محمد پھلتیؒ کو اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے چاہا کہ ان کی صاحبزادی سے نکاح ہو تاکہ وہ صاحبزادی اس لڑکے کی ماں بنے۔ فقیر نے بعض ثقہ لوگوں سے سنا ہے کہ جب یہ رشتہ طے ہوگیا تو بعض اہل نفاق وشقاق نے چہ میگوئیاں کیں کہ اس عمر میں شادی مناسب نہیں "حضرت ایشانؒ" نے جب سنا تو فرمایا کہ " (اللہ نے چاہا تو) ابھی میری عمر کے کئی سال باقی ہیں اور (انشاء اللہ تعالٰی) مجھ سے اولاد بھی ہوگی"۔ اس کے بعد والد ماجدؒ سترہ سال زندہ رہے اور دو فرزند وجود میں آئے (شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اہل اللہ)

ایک عجیب واقعہ | حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ فقیر ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ ایک رات حضرت والد ماجدؒ نے حسب عادت نماز تہجد ادا فرمائی اور فقیر کی والدہ ماجدہؒ بھی وہیں قریب میں تہجد پڑھ رہی تھیں نماز تہجد سے فارغ ہونے کے بعد والد ماجدؒ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے والدہ صاحبہؒ بھی (ہاتھ اٹھائے ہوئے) آمین کہہ رہی تھیں (یکایک) دونوں کے درمیان دو ہاتھ اور نمودار ہوئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ دو ہاتھ ہمارے فرزند کے ہیں جو عنقریب متولد ہوگا اس کے بعد فقیر پیدا ہوا اور سات سال کی عمر میں تہجد کی نماز کے اندر شریک والدین ہوا اور اسی وضع پر جس وضع پر سات سال پہلے دیکھا گیا تھا فقیر نے اپنے دونوں ہاتھ والدین کے درمیان دعا کے لئے اٹھائے۔

حضرت محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک روز جبکہ یہ فقیر بہت ہی صغیر السن تھا حضرت والد ماجدؒ نے مجھے اہل اللہ کہہ کر کر پکارا کسی نے اس راز کو معلوم کیا تو فرمایا اس کا بھائی اہل اللہ عنقریب متولد ہوگا (بے اختیار) میری زبان پر اس کا نام اس وقت جاری ہوگیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی جانب التفات بیکراں | حضرت شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت والد ماجد والد رحمۃ اللہ علیہ خلوت وجلوت میں میری جانب انتہائی توجہ والتفات اور

تلطف مبذول فرماتے تھے اور مجھے دیکھ کر بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ بیشتر دل میں بے اختیار یہ بات آتی ہے کہ تمام علوم و معارف کو یکبارگی تیرے سینے میں انڈیل دوں یہ فرماکر آپ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور پھر دوبارہ سہ بارہ یہی جملہ ارشاد فرماتے تھے۔ چنانچہ فقیر کو جو کچھ حاصل ہوا وہ آپ ہی کے انفاسِ طیبہ کا اثر اور ظہور ہے ورنہ اس فقیر نے تحصیلِ علم سلوک میں کچھ زیادہ محنت نہیں کی ہے ـــــ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن فقیر زمانۂ طفولیت میں احباب و اقرباء کے ساتھ ایک باغ کی سیر کو چلا گیا جب واپس آیا تو حضرتِ والاؒ نے فرمایا اے بیٹا! تم نے جتنے وقت میں باغ کی سیر کی اس وقت میں وہ کیا شئے حاصل کی جو کہ تمہارے ساتھ باقی رہی؟ مجھے دیکھو میں نے اتنی دیر میں اس قدر درود پڑھا ہے ـــــ یہ سنتے ہی فقیر کا دل باغوں کی سیر سے سرد ہوگیا پھر سیر و تفریح کا داعیہ دل میں پیدا ہی نہیں ہوا۔

خلفاء و مریدین | آپ کے چند خلفاء اور خاص مریدین کی ایک فہرست ذیل میں پیش کی جارہی ہے جو سرسری تلاش سے معلوم ہوئے ہیں صحیح تعداد تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

(۱) حضرت شیخ محمد پھلتیؒ جو حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے خسر اور حضرت شاہ ولی اللہ کے نانا تھے ـــــ حضرت محدث دہلویؒ نے آپ کے حالات میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے عطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ ـــــ آپ کا اور آپ کے آباؤ اجداد کا فضل و کمال اس رسالہ سے واضح ہوتا ہے ۔ شاہ عبیداللہؒ آپ کے صاحبزادے اور شاہ محمد عاشق پھلتیؒ آپ کے پوتے ہیں ـــــ ۸ رجمادی الاولیٰ ۱۱۲۵ھ میں آپ نے انتقال فرمایا مزار پھلت میں ہے

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جو اپنے زمانے کے آفتاب شریعت و طریقت ہیں، اپنے والد ماجد کے خلیفہ و مجاز ہیں عقد الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

فقیر نے والد بزرگوار کی ایک مدت تک صحبت حاصل کی اور ان سے بیعت کی اور آدابِ طریقہ کا بڑا حصہ ان سے سیکھا۔ طرق مشہورہ کے اشغال ان سے اخذ کئے، خرقۂ صوفیاء ان کے ہاتھوں سے پہنا ۔ حضرت والد ماجد اس ضعیف کی طرف بہت توجہ فرماتے تھے اصل نسبتِ حضور آپ ہی کی توجہ سے حاصل کی۔ آپ کی بہت سی کرامات کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا

واقعات عجیبہ اور اتفاقات غریبہ جو والد صاحب کو اور ان کے شیوخ کو پیش آئے تھے ان باتوں کو سن کر یاد رکھا اور انفاس العارفین کی قسم اول میں قلمبند کیا آخر عمر میں حضرت والد ماجدؒ نے مجھے تلقین وبیعت از صحبت وتوجہ کی اجازت عطا فرمائی اور یدہ کیدی (یعنی اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی مانند ہے) میرے بارے میں ارشاد فرمایا۔ والحمدللہ علی ذلک حمداً کثیراً امباراً کافیہ۔

(۳) حضرت شاہ زین العابدین ابن شیخ یحییٰ ابن حضرت مجدد الف ثانیؒ آپ ۱۰۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ بڑے باکمال تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور تصوف میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ شیخ حجۃ اللہ نقشبندی سرہندیؒ سے ظاہری وباطنی علوم حاصل کئے۔ مدتوں مسند درس وتدریس اور محفل تصوف کو رونق دی۔ بہت سے علماء نے آپ سے علم حاصل کیا ۱۱۲۶ھ میں انتقال فرمایا۔

(نزہۃ الخواطر جلد ۶)

انفاس العارفین اور انفاس رحیمیہ میں آپکے نام حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے مکتوبات درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے خاندان سے اخذ فیض کے بعد آپنے حضرت شاہ عبدالرحیمؒ سے بھی سلوک میں رہنمائی حاصل کی ہے۔ انفاس العارفین سے پتہ چلتاہے کہ ان کا اصل نام شیخ نفیر اللہ اور زین العابدین لقب تھا۔ انفاس العارفین میں کئی جگہ شیخ نفیر اللہ کا نام آیا ہے وہ یہی شیخ زین العابدین نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانیؒ ہیں۔ آپ حضرت خواجہ عبداللہ دہلوی عرف خواجہ کلاںؒ کے نواسے تھے۔

(۴) حضرت شیخ حسام الدین انصاریؒ بن شیخ بایزیدؒ بن شیخ بدیع الدین سہارنپوریؒ آپ کے والد ماجد حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کے اور آپ کے جدّ امجد حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپنے ۱۱۰۰ھ میں رد روافض کے موضوع پر ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی جس کا نام مرافض الروافض ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ مظاہر علوم سہارنپور میں موجود ہے۔ چند اجزا راقم کے پاس بھی محفوظ ہیں ــــ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتاہے کہ شیخ حسام الدین انصاری سہارنپوریؒ بھی آپکے اجازت یافتہ اور خلیفہ ہیں۔ افسوس کہ اس باکمال شخصیت کے حالات اور سن وفات کا پتہ نہ چل سکا۔

(۵ و ۶) شاہ عبید اللہ و شاہ حبیب اللہ۔ دونوں حضرت شاہ محمد پھلتیؒ کے صاحبزادے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ماموں ہیں حضرت شاہ عبد الرحیمؒ نے ان دونوں کے نام بھی علیحدہ علیحدہ اجازت نامہ لکھا ہے۔ دونوں کا مزار پھلت میں ہے۔

(۷) حضرت شیخ عبد الوہاب پھلتیؒ آپ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کے نانا اور حضرت شاہ محمد پھلتیؒ کے چچا زاد بھائی تھے۔

(۸) شیخ محمد معظم پھلتیؒ

(۹) شیخ بدر الحق پھلتیؒ جامع ملفوظات شاہ عبد الرحیمؒ

(۱۰ و ۱۱) شیخ فیض اللہ و دلدار بیگ۔ یہ دونوں حضرات بھی حضرت شاہ عبد الرحیمؒ کے خاص اصحاب میں سے تھے جیسا کہ آپ کے مکتوبات سے واضح ہوتا ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ دونوں بزرگ کہاں کے رہنے والے تھے؟

تصنیفات: حضرت شاہ عبد الرحیمؒ کو تالیف و تصنیف کا زیادہ موقع نہیں ملا حسب ذیل رسائل آپ کی یادگار ہیں۔

(۱) انفاس رحیمیہ۔ جو چند مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ حضرت شاہ اہل اللہؒ ان مکتوبات کے جامع ہیں۔

(۲) ارشاد رحیمیہ۔ فن تصوف اور سلوک میں ایک مفید و جامع رسالہ ہے

(۳) حضرت شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کے ایک رسالہ تصوف کا جو عربی زبان میں تھا، فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جس کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے والد سے سبقاً سبقاً پڑھا ہے اور جس کا ذکر انفاس العارفین اور الانتباہ میں کیا ہے۔

آخر عمر کے چند واقعات اور وفات: حضرت محدث دہلویؒ ارقام فرماتے ہیں کہ شوال ۱۱۳۱ھ میں حضرت ایشانؒ ایسے سخت بیمار ہوئے کہ امید حیات منقطع ہو گئی ان ایام میں حضرت والاؒ نے خلوت میں بلا کر مجھے حکم دیا کہ توجہ دل ودماغ ان کی جانب رکھوں اور اس کی نگہداشت کروں اور یہ بھی فرمایا کہ تین ماہ تک اس بات کا خاص خیال رکھنا۔ اس وقت تین ماہ کی تخصیص کا راز معلوم نہ ہو سکا تھا۔

اس سخت مرض سے چند روز میں افاقہ ہو گیا اور غسل صحت بھی کر لیا گیا۔ تین ماہ بعد مرض پھر لوٹ آیا اور کچھ عرصے بعد وفات ہوئی تو معلوم ہوا کہ تین ماہ کی تخصیص اس لئے تھی

حضرت شاہ صاحب ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ایشانؒ جب آخر عمر کو پہنچے اور صاحب فراش ہو گئے تو اس فقیر سے فرمایا کرتے تھے کہ دوات و قلم لاؤ میں چاہتا ہوں کہ اپنے معارف خاصہ تحریر کر دوں۔ فقیر نے چند مرتبہ دوات و قلم کو حاضر بھی کیا مگر نہ لکھنے کی طاقت تھی نہ املا کرانے کی۔ انفاس العارفین میں ہے کہ ان آخری ایام زندگی میں ایک روز حضرت ایشانؒ نے مجھ سے اور صلاح آثار محمد عاشق پھلتیؒ عہ سے ارشاد فرمایا کہ دیکھو آپس میں خوب دوستی رکھنا تمھاری دوستی میری روح کی خوشی کا باعث ہو گی۔ حضرت محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ان کلمات کا راز بعد کو کھلا جبکہ محمد عاشق پھلتیؒ نے اس فقیر سے ارتباط طریقہ پیدا کر لیا اور وہ مجھ سے منتفع ہوئے امید یہ ہے کہ اس دوستی سے "فوائد بسیار" برآمد ہوں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت والد ماجدؒ کی عمر کا آخری رمضان جب آیا تو آپ نے صیام و قیام کا اسی طرح اہتمام کیا جیسا کہ ہر رمضان میں کرتے تھے اگرچہ شیخ فانی ہونے کی بنا پر بحسب شریعت، رخصت افطار موجود تھی اور روزہ رکھنے کی

عہ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کی ممتاز و اعلیٰ شخصیت ایک مستقل مقالے کی متقاضی ہے اس وقت اتنا لکھنا کافی ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جس قدر تصنیفات بھی آج ہمیں دستیاب ہو سکی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر حضرت شاہ پھلتیؒ ہی کی کوشش جمع و تدوین کا نتیجہ ہیں امت مسلمہ پر حضرت شاہ محمد عاشقؒ کا یہ بڑا احسان ہو کہ انھوں نے حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف کی اشاعت کا انتظام کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو حضرت شاہ پھلتیؒ سے کس قدر روحانی تعلق تھا اس کا اندازہ خیر کثیر کے دیباچے سے ہو سکتا ہے جو حضرت شاہ محمد عاشقؒ کے قلم سے ہے اور اس عربی شعر سے ہوتا ہے جو حضرت محدث دہلویؒ نے شاہ محمد عاشق کے نام ایک مکتوب میں ان کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہو۔

وإنّي وإن خاطبتُ ألفَ مخاطَبٍ ……… فأنتَ الذي أعني وأنتَ المخاطَبُ

(یعنی اگرچہ میں خطاب ہزاروں آدمیوں سے کروں مگر اصل میرے مخاطب تم ہی ہوتا۔

بالکل طاقت نہیں تھی ـــــــ اس حقیر نے اور تمام گھر والوں نے عرض کیا کہ رخصت شرعی ہوتے ہوئے یہ تکلیف کیوں اٹھائی جا رہی ہے؟ اس کے جواب میں فرماتے تھے کہ روزہ رکھنے سے زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ ضعف کی وجہ سے بیہوش ہو جاؤں گا بیہوشی کا تو میں پہلے ہی سے خوگر ہوں ـــــــ جب شوال کا مہینہ آیا تو بھوک یک لخت ساقط ہوگئی اور ضعف کا غلبہ ہوگیا ایک روز ایسی حالت ہوگئی کہ امید حیات بالکل باقی نہیں رہی تھی۔ اس نازک حالت میں استغفر اللہ الذی لا الٰہ الا اللہ ھو الحی القیوم ـــ زبان پر جاری تھا پھر کچھ صحت اور تخفیف ہوگئی۔ صفر المظفر کے مہینے میں مرض دوبارہ لاحق ہوا ـــــــ جس روز وفات ہوئی ہو اس کی صبح صادق سے پہلے جب آثارِ موت ظاہر ہوئے تو آپ کو اس کا بڑا خیال تھا کہ نمازِ صبح فوت نہ ہو جائے۔ چند بار اس آخری وقت میں دریافت فرمایا کہ صبح صادق ہوگئی یا نہیں؟ حاضرین نے کہا کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی۔ حضرت والاؒ نے غصّے کے لہجے میں فرمایا کہ اگرچہ تمھاری نماز کا وقت نہیں ہوا ہماری نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ پھر فرمایا کہ مجھ کو قبلہ کی جانب متوجہ کر دو پھر اشارے سے آخری نماز پڑھی حالانکہ وقت میں شک تھا بعد ازاں ذکر اسم ذات آہستہ آہستہ کرتے رہے اور اسی مشغولیت ذکر میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے ـ یہ واقعہ ۱۲ صفر المظفر ۱۱۳۱ھ یوم چہارشنبہ کا ہے ـــــــ فرخ سیر بادشاہ کی حکومت کا آخری سال تھا۔ فرخ سیر آپ کی وفات سے پچاس روز بعد اسیر ہوا بعد ازاں سلطنتِ مغلیہ میں زبردست انقلاب برپا ہوا۔ آپ کی عمر عـــہ ۷۷ سال کی ہوئی۔ فتح چتوڑ اور تعمیر جامع مسجد شاہجہانی دہلی آپ کو یاد تھی۔

قطعۂ تاریخ وفات

در ہزار و یک صد و سی و یک از ہجر رسول
بامدادِ چہار شنبہ (۱۱۳۱ھ) از صفر ثانی عشر
ہادیٔ راہِ طریقت، شیخ دیں عبدالرحیم
کرد از دنیائے دوں در جنّت الماوٰی سفر

اخلاق و عادات

حضرت محدث دہلویؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت ایشانؒ (والد ماجد) اخلاق سلیمہ مرضیہ مثلاً شجاعت، فراست اور غیرت وغیرہ سے بوجہِ اتم متصف تھے۔ عقلِ معاش

عـــہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی پیدائش ۱۰۵۶ھ میں ہوئی ہے۔ پہلی قسط میں غلطی سے ۱۰۵۰ھ لکھی گئی ہے۔

بھی شمل عقل معاد کا ل و وافر رکھتے تھے۔ ہر امر میں اعتدال کو پسند فرماتے تھے، لباس میں عدم تکلف ملحوظ رہتا تھا ــــ موٹا، باریک جیسا کپڑا میسر آگیا استعمال کر لیا۔ امراء کے مکانات پر کبھی نہیں جاتے تھے اگر امراء آپ کے پاس حاضر ہوتے تو آپ بڑے اخلاق و تواضع سے پیش آتے تھے۔ کریم قوم کا مزید اکرام فرماتے تھے۔ اگر امراء نصیحت طلب کرتے تھے تو نہایت نرمی سے نصیحت فرماتے تھے۔ ہمیشہ تعظیم علم و علماء اور نفرت از جہل و جہلا آپ کا شعار رہا۔

ہر حال میں آثار نبویہ کا تتبع کرتے تھے۔ آپ کے آثار استقامت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کبھی اپنی عمر میں بعد سن شعور، جماعت نماز فوت نہیں کی الا یہ کہ کوئی عذر شرعی پیش آگیا ہو۔ کسی زمانہ عمر میں خواہ جوانی ہو یا نوجوانی، امور ممنوعہ کی جانب کبھی میلان نہیں ہوا اتباع جادہ محمدیہ آپ کا خلق جبلی تھا ــ ضرورت کے وقت بیع و شراء کا معاملہ خود کر لیتے تھے۔ عمامہ وغیرہ لباس میں مشائخ صوفیا کی وضع پسند تھی ــــ غرضکہ بے تکلفانہ زندگی بسر کرتے تھے ــــ بغیر شدید ضرورت کے قرض لینا مکروہ سمجھتے تھے اور جو شخص عیش و عشرت اور اچھے کھانے، پینے کی خاطر قرض لیتا تھا اس سے ناراض ہوتے تھے ــــ ہر علم میں کچھ نہ کچھ دخل رکھتے تھے فن طب میں آپ کی مہارت، انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔

معمولات | حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت ایشان نوافل تہجد کا اہتمام فرماتے تھے مگر ان کے یہاں عدد رکعات کی کوئی قید نہ تھی، نشاط و رغبت کے ساتھ جس قدر رکعات بھی ہو جائیں ــ اشراق و چاشت بھی پڑھتے تھے، بعد مغرب دسنتوں سے فارغ ہو کر، دو رکعت نماز نفل برائے ثواب والدین و برادر کلاں، پڑھنے کا معمول تھا۔ زیادہ تر تلاوت قرآن مجید میں مشغول رہتے تھے کوئی عذر ہوا تو دوسری بات ہے ــ بہت ہی خوش لحان تھے ــ رعایت تجوید کے ساتھ قرآن شریف پڑھتے تھے۔ تلاوت کے علاوہ "حلقہ یاراں" میں دو تین رکوع کا ترجمہ بیان معانی کے ساتھ کرتے تھے۔ ایک ہزار مرتبہ ذکر نفی و اثبات ہوتا کچھ حصہ ذکر سے پہلے جہر کے ساتھ کچھ آہستہ آہستہ ــــ بارہ[12] ہزار مرتبہ اسم ذات کا ورد ملازم تھا مراقبہ میں بھی رہتے تھے ــ بعد وفات حضرت شیخ ابو الرضا محمدؒ بعض مخلصین کی درخواست پر اپنے مرحوم بھائی کے انداز میں وعظ فرماتے تھے شروع میں اکثر مشکوٰۃ شریف، تنبیہ الغافلین

اور غنیۃ الطالبین سے اخذ کرکے وعظ فرماتے تھے آخر میں تفسیر قرآن وعظ کے اندر شروع کر دی تھی۔ بارہا ہم نے آپ کی زبان مبارک سے سنا ہے کہ ہم نے جو کچھ پایا درود شریف کی بدولت پایا ـــــ ہر روز سورۂ مزمل گیارہ مرتبہ اور یا مغنی گیارہ سو مرتبہ، غنائے ظاہری کے لئے پڑھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حالات میں پہلے اسباب ظاہر کے اپنے بندوں کے قلوب حضرت ایشانؒ کی طرف متوجہ فرما دیتا تھا ـــ

اخلاقی انقلاب

مترجمہ وحیدالدین خاں

صاحب مقالہ ولیم۔ آئی۔ نکولس THIS WEEK کے اڈیٹر اور پبلشر ہیں جو امریکہ کا ایک کثیر الاشاعت رسالہ ہے اور بڑے بڑے شہروں کے چودہ ملین سے زیادہ خاندانوں میں پہنچتا ہے۔ مقالہ موصوف کی ایک تقریر کا خلاصہ ہے جو انھوں نے ملواکی کے صبہونی مرکز میں وسکانسن ویلفیر کونسل کے سامنے ۱۶ر نومبر ۱۹۶۷ء کو دیا تھا۔

ہماری جدید اور دائمی طور پر تغیر پذیر دنیا میں جو نئی اخلاقیات ابھر رہی ہیں، آیئے دیکھیں کہ کیا ہم اس کے کسی عقلی تصور (RATIONAL CONCEPTION) تک پہنچ سکتے ہیں۔

ساوتھمپٹن میں چار نوجوان اشخاص تہذیب سوز حرکات کے جرم میں گرفتار کئے گئے۔ ان میں سے ایک نے صفائی کے ساتھ کہا۔ "ہر آدمی جانتا ہے کہ اس ملک کا اخلاق نہایت پستی میں جا رہا ہے"

کیا اخلاق فی الواقع پستی میں جا رہا ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو کیوں ہے اور کیا یہ کوئی ناگزیر رجحان ہے۔ یا اس کی کوئی گنجائش ہے کہ آنے والے برسوں میں ایک پرامید مثبت اور تعمیری قسم کے موڑ کی توقع کی جا سکے۔

شخصی طور پر میں پرامید نقطۂ نظر کا قائل ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہم بڑھ رہے ہیں۔ یہ بڑھنا زوال اور شکست کی طرف نہیں ہے بلکہ انسانی کامیابی کے ایک نئے عظیم عہد کی طرف ہے

اور ایک ایسے وقت کی طرف ہے جب لوگ خود اپنے اندر سے ایک نئی قسم کی اخلاقی طاقت کی تعمیر کرنا سیکھ جائیں گے۔ مگر اس نئی قسم کی اخلاقیات کو دیکھنے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم موجودہ اخلاقی بحران کے وقتی پہلوؤں سے بلند ہو کر غور کریں۔

ہم سب باخبر ہیں کہ اس اخلاقی بحران نے ہمارے درمیان کس قسم کے مظاہر پیدا کئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگوں نے ان اعداد و شمار کو دیکھا ہے جو ایف۔ بی آئی (F. B. I.) اور دوسرے ادارے شائع کرتے ہیں۔ جن میں جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار، کوتاہیوں اور بری خصلتوں کا ذکر ہے۔

ہم نے ان کہانیوں کو سنا ہے جو شراب نوشی، عصمت دری اور ہائی اسکول کی طالبات کے حاملہ ہونے سے متعلق ہیں۔

ہم باخبر ہیں کہ کس طرح جنسیات سے بھری ہوئی کتابوں، رسالوں اور فلموں کا لامتناہی طوفان چلا آرہا ہے جو بالآخر ذوق اور اخلاقیات کے قدیم معیاروں کو الٹ پلٹ دینے والا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ پبلک اور پرائیویٹ زندگیوں میں بدعنوانی کے واقعات ہوتے ہیں۔ مگر صرف واقعات اور اعداد و شمار کا حوالہ دے دینا کافی نہیں ہے۔ یا یہ کہ ان پر ماتم کر لیا جائے۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہے کہ سماج جس گڑھے میں گر رہا ہے اس پر شور و واویلا کیا جائے یا عدالت کو برا بھلا کہا جائے۔ یا پرانے زمانے کی سخت سزاؤں، مثلاً شکنجہ میں کسنا وغیرہ کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ دور قدیم کے "اچھے دنوں" کی طرف واپسی کا اب کوئی سوال نہیں ہے۔ خواہ وہ اچھے دن واقعۃً اتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں جیسا کہ ہر شخص کہہ رہا ہے۔ تبدیلی کی ہوائیں نہایت شدت کے ساتھ چل رہی ہیں۔ منظم کرۂ ارض جس کو ہم اسکول میں پڑھتے ہیں، وہ از سر نو ادھیڑا جا رہا ہے اور اس کو دوبارہ جوڑتا ہے۔

آج کے نقشے مشکل ہی سے ان حالات کے پس منظر میں سمجھ میں آسکتے ہیں جس کو ہم ایک نسل پہلے جانتے تھے۔ اسی اتار چڑھاؤ نے پرانے خیالات اور زندگی کے پرانے

طریقوں کو ہلا دیا ہے۔ واحد تعمیری نقطۂ نظر (CONSTRUCTIVE APPROACH) یہ ہے کہ آگے کی طرف دیکھا جائے، یہ دیکھا جائے کہ کون سے نئے خیالات اور نقطۂ نظر ابھر رہے ہیں جو ہمارے بدلتے ہوئے زمانہ کے مسائل کا ساتھ دے سکیں۔

کیا پرانا زمانہ اچھا تھا؟

مطالعہ کے آغاز کی بہترین صورت یہ ہے کہ پیچھے مڑ کر تھوڑا سا دیکھ لیا جائے۔ جب میں لوگوں کو موجودہ زمانہ کے اخلاق پر تنقید کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے ایک مضمون یاد آجاتا ہے جو میں نے انگلینڈ کے بارے میں پڑھا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ صرف دو سو برس پہلے انگلینڈ کے عام آدمی کی زندگی کیسی ہوتی تھی۔ صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ اس وقت کا انسان اپنی تمام عمر مقامی گرجا کے سات میل کے دائرہ کے اندر اندر گزارتا تھا۔ اور اپنی پوری زندگی میں وہ تین سو سے بھی کم آدمیوں سے ملاقات کرتا تھا۔

جاگیرداری نظام کے ان گزرے ہوئے دنوں میں عام زندگی کیسی تھی، اس کی نہایت عمدہ تشریح الکسس ڈی ٹاکویلی (ALEXIS DE TOCQUEVILLE) نے دی ہے۔ ہر آدمی عملاً اپنے گاؤں سے بندھا ہوا تھا اور ذمہ داریوں کے ایک مضبوط جال کے اندر ہوتا تھا۔ یہ ایک زنجیر تھی جو جاگیردار، مقامی پادری گلڈ ہال (GUILD HALL) اور زمیندار کے ساتھ ساتھ ہر وقت کے پڑوسیوں اور مستحکم خاندان کی مختلف کڑیوں سے بنتی تھی۔

ان تمام چیزوں نے مل کر کنٹرول اور نگرانی کا ایک مضبوط نظام وجود دے دیا تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ دوسرا آدمی کیا کرتا ہے۔ ہر شخص کی نظر میں دوسرے آدمی کا اخلاق ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ لوگ ایک عظیم اور محیط قسم کے اجتماعی حلقہ پرہیزگاری (COMMUNITY CHASTITY BELT) میں بندھے ہوئے تھے۔ اس میں تعجب نہیں اگر اس وقت کا سماج اخلاقی تھا یا ایسا دکھائی دیتا تھا، یہاں تک کہ جب تمام رکاوٹیں ختم ہو گئیں، جیسا کہ صلیبی لڑائیوں یا مشہور سو سالہ جنگ (HUNDRED YEARS WAR) یا فرانسیسی انقلاب کا عہد خونیں (REIGN OF TERROR) میں ہوا تو نقشہ بالکل دوسرا تھا۔ اس وقت جو کچھ ہوا وہ ایک شخص کو حیرانی میں ڈال دیتا ہے کہ قدیم اچھے دن کیا پھر بھی واقعۃً اتنے

اچھے یا اتنے اخلاقی تھے۔

نئی آزادی

انسانی تاریخ میں پہلی بار اب ہم سماجی، اقتصادی اور ٹکنکل ترقیوں کے ایک ایسے مقام پر پہنچے ہیں جبکہ وسیع آبادیاں فی الواقع آزاد ہیں۔ اور آزادی کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اچھے کی آزادی یا برے کی آزادی .... خیر کی آزادی یا شر کی آزادی ..... گناہ کی آزادی یا تلاشِ خدا کی آزادی۔

یہی دراصل ضروری نکتہ ہے اور یہی کسی اخلاقی بحث کا مرکز ہے، جدید اخلاقیات کوئی تیار مال نہیں ہے۔ جدید اخلاقیات کوئی متعین احکام کا مجموعہ نہیں ہے جو ایک پتھر کی تختی پر کندہ ہو۔ جدید اخلاقیات ایسے قوانین اور مقولوں کا مجموعہ بھی نہیں ہے جو کسی کتاب میں بند ہو۔ جدید اخلاقیات ایک ایسی چیز ہے جو خود تمھارے اندر ہے۔ اس کا دوسرا نام ہے انتخاب کی آزادی (FREEDOM OF CHOICE) خود انضباط (SELF DISCIPLINE) اور ضمیر (CONSCIENCE) یہ صحیح اور غلط کے درمیان فرق جاننے پر مشتمل ہے۔ اور یہ کہ کس چیز کو اختیار کیا جائے اور کب اور کیسے۔

بظاہر بڑھتی ہوئی آزادی کی اس نئی دنیا میں لوگوں کے لئے ہمیشہ سے زیادہ آسانی ہے کہ وہ غلط (WRONG) کا انتخاب کریں۔ لاکھوں لوگوں نے ایسا کیا ہے اور اس معاملے میں ہم میں سے کون ہے جو ایسا نہ کرے — مگر اہم بات یہ ہے کہ لوگوں نے ہمارے ٹکنکل زمانے کی تبدیلیوں کو ہضم کرنا شروع کر دیا ہے اور جب وہ ایسا کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اخلاقی، روحانی اور انسانی قدروں کی اہمیت سے زیادہ باخبر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارے زمانے کی ایک امید افزا ترقی ہے۔

ٹکنکل تبدیلی کا اثر

میں یہاں ٹکنکل تبدیلیوں کی وسعت اور رسائی کو یاد دلاؤں گا جس کو ہمیں جذب

کرتا ہے اور جس کو ہم جذب کر رہے ہیں۔ پچاس برس پہلے آٹو موبائل دور (AUTOMOBILE AGE) کے آغاز پر غور کرو۔ میں اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ وہ کیسا اتار چڑھاؤ تھا صرف معاشیات ہی میں نہیں بلکہ اخلاق اور معاملات میں بھی۔ مگر دوسرے تمام دوروں پر بھی غور کرو جن کو ہمیں جذب کرنا ہے۔ . . . فضائی دور (AIR AGE) ایٹمی دور (ATOMIC AGE) خلائی دور (SPACE AGE)

اور ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا کیونکہ اب ہم ایک دوسرے دور کے سرے پر ہیں اور وہ ہے خود کار دور (AUTOMATION AGE) جو غالباً سب سے زیادہ انقلابی دور ہے۔ یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ یہ دور ہمارے لئے کیا لائے گا، پروفیسر برنارڈ مُلر تھم (BERNARD MULLER THYM) کے الفاظ پڑھئے:-

"ہم حجری دور (NEOLITHIC ERA) کے خاتمہ پر زندگی گزار رہے ہیں آج کی دنیا میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں وہ محض ایک قسم کے سماج سے دوسرے قسم کے سماج، ایک قسم کی ٹکنالوجی سے دوسری قسم کی ٹکنالوجی کے معنی میں نہیں ہے وہ اتنی دور رس ہیں کہ وہ ہم کو انسانی تاریخ کے ایک بڑے عہد (MAJOR EPOCH) سے دوسرے بڑے عہد میں پہنچا رہی ہیں۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو کسی بھی ایسی چیز سے کلی طور پر مختلف ہے جس کو ہمارے آباؤ اجداد جانتے تھے۔ خواہ ہم دس ہزار برس پیچھے چلے جائیں جب وہ جائداد کے تصور تک پہنچے جب انھوں نے ملکیت کو دریافت کیا، جب انھوں نے کام کو جانا اور پہیے کی مکانکس معلوم کی۔"

ہم ایک دوسرے گوشہ کی طرف جا رہے ہیں۔ زیادہ روشن گوشہ۔ ہم نے ابھی تک کچھ نہیں دیکھا ہے۔ یہ بہت کم قابل تعجب ہے ـــ اگر ہم، ہمارے بچوں کا تو ذکر ہی کیا انتشار میں مبتلا ہیں مگر ان سب کے باوجود جس طرح خدا کا مذاق نہیں اڑایا جا سکتا اسی طرح میں یقین رکھتا ہوں کہ انسان کی انسانیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ چیز ہم کو اپنی تاریخ کے امید افزا پہلو کی طرف لے جاتی ہے۔

جدید اخلاقیات

میں نے پہلے کہا ہے کہ میرا یقین ہے کہ بہت سے لوگ جو اخلاقی پستی (MORAL DRAIN) میں گرنے سے بچے ہوئے ہیں، وہ تیزی سے اخلاقی، روحانی اور سماجی قدروں کا شعور حاصل کر رہے ہیں۔ میں اپنے اس یقین کے حق میں چند خاص شہادتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اس سلسلے میں مجھے یہ واضح کرنا چاہیے کہ اڈیٹر لوگ مستقبل کے رجحانات اور امکانی واقعات کا اندازہ کرنے کے لئے اپنے خاص طریقے رکھتے ہیں۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم افق پر دیکھنے کی کوشش کریں، کامیاب ہونے والوں کا انتخاب ان کے کامیاب ہونے سے پہلے کر لیں۔ یا جیسے ہارورڈ کے صدر لاول (LOWELL) تعلیم یافتہ آدمی کی تعریف میں کہا کرتے تھے:-

TO MAKE A REASONED GUESS ON THE BASIS OF INSUFFICIENT INFORMATION "ناکافی معلومات کی بنیاد پر عقلی قیاس کرنا"۔ اسی طرح یہاں چند رجحانات نقل کئے جاتے ہیں جو میرے اس نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں۔

۱۔ حال میں قومی پیمانے کا ایک سروے "امریکن سنڈے" (THE AMERICAN SUNDAY) میں کیا گیا تھا، اس کا تجزیہ کرنے کے بعد المورا پر (ELMO RAPER) نے پایا کہ اتوار امریکہ کا کہیں زیادہ محبوب دن ہے۔ یہ بڑی اکثریت کے نزدیک تین عمدہ، بنیادی اور مشترک قومی وجوہ کی بنا پر ہفتہ کے تمام دنوں کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے (۱) کیونکہ یہ مذہبی میل ملاپ (RELIGIOUS ASSOCIATION) کا دن ہے۔ (۲) کیونکہ یہ آرام کرنے اور ستانے کا دن ہے (۳) کیونکہ یہ خاندان اور دوستوں کے ساتھ رہنے کا دن ہے۔

۲۔ زیادہ قریبی زمانے میں اس سے بڑا سروے امریکن ایسوسی ایشن آف ایڈورٹائزنگ ایجنسیز نے کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ فی صدی تناسب کے اعتبار سے، لوگوں نے سب سے زیادہ جن موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے، وہ بالترتیب حسب ذیل ہیں۔

مذہب، پچاس فیصدی۔ بچوں کی تربیت، چوالیس فیصدی۔ خاندانی زندگی، چھتیس فیصدی۔ تعلیم، تینتس فیصدی۔ اس کے مقابلے میں وہ موضوعات جو زیادہ دلچسپی کا مرکز سمجھے جاتے

ہیں مثلاً کھیل، فیشن، سیر اور انتظام کا تناسب بہت نیچے ہے۔

۳۔ خود اپنے رسالہ (THIS WEEK MAGAZINE) میں ہم نے جو تجربہ کیا ہے، اس میں ہم نے پایا ہے کہ وہ عنوانات جو سب سے زیادہ سنجیدگی سے پڑھے جاتے ہیں وہ وہی ہیں جو بہتری کا کوئی پہلو اپنے اندر رکھتے ہیں۔ مثلاً (WORDS TO LIVE BY, THE ART OF LIVING, FAMILY LIVING, THE SEARCH FOR EXCELLENCE

یہ موضوعات اتنے زیادہ پسند کئے گئے ہیں کہ اب ہم اپنی اشاعتوں پر انھیں پر زیادہ زور دیتے گئے ہیں۔

آندولن کا ایک اور زاویہ سویڈن میں نظر آتا ہے حالانکہ سویڈن وہ ملک ہے جو لمبی مدت تک اخلاقی بندشوں کو ہٹانے پر فخر کرتا رہا ہے۔ آج سویڈن میں ایک تحریک کھیل رہی ہے جس کے سربراہ ملک کے نمایاں ڈاکٹر ہیں۔ اس کا مقصد جنسی آزادی (SEXUAL LAXITY) کو ختم کرنا ہے۔ یہ بات بہت بامعنی ہے کہ ڈاکٹر سادہ طور پر محض بندش، قوانین اور دوسری خارجی پابندیوں کی طرف واپسی کی وکالت نہیں کرتے ہیں۔ اس کے بجائے انھوں نے اس اعلان کے ساتھ کام کا آغاز کیا ہے کہ جنسی آزادی کے باوجود "سویڈن کی نوجوان نسل آج خوش نہیں ہے"۔ وہ اسکولوں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ جنسی تعلیم پر کم وقت صرف کریں اور مذہبی رہنمائی اور تعلیم پر زیادہ وقت دیں جو بچوں کو یہ جاننے میں مدد دے گی کہ

WHAT IS RIGTH AND WRONG

صحیح اور غلط کیا ہے۔

ہم دوبارہ مرکزی نکتہ پر پہنچ گئے ہیں ——— انتخاب کی آزادی (FREEDOM OF CHOICE) جس کا مطلب ہے صحیح کو غلط کے مقابلے میں سمجھنا اور صحیح (RIGHT) کا انتخاب کرنے کی خواہش، کسی ٹیکنیکل نیکی (TECHNICAL VIRTUE) کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ برتر اور ابدی قانون اخلاق کا جزء ہے اور اس لئے کہ بالآخر یہی وہ چیز ہے جو انسانی خوشی (HUMAN HAPINESS) کی سب سے بڑی مقدار عطا کرتی ہے۔

انتخاب کی آزادی

یہاں بڑی دانائی ہے۔ موجودہ متحرک دنیا میں اب آپ کسی کو با اخلاق بننے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ البتہ اس کو اخلاقی طریقہ اختیار کرنے کی طرف راغب کر سکتے ہیں۔ جس چیز کا میں عقیدہ رکھتا ہوں وہ ایک معجزہ ہے جو اب ظاہر ہو گا۔ اور یہ اس مغالطے کے اندر موجود ہے جو حالیہ برسوں میں اخلاقیات کے بارے میں پیش کیا گیا ہے۔ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا قانون بنایا جا سکے یا ایسا کوڑا نکالا جا سکے یا ایسی سیٹی بجائی جا سکے جو ہر ایک کو اس کے اسٹول پر بٹھا دے اور دوبارہ انھیں با اخلاق بنا دے۔

مگر آزادیٔ انتخاب کی موجودہ دنیا میں اس طرح کے واقعات وجود میں نہیں آتے۔ اب یہاں کوئی بنا بنایا مجموعہ قانون (READY-MADE CODE) یا پہلے سے طے کیا ہوا عقیدہ نہیں ہے اب ہم اس مقام سے بہت آگے جا چکے ہیں۔ اب ہم مسلسل بڑھتی ہوئی سیاسی، معاشی اور سماجی آزادی کی دنیا میں ہیں۔ اب ہر چیز کو از سر نو شروع کرنا ہے اور ہر چیز کو ہمارے اندر سے شروع ہونا ہے:۔

(FROM HERE ON, EVERY THING HAS TO START ANEW AND FROM WITHIN) اس مقام پر میں فلپائن کے صدر میکا پاگل (MAC A PAGAL) کا ایک بیان نقل کرنے کی جرأت کروں گا۔ انھوں نے کہا "میرا یقین ہے کہ آزادی، خود انضباط اور خود ترقی کی اندرونی خصوصیات رکھتی ہے"

FREEDOM HAS INHERENT QUALITIES OF SELF-DISCIPLINE AND SELF-IMPROVEMENT) کھلی ذہن رکھنے والے لوگ خواہ جو بھی کہیں، یہ ہم سب کے لئے عقیدہ کی نہایت عمدہ دفعہ ہے۔

عالمی نمائش کی شہادت

پچھلی گرمیوں میں نیویارک کی عالمی نمائش کو دیکھتے ہوئے میں نے کئی بار اس معاملہ

پر غور کیا۔ اب تک یہ کم و بیش ایک مسلمہ رہا ہے کہ عالمی نمائشیں اپنے وقت کا آئینہ ہوتی ہیں اور لوگوں کے ذہن میں سب سے اوپر جو بات ہوتی ہے وہ اس کو منعکس کرتی ہے۔

اب تک میرے حافظہ کے مطابق تمام نمائشوں میں سائنس اور ٹکنالوجی لوگوں کی توجہات کا سب سے بڑا مرکز رہی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں نیویارک کی پہلی نمائش میں دلچسپی (FUTURAMA) اور (WORLD OF TOMORROW) پر مرکوز رہی جن میں لمبے سفروں، ہوائی اڈوں، الکٹرانکس اور ٹیلی ویژن کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں برسلز کی نمائش میں خاص چیز عظیم (ATOMIUM) تھا۔ جو گویا آنے والے اٹمی دور کا نشان تھا۔

۱۹۶۲ء میں سیٹل (SEATTLE) کی نمائش میں "خلائی سوئیوں" کا چرچا تھا۔

مگر اس سال گرمیوں میں نیویارک کی نمائش میں میں نے مکمل طور پر ایک مختلف اسپرٹ محسوس کی۔ جیسا کہ رسالہ ٹائم (TIME) نے اپنے تبصرہ میں کہا تھا "مستقبل کا حسن کسی قدر ڈھل گیا ہے" (THE FUTURE HAS BECOME SLIGHTLY PASSE) اور جب کہ لوگ اب بھی ٹکنکل معجزات کے شو دیکھنے کے لئے لائن میں کھڑے تھے، حقیقتاً معنی خیز چیز روحانی اور انسانی قدروں سے ان کا بڑھا ہوا تعلق تھا۔ جو نمائش کے دوسرا اجزا سے کم نہیں تھا۔ خاص طور پر سات مذہبی پیولین بشمول PIETA اور حیرت انگیز فلم "TO BE ALIVE"۔

اور یہ آخری چیز تو نمائش پر واقعی ایک ضرب تھی۔ وہ اتنی سادہ ہے کہ اس کی تشریح کرنا تقریباً محال ہے۔ کیونکہ وہ بالکل معمولی لوگوں سے متعلق تھی جو معمولی کام کرتے ہیں۔ مگر وہ خوشی کے عالمی احساس کا اظہار کرتی ہے اور اس سادہ حقیقت کا سبق دیتی ہے کہ ہمیں اس زمین پر زندہ رہنا چاہیئے.....

اس سے صورت حال میں ایک خوش گوار تبدیلی کا پتہ چلتا ہے:

(THIS SUGGESTS A WELCOME TURNING OF THE WHEEL)

مدت سے ہمیں بتایا جاتا رہا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے انسانیت پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اور وہ ہماری دنیا پر حکمرانی کر رہی ہیں۔ مگر اب انسانیت (HUMANITY) ان کو پکڑتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ اس عمل میں خلائی انسان (SPACE MAN) اپنی سحر آفرینی (GLAMOUR) کھو

دینا چاہتا ہے۔ ہم دوبارہ زمین کی طرف واپس ہو رہے ہیں۔ چاند کے بجائے خود اپنی زمین پر زور دینے کا زمانہ واپس آرہا ہے۔ بیرونی خلا سے ہمارا تعلق کم ہوتا جارہا ہے۔ اندرونی روح سے ہمارا تعلق بڑھ رہا ہے:

(WE ARE GROWING MORE CONCERNED WITH THE INNER SPIRIT) ہم انسان اور اس کے موجودہ ماحول کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اور یہ کہ اس زمین پر حالات کو بہتر بنانے کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں خود تو یہ کہتا ہوں کہ یہ بہت اہم وقت ہے اور اس کے لئے خدا کا شکر گزار ہوں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ تمام ٹکنکل کامیابیوں سے دست بردار ہوگئے ہیں۔ اس کا مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو بلا ثبوت مان رہے ہیں:

(THEY NOW TAKE ALL THESE "THINGS" MORE FOR GRANTED)

وہ موجودہ حالت کے مقابلے میں کسی نئی حالت کے طلب گار ہیں۔ بظاہر وہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"موجودہ چیزیں بلاشبہ بہت عمدہ ہیں۔ مگر اس میں میرے لئے کیا چیز ہے۔ خوشی (HAPPINESS) کے مفہوم میں وہ کہاں لے جاتی ہیں۔ میری خوشی میرے خاندان کی خوشی اور گرد و پیش کے تمام لوگوں کی خوشی۔ یقیناً ہمیں ان سامانوں کا مالک ہونا چاہیئے۔ مگر اب ہمیں ان کے ساتھ زندگی گزارنے کو سیکھنا چاہیئے۔ مختصر طور پر یہ کہ ہمیں زندہ رہنا سیکھنا چاہیئے۔ (LET'S LEARN TO LIVE)

یہ رد عمل (REACTION) جتنا زیادہ پھیلے گا، ہمارا سماج اتنا ہی زیادہ اپنے آپ کو انسانی قدروں (HUMAN VALUES) سے متعلق کرتا چلا جائے گا۔ اور اسی کے ساتھ سائنس بھی طبیعیاتی سے زیادہ سماجی معاملات پر زور دینے لگے گی۔

تعلیم میں نئے رجحانات

میری پیشین گوئی ہے کہ یہ تبدیلی بہت جلد ہمارے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں

جگہ پائے گی۔ موجودہ زمانے میں زیادہ لائق طلبا خود بخود فزکس، میتھمیٹکس، الکٹرانکس اور دوسرے طبیعیاتی علوم (PHYSICAL SCIENCES) کی طرف متوجہ رہے ہیں۔ آیندہ برسوں میں ایک تبدیلی ہونے والی ہے جبکہ سماجی، نفسیاتی اور حیاتیاتی علوم پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ تحقیق اور عمل (RESEARCH & ACTION) کے لئے دوسرا بڑا میدان انسان کی فطرت اور انسانی ماحول کو بنانا ہے۔

یہ خلائی اڑان اور یہ مینہاٹن پروجکٹ (MANHATTAN PROJECTS) کے اعتبار سے ایک دور کی بات ہوگی اور یہ انسان سے متعلق موضوعات کے ایک بڑے رقبہ کو لے لے گی۔ مکانات کی تعمیر اور شہری منصوبہ بندی سے لے کر تعلیم اور سماجی نفسیات تک، آبادی پر کنٹرول اور سمندر کے پانی کو صاف کرنے تک، علم توالد و تناسل (GENETICS) اور سالماتی بیالوجی تک، اخلاقیات اور فلسفہ کردار تک۔

آپ جدھر بھی دیکھیں، آپ اس رجحان کے نشانات پائیں گے۔ ہر جگہ ماہرین تعلیم، اخلاق اور روحانی اقدار کی اہمیت پر زور دے رہے ہیں یا جیسا کہ کہا گیا ہے، قدروں کی قدر (VALUE OF VALUES) پر۔

مثال کے طور پر ایل میں صدر رنگمن بریوسٹر (RINGMAN BREWSTER) نے حال میں کہا ہے کہ اب طالب علموں کا انتخاب ان کی اخلاقی وسعت اور ان کی ذہنی صلاحیت کی بنا پر کیا جانا چاہیئے۔ وسکانسن کے لارنس کالج میں صدر کرٹس ٹار (CURTIS TARR) نے کہا ہے کہ "معلومات کی فراہمی صرف ابتدائی کام (STARTING POINT) ہے"۔ ڈین بروس ہیوڈ (DEAN BRUCE HAYWOOD) کہتے ہیں کہ کامیابی بالآخر طالب علموں کے ذوق اور اخلاقی فیصلے پر منحصر ہے۔" اور نیویارک میں بورڈ آف ایجوکیشن کے صدر جیمز بی۔ ڈونووین (JAMES B DONOVAN) نے اخلاقی قدروں کی تعلیم کی بہت عمدہ وکالت کی ہے۔ انھوں نے کہا "یہ جاننے کا وقت آگیا ہے کہ اپنے نوجوانوں میں اخلاقی عمل اور مضبوط کردار کے بنیادی تصورات کی تعلیم کے لئے دستوری حدود میں مزید کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

ان اقوال میں ایک پیغمبرانہ اضافہ آنجہانی کارل ینگ (carl jung) کا ہے جو زبردست ماہر نفسیات اور فلسفی تھا۔ اس نے کہا۔ میں مطمئن ہوں کہ روح کی چھان بین مستقبل کی سائنس ہوگی۔"

(EXPLORATION of THE SOUL IS THE SCIENCE OF THE

مشہور خلائی ایکسپرٹ اور برطانی بین سیاراتی انجمن (BRITISH

INTER-PLANETRY SOCIETY) کے سابق صدر آرتھر کلارک نے اسی جذبہ کے تحت کہا ہے کہ " یہ محض اتفاقی مطابقت نہیں ہے کہ آج سب سے زیادہ وحشیانہ برائی ہمارے بڑے بڑے شہروں سے نمودار ہو رہی ہے۔"

میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ہم ایٹمی دور، خلائی دور اور کمپیوٹر دور (COMPUTER AGE) سے آگے جائیں گے اور ایک نئے زمانہ میں داخل ہوں گے جس کو انسانی دور (MAN AGE) کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہوگا جس میں اخلاق اور روحانیت کو اونچا مقام حاصل ہوگا۔ اس وقت ہماری تمام وسیع قوتیں اور جد و جہد اور تخلیقی طاقتیں انسانی دلدل اور خارزار کی صفائی کے لئے وقف ہوں گی۔ اور زندگی کے نقشہ کو ترقی دے کر اس کو تمام انسانیت کے قابل بنائیں گی۔

اخلاق، آزادی اور مسرّت

اس واقعہ میں ہمارے لئے رجائیت کی گنجائش ہے کہ انسانی آزادی کی بنیاد پر ایک اخلاقی نظام کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔ وہ وقت گزر گیا جب اخلاق کسی کے اوپر لادا جاسکتا تھا۔ اب ان کا انتخاب کیا جائے گا (NOW THEY MUST BE CHOSEN) بے دلی کے ساتھ باپ یا ماں یا سپاہی کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ آزادی اور شوق کے ساتھ کیونکہ آج کی اخلاقیات وہ اخلاقیات ہیں جن کو میزان پر تولا جاسکتا ہے یا آج کی اصطلاح میں تجربہ اور عقل عام سے جانچا جاسکتا ہے۔ ہم مظاہرہ کرکے دکھا سکتے ہیں کہ اخلاق اور مسرّت (MORALITY AND HAPINESS) دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ جو اخلاقی ایشو (MORAL ISSUE) سے باخبر ہیں اور جس کو دوسرے لفظوں میں زیادہ مسرت بخش انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہمارے زمانہ کا ڈراما ہے۔ اس سے زیادہ بڑا جتنا کوئی سائنٹفک یا ٹکنکل معجزہ ہو سکتا ہے۔ یہ آزاد مردوں اور عورتوں کی بصیرت ہے جو اپنے لئے بہتر سماج کا انتخاب کر رہے ہیں اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ تعبیر ہر شخص خود کر رہا ہے، اپنی آزاد خواہش سے

(امریکن ریویو — جنوری ۱۹۶۶ء)

عرض مترجم

مضمون کے سلسلے میں چند باتیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ صاحب مضمون نے کہا ہے کہ دور قدیم کی طرف واپسی کا کوئی سوال نہیں۔ خواہ وہ اچھا ہی کیوں نہ رہا ہو۔ یہ بات انھوں نے اخلاقی بحث کے ضمن میں کہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ موصوف کے الفاظ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ "ہماری زمین میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں" مگر ان تبدیلیوں سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ "پرانے اخلاقی تصورات اور زندگی گزارنے کے پرانے طریقے بھی قابل ترک ہو گئے۔ اور اب لازماً نیا اخلاق اور نیا طریق زندگی تلاش کرنے کی ضرورت ہے"

ہماری زمین پر جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ زیادہ تر دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ تبدیلیاں جو اسباب زندگی کی ترقیوں سے متعلق ہیں۔ مثلاً مواصلاتی ذرائع، فرنیچر اور آلات حرب وغیرہ۔ دوسری تبدیلیاں وہ ہیں جو طبعی واقعات کی توجیہہ سے متعلق ہیں۔ مثلاً چاند کے متعلق یہ معلوم کرنا کہ وہ خود روشن نہیں ہے بلکہ سورج کی روشنی کے انعکاس سے چمکتا ہے۔

مگر اخلاق کا مسئلہ ان دو قسم کی چیزوں سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ اور اب تک کوئی ایسی بات دریافت نہیں ہوئی ہے جو اخلاقی نوعیت کے معاملات میں ذرہ برابر کسی تبدیلی کی ضرورت کو ثابت کرتی ہو۔ اخلاق کا معاملہ اس سوال سے تعلق رکھتا ہے کہ انسانی تعلقات کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔ اور اس معاملے میں ہمارا علم مسلمہ طور پر ابھی تک صفر کے درجہ میں ہے۔ پھر کس

بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح سواری اور فرنیچر کے طریقے بدل گئے یا طبعی دنیا کے بارے میں بہت سی نئی توجیہات ہمارے علم میں آئیں۔ اسی طرح اخلاقیات پر بھی لازماً نظرثانی کرنی چاہیئے۔ سواری یا فرنیچر کے معاملے میں ہم نے تبدیلی کو اس وقت قبول کیا ہے جب نئی سواری اور نیا فرنیچر واقعتہً وجود میں آگئے۔ اسی طرح طبیعات کی دنیا میں صرف اس وقت کسی نئے نظریے کو تسلیم کیا گیا ہے جب فی الواقع کوئی نیا نظریہ تحقیق اور مشاہدہ سے ثابت ہوگیا۔ پھر یہ بات جدید دنیا کے مناسب حال کیسے کہی جاسکتی ہے کہ اخلاق کے معاملے میں حقیقتاً کسی نئی دریافت کے بغیر خواہ مخواہ جدت پسندی کو اختیار کرلیا جائے۔

بالفرض اگر جدید تحقیقات نے یہ اصول ثابت کیا ہوتا کہ تمام حقائق کو لازماً قابل تبدیلی ہونا چاہیئے، جب بھی اس دلیل میں ایک اضافی وزن ہوسکتا تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ بے شمار حقیقتیں ایسی ہیں جن میں تبدیلی کا کوئی ادنیٰ امکان بھی نہیں ملتا۔ مثلاً انسانی پھیپھڑے کے لیے آکسیجن کی معنویت، یا روشنی اور گرمی کے حصول کے لئے سورج کی اہمیت، یا نظام جسمانی کے قیام کے لئے خون کی گردش کی ضرورت۔ اور اس طرح کی دوسری بے شمار حقیقتیں۔ پھر جب کائنات میں دونوں قسم کے واقعات ہیں۔ تغیر پذیر اور غیر تغیر پذیر۔ تو کس دلیل کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اخلاق کے معاملے کو لازماً پہلی قسم میں شمار کیا جانا چاہیئے۔ اس کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ اخلاق کا معاملہ دوسری قسم کے فطری حقائق سے متعلق ہے تو اس کی تردید کے لئے کسی کے پاس کیا دلیل ہوگی۔

۲۔ ”پرانا زمانہ اچھا تھا“ — اس کی اہمیت یہ کہہ کر کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی وجہ پرانے زمانے کا مخصوص نظام تھا۔ قدیم نظام میں ہر شخص ایک قسم کی پابندی کے اندر زندگی گزارتا تھا، اس لئے وہ بااخلاق ہوتا تھا۔

یہ نہایت عجیب دلیل ہے۔ یہ بات اس پہلو سے صحیح ہے کہ پہلے زمانہ کے نظام میں ایک شخص صرف ”سات میل کے دائرہ کے اندر“ زندگی گزارتا تھا۔ اور تمام عمر اس کی ملاقات صرف ”تین سو آدمیوں“ سے ہوتی تھی۔ اس کے مقابلے میں جدید انسان کے تعلقات بے حد بڑھ گئے ہیں۔ مگر جہاں تک افراد سے واقفیت اور ان پر کنٹرول کا تعلق ہے، صاحب مضمون کا

دعویٰ صحیح نہیں۔

اصل میں یہاں یہ غلطی کی گئی ہو کہ قدیم زمانے کی غیر سیاسی شخصیتوں کا مقابلہ جدید زمانہ کی غیر سیاسی شخصیتوں سے کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ بات صحیح ہو کر پہلے زمانے کے خاندان، اس زمانے کے زمیندار اور مذہبی عہدیدار لوگوں کے اوپر جتنا اثر ورسوخ رکھتے تھے، آج کے خاندان، آج کے مالکان زمین اور آج کے مذہبی سرداروں کو وہ مقام حاصل نہیں ہے۔ مگر یہ مقام انھوں نے اس لئے نہیں کھویا ہے کہ جدید زمانے کے لوگ آزاد ہو گئے ہیں۔ ان کی بے اثری کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اس حیثیت پر جدید ریاست نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ قدیم زمانے کے خاندانی، مذہبی اور معاشی سرداروں کا مقابلہ جدید زمانے کی ریاست سے کیا جائے۔ صرف اسی وقت ہم واقعی صورت حال کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس حیثیت سے دیکھئے تو یہ واقعہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جدید زمانے میں جو نظام افراد کو کنٹرول کرتا ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ شدید اور وسیع ہے جو قدیم زمانے میں لوگوں کے اوپر کنٹرول کرنے کا ذمہ دار تھا۔ آج کی ایک ریاست جتنا زیادہ اپنے شہریوں سے واقف ہوتی ہے اور ایک ایک فرد جس طرح اس کی مٹھی میں ہوتا ہے، قدیم زمانے کے لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور اشتراکی ریاستوں میں تو کنٹرول اور بندش کا یہ نظام اپنی آخری حد تک پہنچ گیا ہے۔

اس لئے اگر بندش اور کنٹرول سے اخلاق پیدا کیا جا سکتا ہے تو آج کی دنیا کو اخلاق و کردار میں سب سے زیادہ آگے ہونا چاہئے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، نتائج بالکل الٹے نکل رہے ہیں۔ یہ نتیجہ ہم کو یہ ماننے کی طرف لے جاتا ہے کہ قدیم زمانے کے "اچھے دنوں" کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کی اخلاقی بنیادیں زیادہ صحیح تھیں۔ اسی طرح موجودہ زمانے کے خراب دنوں کی وجہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں اخلاقیات کے لئے جس چیز کو بنیاد بنایا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

۳۔ رسالہ کے ذریعہ سروے اور عالمی نمائش کی بنیاد پر صاحب مضمون نے جس اخلاقی صورت حال کا اندازہ کیا ہے اور جس بہتر مستقبل کی پیشین گوئی کی ہے، وہ علمی حیثیت سے بے حد کمزور ہے۔ اولاً تو اس طرح کے سروے اور مشاہدات نہایت غیر یقینی ہوتے ہیں۔ جن اخباری جوابات کی

بنیاد پر لوگوں کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے وہ کسی کی حقیقی شخصیت کو بتانے کے لئے بے حد ناقص ہوتے ہیں۔

تاہم اس سے قطع نظر، جہاں تک صاحب مضمون کے دعوے کا تعلق ہے، اس سے ان کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ موصوف کا کہنا یہ ہے کہ جدید انسان ایک نئی خود دریافت کردہ اخلاقیات کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ جدید انسان نے حقیقتاً ابھی تک کوئی نئی اخلاقیات دریافت نہیں کی ہے تو سر دے اور نمائش کی دوسری توجیہ زیادہ قریبی اور قابل فہم معلوم ہوتی ہے۔

اس کی ایک وجہ وہ عام مرض ہو سکتا ہے جس کو جدید تمدن نے پیدا کیا ہے اور جسے اکتاہٹ (BOREDOM) کہا جاتا ہے۔ انسان عام طور پر ایک مخصوص طرز کے ساز و سامان اور مشغولیتوں میں رہتے ہوئے یکسانیت سے گھبرا جاتے ہیں اور انھیں وقتی طور پر کسی نئی دلچسپی کی ضرورت ہوتی ہے۔ "TO BE ALIVE" قسم کی سادہ ظلموں سے دلچسپی کی وجہ زیادہ تر یہی ہے۔ اکثر اوقات اس کے پیچھے کوئی گہرا شعور موجود نہیں ہوتا۔

دوسری وجہ "ماضی کی طرف واپسی" ہو سکتی ہے جیسا کہ صاحب مضمون نے لکھا ہے، بیشتر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ پرانا زمانہ زیادہ اچھا تھا۔ اس لئے اگر موجودہ زمانے کے تلخ تجربات انھیں پچھلے زمانے کی یاد دلاتے ہوں۔ اور شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں ماضی کی طرف کھینچتے ہوں۔ تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ "نئی اخلاقیات" کا تصور خود ان لوگوں کے ذہنوں میں موجود نہیں ہے جو ان اخلاقیات کو اختیار کر رہے ہیں۔ یہ بعض خارجی ذہنوں کی اپنی توجیہ ہے جو الگ سے پیدا ہوئی اور الگ سے لے جا کر لوگوں کے اوپر چسپاں کر دی گئی۔

۴۔ صاحب مضمون فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی اخلاقیات کسی بنے بنائے کوڈ کی بنیاد پر نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ آج ہر شخص اپنے اخلاق کا انتخاب خود کرے گا۔ یہ الفاظ جتنے شاندار ہیں اتنے ہی بے معنی ہیں۔ صاحب مضمون نے آغاز میں ایک مجرم کا قول نقل کیا ہے کہ:

"EVERYBODY KNOWS THAT THE MORALS OF THIS COUNTRY ARE GOING DOWN THE DRAIN" اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجرم اس بات سے واقف

ہے کہ وہ جرم کر رہا ہے، ایسا جرم جو اپنی آخری حد کو پہنچا ہوا ہے۔ اس کے باوجود وہ جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اخلاقی حدود میں رکھنے کے لئے فی الواقع ایک "ریڈی میڈ کوڈ" کی ضرورت ہے۔ اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اس کو ترک یا اختیار ——— دو میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنے کی آزادی نہ ہو۔ گویا اخلاق کو متعین بھی ہونا چاہیے اور لازمی بھی۔ کیونکہ اخلاق کا تعلق انسان سے ہے اور انسان کے متعلق معلوم ہے کہ اس کی رائے مختلف عوامل سے متاثر ہوتی ہے اور وہ اکثر اوقات اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔

۵۔ جدید انسان کی یہ غلطی ہے کہ اس نے آزادی (FREEDOM) کو زندگی کی سب سے بڑی قدر سمجھ لیا ہے۔ بلاشبہ آزادی ایک عظیم قدر ہے لیکن اگر اسکو سب سے بڑی قدر فرض کر لیا جائے تو وہ حقیقی دنیا سے ٹکرا جائے گی۔ سوچنے اور کرنے کی آزادی کا تصور خواہ ہمیں کتنا ہی محبوب ہو۔ مگر ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم ایک خاص ڈھانچہ کے اندر پیدا کئے گئے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کو صرف محدود طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم خواہ زمین پر ہوں یا خلا میں چلے جائیں۔ بہر حال خارجی طور پر جو طبیعاتی قوانین مقرر ہیں۔ ان کی مطابقت میں زندگی گزارنے کے سوا ہمارے لئے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اخلاقی قوانین بھی خارجی فطرت کا ہم پر عائد کردہ ہیں تو اس میں قدامت پسندی کی کون سی بات ہے اور علمی طور پر اس کو رد کرنے کے لئے کسی کے پاس کیا دلیل ہے۔

۶۔ صاحب مضمون نے صلیبی لڑائیوں، عیسوی عہد کی سو سالہ جنگ یا فرانسیسی انقلاب کے زمانے کے مظالم کی مثال دی ہے اور اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم اچھے دن اخلاقی اعتبار سے اچھے نہیں تھے۔ مجھے یورپی تاریخ کی وکالت نہیں کرنی ہے۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ مصنف کا استدلال علمی حیثیت سے غلط ہے۔ انھوں نے جن واقعات کی مثال دی ہے، وہ قدیم یورپی سماج کی کل تاریخ نہیں ہے بلکہ وہ اس کا ایک جزو ہے۔ مصنف نے خود اس تاریخی حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ان واقعات سے پہلے یورپی سماج آج کے سماج سے بہتر تھا۔ ایسی حالت میں یہ واقعات تسلسل کی مثال نہیں بلکہ اصل سماجی تسلسل میں شکست پیدا ہونے کی مثال ہیں۔ گویا قدیم اخلاقی

نظریہ میں یہ طاقت تو بہرحال تھی کہ وہ ایک بہتر سماج بناسکے اور اس نے ایسا کیا، البتہ بعد کو کسی سبب سے اس کا تسلسل باقی نہ رہ سکا۔ جبکہ جدید اخلاقی نظریات ابھی تک سرے سے ہی اس کا کوئی ثبوت نہیں دے سکے ہیں کہ وہ کسی اخلاقی سماج کو وجود میں لاسکتے ہیں۔ جدید اخلاقیات نے اپنا آغاز بے اخلاقی سے کیا ہے۔ جبکہ قدیم اخلاقیات نے اپنا آغاز فی الواقع اخلاق سے کیا تھا۔ قدیم اخلاقیات کو جو چیز زوال کے مرحلہ میں پیش آئی تھی، جدید اخلاقیات کو اس کا سابقہ عین ترقی کے زمانے میں پیش آرہا ہے۔ پھر دونوں میں سے کون ہے جس سے زیادہ امید کرنا ہمارے لئے صحیح ہوگا۔

فہم قرآن

——— از جناب وحید الدین خاں

قرآن کو سمجھنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک بزرگ نے تفصیلی کلام کیا ہے۔ چند ابتدائی تدبیروں کی فہرست دینے کے بعد لکھتے ہیں:

"فہم قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لئے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں، یہ دنیا کے عام تصور مذہب کے مطابق ایک نری کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں۔ ... یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشہ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علمبرداران کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعی حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیان حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فرد واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافت الٰہیہ کے قیام تک پورے تیئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اس نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاع کفر و دین اور معرکہ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب

ہو جائیں۔ اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے۔ اس طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے مکے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و احد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا۔ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین اولین سے لے کر مولفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لینگے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا سلوک ہے جس کو میں "سلوک قرآنی" کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے۔ قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آکر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔

پھر اسی کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے، نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بتائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں"

مندرجۂ صدر اقتباس میں، جہاں تک اس کی اس روح کا تعلق ہے کہ قرآن کو ماننے کے ساتھ اس پر عمل کیا جائے۔ یہ بجائے خود صحیح ہے۔ مگر یہ اقتباس اس سادہ سی حقیقت سے بہت آگے جاتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ "سمجھنے" کا رشتہ "کرنے" سے ملاتا ہے، بلکہ اس نے "کرنے" کو بھی ایک خاص مفہوم دیا ہے اور اسی مخصوص کرنے کے عمل میں، اس کے دعوے کے مطابق، قرآن کو سمجھنے کا راز چھپا ہوا ہے۔

مگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ یہ بات علمی اور شرعی، دونوں اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیا یہ واقعہ ہے کہ کسی تصور کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ اسے کر کے دیکھ لیا گیا ہو۔ یہ

ابتداً ایک خالص علمی سوال ہے اور سب سے پہلے علمی پہلو سے ہی ہمیں اس کا جائزہ لینا چاہیئے۔ غیر ضروری بحث سے بچنے کے لیے یہاں شروع میں ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ کسی چیز کو سمجھنے کے لئے اس کو کرنے کی بھی ایک اہمیت ہے۔ مگر یہ اہمیت اکثر پہلوؤں سے صرف ضمنی ہے۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لئے اس کو فیصلہ کن حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ اور اگر "کرنے" کو وہ اہمیت دیدی جائے۔ جو اوپر کے اقتباس میں نظر آتی ہے تو یہ نہ صرف مبالغہ ہے بلکہ صورت واقعہ کی غلط ترجمانی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ دنیا میں کسی فلسفی کا وجود نہیں۔ کیونکہ کوئی بھی ایسا فلسفی نہیں جس نے ان تمام باتوں کو خود اپنی زندگی میں دہرایا ہو جن پر وہ گفتگو کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی مورخ کا وجود نہیں۔ کیونکہ شاید کوئی بھی ایسا مورخ نہیں ہو سکتا جس کے لئے تاریخ کے وہ تمام واقعات خود اپنی زندگی کا تجربہ ہوں جن کو سمیٹ کر وہ تاریخ بناتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سماجیات بلکہ نفسیات تک کے عالم کا کوئی وجود نہیں۔ کیونکہ مشکل ہی سے کوئی ایسا عالم ملے گا جو ذاتی طور پر ان تمام نفسیاتی اور سماجی تجربات سے گزرا ہو جن سے وہ اپنے علم کو مکمل کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ میں کہوں گا کہ اس اصول کے مطابق کسی بھی علم کے کسی عالم کا کوئی وجود نہیں کیونکہ ایسا کوئی بھی علم نہیں ہے جس میں ہر عالم خود اپنے تجربے کی بنیاد پر ساری رائیں قائم کرتا ہو۔ حتیٰ کہ سائنس جس کی تمام تر بنیاد ہی تجربے پر ہے، وہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کیونکہ کوئی بھی سائنسداں تمام باتوں کا خود تجربہ نہیں کرتا۔ بلکہ دوسروں کے تجربات کو مان کر آگے بڑھتا ہے۔ مثال کے طور پر بہت کم سائنسداں ایسے ہوں گے جنھوں نے بطور خود تجربہ کر کے یہ معلوم کیا ہو کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

شرعی اعتبار سے دیکھئے تو یہ بات اور زیادہ خلاف واقعہ معلوم ہوتی ہے۔ میں یہاں اس سلسلے میں چند پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔

۱- پہلی بات یہ کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دور اول کے بعد آج تک کوئی قرآن کا سمجھنے والا پیدا نہیں ہوا۔ بلاشبہ یہ بات صحیح ہے کہ نبی اور آپ کے اصحاب قرآن کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ مگر اس کی وجہ اصلاً یہ نہیں ہے کہ آپ کو بدر و احد اور حنین و تبوک کے معرکے پیش آئے۔ بالفرض یہ واقعات پیش نہ آتے جب بھی یہ مقدس ہستیاں قرآن سے اتنی

ہی واقف ہوتیں جتنا اس کے بعد وہ واقف ہوئیں۔ اگر ہم اس کو نہ مانیں تو ہم کو دوسری بہت سی ایسی باتیں ماننی ہوں گی جن کو ماننے کے لئے ہم کسی طرح تیار نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر ہم کو یہ ماننا ہوگا کہ نعوذ باللہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کتاب الٰہی کے مضامین سے پوری طرح آشنا نہیں تھے۔ کیونکہ اگرچہ ان پر بھی صحیفے اترے تھے۔ مگر ان صحیفوں کو لے کر وہ کسی بدر و حنین اور احد و تبوک تک نہیں پہنچ سکے۔ اسی طرح دوسرے انبیاء۔

دور اول سے آگے بڑھئے تو مفسرین، محدثین، فقہا اور متکلمین سے لے کر صوفیا تک ہماری تاریخ کی جتنی بھی درخشاں فہرست ہے، اس کی تقریباً سب یا کم از کم بہت بڑی تعداد قرآن فہمی کے اس معیار پر پوری نہیں اترے گی۔ میں اپنی حد تک اعتراف کرتا ہوں کہ دور اول کے بعد کی تاریخ میں مجھے کسی ایک بھی ایسے شخص کا علم نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وہ قرآن کو سمجھتا تھا اور اس لئے سمجھتا تھا کہ اس نے قرآنی دعوت کا اس مفہوم میں تجربہ کیا تھا جس مفہوم میں مندرجہ بالا اقتباس میں اس کا ذکر ہے۔ اس لئے یا تو یہ مانیں کہ بعد کی ساری تاریخ میں کوئی قرآن کا سمجھنے والا پیدا ہی نہیں ہوا۔ یا اگر پیدا ہوا ہے تو پھر یہ ماننا ہوگا کہ قرآن فہمی کی مندرجہ بالا شرط صحیح نہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ اس اقتباس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص "انقلابی تحریک" نہ چلائے تو گویا کہ وہ "آرام کرسی" پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے باہر انقلابی جد و جہد کا کوئی میدان ہی نہیں۔ حالانکہ ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ سے فارغ ہو کر واپس آئے تو آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا:

رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر　چھوٹے جہاد کے بعد اب ہم بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ میدان جنگ کے باہر بھی جہاد ہوتا ہے بلکہ یہ دوسرا جہاد پہلے جہاد سے زیادہ عظیم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل میدان مقابلہ وہ ہے جو نفس کے میدان میں پیش آتا ہے۔ بڑے بڑے سورما اور مجاہد یہاں آکر شکست کھا جاتے ہیں۔ جب آپ پر ایک شخص تنقید کرے اور بظاہر اس شخص کے پاس ایسی کوئی طاقت نہ ہو جس سے وہ آپ کو ماننے پر مجبور کر سکتا ہو یا آپ کی غلطی کو اس طرح مبرہن کر سکتا ہو جیسے کہ آخرت میں ہوگی جبکہ کسی کو مانے بغیر چارہ ہی نہ ہوگا۔ ایسی حالت

میں آپ کے اپنے اندر ایک معرکہ جنگ پیش آتا ہے، آپ کی شہرت، آپ کی انانیت، آپ کی قیادت چاہتی ہے کہ آپ غلطی کو تسلیم نہ کریں کیونکہ اس میں آپ کی ساکھ ختم ہو جائے گی اور آپ کی لیڈری متاثر ہوگی۔ یہ میدان جنگ جس میں آدمی خود اپنا مدمقابل ہوتا ہے، اس کو جیتنا بہت مشکل ہے اور اس کی کشمکش بے حد سخت ہے۔ اسی طرح جب اپنا مفاد اور دوسرے کا مفاد ٹکرائے، جب ڈیوٹی پورا کرنے کے تقاضے اور آرام طلبی کی خواہش دونوں ہم آہنگ نہ ہوسکیں، جب انصاف اور بات کی پچ ایک ساتھ نہ چل سکیں، جب عادت اور احساس ذمہ داری دونوں کے مطالبات الگ الگ ہو جائیں، جب خدا کی مرضی اور اپنی مرضی میں موافقت نہ ہو رہی ہو ——— ایسی اور اس طرح کی دوسری تمام حالتوں میں آدمی ایک عظیم کشمکش اور سخت ترین لڑائی سے دوچار ہوتا ہے، یہی "نزاع کفر و دیں" اور "معرکۂ اسلام و جاہلیت" ہی ہے۔ البتہ اس کا میدان انسان کا اپنا نفس ہے نہ کہ بدر اور تبوک۔

پھر جب اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ بدر و حنین تو زندگی میں کبھی کبھی پیش آتے ہیں، مگر یہ دوسرا معرکہ ہر شخص کی زندگی میں ہر وقت درپیش رہتا ہے، تو یہ اندازہ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ اس کو حدیث میں جہاد اکبر کیوں کہا گیا ہے۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ یہ جہاد انھیں لوگوں کے لئے جہاد ہے جو اپنے آپ کو اس میں ڈالیں۔ بدر و حنین بھی انھیں لوگوں کے لئے بدر و حنین تھا جو بالارادہ اپنے مقامات سے نکل کر وہاں گئے اور ان جنگوں میں شریک ہوئے، جو لوگ اپنے کاروبار میں لگے رہے ان کے لئے عین معرکہ کارزار کے وقت بھی بدر و حنین کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اسی طرح یہ دوسرا معرکہ بھی خود بخود کسی سے چمٹ نہیں جاتا بلکہ ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنے آپ کو اس سے دوچار کریں۔ ایک شخص غلطی کی اصلاح کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتا ہو تو کسی کی تنقید اس کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرے گی۔ وہ سنگین ترین تنقیدیں سن کر بھی اسی طرح مطمئن رہے گا جیسے وہ اس کو سننے سے پہلے تھا۔ اسی طرح جو خدا سے ڈرتا نہ ہو، جس کے اندر احساس فرض نہ ہو، جو حقوق العباد کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو۔ اس کے لئے ایسے میدان کا وجود نہیں جہاں اس کو اپنے نفس اور شیطان سے جہاد اکبر کی ضرورت پیش آئے۔

قرآنی نظریات کے تحت عملی جد و جہد کی جو شکل اوپر بتائی گئی ہے، وہ اس شخص کی زندگی میں بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی جو اس سے دوچار ہوا ہو ——— مثلاً اگر صاحب جد و جہد غلبہ کے مقام تک پہنچ

جائے اور ابوجہل اور ابولہب مد مقابل کی حیثیت کھو کر یا تو ہلاک ہو جائیں یا ماتحت بن جائیں، اسی طرح اسلامی غلبہ منافقین اور یہود کے مسئلہ کو بھی جلا وطنی یا کسی اور شکل میں ختم کر دے، اسوقت کشمکش کس میدان میں ہوگی۔ اور کیا اس کے بعد قرآنی سلوک اپنے آخری مقام پر پہنچ جائے گا۔ کیا فتح مکہ کے بعد مہاجرین و انصار کے لئے سلوک کی کوئی وادی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ کیا "نزاع کفر و دین" اور "معرکۂ اسلام و جاہلیت" صرف فتح مکہ تک ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی نزاع ہے اور نہ کوئی معرکہ۔

۳۔ اصل یہ ہے کہ غزوات یا مخالفین اسلام سے حرب و ضرب اسلامی تاریخ کا جزو ہے نہ کہ خود اسلام کا جزو ہے۔ ان الفاظ سے کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام کی راہ میں چلنے کے بعد لازمی طور پر بدر و احد اور حنین و تبوک پیش نہیں آتے۔ اگرچہ اس کا امکان ضرور ہے کہ یہ واقعات پیش آئیں۔ انبیاء کی کثیر تعداد میں صرف چند ایسے نام ہیں جن کے یہاں کسی نہ کسی درجہ میں ان مراحل کی نشاندہی کی جا سکتی ہو۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک نے دین کا کام کیا اور آخری حد تک کیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کام اپنے اصول، اپنی تعلیمات اور اپنے احکام کے لحاظ سے بلا شبہ دائمی ہے مگر قریش اور یہودیوں سے ٹکراؤ کے نتیجہ میں جو واقعات پیش آئے، وہ کوئی دائمی چیز نہیں بلکہ ان کی حیثیت اضافی ہے، آپ نے نماز کی تعلیم دی اور نماز کے طریقے بتائے۔ یہ دونوں چیزیں دائمی ہیں۔ مگر دعوت الی اللہ کے نتیجے میں جو واقعات پیش آئے وہ اس طرح دعوت الی اللہ کا لازمی جزو نہیں ہیں جس طرح نماز کا طریقہ نماز کا لازمی جزو ہے۔ دعوت الی اللہ کے نتیجے میں پیش آنے والے واقعات مختلف وجوہ سے ہمیشہ یکساں نہیں ہو سکتے۔ ——— داعی کا مخاطب کبھی ایسا گروہ ہوگا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، کبھی ایسا ہوگا کہ وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں یا سرے سے نہیں ہیں، اسی طرح اخلاقی، جغرافی اور سماجی اعتبار سے مختلف قسم کے فرق پائے جا سکتے ہیں، نیز تہذیبی قدروں اور تمدنی نظام کے اعتبار سے ان کے درمیان بہت سے فرق ہو سکتے ہیں۔ ان وجوہ سے دعوت الی اللہ کا ردعمل ہر جگہ یکساں نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو جس طرح حکومت ملی وہ اس سے مختلف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو ملی۔ حالانکہ دونوں نبی تھے اور دونوں نے دعوت الی اللہ کا کام کیا تھا۔

۴۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے ایمان کے بعد اصلاً جس چیز کی ضرورت ہے وہ "تدبر" ہے (افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا) قرآن پر تدبر صحیح، قرآن کو سمجھنے کی اصل کنجی ہے۔ قلب انسانی کے کچھ "قفل" ہوتے ہیں، یہ قفل جو اپنی نوعیت میں زیادہ تر نفسیاتی ہیں، اگر قلب پر لگے ہوئے نہ ہوں اور اس کے بعد آدمی صحیح ڈھنگ سے اللہ سے رجوع کرتے ہوئے قرآن پر تدبر کرے تو بلاشبہ وہ قرآن کو پا جائے گا۔ اور جن کے دلوں پر نفسیاتی قفل لگے ہوئے ہوں وہ اولاً تو بدر وحنین میں پہنچیں گے نہیں، کیونکہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے، اور بالفرض پہنچ بھی گئے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کو بھی لازماً سمجھ جائیں جس طرح ایک طالب علم استاد سے کتاب پڑھتا ہے، اسی طرح قرآن کو سمجھنے کا سب سے بڑا راز اللہ تعالیٰ کا فیضان ہے، اور یہ فیضان انھیں کو ملتا ہے جو کھلے دل سے اللہ کی طرف ہمہ تن راغب ہو گئے ہوں اس سے باہر قرآن فہمی کا کوئی وجود نہیں۔

الفرقان محترم مضمون نگار جناب وحیدالدین خاں صاحب نے شروع مضمون میں جو طویل اقتباس نقل کیا ہے جس کو انھوں نے تنقید کا موضوع بنایا ہے یہ حقیقت ہے کہ اس میں فہم قرآن کو دینی دعوت اور خاص کر اس سلسلہ کی سیاسی جدوجہد سے جس درجہ وابستہ بتایا گیا ہے اس میں بلاشبہ کافی مبالغہ ہو گیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ عام قارئین اس سے جو کچھ سمجھیں گے وہ صحیح نہ ہوگا۔ ...... لیکن ہمیں شبہ ہے کہ جناب وحیدالدین خاں صاحب کی تنقید سے بہت سے ناظرین اس کے برعکس تفریط میں نہ مبتلا ہو جائیں اور فہم قرآن میں دعوت اور اس کے مختلف مراحل اور تجربوں کی جو واقعی اہمیت ہے اسکی بھی نفی نہ کرنے لگیں۔

دربارِ عالمگیری

(۱۳)

——— از جناب مولانا ڈاکٹر سید معین الحق صاحب علوی (ایم اے پی ایچ ڈی)

سید محمدؒ

یہ سید محمد رحمۃ اللہ انھیں شاہ عالم کے لقب سے بھی شہرت عام حاصل رہی۔ آپ سید برہان مخدوم جہانیاں روح اللہ روحہ کے نواسے ہیں اور یہ وہی سید برہان ہیں جنھوں نے گجرات اور نواح گجرات میں مدتوں اصلاح اور ارشاد کا بازار گرم رکھا اور پھر وہاں ہی وفات پاکے احمد آباد میں مدفون ہوئے، سید محمد انھیں کے نواسے ہوتے ہیں بڑے صاحب کرامات اور بڑے صاحب فضل و کمال گزرے ہیں اور بقول صاحب فرحۃ النّاظرین[1]

صاحب خوارق بود از بس شہرت
مستغنی از ذکر و بیان ست

انشا اور تحریر میں بھی امتیاز حاصل تھا عالمگیر نے دربار ان سے ملاقات کی مرتبے

---

[1] فرحۃ ص ۵۰

پہلے اپنی تاریخ وفات خود ہی کہہ کے رکھدی تھی اسی طرح اپنی ولادت کی تاریخ بھی

"من دوست دوامان آل رسول"

سے نکالی تھی، رسول آباد گجرات میں مدفون ہوئے ۱۰۸۱ھ ان کا سال وفات ہے۔

سیّد جعفرؒ

یہ احمد آباد کے رہنے والے تھے اور سید جلال کے بیٹے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ

بہ صفات مرضیہ و اخلاق سنیہ موصوف

بود و مضامین رنگین و معانی

دلنشیں را بہ لباس

نظم می آراست

ان کا تخلص "رضا" تھا۔

من از غم تو در آتش تو شمع بزم رقیب

کلیم مست تمنا و جلوہ پر سنگ ست

انھیں کا شعر ہے، ۱۰۸۵ھ میں عالمگیر نے انھیں احمد آباد سے بڑے اشتیاق سے بلاکر عطیات اور داد و دہش سے نوازا اور ششش ہزاری منصب کا مستحق بنا دیا تھا اس کے علاوہ صدارت عامہ کی پوزیشن سے بھی نوازا تھا ۱۰۸۰ھ میں ان کی وفات ہوئی اور رسول آباد ان کا مدفن بنا جو اس نواح میں بسنے والوں کے لئے مرجع اور ایک مقدس زیارت گاہ ہے ان کی تاریخ وفات

"جا نشین حیدر کرار بود"

سے نکلتی ہے، ان کے اشعار میں ایک خاص وجد و طرب کی کیفیت ہے۔ ان کا ایک دیوان بھی مرتب ہوا تھا اور انھوں نے سادات کرام کے احوال پر "روضات" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی، صفاؔ ان کا تخلص ہے

راز ما در زمانہ افتاد ست

بزم ہا را فسانہ افتاد ست

اے صفا درمیان ماہ رخاں
شاہد ما یگانہ افتادست

شیخ پیر محمدؒ

ان کے اصلی مولد موطن اور منشا سے قطع نظر، ان کا وطن اقامت لکھنؤ تھا اور شیخ عبداللہ کملی پوش ایک لبنانی شیخ طریقت کے ارشاد کے مطابق جو سلسلہ چشتیہ سے منسلک تھے اور وادیوں اور پہاڑیوں میں متوکلانہ زندگی گزارتے رہے شیخ پیر محمد نے لکھنؤ میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ اذکار اور اشتغال کی تعلیم انھیں سے حاصل کی تھی۔ لکھنؤ میں درس و تدریس کے مشاغل میں زیادہ وقت گزرتا تھا۔ مخدوم شاہ بینا کے مزار کے قریب انھوں نے چار سال تک چلہ کشی کی۔ اس کے بعد کچھ دنوں کے لئے شاہ جہاں آباد میں بھی قیام اختیار کیا۔ یہاں مقبرۂ قطب الاقطاب میں گوشہ نشیں رہتے۔ پھر اجمیر جا کے قدوۃ الواصلین خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ کے قرب میں مقیم رہے۔ کسی رات میں خواجہ صاحب کو خواب میں دیکھا اور ان کا اشارہ پایا کہ لکھنؤ جاکے مستقل بود و باش اختیار کرلیں انھوں نے خواب ہی میں سلطان المشائخ کا لقب دیا

ولایت لکھنؤ بہ شیخ میناست
وشمارا بسلطان المشائخ"
ملقب گردانیدم[1]

شیخ نے حسب ارشاد خواجہ اجمیری لکھنؤ کا سفر اختیار کیا اور ایک ٹیلہ پر کیتھے اور املی کے درختوں کے سایہ میں بود و باش اختیار کرلی۔ (یہ جگہ "پیر محمد صاحب کا ٹیلہ" کے نام سے اب تک مشہور رہے)۔ مریدوں کا مجمع رہتا اور طلبا کا ہجوم۔ انتہائی متوکلانہ زندگی تھی۔
وتوکل شیخ نہ بحدیکہ در احاطہ

---

[1] خزینۃ الاصفیا ص ۴۲۳

تحریر و تقریر در آید کرا یارا
کہ بہ تحریر آں پرداز د

صرف ایک جبہ ایک پگڑی اور اوراد کی کتاب یا اور چند ضروری کتابیں ان کے پاس تھیں ان کے علاوہ بس ایک چٹائی اور بدھنی تھی۔ اس کے ماسوا کوئی اثاثہ نہ تھا ۱۱۵۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

"بخدا پیوست" سے انکی تاریخ وفات نکلتی ہو۔ انکے وصال کے بعد شاہ آفاق انکے جانشین ہوئے۔

قدم قدم طریقہ پیر خود سلوک	اپنے پیر طریقت کے طریقہ پر پورے پورے
داشت و در علوم دینی تفوق	چلتے رہے اور علوم دینی میں اپنے معصروں
از اقران خود می جست	سے ممتاز رہے

ان کے شاگردوں میں ایک شیخ مولانا غلام نقشبند بھی ہوئے ہیں۔۔۔۔

جو قصبہ "گھوسی" کے رہنے والے تھے اور جنھوں نے شرح چغمینی علم ہیئت میں اور قدوری فقہ میں اس کے علاوہ تفسیر میں کچھ حصہ بیضاوی شریف کا ان سے پڑھا تھا اور جن کے متعلق ایک واقف احوال کے یہ ریمارک ہیں

والشیخ غلام نقشبند کان من کبار الاساتذہ	شیخ غلام نقشبند کا اپنے زمانہ کے بڑے اساتذہ
لم یکن فی زمانہ اعلم منہ بالنحو واللغۃ	میں شمار ہوتا تھا علم نحو لغت اشعار اور عرب
والاشعار وایام العرب وما یتعلق	جاہلیت کی جنگوں اور انکے متعلقات کے بارے
بہا منوفرا علی علوم الحکمۃ	میں یہ اپنے معلومات میں سب سے بڑھے ہوئے تھے انکے

[illegible] ۱۱۵۵ھ

ان غلام نقشبند گھوسوی نے الانوار کے نام سے چوتھائی کلام پاک کی تفسیر لکھی اس کے علاوہ آل عمران مریم یوسف وغیرہ وغیرہ مختلف سورتوں کی تفسیریں بھی لکھیں۔ آیۃ لا تقولن لشیٔ انی فاعل ذلک غدا۔ "آیۃ کلوا واشربوا" اور "افحسبتم انما خلقناکم عبثا" پر ان کے نوٹ مقبول اہل دانش و علم رہے۔ وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر بھی ان کا ایک رسالہ ہے۔

لہ نزہتہ الخواطر ج ۶ ۲۱۲-۲۱۳

قصیدہ بحر رجیہ پر ان کی شرح لکھی ہے ادب عرب میں کمال رکھتے اور اپنے استاد محمد شفیع دہلوی کی شان میں جو قصیدہ انھوں نے کہا اس کی تشبیب کے چند اشعار یہ ہیں

خلیلی حلا ھاتان دارة علیمیٰ ۔ دارة سلمیٰ فی قفاف بعنقل

اربع الجبینة صارت موطنا ۔ فیا عجبا من صنع دھر محول

شفیعی بیوم الحشر حرزی وموئلی ۔

ووجہة قلبی غوث کل موئل

۱۱۲۶ھ میں ان کی وفات ہوئی اور لکھنؤ میں شیخ پیر محمد کے مشہور ٹیلہ پر مدفون ہوئے ۔

حاجی محمد حسین (چمڑہ پوش سیاح)

عراق عرب میں کسی مقام کے رہنے والے تھے قصبہ کلا نور مضافات لاہور میں کچھ زمانہ قیام کے بعد سفر حجاز کے لئے روانہ ہوگئے ۔ جب عالمگیر کا عہد آیا تو آپ حجاز سے واپس کلانور ہوئے اور اپنے جائے قیام کو ایک تکیہ کی شکل دیدی، مریدوں کا ہجوم رہتا اور دن رات انھیں کی تعلیم و تربیت میں گزرتے، محاسن اخلاق خوبئ عادات اور کمال تشرع کی وجہ سے مرجع خلائق بنے ہوئے تھے حتیٰ کہ شاہ وقت اورنگ زیب بھی ان کی زیارت کے لئے تکیہ پر حاضری دیتے ۔

۱۰۷۲ھ میں سید مذکور نے وفات پائی لباس میں پوستین اکثر استعمال میں رہا کرتی ان کے بعد حاجی محمد عادل جب ان کے خلیفہ ہوئے تو مریدوں کی تربیت اور روحانی اصلاح ہی ان کا بھی شغل رہا یہ پنجاب ہی کے رہنے والے تھے توکل ان کا بھی پیشہ تھا جو کچھ خود کھاتے وہ کھانے باقی سب اللہ کی راہ میں دے دیتے ۔ انھوں نے وافر خرچ کرکے تکیہ کی تزئین بڑھادی ایک مہمان خانہ بھی ان کی تعمیرات میں ست یادگار رہا بزرگی نویدوں کے ایک رہتے ۔

برائے ورود مسافران مہمان خانہ تعمیر فرمود

صاحب خرق عادات و محاسن اخلاق بودند

انھوں نے بھی ۱۰۹۵ھ میں رحلت فرمائی رحمہا اللہ تعالیٰ

لہ فرقد ص ۶۶

نواب زیب النسا بیگم

یہ شاہ عالمگیر کی بیٹی، شاہنواز خاں صفوی کی دختر دل رس بانو کے بطن سے پیدا ہوئی اور باپ کے سایہ عاطفت میں تربیت پائی۔ عنایت اللہ کشمیری[1] کی والدہ نے انھیں کلام پاک حفظ کرایا، اس پر عالمگیر نے انھیں ایک ہزار اشرفیاں انعام میں دیں۔ خط نسخ (عربی)، نستعلیق (اردو فارسی)، اور خط شفیعہ میں انھیں پوری پوری دستگاہ تھی۔ درسی کتابیں انھوں نے ملا عظمت اللہ[2] کاکوروی اور شیخ احمد بن سعید[3] اٹھوی جیسے عالموں سے پڑھیں، فن انشا اور شعر و ادبیات میں شیخ محمد سعید اشرف مازندرانی کی شاگرد تھیں، فطرت نے انھیں شاعرہ بنایا تھا، ایک ایک شعر حلاوت اور سحر میں ڈوبا ہوا ہوتا، سننے والے سن سن کے سر دھنتے اور دلوں کو قابو میں نہ رکھ پاتے۔ کنوارے پنے میں ساری زندگی گزار دی اور کسی مرد کے پہلو میں بیٹھنے کے لیے ان کی حیا اور غیرت نے اجازت نہ دی۔

لا نظیر لھا امرأۃ فی الھند فی	ہندوستان کی کوئی عورت جودت طبع سلامتی
جودۃ القریحۃ و سلامۃ الفکر	فکر اور لطافت مزاج میں ان کی ہمسری نہ کر پائی
و لطافۃ الطبع لم تتزوج قط لغیرتھا	نکاح اور شادی کا کبھی ارادہ ہی نہیں کیا، ان
ان تکون ضجیعۃ (مع احد من الرجال)	کی غیرت اور حیا اس سے مانع رہی کہ وہ کسی مرد کے ہم آغوش بنیں

---

[1] ... ان ... کے بڑے عالم اور محدث تھے منقولات معقولات دونوں علوم میں ید طولیٰ رکھتے مولانا عبدالرشید مولانا ابو الفتح اور شیخ حیدر رحمتی وغیرہ کے شاگرد تھے۔

و کان بارعاً فی العلوم راساً فی	علوم میں سرآمد تھے اور فقہ اور حدیث میں
الفقہ و الحدیث	انھیں ریاست حاصل تھی۔

اپنی حیات میں انھوں نے ۲۳ بار بخاری پڑھائی تھی، مثنوی مولانا روم ایک خاص کیفیت اور وجد کے ساتھ پڑھتے ۱۱۸۵ء میں ان کی وفات ہوئی۔ [2] ملا عظمت اللہ کہ فضیلت برجستہ می داشت نواب زیب النسا بیگم بنت عالمگیر را مسائل فقہی تعلیم می فرمود (حدائق الحنفیہ) (چشمہ فیض شی نبض بخش) [3] ملا جیون امیٹھوی کی اولاد میں ہیں پایہ کے عالم تھے محمد صادق سترکھی اور لطف اللہ کوروی کے شاگرد ۔ درس و تدریس ان کا شغل تھا در یاض عثمانی ہند نزہۃ الخواطر صد ۹۴ جلد ۶

انھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں لیکن سوائے زیب المنشآت سب کی سب ناپید ہیں، یہ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ زیب النسا کی طرف ایک فارسی دیوان اگرچہ منسوب کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی اور فارسی شاعر کا ہے، ان کے دیوان کا وجود تھا مگر ان کی حیات ہی میں تلف ہو گیا۔ تفسیر کبیر امام رازی کا فارسی ترجمہ "زیب التفاسیر" بھی ان کی طرف منسوب ہے حالانکہ مولانا صفی الدین اردبیلی کشمیری نے تفسیر کبیر کو فارسی جامہ پہنا کے ان کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ ہاں ان کے اشعار جو منقول چلے آتے ہیں ان میں کافی انھیں کے ہیں منجملہ ان کے یہ دو شعر بھی ہیں۔

بشکند دستے کہ خم در گردن یارے نشد کور بہ چشمے کہ لذت گیرد بدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت غنچہ باغ دل ما زیب دستارے نشد

سنہ ۱۱۱۳ھ میں ان کی وفات ہوئی اور لاہور کے ایک باغ میں جس کی تعمیر خود کی تھی سپرد خاک کی گئیں۔

کراچی اور لاہور کی خاص مطبوعات

دینیات

الادب المفرد:۔ معاشرتی زندگی سے متعلق امام بخاریؒ کا مرتب کردہ مجموعۂ حدیث، اصل عربی متن مع ترجمہ اردو مجلد -/۱۲

الادب المفرد:۔ خالص اردو ترجمہ قیمت -/۸

زبدۃ البخاری:۔ صحیح بخاری شریف کی احادیث مع اردو ترجمہ بحذف اسناد قیمت مجلد -/۱۲

ترمذی شریف: (اردو) ۲ جلد کامل -/۲۴

آثار امام شافعی (اردو) از ابوزہرہ مجلد -/۱۲

سبل السلام (شرح بلوغ المرام) (معہ ترجمہ) -/۱۲

لغات الحدیث۔ از مولانا وحید الزماں خاں صاحبؒ اپنے موضوع پر اساتذہ اور طلبا سب کے لیے کافی، ۳ ضخیم جلدیں۔ قیمت مجلد فی جلد -/۱۳

موضوعات کبیر: موضوع حدیثوں کے بیان میں ملا علی قاریؒ کی مشہور مستند کتاب کا اردو ترجمہ۔ مجلد -/۸

تدوین حدیث:۔ مولانا گیلانی مرحوم کی معرکۃ الآرا کتاب۔ ہر تعلیمیافتہ کے مطالعہ کے لائق قیمت مجلد ۶/۵۰

بستان المحدثین:۔ حدیث کی تمام کتابوں کا تعارف اور ان پر تبصرہ اور ائمہ حدیث کا تذکرہ۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا شاہکار ہے۔ قیمت مجلد -/۵

تحفۂ اثنا عشریہ:۔ (اردو) قیمت -/۱۵

تاریخ

تاریخ اسلام: از اکبر شاہ خان نجیب آبادی مرحوم اردو زبان میں اسلامی تاریخ پر مانی ہوئی کتاب جو مغربی مورخین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا غبار بھی چھانٹ کر رکھ دیتی ہے۔ مکمل سٹ۔ مجلد -/۳۸

تاریخ ابن خلدون: جلد اول (ترجمہ اردو) مجلد -/۱۵

تاریخ الخلفاء: از علامہ سیوطیؒ (اردو ترجمہ) مجلد -/۱۲

تاریخ فلاسفۃ الاسلام: (ترجمہ از ڈاکٹر میر ولی الدین) اس میں کندی، فارابی، غزالی ابن رشد وغیرہ تمام فلاسفہ اسلام کے حالات اور ان کے فلسفیانہ افکار و نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجلد -/۹

تاریخ فیروز شاہی (اردو) ۸/۲۵

فقہ و فتاویٰ

فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ کامل مجلد -/۱۵

فتاویٰ رشیدیہ کامل -/۸

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مرتبہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ۴ ضخیم جلدیں۔ مجلد -/۳۰

فتاویٰ فرنگی محل ۴/۲۵

اقبال نامہ جہانگیری مجلد ۵/۷ **مآثر عالمگیری** ۹/۵

عرب دنیا: (از خلا عزالدین) اردو ترجمہ -/۱۲

تجلیات عثمانی: مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی مفصل سوانح حیات۔ از پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی مجلد ۱۰/۵۰

حیات امدادیہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ ۴/۵۰

تذکرۂ سلیمانی: سوانح مولانا سید سلیمان ندویؒ -/۷

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی: از مولانا گیلانی مرحوم۔ .... -/۱۲

البرامکۃ: ... مجلد ..... -/۱۲

Alfurqan (Regd. No. L. [illegible]) Lucknow

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ کتاب

اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔

- [illegible] جامع خلاصہ ہے۔
- [illegible] قرآنی آیات کو نہایت مؤثر [illegible] تشریحات [illegible] گیا ہے
- [illegible] قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
- [illegible] قرآن کی دعوت سے روشناس [illegible] کے ساتھ ساتھ قرآن کے طرز بیان کی لذت [illegible] ہے۔

[illegible] طباعت [illegible] صفحات [illegible] قیمت [illegible]

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

Cover Printed at A.O. Press Aminabad Park, Lucknow.

سنہ آغاز ۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

34(5)

زیرِ ترتیب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

[illegible]

[illegible] متن اور مستقل افادات سے معمور — ایک

[illegible] ترجمہ و تشریح کے ساتھ — احادیثِ نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب

[illegible]

[illegible] کی نفسیات کا لحاظ — ہر سطح کے فہم و فکر کی رعایت — [illegible]

[illegible]

سالانہ چندہ ہندوستان سے ...... ۶/- پاکستان سے ...... ۷/- ششماہی ہندوستان سے ...... ۳/۵۰ پاکستان سے ۴/-	ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ فی کاپی ...... ۶۰ پیسے	سالانہ چندہ غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ ہوائی ڈاک کے لیے مزید محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۴ | بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۶ء | شمارہ (۵)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ ستمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولانا) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسلم مجلس مشاورت نے آنے والے عام انتخابات کے لیے رائے عامہ، بالخصوص مسلم رائے عامہ کی تربیت کے لیے ایک نونکاتی منشور شائع کرکے اور اس کی توسیع اشاعت کے لیے ملک بھر میں عام جلسوں کا ایک پروگرام چلاکے باقاعدہ عملی میدان میں قدم رکھ دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جمعیۃ علماء نے مخالفت کا محاذ بھی سنبھال لیا ہے۔ یعنی مجلس جو ملت کے اتحاد و اتفاق کے لیے وجود میں آئی تھی اب اس کی بنیاد پر ملت کے مختلف طبقوں میں اختلاف کا بازار گرم ہوگا۔ مجلس دعوت دے گی کہ مسلمان متحد ہو کر انتخابات پر اثر انداز ہوں اور جمعیۃ علماء پکارے گی کہ یہ فرقہ واریت ہے، مسلم لیگ کا نیا روپ ہے اور مسلمانوں کے لیے سراسر ہلاکت! اس لیے مسلمان خبردار ہوں، ہوشیار ہوں اور اس دعوتِ ہلاکت کو نہ سنیں۔

مان لیجئے کہ یہ دعوت ایسی ہی ہو، مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ ہو۔ اور فرقہ ورانہ سیاست کی نقیب ہو۔ لیکن کیا جمعیۃ علماء کا پلیٹ فارم اس کی مخالفت کیلئے موزوں ہے؟ جمعیۃ علماء آزادئ ہند کے بعد مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی سے، باقاعدہ اعلان کرکے دست کش ہوچکی ہے۔ اور آج بھی اسکے ذمہ دار پوری صراحت کے ساتھ جمعیۃ کے اس موقف کا اعادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی مہینے کی بات ہے کہ جمعیۃ کے جنرل سکریٹری مولانا اسعد میاں نے ایک انٹرویو میں جمعیۃ کی اسی پالیسی کا حوالہ دیتے ہوئے اس سوال کے جواب میں کہ اٹھارہ برس کے تجربوں کے بعد کانگرس کو مزید آزمایا جائے یا نہ آزمایا جائے، فرمایا کہ

> "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی اور آزمایا جائے وہ آزمائیں۔ جو بالکل مایوس ہوچکے ہیں وہ اس سے کنارہ کش ہوجائیں، جمعیۃ علماء کی اس بارے میں کوئی پالیسی نہیں ہے......
>
> جمعیۃ علماء کی تو صرف دو پالیسیاں ہیں (۱) الکشن سے کنارہ کشی۔ (۲) ہر طرف سے مسلم

مفاد کے لیے کوشش کرنا" (الجمعیۃ بدھ اڈیشن ۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۶۶ء)

ٹھیک یہی بات جمعیۃ کا اخبار الجمعیۃ بھی اس انٹرویو سے چند دن پیشتر لکھ چکا ہے کہ

"خود جمعیۃ علمار ہند جماعتی حیثیت سے پارلیمنٹری سیاست سے الگ ہو، اس لیے وہ کسی سیاسی جماعت سے اپنے آپ کو منسلک نہیں کرسکتی۔ اصولی طور پر مسلمان ہر غیر فرقہ دارانہ جماعت کو ووٹ دے سکتے ہیں اور وہ اپنے ووٹ استعمال کرنے میں آزاد ہیں۔ جمعیۃ علمار ان کے فیصلے میں مخل نہیں ہوسکتی"

اب سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت (اس کا نام خواہ مجلس مشاورت ہو یا کچھ اور) الکشن کے بارے میں مسلمانوں کی کوئی رہنمائی کرنا چاہتی ہے تو جمعیۃ علمار کی طرف سے اس کی راہ میں خلل اندازی کی کیا تک ہے؟ اور جب اخبار میں جمعیۃ کی پالیسی کے یہ اعلانات ہو رہے ہوں، اسی میں مجلس مشاورت کی الکشنی مہم کے خلاف محاذ آرائی کا بھی زور و شور ہو، ان دونوں باتوں میں آخر کیا جوڑ ہے؟ ابھی مجلس کا وہ اجلاس ہوا بھی نہیں تھا، جس میں الکشن کے بارے میں پالیسی طے ہونا تھی۔ کہ الجمعیۃ میں اس خطرے کے خلاف مہم چل پڑی۔ الکشن اور مسلمان کے عنوان سے انٹرویوز کی ایک بھرمار ہوئی اور اس میں خود جمعیۃ کے لوگوں کے اس انداز کے انٹرویو شائع کیے گئے کہ اگر کسی مسلم جماعت نے اس طرح کی حرکت کی تو ہم خدام جمعیۃ اس کا اسی طرح ڈٹ کر مقابلہ کریں گے جس طرح آزادی سے پہلے مسلم لیگ کا کیا تھا۔

کیسی عجیب بات ہو کہ جمعیۃ کے یہ پرجوش مخلص اس بات کو بھولے جا رہے ہیں کہ جمعیۃ نے جب مسلم لیگ کا مقابلہ کیا تھا اس وقت اس کی پالیسی سیاست سے کنارہ کشی کی نہیں تھی۔ اور پھر جب وہ کنارہ کش ہوئی تو جہاں مسلم لیگ رہ گئی تھی یعنی جنوبی ہند وہاں کبھی جا کر اس نے مسلم لیگ کو مقابلہ کا چیلنج نہیں دیا اور اس کی ادنیٰ خلل اندازی کے بغیر مسلم لیگ پورے سکون کے ساتھ ہر الکشن لڑتی ہے۔ تو کیا مسلم مجلس مشاورت کا گناہ مسلم لیگ سے بھی سوا ہو جبکہ وہ خود الکشن لڑتے نہیں جا رہی ہو بلکہ محض کچھ سے اپنے ووٹ استعمال کرنے کا مشورہ مسلمانوں کو دے رہی ہے؟ یا مجلس مشاورت کے بارے میں جمعیۃ کی پالیسی میں کسی انتشار کی گنجائش نکل آئی ہے؟

اور اس سے بھی زیادہ بوالعجبی یہ ہے کہ جو گناہ مجلس مشاورت کر رہی ہے ٹھیک اسی گناہ میں ہم الجمعیۃ کو بھی مبتلا پاتے ہیں۔ وہ اپنے ایک اداریہ میں لکھتا ہے کہ

"کانگریس پانچ سال تک مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو مرعوب کر کے یہ اطمینان حاصل کر لیتی ہو

کہ ان سے کہو یا نہ کہو بہر حال وہ کانگریس ہی کو ووٹ دیں گے۔ اگر کسی زحمت کے بغیر مسلمانوں کے ووٹ کانگریس کے لیے ریزرو سمجھ لیے گئے ہیں تو کانگریس ان کے پیچھے کیوں پھرے اور غیر مشروط تعاون کو مشروط کیوں بنائے ؟

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ

"مگر شاید اب وقت آگیا ہے کہ خود دار شہریوں کی طرح مسلمانوں کو اپنی اس پوزیشن پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ چھ کروڑ مسلمان بھیڑ بکری نہیں ہیں کہ وہ خود بخود کسی ایک جماعت کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے آپ کو بے وزن ثابت کریں"

اس دوسرے اقتباس میں جو بات کہی گئی ہے کیا مجلس مشاورت کے منشور کی روح میں یک سر مو بھی اس سے کوئی فرق ہے؟ اور مجلس مشاورت مسلمانوں سے اس کے سوا کیا کہنے جا رہی ہے جو خود الجمعیۃ نے کہی ہے ؟۔

جمعیۃ کا اخبار مسلمانوں کو ایک مشورہ دیتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ جمعیۃ کی معذوری ظاہر کرتا ہو کہ وہ اپنی پالیسی کی وجہ سے مسلمانوں کی رہبری اس معاملہ میں نہیں کر سکتی۔ اتفاق سے ٹھیک اسی مشورہ کے خطوط پر مسلمانوں کے مختلف حلقے مل کر عام مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو جمعیۃ ان کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہے کہ یہ فرقہ پرستی ہے! مسلم لیگیت ہے!!۔ بہت اچھا، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کی شمولیت سے یہ پلیٹ فارم مہلک ہو گیا تو آپ آئیے، سیاست سے کنارہ کشی کی پالیسی کو منسوخ کر دیجئے۔ اور اپنے آرگن کے دیے ہوئے مشورے کے منطقی تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی رہبری فرمائیے۔ وہ آپ ہی کی رکاب تھام کر چلیں گے۔ مگر یہ کیا مصیبت ہے کہ نہ آپ خود کریں نہ دوسروں کو کرنے دیں۔

ہمیں افسوس ہو کہ جمعیۃ کے ذمہ دار مجلس مشاورت کی مخالفت روز اول سے صرف اسی بنیاد پر کر رہے ہیں کہ یہ فرقہ پرست عناصر کا مجموعہ ہے اور اس سے مسلمانوں کو نقصان پہونچے گا۔ لیکن اب تک شاید ایک لمحہ کے لیے بھی انھوں نے یہ بات نہیں سوچی ہے کہ "فرقہ پرستی" خواہ وہ ہندو فرقہ پرستی ہو یا مسلم فرقہ پرستی اس کے خلاف محاذ بنانے کی گنجائش جمعیۃ علمار کی آزادی ہند کے بعد والی پالیسی میں کیونکر نکلتی ہے؟ فرقہ پرستی سے لڑنے کے لیے اس نے ترقی پسند سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم تجویز کیے تھے۔ اسی لیے جمعیۃ

ہم نے کہا وہ آج تک جنوبی ہند میں جاکر مسلم لیگ سے نہیں لڑی لیکن مجلس مشاورت کا پتہ نہیں کیا قصور ہو کہ جمعیتہ اس سے براہ راست خود لڑنا اپنے اوپر واجب سمجھتی ہو۔ محض عدم تعاون کو کافی نہیں سمجھتی۔

ہم محض نکتہ چیں نہیں ہیں۔ خلوص کے ساتھ چاہتے ہیں کہ ہمارے بزرگ اور احباب یا تو ہماری اس الجھن کو دور کریں ورنہ اپنے رویہ پر نظر ثانی فرمائیں۔ ایک ایسی چیز جو جمعیتہ کے دائرۂ کار میں نہیں وہ باعث اختلاف کیوں بنے؟۔

مصر کا المیہ

مصر میں سابق "اخوان المسلمین" کے مرشد عام (صدر) الاستاذ حسن الہضیبی، اخوان کے بلند پایہ ادیب و مفکر الاستاذ سید قطب، ان کی ہمشیرہ محترمہ حمیدہ قطب اور دوسرے سیکڑوں اخوانیوں کے خلاف صدر ناصر کو قتل کرنے کی سازش کے الزام میں جو عدالتی ڈرامہ کھیلا جارہا تھا اسکی ایک قسط اگست کی ۲۱ تاریخ کو مصر کی "سلامتی سپریم کورٹ" کے اس فیصلے پر ختم ہوگئی کہ استاذ سید قطب اور اُن کے ساتھ چھ دوسروں کو پھانسی دے دی جائے۔ اُن کی بہن حمیدہ قطب کو دس سال قید بامشقت اور استاذ حسن ہضیبی کو تین سال۔ باقی ملزمان کو ایک سال سے ۱۵ سال تک کی قید بامشقت کی سزا دی گئی ہو۔ ان میں ایک دوسری خاتون زینب غزالی بھی ہیں جن کے لیے دس سال کی قید بامشقت کی سزا تجویز ہوئی ہے۔ اور مرشد عام کے دو صاحبزادے ہیں جن کو تین سال اور ایک سال کی سزا ملی ہے۔ استاذ حسن الہضیبی کی عمر قریب اسّی سال ہے اور وہ ایک معزز جج کے عہدہ سے ریٹائر ہوکر اخوان میں آئے تھے۔ استاذ سید قطب ساٹھ سال کے ہیں۔ دائم المرض ہیں۔ عباس محمود العقاد کے ادبی اسکول سے ایک ممتاز ادیب و نقاد کی حیثیت سے مصر میں اُبھرے اور انقلاب مصر (۵۲ء) کے بعد اخوان کی طرف مائل ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد (۵۴ء) میں اخوان کی عظیم الشان تنظیم ناصری عتاب کا شکار ہوئی اور بے پناہ مظالم کے ساتھ خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ سید قطب اس وقت گرفتار ہوئے۔ برسوں جیل میں رہے۔ پھر اخوان چھوڑے گئے تو وہ اور ان جیسی مؤثر شخصیتیں خانہ قید رکھی گئیں۔ اس عرصہ میں انھوں نے اپنی تصنیف و تالیف کا غیر معمولی کام کیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ان پر سے پابندیاں اٹھالی گئی تھیں۔

اگر خواتین تک کو دس دس سال قید با مشقت کی سزا نہ دی جاتی اور اسّی سال کے بوڑھے شیخ حسن ہضیبی اور ساٹھ سال کے مستقل مریض استاذ سید قطب کو اس ہنگامۂ دار و گیر میں نہ گھسیٹا جاتا تو ہم باور کر سکتے تھے کہ الزامات میں کچھ صداقت ہے۔ مگر یہ سفاکی اور بے رحمی بتا رہی ہے کہ اخوان کا گناہ بس یہ ہے کہ ان کی رُوح مردہ نہیں ہوئی اور صدر ناصر کی عبودیت کا کلمہ ان کی زبانوں سے نہیں نکلا۔ اندرونی اور بیرُونی مسائل میں صدر ناصر کے خلاف جو گھٹن مصر میں عام ہوتی جا رہی ہے اُس نے ان کا حال اسوقت بالکل اسٹالن کے آخری دنوں جیسا کر رکھا ہے۔ وہ خوف اور وہم میں اپنے سائے تک کی گردن اڑا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے حالات میں اخوان کا فکری اور رُوحانی وجود بھی ان کے لیے خطرہ بننا ہی چاہیئے تھا۔ اور اس سے کچھ اطمینان حاصل کرنے کی صورت یہی تھی کہ انتہائی سفاکی اور بے رحمی سے دہشت طاری کردی جائے۔

کیا صدر ناصر سے اسٹالن کا انجام پوشیدہ ہے؟ انھیں یاد نہیں کہ مرنے کے بعد خود ان کے دوست مسٹر خروشچوف کے ہاتھوں اس کی کیا گت بنی؟ مگر کب کسی جابر نے اپنے کسی پیشرو کے انجام سے عبرت حاصل کی ہے؟ اور کب تاریخ کے سبق نے کسی سفاک کو بدانجامی کی راہ سے روکا ہے؟ — سلام ہو ان مظلوموں پر جو شاید جام شہادت سے سیراب ہو چکے ہوں گے!۔

چندے میں اضافہ: — کاغذ اور رسالے کے بعض کاموں کی اجرتیں بےحد گراں ہوگئی ہیں۔ مجبوراً اس ماہ سے الفرقان کے چندے میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ اب ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیے سالانہ چندہ ۷/= ہوگا۔



تبلیغی جماعت پر بعض بے بنیاد تنقیدیں

_____ محمد منظور نعمانی

بلاشبہ یہ بات صحیح ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان کے طول و عرض میں کوئی لکھا پڑھا ایسا مسلمان غالباً اب مشکل سے ملے گا جو تبلیغی جماعت کے نام اور اس کے کام سے بالکل ہی بے خبر ہو اور اس نے یہ نام تک نہ سنا ہو، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس کے کام کی واقعی نوعیت اور اس کی اصل دعوت اور طریقۂ کار کو وہی لوگ صحیح طور پر جانتے ہیں جو اس میں عملی حصہ لیتے ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ خدانخواستہ باطنی جماعتوں کی طرح اس کی دعوت اور اس کے کام میں کچھ "اسرار" اور "سینہ بسینہ" والی باتیں ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اس زمانے میں جن طریقوں سے اجتماعی کاموں کا عام رواج ہے تبلیغی جماعت کا طریقہ اور راستہ اس سے بہت مختلف ہے اور اس کا کوئی مستند لٹریچر بھی نہیں ہے جو اس کے تعارف کا کفیل ہو اسلئے عملی شرکت اور ذاتی تجربے کے بغیر اس کی دعوت اور اس کا طریقہ لوگوں کے ذہن میں نہیں آتا ــــ

راقم سطور کا یہ اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا بھی تھا، ان کی باتیں بھی ایک دو دفعہ سے زیادہ سُنی تھیں، چلتی پھرتی بعض تبلیغی جماعتیں بھی دیکھی تھیں، ان کے تبلیغی کام کے متعلق کچھ سُنا بھی تھا اور اس بنا پر اس کے بارہ میں اپنا ایک تصور تھا۔ اور اگر اس وقت کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ تم تبلیغی جماعت اور اس کے کام کو نہیں جانتے تو غالباً مجھے ناگوار گزرتا ــــ لیکن جب پہلی دفعہ (ایک لطیفۂ غیبی کے نتیجہ میں) حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک تبلیغی سفر میں قریباً ایک ہفتہ ان کے ساتھ رہنا ہوا جس میں ایک بڑی جماعت بھی ان کے ساتھ تھی اور اس کا پورا کام اور پروگرام دیکھا اور مختلف اوقات کی گفتگوؤں اور کام کے مشاہدہ اور مطالعہ سے نئے نئے پہلو اور گوشے سامنے آئے تو اندازہ ہوا کہ اب تک اس کے بارہ میں اپنا جو تصور تھا وہ بہت ناقص بلکہ بڑی حد تک غلط تھا۔

ــــ اور میرا خیال ہے کہ یہ تبلیغی جماعت کے کام ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس طرح کا جو کام بھی

دُنیا کے عام مروج کاموں سے الگ طور طریقوں پر کیا جائے گا اس کو صحیح طور پر عمل اور مشاہدہ و تجربہ ہی سے جانا جا سکے گا ——

ایسی حالت میں جماعت سے اور اس کے کام سے ایسے حضرات کا صحیح طور پر واقف نہ ہونا یا کچھ غلط فہمیوں میں مبتلا ہونا جن کا نہ اُس میں عملی حصہ ہو نہ اس کام کے کرنے والوں سے ان کے قریبی تعلقات ہیں نہ تو مستبعد ہو اور نہ لائق شکایت —— البتہ اگر کوئی صاحب کامل ناواقفیت کے باوجود محض اپنے خیالات یا ہوائی باتوں کی بنا پر اس کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنائیں اور نہایت سنگین قسم کے الزامات اس پر عائد کر کے اُمت کی اجتماعیت کے لیے اس کو سنگین خطرہ قرار دیں اور اس کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دیں تو بلاشبہ یہ بڑی افسوسناک اور بدقسمتی کی بات ہوگی۔

ہرگز ضروری نہیں ہے کہ تبلیغی جماعت کے اکابر جو کچھ سوچتے ہوں اور جن لائنوں پر دین کا کام کرتے ہوں وہ سو فی صدی صحیح ہو اور اس سے اختلاف نہ کیا جا سکے، یہ مقام صرف نبی کا ہوتا ہے، امام مالکؒ کا مشہور مقولہ ہے "ما منا الا راد او مردود علیہ الا صاحب ھذا القبر صلی اللہ علیہ وسلم" —— راقم سطور کو اور اس کی طرح ہر واقف و باخبر کو ذاتی طور پر معلوم ہو کہ جماعت کے تمام اکابر اور ذمہ دار (جو خدا کے فضل سے کتاب و سنت اور شریعت کے عالم اور خادم ہیں) اسی عقیدہ اور فکر کے ہیں اور ہرگز اپنے کو اس سے مستثنیٰ اور بالاتر نہیں جانتے —— اسلئے اگر کسی واقف صاحب علم کو تبلیغی جماعت کے کام میں کچھ فکری یا عملی غلطیاں محسوس ہوں تو خیر خواہانہ طور پر ان کو بتانا اور ذمہ داروں کو ان کی طرف توجہ دلانا ایک مشکور دینی خدمت ہوگی اور اُمت کا کوئی بھی فرد اور کوئی بھی جماعت کبھی اس نصیحت دینی سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

تبلیغی جماعت اور اس کے ذمہ داروں سے قریبی واقفیت اور تعلق رکھنے والے اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ ان حضرات کا نقطۂ نظر اور طرز عمل بالکل یہی ہے۔ اس عاجز کا بیسوں دفعہ کا یہ اپنا ذاتی تجربہ بھی ہے۔

حال میں کلکتہ سے ایک مخلص دوست نے دربھنگہ (بہار) سے نکلنے والے ایک ہفتہ وار دینی اخبار کا تراشا بھیجا ہے، اس میں تبلیغی جماعت سے متعلق ایک صاحب کا مضمون ہے جس میں جماعت اور

اس کے ذمہ داروں کی بھرپور خبر لی گئی ہے اور بڑے سازوعان کے انداز میں ایسے سنگین الزامات لگائے گئے ہیں کہ اگر فی الواقع ان میں سے پچاس فیصدی بھی صحیح ہوں تو بلاشبہ یہ جماعت بہت بڑا دینی فتنہ اور ملت کے لیے نہایت سنگین خطرہ ہو ــــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ اس جماعت کی دعوت، اس کے کام اور اس کے ذمہ داروں سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس مضمون کو پڑھ کر بالبداہت محسوس کریں گے کہ جو سنگین بنیادی الزامات اس میں عائد کیے گئے ہیں اُن کا کم از کم ۔۔۔۔ ۸۰ فی صد حصہ بالکل بے بنیاد ہے۔

یہ عاجز صاحب مضمون سے کچھ واقف ہو (اگرچہ صرف غائبانہ طور پر) اس لیے ان کے اس عجیب و غریب مضمون کو صرف ان کی افتاد طبع کا نتیجہ سمجھتا ہے لیکن جو لوگ بالکل واقف نہ ہوں گے اور حسن ظن سے کام نہ لے سکیں گے وہ بیچارے کسی بُرے جذبہ کے سوا ایسے مضمون کی کوئی توجیہ نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ اس میں جماعت اور اس کے اکابر کی طرف ایسی باتیں بھی پورے ایقان کے ساتھ منسوب کی گئی ہیں جن سے بچنے اور دوسروں کو بچانے کی وہ حضرات اتنی کوشش کرتے ہیں کہ کبھی کبھی ان کی اس کوشش میں غلو محسوس ہونے لگتا ہے۔ فالی اللّٰہ المشتکی!

اس کے بعد جماعت کے ذمہ دار حضرات کی خدمت میں بھی گزارش ہو کہ چونکہ جماعت کی دعوت اور اسکے کام کی ساخت ایسی ہو کہ اس میں ہر طبقہ، ہر سطح اور ہر قسم کا آدمی آتا ہو بلکہ لایا جاتا ہے، اور بلا کسی شرط اور معاہدہ کے لایا جاتا ہو اور اُمت میں بڑی سے بڑی بیماریاں وبا کی طرح عام ہیں، نیز افراد امت میں ہر طرح کی اعتقادی اور عملی گمراہیوں کے قبول کرنے کی بڑی استعداد اور صلاحیت ہو اس لیے اس کی ضرورت ہو کہ پھیلاؤ کی فکر سے زیادہ نگرانی اور دیکھ بھال کی اور صحیح معتدل دینی مزاج بنانے کی فکر کی جائے اور اس بات پر خاص طور سے نظر رکھی جائے کہ اس کام کے کرنے والوں میں یہ احساس پیدا نہ ہو کہ اللہ کے ہاں قابل قبول دینی کام بس یہی ہو اور ان کی دینی برادری صرف ان کے تبلیغی ساتھی ہیں۔ بلکہ دوسری شکلوں اور دوسری راہوں سے دینی کام کرنے والوں کے لیے بھی ان کے دلوں میں پوری عقیدت اور پورا احترام ہو اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ ان کے تعلقات ہوں۔ جماعت کے سب اکابر جانتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ان باتوں کا کتنا اہتمام تھا۔

کتاب الاذکار والدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

اسماءِ حسنیٰ :-

حقیقی معنی میں اللہ پاک کا نام یعنی اسم ذات صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے "اللہ" البتہ اس کے صفاتی نام سیکڑوں ہیں، جو قرآن مجید اور احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔ انہی کو اسماءِ حسنیٰ کہا جاتا ہے ـــ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں امام جعفر بن محمد صادق اور سفیان بن عیینہ اور بعض دوسرے اکابر اُمت سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ نام تو صرف قرآن مجید ہی میں مذکور ہیں اور پھر انہی حضرات سے ان کی تفصیل اور تعیین بھی نقل کی ہے۔ اس کے بعد حافظ ممدوح نے ان میں سے بعض اسماء کے متعلق یہ تبصرہ کرکے کہ یہ اپنی خاص شکل میں قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں بلکہ استخراج اور اشتقاق کے طور پر وضع کیے گئے ہیں اُن کے بجائے دوسرے اسماء قرآن مجید ہی سے نکال کے بتایا ہے کہ یہ ننانوے ۹۹ اسماء الٰہیہ قرآن مجید میں اپنی اصل شکل میں مذکور ہیں اور ان کی پوری فہرست دکھا ہے جو انشاء اللہ عنقریب نقل ہوگی۔

ہمارے ہی زمانہ کے بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء کا تتبع احادیث میں کیا تو دو سو سے زائد ان کو ملے ـــ یہ سارے صفاتی اسماء حسنیٰ اللہ تعالیٰ کے صفاتِ کمال کے عنوانات اور اس کی معرفت کے دروازے ہیں ـــ پس اللہ تعالیٰ کے ذکر کی ایک بڑی جامع اور تفصیلی شکل ہے کہ بندہ عظمت اور محبت کے ساتھ ان اسماء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور ان کو

وظیفہ بنائے ___ اس تمہید کے بعد اس سلسلہ کی چند احادیث ذیل میں پڑھیے !

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَةً وَّتِسْعِیْنَ اِسْمًا مِائَةً اِلَّا وَاحِدًا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ ___ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) یعنی ایک کم سو نام ہیں جس نے ان کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی وہ جنت میں جائے گا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) صحیحین کی روایت میں صرف اتنا ہی ہے، ان ننانوے ناموں کی تفصیل اور تعیین اس روایت میں نہیں کی گئی ہے۔ عنقریب ہی انشاء اللہ جامع ترمذی وغیرہ کی اس روایت کا ذکر آئے گا جس میں تفصیل کے ساتھ یہ ننانوے نام بیان کیے گئے ہیں ___ شارحین حدیث اور علماء کا اس پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اسماء الٰہیہ صرف ننانوے میں منحصر نہیں ہیں اور یہ ان کی پوری تعداد نہیں ہے، کیونکہ تتبع اور تلاش کے بعد احادیث میں اس سے بہت زیادہ تعداد مل جاتی ہے، اس لیے حضرت ابوہریرہ کی اس حدیث کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب اور مدعا صرف یہ ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کو یاد کرے گا اور ان کی نگہداشت کرے گا وہ جنت میں جائے گا ___ یعنی صرف ننانوے ناموں کا احصاء کر لینے پر بندہ اس بشارت کا مستحق ہو جائے گا۔

حدیث پاک کے جملہ "مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ" کی تشریح میں علماء اور شارحین نے مختلف باتیں لکھی ہیں ___ ایک مطلب اس کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو بندہ ان اسماء الٰہیہ کے مطالب سمجھ کر اور ان کی معرفت حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر یقین کرے گا جن کے یہ اسماء عنوانات ہیں وہ جنت میں جائے گا ___ دوسرا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو بندہ ان اسماء حسنیٰ کے تقاضوں پر عمل پیرا ہوگا وہ جنت میں جائے گا ___ تیسرا ایک مطلب بیان کیا گیا ہے کہ جو بندہ ننانوے ناموں سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا اور ان کے ذریعہ سے دعا کرے گا وہ جنت میں جائے گا ___ امام بخاریؒ نے "مَنْ اَحْصَاهَا" کی

تشریح "مَنْ حَفِظَهَا" سے کی ہے، بلکہ اس حدیث کی بعض روایات میں "مَنْ اَحْصَاهَا" کی جگہ "مَنْ حَفِظَهَا" کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں اس لیے اس تشریح کو ترجیح دی گئی ہے اور اسی لیے ترجمہ میں اس عاجز نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے ــــ اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ جو بندہ ایمان اور عقیدت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے اس کے ننانوے (۹۹) نام محفوظ کرلے اور ان کے ذریعہ اس کو یاد کرے وہ جنت میں جائے گا ــــ واللہ اعلم

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰى تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ اِسْمًا مِائَةً اِلَّا وَاحِدَةً مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَهَّارُ الْوَهَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ الْحَكَمُ الْعَدْلُ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ الْحَلِيْمُ الْعَظِيْمُ الْغَفُوْرُ الشَّكُوْرُ الْعَلِىُّ الْكَبِيْرُ الْحَفِيْظُ الْمُقِيْتُ الْحَسِيْبُ الْجَلِيْلُ الْكَرِيْمُ الرَّقِيْبُ الْمُجِيْبُ الْوَاسِعُ الْحَكِيْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِيْدُ الْبَاعِثُ الشَّهِيْدُ الْحَقُّ الْوَكِيْلُ الْقَوِىُّ الْمَتِيْنُ الْوَلِىُّ الْحَمِيْدُ الْمُحْصِىْ الْمُبْدِئُ الْمُعِيْدُ الْمُحْيِىْ الْمُمِيْتُ الْحَىُّ الْقَيُّوْمُ الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاهِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِىْ الْمُتَعَالِىْ الْبَرُّ التَّوَّابُ الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّؤُفُ مَالِكُ الْمُلْكِ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِىُّ الْمُغْنِىْ الْمَانِعُ الضَّارُّ

اَلنَّافِعُ اَلنُّوْرُ الْهَادِیُ الْبَدِيْعُ الْبَاقِیْ الْوَارِثُ الرَّشِيْدُ الصَّبُوْرُ ـــــــ رواہ الترمذی والبیہقی فی الدعوات الکبیر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں ایک کم سو، جس نے ان کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی وہ جنت میں جائے گا ـــ (ان ناموں کی تفصیل یہ ہے)

وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی مالک و معبود نہیں، وہ ہے الرَّحْمٰن[1] (بڑی رحمت والا) الرَّحِیْم[2] (نہایت مہربان) المَلِکُ[3] (حقیقی بادشاہ اور فرمانروا) القُدُّوس[4] (نہایت مقدس اور پاک) السَّلَام[5] (جس کی ذاتی صفت سلامتی ہے) المؤمن[6] (امن و امان عطا فرمانے والا) المہیمن[7] (پوری نگہبانی فرمانے والا) العزیز[8] (غلبہ اور عزت جس کی ذاتی صفت ہے اور جو سب پر غالب ہے) الجبّار[9] (صاحب جبروت ہے، ساری مخلوق اس کے زیر تصرف ہے) المتکبّر[10] (کبریائی اور بڑائی اس کا حق ہے) الخالق[11] (پیدا فرمانے والا) البارِی[12] (ٹھیک بنانے والا) المصوّر[13] (صورت گری کرنے والا) الغفّار[14] (گناہوں کا بہت زیادہ بخشنے والا) القہّار[15] (سب پر پوری طرح غالب اور قابو یافتہ جس کے سامنے سب عاجز اور مغلوب ہیں) الوہّاب[16] (بغیر کسی عوض اور منفعت کے خوب عطا فرمانے والا)، الرزّاق[17] (سب کو روزی دینے والا) الفتّاح[18] (سب کے لیے رحمت اور رزق کے دروازے کھولنے والا) العلیم[19] (سب کچھ جاننے والا) القابض[20] الباسط[21] (تنگی کرنے والا، فراخی کرنے والا ـــ یعنی اس کی یہ شان ہے کہ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق کبھی کسی کے حالات میں تنگی پیدا کرتا ہے اور کبھی فراخی کر دیتا ہے) الخافض[22] الرافع[23] (پست کرنے والا، بلند کرنے والا) المعزّ[24] المذلّ[25] (عزت دینے والا، ذلت دینے والا) [یعنی کسی کو نیچا اور کسی کو اونچا کرنا، کسی کو عزت دے کر سرفراز کرنا اور کسی کو قعر مذلت میں گرا دینا اس کے قبضہ و اختیار میں ہے، اور یہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہوتا ہے] السمیع[26]، البصیر[27] (سب کچھ

سننے والا سب کچھ دیکھنے والا) اَلْحَکَمُ[۲۸]، اَلْعَدْلُ[۲۹] (حاکم حقیقی، سراپا عدل
انصاف) اللَّطِیْفُ[۳۰] (لطافت اور لطف وکرم جس کی ذاتی صفت ہے) اَلْخَبِیْرُ[۳۱]
(ہر بات سے باخبر) اَلْحَلِیْمُ[۳۲] (نہایت بردبار) اَلْعَظِیْمُ[۳۳] (بڑی عظمت والا، سب
بزرگ و برتر) اَلْغَفُوْرُ[۳۴] (بہت بخشنے والا) الشَّکُوْرُ[۳۵] (حسن عمل کی قدر کرنے والا
اور بہتر سے بہتر جزا دینے والا) اَلْعَلِیُّ[۳۶]، اَلْکَبِیْرُ[۳۷] (سب سے بالا، سب سے بڑا)
اَلْحَفِیْظُ[۳۸] (سب کا نگہبان) اَلْمُقِیْتُ[۳۹] (سب کو سامانِ حیات فراہم کرنے والا)
اَلْحَسِیْبُ[۴۰] (سب کے لیے کفایت کرنے والا) اَلْجَلِیْلُ[۴۱] (عظیم القدر) اَلْکَرِیْمُ[۴۲]
(صاحب کرم) الرَّقِیْبُ[۴۳] (نگہدار، اور محافظ) اَلْمُجِیْبُ[۴۴] (قبول فرمانے والا) اَلْوَاسِعُ[۴۵]
(وسعت رکھنے والا) اَلْحَکِیْمُ[۴۶] (سب کام حکمت سے کرنے والا) اَلْوَدُوْدُ[۴۷] (اپنے بندوں
کو چاہنے والا) اَلْمَجِیْدُ[۴۸] (بزرگی والا) اَلْبَاعِثُ[۴۹] (اٹھانے والا، موت کے
بعد مُردوں کو جلانے والا) الشَّہِیْدُ[۵۰] (حاضر جو سب کچھ دیکھتا ہے اور جانتا ہے) اَلْحَقُّ[۵۱]
(جس کی ذات اور جس کا وجود اصلاً حق ہے) اَلْوَکِیْلُ[۵۲] (کارساز حقیقی) اَلْقَوِیُّ[۵۳]
اَلْمَتِیْنُ[۵۴] (صاحب قوت اور بہت مضبوط) اَلْوَلِیُّ[۵۵] (سرپرست و مددگار) اَلْحَمِیْدُ[۵۶]
(مستحق حمد وستائش) اَلْمُحْصِیْ[۵۷] (سب مخلوقات کے بارہ میں پوری معلومات رکھنے والا)
اَلْمُبْدِیُٔ[۵۸]، اَلْمُعِیْدُ[۵۹] (پہلا وجود بخشنے والا، دوبارہ زندگی دینے والا) اَلْمُحْیِیْ[۶۰]
اَلْمُمِیْتُ[۶۱] (زندگی بخشنے والا، موت دینے والا) اَلْحَیُّ[۶۲] (زندۂ جاوید، زندگی جس کی
ذاتی صفت ہے) اَلْقَیُّوْمُ[۶۳] (خود قائم رہنے والا اور سب مخلوق کو اپنی مشیت کے
مطابق قائم رکھنے والا) اَلْوَاجِدُ[۶۴] (سب کچھ اپنے پاس رکھنے والا) اَلْمَاجِدُ[۶۵] (بزرگی
اور عظمت والا) اَلْوَاحِدُ[۶۶]، اَلْاَحَدُ[۶۷] (ایک اپنی ذات میں اور یکتا اپنی صفات میں) اَلصَّمَدُ[۶۸]
(سب سے بے نیاز اور سب اس کے محتاج) اَلْقَادِرُ[۶۹]، اَلْمُقْتَدِرُ[۷۰] (قدرت والا،
سب پر کامل اقتدار رکھنے والا) اَلْمُقَدِّمُ[۷۱] اَلْمُؤَخِّرُ[۷۲] (جسے چاہے آگے کردینے والا
اور جسے چاہے پیچھے کردینے والا) اَلْاَوَّلُ[۷۳]، اَلْآخِرُ[۷۴] (سب سے پہلے اور سب سے پیچھے
[یعنی جب کوئی نہ تھا، کچھ نہ تھا، جب بھی وہ موجود تھا اور جب کوئی نہ رہے گا

کچھ نہ رہے گا وہ اس وقت اور اس کے بعد بھی موجود رہے گا) الظَّاہِر[۷۵] الباطِن[۷۶] (بالکل آشکارا اور بالکل مخفی) الوالِی[۷۷] (مالک و کارساز) المُتَعالِی[۷۸] (بہت بلند و بالا) البَرّ[۷۹] (بڑا محسن) التَّوّاب[۸۰] (توبہ کی توفیق دینے والا اور توبہ قبول کرنے والا) المُنتَقِم[۸۱] (مجرمین کو کیفر کردار کو پہونچانے والا) العَفُوّ[۸۲] (بہت معافی دینے والا) الرَّؤُف[۸۳] (بہت مہربان) مَالِكُ المُلْك[۸۴] (سارے جہان کا مالک) ذُوالجَلالِ[۸۵] وَالاِكرام (صاحب جلال اور بہت کرم فرمانے والا جس کے جلال سے بندہ ہمیشہ خائف رہے اور جس کے کرم سے ہمیشہ امید رکھے) المُقْسِط[۸۶] (حقدار کا حق ادا کرانے والا عادل و منصف) الجَامِع[۸۷] (ساری مخلوق کو قیامت کے دن یکجا کرنے والا) الغَنِیّ[۸۸]، المُغْنِی[۸۹] (خود بے نیاز جس کو کسی سے کوئی حاجت نہیں، اور اپنی عطا کے ذریعہ بندوں کو بے نیاز کر دینے والا) المَانِع[۹۰] (روک دینے والا ہر اس چیز کو جس کو روکنا چاہے) الضَّار[۹۱]، النَّافِع[۹۲] (اپنی حکمت اور مشیت کے تحت ضرر پہونچانے والا اور نفع پہونچانے والا) النُّور[۹۳] (سراپا نور) الهَادِی[۹۴] (ہدایت دینے والا) البَدِیع[۹۵] (بغیر مثال سابق کے مخلوق کا پیدا فرمانے والا) البَاقِی[۹۶] (ہمیشہ رہنے والا جس کو کبھی فنا نہیں) الوَارِث[۹۷] (سب کے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہنے والا) الرَّشِید[۹۸] (صاحب رشد و حکمت جس کا ہر فعل اور فیصلہ درست ہے۔) الصَّبُور[۹۹] (بڑا صابر کہ بندوں کی بڑی سے بڑی نافرمانیاں دیکھتا ہے، اور فوراً عذاب بھیج کر ان کو تہس نہس نہیں کر دیتا۔ (جامع ترمذی۔ دعوات کبیر للبیہقی)

(تشریح) حضرت ابوہریرہ کی اس حدیث کا ابتدائی حصہ بالکل وہی ہے جو صحیحین کے حوالے سے ابھی اوپر نقل ہو چکا ہے۔ البتہ اس میں ننانوے ناموں کی تفصیل بھی ہے جو صحیحین کی روایت میں نہیں ہے۔ اس بنا پر بعض محدثین اور شارحین حدیث کی یہ رائے ہے کہ حدیث مرفوع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل ارشاد بس اسی قدر ہے جتنا صحیحین کی روایت میں ہے یعنی "اِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا مِائَةً اِلَّا وَاحِدًا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ" (اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کا احصا کیا وہ جنت میں جائے گا)

اور ترمذی کی اس روایت میں اور اسی طرح ابن ماجہ اور حاکم وغیرہ کی روایتوں میں جو ننانوے نام بہ تفصیل ذکر کیے گئے ہیں وہ ارشادِ نبوی کا جز نہیں ہیں، بلکہ حضرت ابوہریرہ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی شاگرد نے حدیث کے اجمال کی تفصیل اور ابہام کی تفسیر کے طور پر قرآن و حدیث میں وارد شدہ یہ اسماء الٰہیہ ذکر کر دیے ہیں، گویا محدثین کی اصطلاح میں یہ اسماء حسنیٰ مُدرَج ہیں ـــــ اس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ ترمذی اور ابن ماجہ اور حاکم کی روایات میں ننانوے ناموں کی جو تفصیل ذکر کی گئی ہے اس میں بہت بڑا فرق اور اختلاف ہے۔ اگر یہ ننانوے اسماء حسنیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم فرمائے ہوتے تو ان میں اتنا اختلاف اور فرق ناممکن تھا۔

بہرحال یہ تو فنِ حدیث و روایت کی ایک بحث ہے، مگر اتنی بات سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ ترمذی کی مندرجۂ بالا روایت میں اور اسی طرح ابن ماجہ وغیرہ کی روایات میں جو ننانوے اسماء الٰہیہ ذکر کیے گئے ہیں وہ سب قرآن مجید اور احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ننانوے اسماء الٰہیہ کے احصاء پر (محفوظ کرنے پر) جو بشارت سنائی ہے اس کے وہ بندے یقیناً مستحق ہیں جو اخلاص اور عظمت کے ساتھ ان اسماء حسنیٰ کو محفوظ کریں اور ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو یاد کریں ـــــ حضرت شاہ ولی اللہ رح نے اس کی لِم اور اس کے سبب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے کہ جو صفاتِ کمال حق تعالیٰ کیلئے ثابت کی جانی چاہئیں اور جن چیزوں کی اسکی ذاتِ پاک سے نفی کی جانی چاہیئے، ان ننانوے اسماء حسنیٰ میں وہ سب کچھ آجاتا ہے۔ اس طرح یہ اسماء حسنیٰ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا مکمل اور صالح نصاب ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کے مجموعہ میں غیر معمولی برکت ہے۔ اور عالمِ قدس میں ان کو خاص قبولیت حاصل ہے اور جب کسی بندہ کے اعمال نامہ میں یہ اسماء الٰہیہ ثبت ہوں تو یہ اس کے حق میں رحمتِ الٰہی کے فیصلہ کے موجب ہوں گے ـــــ واللہ اعلم

ترمذی کی مندرجۂ بالا روایت میں جو ننانوے (۹۹) اسماء حسنیٰ ذکر کیے گئے ہیں ان میں سے دو تہائی تو قرآن مجید میں مذکور ہیں باقی احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق وغیرہ جن حضرات نے دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام قرآن مجید میں موجود ہیں اُن کا ذکر ابھی اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر کی (۲) آخری کاوش کا بھی حوالہ دیا جا چکا ہے کہ انھوں نے صرف قرآن مجید سے وہ ننانوے

اسماء الہیہ کا لے رہے ہیں جو اپنی اصل شکل میں قرآن پاک میں موجود ہیں۔

اگر ان محدثین اور شارحین کی بات مان لی جائے جن کی رائے ہے کہ ترمذی کی مندرجہ بالا روایت میں جو اسماء حسنیٰ ذکر کیے گئے ہیں یہ حدیث مرفوع کا جزو نہیں ہیں بلکہ کسی راوی کی طرف سے مُدرَج ہیں۔ یعنی حدیث کے اجمال کی تفصیل کے طور پر انھوں نے قرآن و حدیث میں وارد شدہ ان ناموں کا اضافہ کر دیا ہے تو پھر حافظ ابن حجر کی پیش کردہ وہ فہرست قابلِ ترجیح ہونی چاہیے جس کے سب اسماء بغیر کسی خاص تصرف کے قرآن مجید ہی سے لیے گئے ہیں، ہم ذیل میں ان کی وہ فہرست فتح الباری سے نقل کرتے ہیں، انھوں نے اسم ذات اللّٰہ کو بھی ان ننانوے ناموں میں شمار کیا ہے بلکہ اسی سے اپنی فہرست کا آغاز کیا ہے۔

ننانوے (۹۹) اسماء حسنیٰ جو سب کے سب قرآن مجید میں ہیں۔

(۱) اللّٰہ (۲) الرحمٰن (۳) الرحیم (۴) الملک (۵) القدوس (۶) السلام (۷) المؤمن
(۸) المہیمن (۹) العزیز (۱۰) الجبار (۱۱) المتکبر (۱۲) الخالق (۱۳) البارئ (۱۴) المصور (۱۵) الغفار
(۱۶) القہار (۱۷) التواب (۱۸) الوہاب (۱۹) الخلاق (۲۰) الرزاق (۲۱) الفتاح (۲۲) العلیم (۲۳) الحلیم
(۲۴) العظیم (۲۵) الواسع (۲۶) الحکیم (۲۷) الحی (۲۸) القیوم (۲۹) السمیع (۳۰) البصیر (۳۱) اللطیف
(۳۲) الخبیر (۳۳) العلی (۳۴) الکبیر (۳۵) المحیط (۳۶) القدیر (۳۷) المولیٰ (۳۸) النصیر (۳۹) الکریم
(۴۰) الرقیب (۴۱) القریب (۴۲) المجیب (۴۳) الوکیل (۴۴) الحسیب (۴۵) الحفیظ (۴۶) المقیت
(۴۷) الودود (۴۸) المجید (۴۹) الوارث (۵۰) الشہید (۵۱) الولی (۵۲) الحمید (۵۳) الحق (۵۴) المبین
(۵۵) القوی (۵۶) المتین (۵۷) الغنی (۵۸) المالک (۵۹) الشدید (۶۰) القادر (۶۱) المقتدر (۶۲) القاہر
(۶۳) الکافی (۶۴) الشاکر (۶۵) المستعان (۶۶) الفاطر (۶۷) البدیع (۶۸) الغافر (۶۹) الاول (۷۰) الآخر
(۷۱) الظاہر (۷۲) الباطن (۷۳) الکفیل (۷۴) الغالب (۷۵) الحکم (۷۶) العالم (۷۷) الرفیع (۷۸) الحافظ
(۷۹) المنتقم (۸۰) القائم (۸۱) المحیی (۸۲) الجامع (۸۳) الملیک (۸۴) المتعال (۸۵) النور (۸۶) الہادی
(۸۷) الغفور (۸۸) الشکور (۸۹) العفو (۹۰) الرؤف (۹۱) الاکرم (۹۲) الاعلیٰ (۹۳) البر (۹۴) الحفی
(۹۵) الرب (۹۶) الالٰہ (۹۷) الواحد (۹۸) الاحد (۹۹) الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم

---

(۱) حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اسی کو راجح بتایا ہے ۱۲

یکن لہ کفواً احد (فتح الباری جز ۲۲)

ننانوے اسماء حسنیٰ جو ترمذی کی روایت میں مذکور ہیں اور اسی طرح یہ جو حافظ ابن حجر نے قرآن مجید سے نکالے ہیں، بلا شبہ ان میں سے ہر ایک معرفت الٰہی کا دروازہ ہے — علماء امت نے مختلف زمانوں میں ان کی شرح میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مہمات میں ان کے ذریعہ دعا کرنا بہت سے اہل اللہ کے خاص معمولات میں سے ہے اور اس کی قبولیت مجرّب ہے۔

اسم اعظم :-

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے بعض وہ ہیں جن کو اس لحاظ سے خاص عظمت و امتیاز حاصل ہے کہ جب ان کے ذریعہ دعا کی جائے تو قبولیت کی زیادہ امید کی جاسکتی ہے ان اسماء کو حدیث میں "اسم اعظم" کہا گیا ہے لیکن صفائی اور صراحت کے ساتھ ان کو متعین نہیں کیا گیا ہے بلکہ کسی درجہ میں ان کو مبہم رکھا گیا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ لیلۃ القدر کو اور جمعہ کے دن قبولیت دعا کے خاص وقت کو مبہم رکھا گیا ہے۔ احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ایک ہی اسم پاک "اسم اعظم" نہیں ہے جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں بلکہ متعدد اسماء حسنیٰ کو "اسم اعظم" کہا گیا ہے، نیز انہی احادیث سے یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ عوام میں اسم اعظم کا جو تصور ہے اور اس کے بارہ میں جو باتیں مشہور ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں۔ اصل حقیقت بس وہی ہے جو اوپر عرض کی گئی ہے —— اس کے بعد اس سلسلہ کی احادیث ذیل میں پڑھی جائیں۔

عَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ بِاَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِىْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ كُفُوًا اَحَدٌ. فَقَالَ دَعَا اللّٰهَ بِاِسْمِهِ الْاَعْظَمِ الَّذِىْ اِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰى وَاِذَا دُعِىَ بِهٖ اَجَابَ.

—— رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو اس طرح دعا کرتے ہوئے سنا، وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کر رہا تھا ——"اے اللہ میں اپنی حاجت تجھ سے مانگتا ہوں بوسیلہ اس کے کہ بس تو اللہ ہے، تیرے سوا کوئی مالک و معبود نہیں، ایک اور یکتا ہے، بالکل بے نیاز ہے اور سب تیرے محتاج ہیں، نہ کوئی تیری اولاد، نہ تو کسی کی اولاد اور نہ تیرا کوئی ہمسر" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب اس بندے کو یہ دعا کرتے سنا تو) فرمایا کہ اس بندے نے اللہ سے اس کے اس اسم اعظم کے وسیلے سے دعا کی ہے کہ جب اس کے وسیلے سے اس سے مانگا جائے تو وہ دیتا ہے اور جب اس کے وسیلے سے دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے۔　　　(جامع ترمذی، سنن ابوداؤد)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنْتُ جَالِساً مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ وَرَجُلٌ يُصَلِّيْ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ اَسْئَلُكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَا اللّٰهَ بِاسْمِهِ الْاَعْظَمِ الَّذِيْ اِذَا دُعِيَ بِهٖ اَجَابَ وَاِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰى۔

—— رواہ الترمذی وابو داؤد والنسائی وابن ماجۃ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک دن مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا اور ایک بندہ وہاں نماز پڑھ رہا تھا، اس نے اپنی دعا میں عرض کیا —"اے اللہ میں تجھ سے اپنی حاجت مانگتا ہوں بوسیلہ اس کے کہ ساری حمد و ستائش تیرے ہی لیے سزاوار ہے، کوئی معبود نہیں تیرے سوا، تو نہایت مہربان اور بڑا محسن ہے، زمین و آسمان کا پیدا فرمانے والا ہے، میں تجھ ہی سے مانگتا ہوں، اے ذوالجلال والاکرام، اے حیّ و قیوم!" —— تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بندے نے اللہ کے اس اسم اعظم کے وسیلے سے دعا کی ہے کہ اس کے وسیلے سے جب اس سے دعا کی جائے تو وہ قبول فرماتا ہے اور جب اس کے وسیلے سے مانگا

جائے تو عطا فرماتا ہے۔ (جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِسْمُ اللّٰهِ الْاَعْظَمُ فِيْ هَاتَيْنِ الْاٰيَتَيْنِ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ وَفَاتِحَةِ اٰلِ عِمْرَانَ الٓمّٓ ۔ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ——

—— رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجہ والدارمی

اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اسم اللہ الاعظم" ان دو آیتوں میں موجود ہے۔ ایک "وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ" اور دوسری آل عمران کی ابتدائی آیت "الٓمّٓ ۔ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ"۔

(جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

تشریح) ان احادیث میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی ایک مخصوص نام پاک کو اسم اعظم نہیں فرمایا گیا ہے، بلکہ یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ آخری حدیث میں جن دو آیتوں کا حوالہ دیا گیا اور اس سے پہلی دونوں حدیثوں میں دو مخصوص کی جو دو دعائیں نقل کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک میں متعدد اسماءِ الٰہیہ کی خاص ترکیب سے اللہ تعالیٰ کا جو مرکب اور جامع وصف مفہوم ہوتا ہے اس کو "اسم اعظم" سے تعبیر فرمایا گیا ہے —— حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اس نوع کے علوم و معارف سے خاص طور پر نوازا ہے انھوں نے ان احادیث سے یہی سمجھا ہے[1] —— واللہ اعلم

---

(۱) شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔ واعلم ان الاسم الاعظم الذی اذا سئل بہ اعطی واذا دعی بہ اجاب ہو الاسم الذی یدل علی اجمع تدلی من تدلیات الحق والذی تداولہ الملأ الاعلیٰ اکثر تداول ونطقت بہ التراجمۃ فی کل عصر..... وہذا المعنی یصدق علیٰ "انت اللہ لا الٰہ الا انت الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا احدٌ" وعلیٰ "لک الحمد لا الٰہ الا انت الحنان المنان بدیع السمٰوات والارض یا ذوالجلال والاکرام یا حیّ یا قیوم" ولصیدق علی اسماء تضاهی ذالک۔ (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۶)

مذہب کے بغیر کیا

از جناب وحید الدین خاں صاحب

میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر (MICHAEL BRECHER) نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی۔ نئی دہلی کی ایک ملاقات میں ۱۳ رجون ۱۹۵۶ کو انھوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا:

"آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں اور آپ کا بنیادی فلسفۂ زندگی کیا ہے"۔

ہندوستان کے سابق وزیر اعظم نے جواب دیا:۔

"میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں۔ آپ ان کو اخلاقی معیار MORAL STANDARDS کہہ لیجئے۔ یہ معیار ہر فرد اور سماجی گروہ کے لیے ضروری ہیں۔ اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتے۔ ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے، لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہو ...... میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے علیحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے"۔

NEHRU: A POLITICAL BIOGRAPHY (LONDON 1959)
607 — 8

یہ سوال وجواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے جس میں آج وہ شدت سے گرفتار ہے افراد کو دیانت واخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ہر سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا۔ مگر خدا کو چھوڑنے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے۔ تین سو برس کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے۔ پبلک اور حکام کے درمیان عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لیے خوش اخلاقی کا ہفتہ (COURTESY WEEK) منایا جاتا ہے مگر اس کے بعد بھی جب سرکاری ملازموں کی افسرانہ ذہنیت ختم نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لیے "اخلاق" کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے۔ بے ٹکٹ مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کے لیے تمام اسٹیشنوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جاتے ہیں "بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے" (TICKETLESS TRAVEL IS A SOCIAL EVIL) مگر جب اس کے باوجود بے ٹکٹ سفر ختم نہیں ہوتا تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ "سماجی گناہ" کا لفظ وہ احساس پیدا نہیں کر سکتا جو نظم وضبط کی تعمیل کے لیے محرک بن سکے۔ پریس کے ذریعہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ جرم کا انجام اچھا نہیں ہوتا (CRIME DOES NOT PAY) مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار بتاتی ہے کہ دنیوی بدانجامی کے اندیشہ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ آدمی کو جرم سے باز رکھے۔ تمام دفتروں کی دیواریں مختلف زبانوں کے ان الفاظ سے رنگین کر دی جاتی ہیں "رشوت لینا اور رشوت دینا پاپ ہے" مگر جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ ہر محکمے میں علی الاعلان انھیں الفاظ کے نیچے رشوت کا کاروبار پورے زور وشور سے جاری ہے تو وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس قسم کے سرکاری پروپیگنڈے رشوت کو روکنے میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہیں۔ ریل کے تمام ڈبوں میں اس مضمون کے کتبے لگائے جاتے ہیں "ریلوے قوم کی ملکیت ہے اس کا نقصان پوری قوم کا نقصان ہے" مگر اس کے باوجود جب لوگ کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالتے ہیں اور بجلی کے بلب غائب کر دیتے ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ "قوم" کے مفاد میں تنا زور نہیں ہو، کہ اس کی وجہ سے ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کو قربان کرے۔ "اجتماعی ذرائع کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنا ملک وقوم سے غداری ہے" — ایک طرف لیڈروں اور حکمرانوں کی زبان سے یہ اعلان ہو رہا ہے دوسری طرف بڑے بڑے قومی منصوبے اس لیے ناکام ہو رہے ہیں کہ سرمایہ کا بڑا حصہ اصل منصوبے پر لگنے کے بجائے متعلقہ کارکنوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ساری قومی زندگی انتہائی کوشش کے باوجود ان معیاروں سے محروم ہو گئی ہے جو قومی تعمیر کے لیے ضروری ہیں۔ اور ان معیاروں کو پیدا کرنے کے لیے جتنے ذرائع استعمال کیے گئے وہ سب کے سب قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لاکر ڈال دیا ہے، اس کو اس پٹری سے محروم کر دیا ہے جس کے اوپر چل کر وہ اپنا سفر بحسن وخوبی طے کر سکتی ہے۔ زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادبان ہو گئی ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف پلٹے۔ وہ زندگی کے لیے مذہب کی اہمیت تسلیم کرے۔ یہی وہ تنہا بنیاد ہے جس پر زندگی کی بہتر تعمیر ممکن ہے۔ اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

ہندستان میں امریکہ کے سابق سفیر مسٹر چسٹر باولز (CHESTER BOWLES) لکھتے ہیں:-

> "زیر ترقی ممالک صنعتی ترقی حاصل کرنے کے سلسلے میں دو طرح کے مسائل سے دوچار ہیں اور دونوں نہایت پیچیدہ ہیں۔ ایک یہ کہ سرمایہ، خام اشیا اور فنی مہارت جو انھیں حاصل ہیں، ان کو کس طرح زیادہ بہتر طور پر استعمال کریں .... دوسرا پیچیدہ مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق عوام اور اداروں سے ہے۔ صنعت کو تیزی سے آگے بڑھانے کے ساتھ ہمیں یہ یقین بھی حاصل کرنا ہے کہ وہ عیبی خرابیوں کو دور کرے اس سے زیادہ خرابیاں پیدا نہ کردے۔ مہاتما گاندھی کے الفاظ میں "سائنسی معلومات اور دریافتیں محض حرص کو بڑھانے کا اوزار ثابت ہو سکتی ہیں۔ اصل قابل لحاظ چیز انسان ہے۔"

THE MAKINGS OF A JUST SOCIETY, (DELHI 1963) PP. 68-69)

باولز کے الفاظ میں "عوام گویا وہ ماحول ہیں جس کے اندر ترقیاتی پروگرام جاری ہوتے ہیں۔ ترقی کے ضروری سامان — سرمایہ اور فنی مہارت وغیرہ تمدنی اور سیاسی خلا میں کارگر ثابت نہیں ہو سکتے" (صفحہ ۳۱)

یہ خلا کیسے پر ہو اور وہ ماحول کیسے بنے جس میں عوام اور سرکاری کارکن دیانت داری اور اتحاد کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں اپنے آپ کو صرف کریں۔ اس سوال کا کوئی جواب جدید مفکرین کے پاس نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہو کہ بے خدا تہذیب کے ماحول میں نہیں ہو سکتا۔ بے خدا تہذیب کے اندر ہر ترقیاتی اسکیم ایک زبردست تضاد کا شکار ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کا شخصی نظریہ اس کے سماجی تصور سے ٹکراتا ہے۔ اس کا اجتماعی پروگرام تو یہ ہے کہ ایک پرامن اور خوش حال سماج کی تعمیر کی جائے مگر اسی کے ساتھ اس کے مفکرین جب یہ کہتے ہیں کہ "انسان کا مقصد مادی خوشی حاصل کرنا ہے" تو وہ اپنی پہلی بات کی تردید کر دیتے ہیں۔ وہ پورے سماج کو جیسا دیکھنا چاہتے ہیں، سماج کے افراد کو اس کے خلاف بنا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی کسی اسکیم کو اب تک اپنے مقصد میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تمام مادی فلسفے زندگی کا بہتر نظام بنانے میں ناکام

ثابت ہوئے ہیں۔

مادی خوشی کو زندگی کا مقصد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی خواہش پوری کرنا چاہے۔ لیکن اس محدود دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص دوسرے کو متاثر کئے بغیر یکساں طور پر اپنی اپنی خواہش پوری کر سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدمی جب اپنی تمام خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے تو وہ دوسروں کے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ فرد کی خوشی سماج کی خوشی کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ ایک محدود آمدنی والا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی آمدنی اس کی خواہشوں کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہو رہی ہے تو وہ حق ماری، بددیانتی، چوری، رشوت اور غبن کے ذریعہ اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ مگر اس طرح جب وہ اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے تو وہ سماج کو اسی محتاجی میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں وہ خود پہلے مبتلا تھا۔ جدید دنیا ایک عجیب و غریب قسم کی نہایت خطرناک مصیبت میں مبتلا ہے جس کا تاریخ میں کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا یہ جرم کم سنی (JUVENILE DELINQUENCY) ہے جو جدید زندگی کا لازمہ بن چکا ہے۔ یہ کم سن مجرمین کہاں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی پیدائش کا سرچشمہ وہی مادی خوشی کو پورا کرنا ہے۔ ایک شادی شدہ جوڑا کچھ دنوں ساتھ رہنے کے بعد ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہیں اور اپنی جنسی خوشی کیلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ نیا جسم اور نیا چہرہ تلاش کریں۔ اس وقت وہ طلاق لے کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اس علیحدگی کی قیمت سماج کو چند ایسے بچوں کی شکل میں ملتی ہے جو اپنے ماں باپ کی موجودگی میں "یتیم" ہو گئے ہیں۔ یہ بچے والدین سے چھوٹنے کے بعد ماحول کے اندر اپنی کوئی جگہ نہیں پاتے، ایک طرف وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں اور دوسری طرف ماحول سے بیزار۔ یہ صورت حال بہت جلد انھیں جرائم تک پہونچا دیتی ہے۔ سر الفرڈ ڈیننگ (ALFRED DENNING) نے بہت صحیح لکھا ہے کہ اکثر کم سن اور نابالغ مجرمین ایسے ٹوٹے ہوئے گھرانوں (BROKEN HOMES) سے نمودار ہوتے ہیں۔

THE CHANGING LAW, P.11

[illegible] جدید دنیا کو انفرادی فلسفہ اور اس کے [illegible] پسند کرنے میں اور ان کو [illegible] اپنی مادی خوشی حاصل کرنے کی [illegible]

جنگ اور اس طرح کی دوسری بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تضاد بتاتا ہے کہ زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی مادی چیزوں کے بجائے آخرت میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو مقصد بنایا جائے۔ یہی وہ مقصد ہے جو فرد اور سماج کو باہمی تضاد سے بچا کر متوافق ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے ——— نظریہ آخرت کی یہ خصوصیت جہاں یہ ثابت کرتی ہے کہ وہی واحد بنیاد ہے جو ترقیاتی اسکیموں کو صحیح طور پر کامیاب کر سکتی ہے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ وہی حقیقی مقصد ہے کیونکہ غیر حقیقی چیز کسی مقصد کے لئے اتنی اہم اور اس سے اتنی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔

بیسویں صدی کی بیماری

موجودہ زمانے میں طب اور سرجری میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ سائنس موت اور بڑھاپے کے سوا ہر جسمانی تکلیف پر قابو پا سکتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ بیماری کے اقسام میں نہایت تیزی سے ایک نئے نام کا اضافہ ہو رہا ہے ——— اعصابی بیماری (NERVOUS DSEASES) یہ اعصابی بیماریاں کیا ہیں یہ دراصل اسی تضاد کا ایک عملی ظہور ہے جس میں جدید سوسائٹی شدت سے مبتلا ہے مادی تہذیب نے انسان کے اس حصے کو جو عضلات، معدنیات اور گیسوں کا مرکب ہے، ترقی دینے کی کافی کوشش کی۔ مگر انسان کا وہ حصہ جو شعور، خواہش اور ارادہ پر مشتمل ہے، اس کی غذا سے اس کو محروم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا حصہ تو بظاہر فربہ اور خوش منظر دکھائی دینے لگا مگر دوسرا حصہ جو اصل انسان ہے وہ طرح طرح کے عوارض میں مبتلا ہو گیا۔

موجودہ امریکہ کے بارے میں وہاں کے ذمہ دار ذرائع کا اندازہ ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اسی فی صد مریض ایسے ہیں جن کی علالت بنیادی طور پر نفسیاتی سبب (PSYCHIC CAUSATION) کے تحت واقع ہوتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان بیماریوں کے پیدا ہونے کے چند اہم ترین وجوہ یہ ہیں ——— جرم، ناراضگی، اندیشہ، پریشانی، مایوسی، تذبذب، حسد، خود غرضی اور اکتاہٹ (BOREDOM) یہ سارے عوارض، اگر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو زندگی کا نتیجہ ہیں۔ خدا پر ایمان آدمی کے اندر وہ اعتماد پیدا کر دیتا ہے جو مشکلات میں اس کے لئے سہارا بنتا ہے۔ بلند تر مقصد اس کے سامنے رکھ دیتا ہے جس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز

کرکے اس کی طرف بڑھ سکے، وہ اس کو ایسا محرک دیتا ہے جو سارے اخلاقی محاسن کی واحد بنیاد ہے وہ عقیدے کی وہ طاقت دیتا ہے جس کے متعلق ڈاکٹر سر ولیم اوسلر (SIR WILLIAM OSLER) نے کہا ہے "وہ ایک عظیم قوت محرکہ (GREAT MOVING FORCE) ہے جس کو نہ کسی ترازو میں تولا جا سکتا ہے اور نہ لیبوریٹری میں اسکی آزمائش کی جا سکتی ہے"

یہی عقیدے کی طاقت دراصل نفسیاتی صحت کا خزانہ ہے جو نفسیات اس سرچشمہ سے محروم ہو وہ "بیماریوں" کے سوا کسی اور انجام سے دوچار نہیں ہو سکتی۔ یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وقت کے ماہرین نے نفسیاتی یا اعصابی عوارض کا کھوج لگانے میں تو کمال درجہ کی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ مگر ان نو دریافت بیماریوں کا صحیح علاج تجویز کرنے میں وہ سخت ناکام ہوئے ہیں۔ ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں "نفسیاتی علاج کے ماہرین (PSYCHIATRISTS) صرف اس تالے کی باریک تفصیلات بتانے میں اپنی کوشش صرف کر رہے ہیں جو ہمارے اوپر صحت کے دروازے بند کرنے والا ہے"

جدید معاشرہ بیک وقت دو متضاد عمل کر رہا ہے۔ ایک طرف وہ مادی ساز و سامان فراہم کرنے میں پوری قوت صرف کر رہا ہے۔ دوسری طرف مذہب کو ترک کر کے وہ حالات پیدا کر رہا ہے جس سے زندگی طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائے۔ وہ ایک طرف دوا کھلا رہا ہے اور دوسری جانب زہر کا انجکشن دے رہا ہے۔ یہاں میں ایک امریکی ڈاکٹر (PAUL ERNEST ADOLFH) کا ایک اقتباس نقل کروں گا جو اس سلسلے میں ایک دلچسپ شہادت فراہم کرتا ہے:

"جن دنوں میں میڈیکل اسکول میں زیر تعلیم تھا، میں ان تبدیلیوں سے آگاہ ہوا جو زخم ہو جانے کی صورت میں جسم کے اخلاط (BODY TISSUES) میں رونما ہوتی ہیں۔ خوردبین کے ذریعہ نسیجوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نسیجوں پر مختلف موافق اثرات کے واقع ہونے سے زخم کا اطمینان بخش اندمال ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جب تعلیم ختم کر کے میں عملاً ڈاکٹری کے پیشہ میں داخل ہوا تو مجھے اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا کہ میں زخم اور اس کے اندمال کے طریقوں کو اس حد تک جانتا ہوں کہ میں یقینی طور پر موافق نتیجہ پیدا کر سکتا ہوں جب کہ میں اس کے ضروری طبی وسائل مہیا کر کے اس کو استعمال میں لاؤں۔ لیکن جلد ہی میری اس خود اعتمادی کو صدمہ پہنچا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنی میڈیکل سائنس میں ایک ایسے عنصر کو نظر انداز کر دیا تھا جو سب سے زیادہ اہم ہے ——— یعنی خدا۔

ہسپتال میں جن مریضوں کی نگرانی میرے سپرد کی گئی ان میں ایک ستر سال کی بوڑھی عورت تھی جس کا کولھا زخمی ہو گیا تھا۔ ایکسرے تصاویر کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ اس کی نسیجیں (TISSUES) بڑی تیزی سے ٹھیک ہو رہی ہیں۔ میں نے اس سرعت کے ساتھ شفایابی پر اس کو مبارک باد پیش کی۔ انچارج سرجن نے مجھے ہدایت کی کہ اس خاتون کو چوبیس گھنٹے میں رخصت کر دیا جائے۔ کیوں کہ اب وہ کسی سہارے کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہے۔

اتوار کا دن تھا۔ اس کی بیٹی ہفتہ وار ملاقات کے معمول کے مطابق اسے دیکھنے آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ چونکہ اس کی ماں اب صحت یاب ہے، اس لئے وہ کل آکر اسے ہسپتال سے گھر لے جائے۔ لڑکی اس کے جواب میں کچھ نہیں بولی اور سیدھی اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس نے اپنے شوہر سے اس کے بارے میں مشورہ کیا ہے اور یہ طے ہوا ہے کہ وہ اسکو اپنے گھر نہ لے جا سکیں گے۔ اس کے لئے زیادہ بہتر انتظام کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی دار الضعفاء (OLD PEOPLE'S HOME) میں پہونچا دیا جائے۔

چند گھنٹوں کے بعد جب میں اس بڑھیا کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ بڑی تیزی کے ساتھ اس پر جسمانی انحطاط طاری ہو رہا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ مر گئی ــــ کولھے کے زخم کی وجہ سے نہیں بلکہ دل کے صدمہ کی وجہ سے۔

NOT OF HER BROKEN HIP BUT OF A BROKEN HEART

ہم نے ہر قسم کی ممکن طبی امداد پہونچائی مگر وہ جاں بر نہ ہو سکی۔ اس کے کولھے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی تو بالکل درست ہو چکی تھی مگر اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی علاج نہ تھا۔ وٹامن، معدنیات اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ لانے کے لئے سارے ذرائع استعمال کرنے کے باوجود وہ صحت یاب نہیں ہوئی۔ یقینی طور پر اس کی ہڈیاں جڑ چکی تھیں۔ اور وہ ایک مضبوط کولھے کی مالک ہو چکی تھی، مگر وہ بچ نہ سکی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کی صحت کے لئے اہم ترین عنصر جس کا ہونا ضروری تھا وہ وٹامن نہیں تھا، نہ معدنیات تھے اور نہ ہڈیوں کا جڑنا تھا، وہ صرف امنگ (HOPE) تھی۔ اور جب زندگی کی امنگ ختم ہو گئی تو صحت بھی رخصت ہو گئی۔

اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ کیوں کہ اس کے ساتھ مجھ پر یہ شدید احساس تھا کہ اس بوڑھی خاتون کے ساتھ ہرگز یہ حادثہ پیش نہ آتا اگر یہ خاتون خدائے امید (GOD OF HOPE) سے آشنا

ہوتی جس پر ایک عیسائی کی حیثیت سے میں اعتقاد رکھتا ہوں۔"

THE EVIDENCE OF GOD PP. 212-14

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید ترقی یافتہ دنیا کس قسم کے تضاد سے دوچار ہے ایک طرف وہ سارے علوم کو اس نہج پر ترقی دے رہا ہے جس سے خدا کا وجود حرف غلط ثابت ہو جائے، تعلیم و تربیت کے پورے نظام کو اس ڈھنگ سے چلایا جا رہا ہے جس سے خدا اور مذہب کے احساسات دلوں سے رخصت ہو جائیں، اس طرح روح — اصل انسان — کو موت کے خطرے میں مبتلا کر کے اس کے جسم — مادی وجود — کو ترقی دینے کی سعی کی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ بہترین ماہرین اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہوتے ہیں، عقیدے کی اندرونی طاقت کی محرومی کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور بظاہر جسمانی صحت کے باوجود وہ موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔

یہی وہ تضاد ہے جس نے آج پوری انسانیت کو تباہ کر رکھا ہے، خوش پوش جسم حقیقی سکون سے محروم ہیں، عالی شان عمارتیں اجڑے ہوئے دلوں کا مسکن ہیں، جگمگاتے ہوئے شہر جرائم اور مصائب کا مرکز ہیں، شاندار حکومتیں اندرونی سازش اور بے اعتمادی کا شکار ہیں، بڑے بڑے منصوبے کردار کی خامی کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں، غرض مادی ترقیات کے باوجود زندگی بالکل اجڑ گئی ہے۔ اور یہ سب نتیجہ ہے صرف ایک چیز کا کہ — انسان نے اپنے خدا کو چھوڑ دیا، اس نے اس سرچشمہ سے اپنے آپ کو محروم کر لیا جو اس کے خالق و مالک نے اس کے لئے مہیا کیا تھا۔

نفسیاتی امراض کی نوعیت جو اوپر بیان کی گئی، وہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ خود اس فن کے علماء نے اس کا اعتراف کیا ہے، نفسیات کے مشہور عالم پروفیسر ینگ (C. G. JUNG) نے اپنی زندگی بھر کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"پچھلے تیس برسوں میں، روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلے میں مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے .... میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہونچنے والے تمام لوگ — جو کہ ۳۵ سال کے بعد کہی جا سکتی ہے — کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیہ میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھو دی تھی جو کہ موجود

مذاہب ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں۔ اور ان رقیبوں میں سے کوئی بھی حقیقۃً اس وقت تک شفایاب نہ ہو سکا جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پالیا۔" ؎

یہ الفاظ اگرچہ سمجھنے والے کیلئے بجائے خود بالکل واضح ہیں۔ تاہم اگر میں نیویارک اکیڈمی آف سائنس کے صدر اے۔ کریسی ماریسن کے الفاظ نقل کر دوں تو بات بالکل مکمل ہو جائے گی:

مراد ب واحترام، ریاضی، کردار کی بلندی، اخلاق، اعلیٰ خیالات اور وہ سب کچھ جس کو خدائی صفات (DIVINE ATTRIBUTES) کہا جا سکتا ہے، وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہو سکتی جو کہ دراصل خود بینی کی عجیب و غریب قسم ہے جس میں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھا لیتا ہے۔ عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہو جائے گی نظم، بے نظمی میں تبدیل ہو جائے گا ضبط نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں"

(MAN DOES NOT STAND ALONE)
P. 123

؎ Quoted by C.A. Coulson,
Science and Christian Belief, P.110

بعض اصحابِ قبور کا تکلم

محمد منظور نعمانی

کئی مہینے سے الفرقان میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات شائع ہو رہے ہیں، اس سلسلہ کی بعض قسطوں میں چند واقعات ایسے بھی مذکور ہوئے ہیں جن میں بعض خواص اصحاب قبور سے شاہ صاحبؒ کے مکالمات کا ذکر ہے۔ ناظرین الفرقان میں سے بعض حضرات نے ان واقعات سے اپنے سخت توحش و اضطراب کا اظہار کیا ہے۔ لیکن انھوں نے وضاحت کے ساتھ اس کا سبب نہیں لکھا ہے ــــ ہم نے بہتر سمجھا کہ اس بارہ میں الفرقان ہی میں کچھ لکھ دیا جائے تاکہ اگر کسی اور کو بھی اس طرح کا خلجان ہو تو وہ بھی رفع ہو جائے۔

جو حضرات حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی شخصیت اور اُن کے علو مقام سے واقف ہیں اُن کی خدمت میں تو سب سے پہلی بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ یہ سب واقعات حضرت شاہ ولی اللہؒ کی "انفاس العارفین" سے ماخوذ ہیں یعنی ان کے اصل راوی حضرت شاہ ولی اللہؒ ہیں۔ اور انھوں نے بلا واسطہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سے سن کر یہ واقعات اپنی کتاب میں محفوظ کیے ہیں ــــ اس لیے جہاں تک ان کی نقل و روایت کا تعلق ہے اس میں کسی شک و شبہ یا کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے بعد گزارش ہے کہ ان واقعات کے بارہ میں ذہنی خلجان اور توحش کی وجہ ایک تو یہ ہو سکتی ہے کہ اصحاب قبور سے اس طرح کے مکالمے کی کوئی مثال اور سند قرآن مجید

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ہمیں نہیں ملتی — یہ بات بلاشبہ صحیح ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ کوئی آیت یا حدیث ایسی بھی ہمارے علم میں نہیں ہے جس سے اس کی قطعاً نفی ہوتی ہو — (اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى "۔ اور — وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ" کے بارہ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اہلِ علم کی نظر میں ہوگا اور یہاں دونوں آیتوں کا سیاق و سباق خود ہی ان کے معنی متعین کر دیتا ہے۔ تفصیل تفاسیر میں دیکھی جا سکتی ہے) بہرکیف صورتِ حال یہ ہے کہ شریعت کے اصل ماخذ قرآن و حدیث اس بارہ میں ساکت ہیں۔ اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ جو بات قرآن و حدیث میں بیان نہ کی گئی ہو وہ لازمی طور پر قابلِ انکار ہی ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک حقیقت بجائے خود صحیح ہو اور وہ خواص اُمت کے تجربہ اور ادراک میں آئے اور قرآن و حدیث میں اس کو اس لیے بیان نہ فرمایا گیا ہو کہ امت کے عوام اور جمہور کے لحاظ سے وہ نازک اور دقیق ہو اور اس سے اُن کے لیے کسی ابتلاء کا خطرہ ہو یا اس طرح کی کسی اور مصلحت سے اس کو قرآن و حدیث میں بیان نہ فرمایا گیا ہو۔ — خود حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں حقیقتِ رُوح پر کلام کرتے ہوئے اس نکتہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

ولیس کل ما سکت عنہ الشرع لا یمکن معرفتہ البتۃ بل کثیراً ما یسکت عنہ لاجل انہ معرفۃ دقیقۃ لا یصلح لتعاطیہا جمہور الامۃ وان امکن لبعضہم۔

(حجۃ اللہ ص ۱۰ / ج ۱)

اور یہ بات نہیں ہے کہ شریعت میں جس چیز کے بیان سے سکوت کیا گیا ہو اس کی معرفت اور اس کا ادراک کسی کے لیے ممکن ہی نہ ہو بلکہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ کسی حقیقت کو شریعت میں اس لیے بیان نہیں کیا جاتا کہ وہ ایک دقیق اونا نک حقیقت ہوتی ہے جس کے لین دین (افادہ و استفادہ) کی صلاحیت جمہور امت میں نہیں ہوتی (اگرچہ خواص میں اس کی اہلیت ہوتی ہو اور وہ اس سے مستفید ہو سکتے ہیں)

صوفیار کرام کے بہت سے معارف اور بہت سے تجربے اسی قبیل سے ہیں۔ ہاں اگر خدانخواستہ ان میں سے کوئی ایسی بات کہے اور ایسی معرفت یا واردات بیان کرے جو قرآن وحدیث اور اُصولِ شریعت کے خلاف ہو تو بلاشبہ اس کا رد و انکار واجب ہوگا، لیکن اگر وہ بات ایسی ہے کہ قرآن وحدیث اس سے صرف ساکت ہیں تو پھر اس کے انکار وابطال پر زور دینا غلو ہوگا — زیادہ سے زیادہ یہ کہ دوسرے لوگ اس کے تسلیم کرنے کے مکلف نہ ہوں گے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم رحؒ کے حالات میں بعض خواص اصحاب قبور سے مکالمہ، یا بیداری میں حضرت سعدی علیہ الرحمہ سے ملاقات، یا منطق الطیر کے ادراک وغیرہ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں اُن سب کی نوعیت دراصل یہی ہے۔ اس لیے صرف اس بنا پر ان کا انکار اور ان سے توحش صحیح نہیں کہ قرآن وحدیث میں ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اموات کے مکالمے سے انکار کی ایک علمی وجہ خاص کر احناف کے لیے یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ بات اچھی خاصی شہرت پاگئی ہے کہ حنفیہ سماعِ موتیٰ کے قائل نہیں ہیں، اور ظاہر ہے کہ اموات سے مکالمے کا اس وقت تک تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ ان کے لیے سماع بلکہ مزید برآں تکلم بھی نہ تسلیم کرلیا جائے۔

اس بارہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جن حنفی علماء ومصنفین نے سماعِ موتیٰ سے انکار کیا ہے ان کو بھی سماع سے مطلق انکار نہیں ہے بلکہ وہ اس میں استثنا کے قائل ہیں، مثلاً وہ مانتے ہیں کہ جب کوئی زائر قبر پر سلام کرتا ہے تو صاحبِ قبر اس کا سلام سنتا ہے اور اس کا جواب بھی دیتا ہے، اسی طرح احادیثِ نبویہ کی روشنی میں انھوں نے اور بھی بعض استثناءات کیے ہیں — لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ شہرت ہی ایک غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ائمہ حنفیہ سماعِ موتیٰ کے منکر ہیں — محققین علماءِ احناف نے دعویٰ کیا ہے کہ فقہ حنفی کے ائمہ واساطین میں سے کسی سے بھی یہ انکار ثابت نہیں ہے [1] — امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحؒ کے

---

(۱) اس موقع پر یہ عاجز اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہے کہ اب سے ۲۲-۲۳ سال پہلے الفرقان کے پہلے یا دوسرے سال کے کسی شمارہ میں سماعِ اموات کے بارہ میں اس عاجز نے بھی وہی لکھا تھا جس کی نسبت حنفیہ کی طرف مشہور ہوگئی ہے۔ یعنی سماعِ موتیٰ کا انکار، بعد میں وہ معلوم ہوا جو "فیض الباری" سے یہاں نقل کیا جارہا ہے۔ اور اب یہ عاجز اسی کو تحقیقی بات سمجھتا ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یہدی السبیل۔

امالی "فیض الباری علی صحیح بخاری" میں ہے۔

وفی رسالۃ غیر مطبوعۃ لعلی القاری ان احداً من ائمتنا لم یذھب الی انکارھا (ای انکار مسئلۃ سماع الاموات) وانما استنبطوھا من مسئلۃ فی باب الایمان ... الخ
ص ۲۹۶ / ج ۲

(ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک غیر مطبوعہ رسالہ میں ہے کہ سماع موتیٰ سے انکار ائمہ حنفیہ میں سے کسی کا بھی مسلک نہیں ہے بلکہ بعض مصنفین نے باب الایمان کے ایک جزئی مسئلہ سے ایسا سمجھا ہے، اور یہ استنباط اس وجہ سے صحیح نہیں ہے۔ الخ)

اس کے بعد صاحب فتح القدیر ابن ہمام کے رویہ پر گفتگو فرمانے کے بعد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اقول، والاحادیث فی سمع الاموات قد بلغت مبلغ التواتر۔

(اور میں کہتا ہوں کہ مسئلہ سماع موتی کے بارہ میں حدیثیں تو اتر کی حد تک پہونچی ہوئی ہیں۔ (اس لیے اس کے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے)

اسی طرح فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں ہے

ان سماع الموتیٰ ثابت فی الجملۃ بالاحادیث الکثیرۃ الصحیحۃ
(فتح الملہم ص ۴۷۹ / ج ۲)

بلاشبہ اموات کا فی الجملہ سماع بہت سی صحیح احادیث سے پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے۔

نیز فتح الملہم میں اس موقع پر علامہ آلوسی البغدادی حنفی کا کلام نقل کیا گیا ہے جس سے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ خاص کر اس شبہ کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ قبر میں تو صرف بے جان اور بے روح لاشہ دفن ہوتا ہے اور وہ بھی عام طور سے زیادہ مدت تک صحیح سلامت نہیں رہتا اس سے سماع کا کیا امکان ہے — ذیل میں علامہ آلوسی کے اس کلام کا صرف حاصل اور خلاصہ درج کیا جاتا ہے — فرماتے ہیں

حق یہ ہے کہ اموات کے لیے سماع فی الجملہ ثابت ہے اور اس کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اپنی خاص قدرت سے جسم میت کے کسی حصہ میں (جو قبر میں مدفون ہے) سننے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ زائرین کا سلام اور اس کے علاوہ جو بھی اللہ تعالیٰ اس کو سنوانا چاہتا ہے سنتا ہے، اور یہ بات کہ وہ میت پچاسوں من مٹی کے نیچے مدفون ہے (اور آواز پہونچنے کے لیے کوئی منفذ بھی نہیں ہے) اور اس کا جسمانی نظام ختم ہو چکا ہے اور اس کے جوڑ بند الگ الگ ہو چکے ہیں اس سماع میں مانع نہیں ہوتی (کیونکہ اس سماع بعد الموت کا قانون حیاتِ دنیا کے سماع کے قانون سے مختلف ہے)

دوسری توجیہ اموات کے سماع کی یہ ہو سکتی ہے کہ سماع براہِ راست میت کی رُوح کو ہوتا ہے اور میت کے جسم اور اس کے کسی عضو کا اصالۃً اس سماع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، لیکن چونکہ میت کے بدن یا اس کے کسی خاص جزء کے ساتھ اسکی رُوح کا کسی قسم کا تعلق ضرور رہتا ہے جو نوعیت میں حیات دنیا والے جسم و رُوح کے تعلق سے مختلف ہوتا ہے اور اس کی حقیقت اور نوعیت بس اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس لیے جب کوئی آدمی صاحبِ قبر کی زیارت کو آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے تو اس کی رُوح کو اس وقت سننے کی صلاحیت بخش دیتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ میت کی رُوح ہر آواز اور ہر بات سُن سکے، اسلئے اموات کا یہ سماع اور اسی طرح ان کے دوسرے احساسات و ادراکات بھی (اس نظامِ عالم کے ماوراء) اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہیں —— (آگے علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ) یہی دوسری توجیہ میرے نزدیک راجح ہے۔

(فتح الملہم)

اسی مسئلہ سماع موتیٰ کے بارہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ایک تحقیق بھی ان کے ایک مکتوب کے حوالہ سے فتح الملہم کی اسی بحث میں نقل کی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مُردوں کا زندوں کی کوئی بات سننا اس طرح نہیں ہے جس طرح ایک زندہ آدمی

دوسرے زندہ آدمی کی بات اسباب ظاہرہ عادیہ طبعیہ کے تحت سنتا ہے اور نہ ہم زندوں کو اسکی قدرت ہے کہ اپنی جو بات چاہیں دوسرے عالم میں پہونچ جانے والے کسی مردہ کو سنا سکیں بلکہ اللہ ہی کو یہ قدرت ہے کہ زندوں کی جو بات وہ مردوں کو سنانا چاہے بطور خرق عادت کے ان کو سنوادے یا اس کے لیے ایسے اسباب خفیہ کا ایک سلسلہ پیدا فرمادے جن کو ہم نہیں جانتے۔ پھر وہ مردے زندوں کی بات زندوں کی طرح سنیں یا زندوں سے بھی زیادہ سنیں ——— (اس وضاحت کے بعد مولانا نانوتوی فرماتے ہیں) غالباً اسی نکتہ کی وجہ سے قرآن مجید میں بندوں سے اسماع یعنی سنوانے کی نفی کی گئی ہو (یعنی فرمایا گیا ہے کہ اے نبی آپ قبروں میں دفن شدہ مردوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے) مردوں کے سننے کی نفی صراحت کے ساتھ کہیں نہیں فرمائی گئی۔

(فتح الملہم)

امید ہے کہ اکابر علماء احناف کی ان توضیحات اور تصریحات سے مسئلہ سماع موتیٰ کے بارہ میں ان کا مسلک معلوم ہونے کے علاوہ بہت سے وہ اشکالات بھی حل ہو جائیں گے جو مسئلہ کی صحیح نوعیت سامنے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور پھر اس مسئلہ کی بنیاد پر اموات سے مکالمہ کے بارہ میں جو اشکال پیدا ہوتا ہے وہ بھی رفع ہو جائے گا ———

اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی مشیت سے خرق عادت کے طور پر زندوں کی بات مردے سُن سکتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کی بات زندے بھی سُن سکتے ہیں، ان دونوں باتوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ فیض الباری میں امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے اسی سماع موتیٰ کی بحث میں نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا

ان مسئلة كلام الميت وسماعه واحدة	میت کا کسی زندہ سے بات کرنا یا کسی زندہ کی بات سننا دونوں مسئلے ایک ہی ہیں۔

فیض الباری ص ۴۶۸ ج ۲

آخر میں ہم شیخ ابن القیمؒ کی بے نظیر تصنیف "کتاب الروح" سے چند اقتباس نقل کرتے ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ ان سے اصل زیر بحث مسئلہ پر اچھی روشنی پڑے گی۔

افتتاحی خطبہ کے بعد کتاب کا آغاز اس سوال سے ہوتا ہے کہ ۔" جو زندہ لوگ مردوں کی زیارت کو آتے اور سلام کرتے ہیں مردوں کو ان کے آنے اور سلام کرنے کی خبر ہوتی ہے یا نہیں اور وہ ان کو پہچانتے ہیں یا نہیں ؟

شیخ ابن القیمؒ نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے اور اس کے ثبوت میں پہلے چند حدیثوں کا حوالہ دیا ہے جن میں بتایا گیا ہو کہ جب کوئی شخص کسی قبر پر جا کر سلام کرتا ہے تو مردہ سلام سنتا ہے، جواب دیتا ہے اور پہچانتا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

والسلف مجمعون علیٰ ھٰذا وقد تواترت الآثار عنھم بان المیت یعرف زیارۃ الحیّ ویستبشر بہ	اور سلف کا اس پر اجماع ہے اور اس بارہ میں ان کے آثار حد تواتر کو پہونچے ہوئے ہیں کہ میت کو زندوں کی زیارت کی خبر ہوتی ہے اور ان کو اس سے مسرت اور خوشی ہوتی ہے۔

صـ

اس کے بعد ابن ابی الدنیا کی تخریج سے متعدد حدیثیں اور متعدد آثار و واقعات اسکے ثبوت میں نقل کیے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

ویکفی فی ھٰذا تسمیۃ المسلّم علیھم زائراً ولولا انھم یشعرون بہ لما صح تسمیتہ زائراً فان المزور ان لم یعلم بزیارۃ من زارہ لم یصح ان یقال زارہ ھٰذا ھو المعقول من الزیارۃ عند جمیع الأمم وکذلك السلام علیھم ایضاً فان السلام علیٰ من لا یشعر ولا یعلم بالمسلّم محال وقد علّم النبی صلّی اللہ	اور قبر پر سلام کرنے والے کو عرف شریعت میں زائر (یعنی ملاقات کرنے والا) کہا جانا بجائے خود اس کا کافی ثبوت ہے۔ اور اگر ایسی بات ہوتی کہ قبر والوں کو اس سلام کرنے والے زائر کی خبر ہی نہ ہوتی تو اس کو زائر (ملاقات کرنے والا) کہنا ہرگز صحیح نہ ہوتا، کیونکہ جب صورت ایسی ہو کہ ملاقات کرنے والے کے آنے کی خبر بھی اس کو نہ ہو جس سے ملاقات کے لیے وہ آیا ہے تو یہ کہنا قطعاً صحیح

علیہ وآلہ وسلم امتہ اذا زاروا القبور ان یقولوا السلام علیکم اھل الدیار من المومنین والمسلمین وانا انشاء اللہ بکم لاحقون یرحم اللہ المستقدمین منا ومنکم والمتاخرین نسأل اللہ لنا ولکم العافیۃ وھذا السلام والخطاب والنداء لموجود یسمع ویخاطب ویعقل ویرد وان لم یسمع المسلم الرد

صلا

نہ ہوگا کہ اس نے اس کی زیارت یعنی اس سے ملاقات کی۔ دنیا کی ساری قوموں کا یہی عرف ہو اور یہی ان کے نزدیک عقل کے مطابق ہے ــــ

اسی طرح شریعت میں اصحاب قبور کو سلام کرنے کا جو حکم ہے وہ بھی اس بات کی مستقل دلیل ہے کہ قبروں والے سلام کو سنتے سمجھتے ہیں کیونکہ کسی ایسی چیز کو جو شعور سے بالکل خالی ہو سلام کرنا اور السلام علیکم سے اس کو مخاطب کرنا بالکل خلاف عقل بات ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اسکی تعلیم دی ہو کہ جب وہ قبور کی زیارت کریں تو کہیں ــــ "السلام علیکم اھل الدیار من المومنین والمسلمین الخ" (یعنی سلام ہو تم پر ان گھروں کے رہنے والے مومنو اور مسلمو، اور ایک دن ہم بھی تم سے آملیں گے، اللہ کی رحمت ہو ہم تم میں سے آگے جانے والوں پر اور بعد میں پہونچنے والوں پر۔ ہم اپنے لیے اور تمھارے لیے اللہ سے خیر وعافیت کی دعا کرتے ہیں"

اور ظاہر ہے کہ اس طرح یہ سلام کرنا اور مخاطب کرنا اور پکارنا کسی ایسی ہستی ہی کو

ہو سکتا ہے جو سنتی ہو اور سمجھتی ہو اور لائق
خطاب ہو اور جواب دیتی ہو۔ اگرچہ سلام کرنے
والا اس کا جواب نہ سن سکے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں

واذا صلی الرجل قریباً	اور جب کوئی آدمی ان مردوں کے قریب
منہم شاہدوہ وعلموا	نماز پڑھتا ہے تو وہ اس کو دیکھتے ہیں اور
صلواتہ وغبطوہ علی	ان کو اس کی نماز کا علم ہوتا ہے۔ اور وہ
ذالك۔	اس پر رشک کرتے ہیں۔

اس کے بعد اس سلسلے کے بعض واقعات بھی نقل کیے ہیں۔ ان میں ایک واقعہ ابن ابی الدنیا کی روایت سے سند کے ساتھ یہ نقل کیا ہے کہ

"مشہور تابعی ابو قلابہ بیان کرتے ہیں کہ میں شام سے بصرہ کی طرف آیا، ایک منزل پر میں نے قیام کیا وہاں میں نے رات کو وضو کر کے دو رکعتیں پڑھیں، وہاں ایک قبر بھی تھی میں اسی پر سر رکھ کے سو گیا، پھر میری آنکھ کھل گئی تو صاحب قبر نے شکایت کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ تم نے آج رات مجھے ایذا پہونچائی (یعنی تمہارا سر رکھ کے سونا میری ایذا کا باعث ہوا) پھر اسی صاحب قبر نے کہا کہ تم زندہ لوگ عمل کرتے ہو اور (اس کے نتیجہ کا) علم تم کو نہیں ہے اور ہم مردوں کو علم ہو گیا ہے مگر افسوس ہم عمل نہیں کر سکتے۔ پھر کہا کہ جو دو رکعتیں تم نے اس وقت پڑھیں وہ دنیا ومافیہا سے بہتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ دنیا کے زندہ لوگوں کو اُن کے اعمال کی بہتر جزا دے میری طرف سے ان کو سلام پہونچا دُ ان کی دعاؤں سے ہم مردوں کو پہاڑوں کی عظیم مقدار میں انوار ملتے ہیں۔"

اس واقعہ میں صاحب قبر نے ابو قلابہ سے بیداری کی حالت میں کلام کیا ہے اور ان کے عمل پر اپنے رشک کا اظہار کیا ہے۔

شیخ ابن القیمؒ نے اس سلسلہ میں جو اور دو تین واقعات نقل کیے ہیں وہ بیداری کی

حالت کے نہیں ہیں بلکہ رویائے حق کے قبیل سے ہیں، ان میں آخری واقعہ مشہور جلیل القدر تابعی مطرف بن عبداللہ الحرشی کا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک دفعہ جمعہ کے دن میں ایک قبرستان کے پاس سے گزرا میں نے دیکھا کہ وہاں ایک جنازہ آیا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ موقع غنیمت ہے اس جنازہ میں بھی شرکت کرلوں، چنانچہ میں اس ارادے سے قبرستان میں آگیا، پھر میں لوگوں کے پاس سے ہٹ کر ایک طرف آگیا اور وہاں میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور بالارادہ ہلکی اور مختصر پڑھی اس کے بعد مجھے کچھ اونگھ سی آگئی، یہاں ایک قبر تھی، میں نے دیکھا کہ صاحب قبر مجھ سے کہہ رہا ہے تم نے یہ دو رکعتیں زیادہ اچھی طرح نہیں پڑھیں۔ میں نے کہا ہاں بے شک ایسا ہی ہوا ہے۔ اس صاحب قبر نے فرمایا" تم زندہ لوگ عمل کرتے ہو لیکن تم کو علم نہیں ہے (یعنی اعمال کے ثواب و عذاب کے بارہ میں وہ علم نہیں ہو جو مرنے کے بعد ہم کو حاصل ہو گیا ہے) اور ہمارا حال یہ ہو کہ ہم یہاں کوئی عمل نہیں کر سکتے (بس تم لوگوں پر رشک کرتے ہیں) بخدا اگر مجھے یہاں ایسی ہلکی اور مختصر ہی دو رکعتیں پڑھنے کا موقع دے دیا جائے جیسی تم نے پڑھی ہیں تو میرے لیے یہ دو رکعتیں پوری دُنیا اور اس کے سارے ساز و سامان سے بہتر ہوں گی۔ (مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں کہ) اس کے بعد میں نے اس صاحب قبر سے پوچھا کہ یہاں کس قسم کے لوگ مدفون ہیں؟ انھوں نے کہا کہ خدا کے فضل سے سب مسلمین ہیں اور سب کو اللہ تعالیٰ کا فضل نصیب ہے۔ میں نے کہا اچھا یہ بتلائیے کہ یہاں کے مدفونوں میں سب سے افضل کون ہے؟ انھوں نے ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ، میں نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ اس قبر والے اپنے بندہ کو میرے لیے باہر نکال دے تاکہ میں اس سے کچھ باتیں کرسکوں، تو اس قبر سے ایک جوان نکل کر میرے سامنے آگیا، میں نے اس سے کہا آپ یہاں والوں میں سب سے افضل ہیں؟ اُس نے کہا یہ لوگ ایسی بات کہتے ہیں، میں نے کہا اس چھوٹی سی عمر میں آپ کو یہ بلند مقام کیونکر حاصل ہوا؟ کیا حج و عمرہ اور جہاد فی سبیل اللہ اور دوسرے اعمال کی کثرت

ہے ؟ انھوں نے کہا میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے دنیوی زندگی میں مصائب اور تکالیف کا بہت سامنا ہوا اور مجھے ان پر صبر کی توفیق ملی، پس اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل و کرم اسی کا صلہ ہے "۔

شیخ ابن القیمؒ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

اگرچہ خواب کے مجرد یہ دو چار واقعے ہمارے مدعا کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہیں لیکن جب یہ بات سامنے رکھی جائے کہ اللہ کے صالح بندوں کے اس طرح کے خوابکے واقعات بے گنتی اور بے شمار ہیں (اور بطور قدر مشترک کے وہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ قبر میں مدفون مردے بھی اللہ کی مشیت سے زائرین کو جانتے پہچانتے ہیں انکی باتیں سنتے اور ان سے باتیں کرتے ہیں) تو پھر یہ خواب بھی اس حقیقت کے ثبوت کی ایک دلیل بن جاتے ہیں — (اس کی نظیر بلکہ سند یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دفعہ متعدد صحابہ کرام نے خواب دیکھا کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہے تو) حضور نے فرمایا۔

اری رویاکم قد تواطأت علیٰ انہا فی العشر الاواخر (۱)	میں دیکھتا ہوں کہ تم سب کے خواب اس پر متفق ہیں کہ شب قدر آخری دس راتوں میں سے کسی رات میں ہے تو تم اپنی راتوں میں اس کو تلاش کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب اللہ کے صاحب ایمان بندوں کے خواب کسی بات پر متفق ہو جائیں تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے کہ ان کی نقل و روایت یا ان کی آراء کا اتفاق کسی بات پر ہو جائے (یعنی جس طرح اہل ایمان کی روایات اور ان کی آراء کا اتفاق

(۱) مشکوٰۃ میں بحوالہ صحیحین حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ ان رجالا من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم اُرُوا لیلۃ القدر فی المنام فی السبع الاواخر فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اری رؤیاکم قد تواطأت فی السبع الاواخر فمن کان متحریہا فلیتحرہا فی السبع الاواخر ۱۲

ایک باوزن دلیل ہے اسی طرح ان کے خوابوں کا اتفاق بھی ایک دلیل ہے.....

علاوہ بریں ہماری دلیل صرف اس طرح کے خواب ہی نہیں ہیں بلکہ ہمارے اصل دلائل وہ روایات ہیں جن کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

(کتاب الروح ص ۱۱-۱۲)

شیخ ابن القیمؒ نے اسی سلسلہ میں عہدِ صحابہ کے بعض ایسے واقعات بھی نقل کیے ہیں جن میں ایک صحابی نے اپنی وفات کے بعد اپنے کسی زندہ ساتھی کو خواب میں کوئی اطلاع دی اور اس کی بنا پر اہم قانونی فیصلے کیے گئے۔ ان میں ایک عجیب و غریب واقعہ صعب بن جثامہ اور عوف بن مالک رضی اللہ عنہما کا ہے۔

ان دونوں کے درمیان عہد مواخات (یعنی بھائی چارہ کا معاہدہ) ہوا تھا، ان میں سے صعب بن جثامہ کا انتقال ہو گیا، عوف بن مالک نے ان کو خواب میں دیکھا تو انھوں نے (چند دوسری باتوں کے علاوہ) عوف کو یہ بھی بتایا کہ میں نے فلاں یہودی سے دس دینار قرض لیے تھے اور وہ میرے ہاں "قرن" (سینگ) میں رکھے ہوئے ہیں وہ اس یہودی کو دے دیے جائیں۔"

عوف کہتے ہیں کہ جب صبح ہوئی تو میں نے دل میں کہا کہ اس خواب میں تو بڑی تعلیم اور بڑا پیغام ہے۔ میں عوف کے گھر آیا، سب سے پہلے میں نے "قرن" اتروایا اور جو کچھ اس میں تھا اس کو نکالا تو اس میں وہ تھیلی نکلی جس میں دینار محفوظ تھے، میں وہ دینار لے کر اس یہودی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ کیا صعب پر تمہارا کچھ قرضہ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت اچھے صحابی تھے جو کچھ تھا وہ میں نے ان کو چھوڑ دیا (یعنی میرا اب کوئی مطالبہ نہیں ہے) عوف کہتے ہیں کہ میں نے اس یہودی سے کہا کہ تمھیں بتانا پڑے گا کہ تمہارا کچھ قرض تھا یا نہیں، تو اس نے کہا کہ ہاں انھوں نے دس دینار قرض لیے تھے۔ عوف کہتے ہیں میں نے وہ دینار جو قرن سے نکالے تھے وہ اس کے سامنے ڈال دیے تو اس نے دیکھ کے کہا خدا کی قسم یہ تو بعینہ میرے والے دینار ہیں۔ (کتاب الروح ص ۱۹ مختصراً و ملخصاً)

بہرحال عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے دہ دس دینار حضرت صعب کے خواب والے بیان ہی کی بنا پر اُس یہودی کو دے دیے۔ حالانکہ اس کے قرضہ کا کوئی اور قانونی ثبوت موجود نہیں تھا اور اگر صعب کے اس خواب والے بیان کو نظر انداز کر دیا جائے تو بظاہر وہ ان کے یتیم بچوں اور دوسرے شرعی وارثوں کی ملکیت تھے اور بلا ثبوت کے ایک یہودی کو اُن کا دے دینا ہرگز جائز نہیں تھا۔ لیکن عوف بن مالک اور حضرت صعب کے گھر والوں کو غالباً کچھ قرائن کی مدد سے حضرت صعب کے خواب والے بیان کا ایسا یقین ہو گیا کہ انھوں نے ان دیناروں کے یہودی کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کا ہے جس کو ابو عمرو ابن عبد البر نے سند کے ساتھ ان کی صاحبزادی کی روایت سے نقل کیا ہے۔ اس کا بھی یہاں صرف وہ حصہ درج کیا جاتا ہے جو زیر بحث موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔

ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ معرکۂ یمامہ میں شہید ہوئے (یعنی اس جنگ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدعیٔ نبوت مسیلمہ کذاب اور اس کے لشکر سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی کمان میں لڑی گئی) جس وقت وہ شہید ہوئے تو اُن کے جسم پر ایک بہت نفیس اور قیمتی زرہ تھی۔ مسلمانوں ہی کے لشکر میں کا ایک آدمی اُن کے پاس سے گزرا تو اس نے اُن کی وہ زرہ اتار کے اپنے قبضہ میں کر لی ـــ لشکر کے ایک مجاہد نے ثابت بن قیس کو خواب میں دیکھا انھوں نے فرمایا میں تمھیں ایک وصیت کرتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ تم یہ خیال کر کے کہ یہ ایک بے حقیقت خواب ہے اس کو ضائع کر دو، مجھے کہنا یہ ہے کہ میں کل شہید کر دیا گیا ہوں اور مسلمانوں ہی میں سے ایک شخص نے میری زرہ لے لی ہے اور اس کا خیمہ بالکل آخری کنارہ پر ہے اور ایک پہچان یہ ہے کہ اس کے خیمہ کے پاس ایک گھوڑا ہے جو بہت اُچھلتا کودتا ہے اس نے میری زرہ کو اس طرح چھپا لیا ہے کہ اس کے اوپر ایک بڑی ہانڈی اُلٹ دی ہے اور اس کے اوپر کجاوہ ہے، تم خالد بن ولید سے کہو کہ وہ کسی کو بھیج کر اس سے میری زرہ حاصل کریں ـــ اور جب تم مدینہ پہنچو تو خلیفۂ رسول ابوبکر صدیق سے عرض کرنا کہ مجھ پر اتنا اتنا قرض ہے، اور میرے غلاموں میں سے فلاں فلاں آزاد ہیں (یعنی میں ان کو آزاد کرتا ہوں) ـــ چنانچہ یہ صاحب جن کو ثابت بن

قیس نے خواب میں یہ وصیت کی تھی حضرت خالد کے پاس آئے اور ان سے زرہ والی بات کہی، انھوں نے آدمی بھیج کر خواب کی نشاندہی کے مطابق وہ زرہ حاصل کر لی اور جب یہ صاحب مدینہ آئے تو حضرت ابوبکر کو حضرت ثابت کا خواب والا پیغام پہونچایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی وصیت کے نفاذ کا حکم دیا"(۱)

ابوعمرو بن عبدالبر اس واقعہ کو روایت کر کے کہتے ہیں کہ ہمارے علم میں نہیں کہ ثابت بن قیس کے علاوہ کسی اور کی موت کے بعد کی وصیت نافذ کی گئی ہو۔

کتاب الروح صہ ۲۱

حضرت ثابت بن قیس اور حضرت صعب بن جثامہ کے ان دونوں واقعوں کے بارہ میں جو فقہی اور قانونی سوالات اٹھتے ہیں شیخ ابن القیم رح نے ان پر بھی بحث کی ہے اور ان سب کا بھی جواب دیا ہے لیکن وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے — ہمارا مقصد تو ان سب واقعات کے بیان نقل کرنے سے صرف یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کی مشیت سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرنے اور مدفون ہونے کے بعد اللہ کا کوئی بندہ خواب میں یا کبھی شاذ و نادر بیداری میں کسی زندہ صاحب روحانیت سے کوئی بات کہے۔ اس لیے حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نقل کیے ہوئے ان واقعات سے توحش و اضطراب کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے — یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اولیاء اللہ کے تذکروں میں تو اس طرح کے واقعات بیشمار ہیں، ہم نے یہ دو چار واقعے صحابہ اور تابعین کے صرف "کتاب الروح" سے نقل کیے ہیں، جو حضرات شیخ ابن القیم کے مسلک اور اُن کی علمی و تحقیقی خصوصیات سے واقف ہیں امید ہے کہ ان کے ذہنوں میں اگر کچھ الجھنیں اس سلسلہ میں ہوں گی تو وہ ختم ہو جائیں گی۔

اس سلسلہ میں ایک نکتہ یہ بھی قابل غور ہے کہ نیند کی حالت میں چونکہ ہمارے احساسات اور

---

(۱) اس واقعہ کو اس پوری تفصیل کے ساتھ حافظ ابن حجر نے "الاصابہ" میں طبرانی کی تخریج سے حضرت انس کی روایت سے بھی نقل کیا ہے۔ الاصابہ صہ ۲۰۳ ج ۱

ادراکات کا تعلق اس عالم سے منقطع ہوجاتا ہے اس لیے دوسرے عالم والوں سے رابطہ قائم ہونے کا اور ان کی باتیں سننے کا امکان زیادہ پیدا ہوجاتا ہے، اسی لیے خواب کے ایسے واقعات پر کسی کو بھی تعجب اور توحش نہیں ہوتا۔ پس سمجھنا چاہیے کہ بیداری کی حالت میں اس طرح کا معاملہ بالعموم ایسے ہی حضرات کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنے گرد وپیش کی دنیا سے منقطع زیادہ رہتے ہیں اور خاص کر ایسے ہی اوقات میں ہوتا ہے جبکہ وہ ہماری اس دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہوکر دوسری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں دوسرے عالم والوں سے ان کی روحانیت کا رابطہ قائم ہوجاتا ہے اور وہ خواب والوں ہی کی طرح ان کی باتیں سننے اور ان سے باتیں کرتے ہیں۔ بہرحال ان کی اس وقت کی خاص حالت اور خواب کی حالت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اسی لیے دوسرے عالم والوں کی جو بات وہ اس حالت میں سنتے ہیں اس کو ان کے برابر بیٹھا ہوا دوسرا آدمی نہیں سنتا جس طرح کہ خواب کی بات دوسرا برابر والا نہیں سنتا اور نہیں جانتا۔ امید ہے کہ اس نکتہ پر غور کرنے سے مسئلہ کی حقیقت سمجھنا اور زیادہ آسان ہوجائے گا۔

یہ مضمون لکھ کر ختم کیا جاچکا تھا اسکے بعد یاد آیا کہ عہد صحابہ میں موت کے بعد کلام کرنے کا سب سے زیادہ اہم اور مشہور و مستند واقعہ تو حضرت زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ کا ہے، یہ جلیل القدر انصاری صحابی ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ان کا وصال ہوا، حضرت نعمان بن بشیر صحابی رض راوی ہیں کہ جب ان کا جنازہ تیار کرکے رکھ دیا گیا اور نماز کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتظار ہونے لگا، تو میں نے ارادہ کیا کہ انتظار کے اس وقفہ میں دو رکعت نماز ہی پڑھ لوں، چنانچہ میں ایک طرف کھڑے ہوکر نماز پڑھنے لگا، دوسرے لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے اتنے میں جنازہ سے آواز آئی — "السلام علیکم اُنْصِتُوْا اَنْصِتُوْا (یعنی خاموش ہوکر بات سنو) اس کے بعد مرحوم حضرت زید نے ایک طویل کلام فرمایا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر و حضرت عثمان کے بارہ میں شہادت دی اور ان کے کچھ اوصاف بیان فرمائے اور آخر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارہ میں ایک پیشین گوئی فرمائی جو بعد میں بالکل حق ثابت ہوئی۔

حضرت زید بن خارجہ کے بعد الموت تکلم کا یہ واقعہ اور اُن کا وہ پورا کلام قریب قریب ان سب کتابوں میں مروی ہے جو صحابۂ کرام کے احوال میں لکھی گئی ہیں اور ائمہ حدیث و روایت نے اس کو قبول کیا ہے، امام بخاری تک نے اس کو ذکر کیا ہے کما فی الاصابہ۔

از قلب کے ہٹی

مسلم ممالک میں مغرب پسندی

(مترجمہ :- وحیدالدین خاں)

انیسویں صدی عیسوی کی صبح طلوع ہوئی تو اس وقت مسلم مشرقی ممالک میں ابھی قرون وسطیٰ کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر صدی کے خاتمہ نے دیکھا کہ وہ دور جدید کی روشن راہ پر اپنا سفر شروع کر چکے ہیں۔ یہ سفر بیسویں صدی میں مزید تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ اس زبردست تبدیلی کا سبب مغرب کے ساتھ اسلام کا تصادم ہے۔ وہ مغرب جو پوری انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ نمایاں واحد واقعہ ہے۔ معاشیات، سماجیات، سیاسیات، تعلیم، سائنس، فلسفہ روحانیات اور مذہب سے متعلق نئے تصورات اور یورپ اور امریکہ کی ٹکنالوجی کے پھیلاؤ کے نتیجہ میں ردعمل کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اب تک جاری ہے۔ اس سے اسلام کو اپنے مختلف پہلوؤں میں جن تبدیلیوں کا تجربہ ہوا، اس کی مثال ہزار برس پہلے یونانی رومی کلچر سے مقابلہ پیش آنے کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

بحر روم کے مشرقی ساحل پر جو تصادم ہوا وہ اصلی طوفان کی محض ایک ہلکی سی لہر تھی جس نے پورے کرہ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے نتیجے میں مسلم مشرقی دنیا میں جو جدت پسندی پیدا ہوئی وہ اس عمل کا صرف ایک حصہ تھی جس نے پورے مشرق کو جدت پسند بنا دیا۔ جدت پسندی (MODERNIZATION) ان معنوں میں کہ ان تصورات اور طریقوں کو اختیار کیا جائے جو عصر حاضر کے نزدیک قابل قبول ہیں، یہ اصلاً مغرب پسندی (WESTERNIZATION) کے ہم معنی تھی۔

اس تاثر کا سب سے زیادہ بڑھا ہوا اظہار عثمانی ترکوں میں ہوا جنھوں نے مصطفیٰ کمال کی قیادت میں ماضی سے حتی الامکان پوری طرح کٹ کر مغربی اقدار اور طور طریقوں کو لینے کی کوشش کی

اور لباس سے رسم الخط تک سب کچھ بدل ڈالا۔ اس کے بعد ترکی لیڈر کے نقش قدم پر دوسرے چلنے والے ایران کے رضا شاہ پہلوی تھے، جنکی کوششیں زیادہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ عرب جو اسلام کا مقدس وطن ہے، وہ اپنے قدیم طریقہ پر قائم رہنے پر مُصر رہا اور خارجی اثرات کے مقابلہ میں تنہا جزیرہ بنا رہا۔ عرب کے دوسرے سرحدی ممالک اور مصر نے درمیانی راستہ اختیار کیا جو درحقیقت سخت دشوار تھا۔ اور وہ یہ کہ جدید تصورات کا اسلام سے تقابل کیا جائے۔ اور پھر دیکھا جائے کہ نئے ذخیرہ میں سے کیا کچھ لینے کے قابل ہے اور کن معاملات میں قدیم ہی کی پیروی کرنی ہے اور ان دونوں کو کیسے ملایا جا سکتا ہے۔ عرب سرزمین میں لبنان نے سب زیادہ آمادگیٔ قلب کے ساتھ اس کو قبول کر لیا۔ اس نے مغربی راستوں سے بہہ کر آنے والے ثمرات پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے فرزندوں کو خاص طور پر امریکہ بھیجنا شروع کیا۔ جس کے بعد مطبوعات، مراسلات اور آمد و رفت کے ذریعہ جدت پسندی کی لہر لبنان میں بہت تیز ہو گئی۔ مزید یہ کہ عربی پریس کا گہوارہ اور اعلیٰ درجہ کی مغربی یونیورسٹیوں کا مقام ہونے کی وجہ سے لبنان آس پاس کے علاقوں کے لئے ذہنی رہنمائی کا مرکز بن گیا۔ اس کے باشندوں نے محض مال تجارت کے ایجنٹ ہی کا کام نہیں کیا بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان نظریات کے درآمد و برآمد کی خدمت بھی انجام دی۔

عرب، جہاں ماضی کا پنجہ سب سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ ترقیات کو روکے ہوئے تھا، وہاں ابتداءً اقتصادیات کی راہ سے جدت پسندی داخل ہونا شروع ہوئی۔ یہ اقتصادی عامل خاص طور پر تیل کی دریافت اور اس کا استعمال تھا، جو ۱۹۳۰ء میں امریکہ اور برطانیہ کے ذریعہ وقوع میں آیا۔ جہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا، وہاں جدید ترین آرائش کی تمام چیزیں پہونچنے لگیں پختہ سڑکیں، ریلوے، بندرگاہ اور ہوائی اڈے بننا شروع ہوئے۔ مقامی باشندوں کو تربیت دیکر انھیں جدید اسامیوں پر رکھا گیا۔ بحرین، کویت اور قطر کے شیوخ نے راتوں رات اونٹوں کی سواری چھوڑ کر کیڈلاک کاروں کی سواری اختیار کر لی۔ اور خیموں کے بجائے ایرکنڈیشنڈ محلوں میں رہنے لگے۔ سعودی شہزادے ذاتی ہوائی جہازوں کے ذریعہ یورپ اور امریکہ کے شہروں کی سیاحت کرنے لگے۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ ہو گیا جو ان کے امکانی خرچ سے بھی زیادہ تھا۔ عرب سوسائٹی کی یہ تبدیلیاں ایسی تھیں جہاں الف لیلہ کے داستان گویوں کی خیالی پرواز بھی نہیں جا سکتی اور

نہ سماجیات کا کوئی عالم اس کے نتائج کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتا تھا۔ مشرق قریب میں پٹرول کے جو ذخائر ہیں ان کے متعلق ماہرین کا عام اندازہ ۸۵ ابلین بیرل ہے جو موجودہ پیداوار کے لحاظ سے اتنا ہے کہ ایک سو برس تک اس کی سپلائی جاری رہ سکتی ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء تک تین سو بلین بیرل تیل نکالا جا چکا ہوگا جو موجودہ نرخ اور موجودہ معاہدوں کے مطابق اس علاقے کو رائلٹی، ٹیکس اور منافع حصص کی صورت میں دو سو بلین ڈالر دے گا۔

اسلامی کلچر میں مغربیت

جدید اثرات سے جو چیز سب سے پہلے متاثر ہوئی وہ اسلامی کلچر ہے۔ مغربی کلچر کے جو اجزا بظاہر موافق اور مفید معلوم ہوئے، پہلے ان کو اختیار کیا گیا۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز آتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری چیزیں بھی آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ بے ضرر چیزوں سے آغاز ہو کر نوبت ان چیزوں تک پہونچتی ہے جو پہلے مضر سمجھی گئی تھیں۔ اس طرح اقتصادی اور تکنیکل تبدیلیاں بالآخر سماجی تبدیلیوں تک جا پہونچتی ہیں۔ سماجی اقتصادی تبدیلیاں سیاسی تبدیلیوں تک ممتد ہوتی ہیں۔ ان کا مجموعی اثر ذہن کو بدلنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ روحانی اور مذہبی چیزیں بھی بدل جاتی ہیں۔

کلچر میں تبدیلی عموماً معاشی اسباب سے پیدا ہوتی ہے۔ قدیم روایتی زراعت کے طریقوں کے بجائے جدید ترقی یافتہ ٹریکٹر کا استعمال، زمین کو زرخیز بنانے کے لئے جدید کیمیائی کھاد اور جراثیم کو مارنے کے لئے جدید دوائیں کوئی سنگین جذباتی کش مکش پیدا نہیں کرتیں۔ یہ اگرچہ صدیوں کی پڑی ہوئی عادتوں کو بار معلوم ہوتی ہیں مگر ان کا معاملہ نسبتاً آسان ہے۔ انیسویں صدی کے عرب کسان جن کی کھیتی اب تک محض گذر بسر کا ذریعہ تھی، اب رفتہ رفتہ اپنی خاندانی ضرورت سے زیادہ پیدا کرنے لگے اور پبلک مارکٹ میں سپلائی کرنے کے قابل ہو گئے۔ اسی طرح ملکی صنعت میں قدیم اوزاروں کی ترقی یا ان کی جگہ نئے درآمد شدہ اوزاروں کا استعمال اپنے اندر کوئی جذباتی پہلو نہیں رکھتا۔ ریلوے، تار، ٹیلی فون جب رائج ہوئے تو وہ اونٹ اور خچر اور ہرکارہ کے ذریعہ رسل و رسائل کے مقابلہ میں عام طور پر پسند کئے گئے۔ ان اقتصادی تبدیلیوں نے تاجروں کو یہ موقع دیا کہ قریبی سطح سے گذر کر شہری یا ملکی پیمانے کی سطح پر تعلقات قائم کریں۔ دیہاتوں سے

شہروں کی طرف آبادیوں کا ناگزیر انتقال شروع ہوا اور جاری رہا۔

زیادہ تکلیف دہ چیز سماجی ڈھانچہ کی تبدیلی تھی۔ یہاں زیادہ گہری وفاداریاں اور پُر فخر روایتی قدریں موجود تھیں۔ تاہم مشترک خاندان جو بائبل کے زمانے سے رائج تھا اور جس میں باپ، خاندان کا بزرگ شمار ہوتا تھا، وہ شہر میں منتقل ہونے والوں کے درمیان آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی شکل اختیار کرنے لگا اور اس طرح مغربی طرز کے آزاد خاندان وجود میں آنے لگے۔ یہ تمام تبدیلیاں ذہنی تطبیق (INTELLECTUAL ADJUSTMENT) کے طریقوں کی متقاضی تھیں۔ تعلیمی ادارے اب قانون داں، طبیعیات داں، معلم اور دوسرے پیشہ ور اور ذہنی لیڈروں کی ایک نئی قسم پیدا کرنے لگے جو مسلم سوسائٹی کے دو طبقات کا مجموعہ تھے۔ یہ ابھرنے والا درمیانی طبقہ سماج، مالیات اور سیاست پر قابض ہونے لگا۔

مغرب کے عطیات میں سب سے اہم چیز جدید طرز کی تعلیم تھی۔ تعلیم کا تعلق ذہن سے ہے اور ذہن ہی سے تمام تبدیلیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جب انیسویں صدی کے بعد بیسویں صدی آئی اس وقت مسلم تعلیمی ادارے ابھی قدیم روایتی انداز کے تھے جو کہ جامد تمدن کے آئینہ دار تھے۔ علم کا حصول محض معلومات کا ڈھیر جمع کرنے پر تمام ہو جاتا تھا۔ اس کی تحقیق نہیں ہوتی تھی کہ کیا چیز حقیقت ہے۔ گویا کہ کائنات محض ایک جامد چیز تھی۔ طالبانِ علم کا کام ہر جگہ معلمین اور کتب نصاب، سے ملنے والی چیز کو لے لینا تھا اور بس۔ علم کی تلاش معلم اور متعلم کی کوئی مشترکہ جد و جہد نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یادداشت پر انحصار تھا۔ تحقیق، تجربہ اور تنقید کے الفاظ لغت سے خارج تھے۔ حافظہ کی طاقت بہت ترقی پر تھی۔ مگر تحقیق کا تصور نا پید تھا۔

اٹھارویں صدی میں بھی، چودھویں صدی کی طرح، ذہنی سرگرمیاں کلاسیکل ادب، زبان اور دینیات پر مرکوز تھیں۔ ادبیات میں جدت کا کوئی عنصر نہ تھا۔ ادبی معیار پچھلی صدیوں سے بھی زیادہ گرا ہوا تھا۔ نظم و نثر میں مضمون سے زیادہ طرزِ ادا پر زور دیا جاتا تھا۔ سائنس، مذہبی روایات، علم نجوم، کیمیا، جادو اور قدیم یونانی سائنس کا ایک عجیب و غریب مجموعہ تھی۔

انیسویں صدی میں تصویر بدل گئی۔ ۱۸۲۸ء یا اس کے لگ بھگ محمد علی (شاہ مصر) نے ایک فرانسیسی ڈاکٹر کو بلایا کہ وہ قاہرہ کے باہر ایک طبی اسکول کی نظامت سنبھالے جو ابو قصر (یعنی

کے نام سے مشہور ہے اور جو اس علاقہ میں اپنی نوعیت کا پہلا اسکول تھا۔ یہ اب بھی اپنے اسپتال کے ساتھ اس علاقے کا سب سے بڑا طبی ادارہ ہے۔ محمد علی نے ایک مصری کو بھی پہلی بار فرانس بھیجا جس کا نام رفاعہ الطہطاوی تھا جو ۱۸۳۱ء میں قاہرہ واپس آیا اور طب اور انجینئرنگ کی درسی کتابوں کے ترجمہ کا کام سنبھالا۔

یہاں جدید تعلیم ابتداً فرانس، برطانیہ اور امریکہ کی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنریوں کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھی۔ کیتھولک نے اس کام کو سب سے پہلے شروع کیا مگر بہت نچلے تعلیمی معیار سے اور ان کا حلقہ بھی بنیادی طور پر عیسائی اقلیت کا گروہ تھا۔ پروٹسٹنٹ نے اس راہ کو ان کے بعد اختیار کیا، مگر انھوں نے بہت جلد اپنی تعلیم کو سکولر شکل دیدی۔ اور اس طرح زیادہ سے زیادہ مسلم طلبہ ان کی طرف کھنچنے لگے۔ مغرب میں تعلیم پائے ہوئے عیسائی تمام سماج کو ایک نئی نسل میں تبدیل کرنے لگے نیز انھوں نے مقامی تعلیمی اداروں کو بھی متاثر کیا کہ وہ مغربی طرز اختیار کریں۔

علاقے کے امریکی اداروں کی رہنمائی رابرٹ کالج قسطنطنیہ (۱۸۶۳) اور شامی پروٹسٹنٹ کالج بیروت (۱۸۶۶) کرتا تھا۔ دونوں مسیحی مشنریوں کے ادارے تھے۔ رابرٹ کالج نے انجینئرنگ میں نمایاں امتیاز پیدا کیا۔ شامی پروٹسٹنٹ کالج نے امریکن یونیورسٹی بیروت میں تبدیل ہو کر نرسنگ، پبلک ہیلتھ، انجینئرنگ اور زراعت کے اسکول کھولے۔ یہ امریکہ کے باہر اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ کا سب سے بڑا اور موثر ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ علاقے کے اکثر فکری اور عملی رہنما اسی کے تعلیم یافتہ گریجویٹ ہیں۔ بعد کے تعلیمی اداروں میں قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی کو شمار کیا جا سکتا ہے جو کہ ۱۹۲۱ء تک مشرقیات کے مطالعہ کا نمایاں ترین ادارہ رہا ہے۔

اسلام بحیثیت ریاست

اب سیاسی نظام کی اور ہالنگ کا راستہ صاف تھا۔ وقت کی تمام نام نہاد مسلم ریاستوں (سعودی عرب، یمن اور افغانستان کو چھوڑ کر) نے حکمرانی کے جدید طریقوں کو اپنا لیا۔ کیبنٹ، پارلیمنٹ اور الکشن ان کے یہاں نظر آنے لگے۔ مزید انھوں نے دیوانی، مالی اور فوجداری قوانین مغربی نوٹ کے مطابق بنا لئے۔ ان میں سے بعض اب بھی اپنے دستور میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ "ان کی ریاست

ایک اسلامی ریاست ہے"۔ جیسے پاکستان۔ یا بعض کا دعویٰ ہے کہ اسلام ان کی انتظامیہ کا بنیادی جز ہے۔ مگر یہ محض ایک زبانی بات (LIP SERVICE) ہے۔ کیونکہ ایک حقیقی مسلم ریاست میں شریعت کی بالاتری ناقابل چیلنج ہوتی ہے۔

مغرب سے جو محرک قوتیں آئیں ان میں نیشنلزم، جس کے ساتھ حکومت خود اختیاری کا تصور لازمی طور پر شامل تھا، بلاشبہ سب سے زیادہ ہیجان خیز تھا۔ نیشنلزم اپنے جدید لباس میں گویا انسان کے "انا" کا اجتماعی سطح پر ظہور ہے۔ نیشنلزم اس مفہوم میں کہ ایک خطہ زمین کے ساتھ ایسی وفاداری جو تمام دوسری وفاداریوں حتیٰ کہ مذہب سے بھی بالاتر ہو، یہ اسلام کے لئے نہ صرف نئی بلکہ اس کے نظریہ سے ٹکرانے والی تھی۔ ملک کی محبت، جیسا کہ اب تک معلوم تھی۔ اپنے اندر کوئی سیاسی یا فوجی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ نیشنلزم بعد کو سیکولر تحریک بن گئی جو جغرافیائی دائروں میں محدود اور معاشی قدروں کی تابع تھی۔ اس کے برعکس اسلام کسی جغرافی حد بندی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی قدریں بنیادی طور پر روحانی ہیں، اور وہ صرف اسی کی وفاداری کا قائل ہے۔ ایک عربی مسلمان ساری دنیا کے ہم عقیدہ مسلمان سوسائٹی کا شہری ہے۔ اس کا آئیڈیل اتحاد اسلام (PAN - ISLAM) ہے نہ کہ اتحاد عرب (PAN - ARABISM)۔ الازہر کے شیوخ اور نجف اور کربلا کے مجتہد اب بھی اسلام ہی کی وفاداری کے قائل ہیں۔ یہی حال مسلم عوام کا ہے ——— صرف وہ سیاسی اور فکری رہنما جو مغربی طرز پر تعلیم پائے ہوئے ہیں، وہی جدید قومیت کی صحیح روح کے حامل ہیں۔ مگر وہ عرب نیشنلزم اور مسلم نیشنلزم کے درمیان گارڈ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

یہ مخصوص طور پر لبنان اور شام کے عیسائی ہیں، جنھوں نے اس مغربی نیشنلزم کو عرب ممالک تک پہونچایا ہے۔ ان کے شاعر اور صحافی جو برطانوی مصر میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے نسبتاً زیادہ آزاد تھے، انھوں نے وہ چنگاری روشن کی جس نے قومیت کی آگ بھڑکائی۔ اس کے نئے تصورات مثلاً حب الوطنی، قوم، مادر وطن، انسانی حقوق وغیرہ کے لئے انھوں نے نئی اصطلاحیں وضع کیں یا قدیم الفاظ میں سے کسی کو رائج کیا۔ عثمانی جوئے سے نجات پانے کے لئے جدوجہد نے جدید نیشنلزم کی پیدائش کے لئے حالات مہیا کئے ——— عرب نیشنلزم کا مقصد بلا امتیاز مذہب، عربی بولنے والے لوگوں کو زبان اور کلچر کی عام سطح پر متحد کرنا تھا جو اپنی قدیم تہذیب کی عظمت اور قدیم تاریخ سے

ذہنی غذا حاصل کرتی ہو۔ عرب اتحاد کی یہ کمزور ابھرتی ہوئی تحریک مقامی دشواریوں اور علاقائی مسائل سے متصادم ہوکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور مصری، لبنانی، شامی یا عراقی قومیت میں بٹ گئی۔ مگر دوبارہ اتحاد کا جذبہ جنگ عظیم ثانی اور اسرائیل بننے کے بعد ابھر آیا۔ اس طرح ابتدائی عرب نیشنلزم جو عثمانی سلطنت کے خلاف جدوجہد سے پروان چڑھی تھی، بالآخر برطانوی اور فرانسیسی تسلط کے خلاف صف آرا ہوگئی۔ اس کے بعد اس کو پنپنے اور ارتقا کرنے کے لئے جدوجہد کا وہ میدان ملا جس کو فلسطین میں صیہونی جارحیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلام بحیثیت مذہب

اسلام کے مذہبی حصے کی باری سب سے بعد میں آئی۔ مندرجہ بالا تبدیلیاں بلاشبہ اسلام کے طریق زندگی سے انحراف کے بغیر نہیں آسکتی تھیں۔ مگر یہ تبدیلیاں بنیادی طور پر مذہب کی بیرونی سطح سے متعلق تھیں۔ اسلام کا مغز ـــــ دینیات اور قانون شریعت ـــــ اس کے بعد بھی کچھ دنوں تک محفوظ رہا۔

ان دونوں میں شریعت سب سے پہلے زد میں آئی۔ شریعت کو قرآن میں خدا کا کلام قرار دیا گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں نظم حکومت کی واحد بنیاد تھی اور عرب میں وہی مختلف فرقوں کے درمیان وجہ اتحاد رہی ہے۔ اس لئے شریعت پر براہ راست حملہ مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ اس پر اطراف سے حملے شروع ہوئے۔ نئی تعبیر کرنے والے اور اصلاح کے علمبردار اور بالآخر متجددین (MODERNIZERS) نے بہت ہوشیاری کے ساتھ اس کے اجزاء پر ادھر ادھر سے اعتراضات کرنا شروع کئے۔ وہ حدیثیں جو موضوع ہونے کے باوجود مجموعۂ احادیث میں شامل ہوگئی ہیں اور اجماع ان دو چیزوں نے ان کو مقصد برآری کا اچھا موقع دے دیا۔ اور کسی مرکزی اور متفقہ مستند ترجمان نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اعتراضات کا موثر توڑ بھی نہ کیا جا سکا۔ ان مسلم ماڈرنسٹوں کا طریقہ وہی تھا جو بیشتر عیسائیوں کا طریقہ تھا ـــــ قدیم متن میں نئے خیالات کو پڑھنا، عبارتوں کو ان کے سیاق وسباق سے الگ کر کے ان کا مفہوم بیان کرنا۔ یہ معلمین ایران کے جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ – ۱۸۹۷) اور مصر کے محمد عبدہ (۱۸۴۹ – ۱۹۰۵) کی قیادت میں کام کر رہے تھے۔

ان کا طریقہ یہ تھا کہ بات کو اس مقدمہ سے شروع کرکے کہ جدید سائنس اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں. اسلامی تعلیمات کی عقلی توجیہات کی جائیں. مگر ان کے پرجوش مقلدین مضحکہ خیز انتہا تک پہونچ گئے. مثلاً تعدد ازدواج کے متعلق قرآنی حکم (۴-۳) کے متعلق ان کا استدلال تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ "لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو" اب چونکہ کوئی شخص زیادہ بیویوں سے یکساں برتاؤ نہیں کر سکتا اس لئے قرآن کے حکم کے مطابق صحیح شادی صرف ایک ہی ہو سکتی ہے. سود کے خلاف حکم (۴: ۱۵۹-۱۵۷) جو کہ سرمایہ کاری اور بینکنگ کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے، اس کی تشریح یہ کی گئی کہ وہ صرف بڑھتے ہوئے سود کے بارے میں ہے. خدا کا فرشتوں سے یہ کہنا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں (انسان)" ۲: ۲۸ نظریہ ارتقاء کی تصدیق کرنے والا بن گیا. قرآن کے "جن" وہی چیز ہیں جن کو آج ہم خوردبینی جرثومہ (MICROBES) کہتے ہیں." حجارۃ من سجیل" جن کو چڑیوں کے غول (۵:۱۰۵-۱) نے مکہ کے باہر حبشہ کی فوج پر برسایا. وہ چیچک کی وبا کا پھوٹ پڑنا تھا. یہی طریقہ اس سے بہت پہلے مسیحی شارحین نے اختیار کیا تھا. انھوں نے کہا کہ کتاب مقدس کا یہ بیان (15-36-37) کہ آشوری فوج جس نے یہود پر حملہ کیا تھا اس کو خدا کے فرشتہ نے برباد کردیا، وہ دراصل طاعون کی وبا تھی. اور یہ کہ بائبل کی کتاب پیدائش میں تخلیق کے دن سے مراد ایک ارضیاتی دور (GEOLOGIC ERA) ہے[1]. متحدہ عرب جمہوریہ (U.A.R) کے وکیل جو کہ سوشلسٹ قانون سازی کے مدعی ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ اس قسم کی قانون سازی قرآنی تعلیمات کے مطابق ہے. وہ اور ان کے سعودی اور یمنی مخالفین دونوں کو یکساں طور پر اپنے اپنے دعوے کے لئے قرآن سے دلائل مل گئے.

ماڈرنزم اور سکولرزم کی اس مسلسل یوچھار کے بعد شریعت نے ذاتی زندگی (PERSONAL STATUS)

---

[1] تخلیق کے ایک دن کو ایک ارضیاتی دور سے تعبیر کرنا ہمارے نزدیک صحیح ہے. اس لئے یہ بقیہ مثالوں کی فہرست میں نہیں آتی. اس کی تصدیق قرآن سے بھی ہوتی ہے. کیونکہ قرآن میں خدا کے دن کو انسانی دنوں کے اعتبار سے ہزار سال کے برابر کہا گیا ہے. اور عربی استعمالات کے اعتبار سے یہ ہزار سال بھی صرف زیادتی کے مفہوم میں ہے نہ کہ بالکل حسابی قسم کا ہزار سال (مترجم)

کے محدود دائرہ میں اپنی آخری جائے پناہ بنائی۔ یعنی شادی، طلاق، وراثت اور ان سے متعلق مسائل جو کہ مذہبی عدالتوں میں فقہا کے ذریعہ فیصل ہوتے تھے۔ ترکی پہلا ملک تھا جس نے اس طرح کی مذہبی عدالتوں کو ختم کیا۔ مذہبی عدالتوں کے خاتمہ کے ساتھ تعدادِ ازدواج کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ٹیونس کی نئی سلطنت نے حبیب بورقیبہ کی قیادت میں ۱۹۵۶ء میں اس کی پیروی کی۔ مگر رمضان میں مہینہ بھر کے روزہ کو ختم کرنے کے سلسلہ میں اس کی کوشش ناکام ہوگئی۔ مصر نے ۱۹۵۹ء میں ایک کم تر درجہ کا انقلابی قدم اٹھایا جبکہ اس نے مذہبی عدالتوں کو ختم کردیا، اور یہ حکم دیا کہ تمام مقدمات عام ملکی عدالتوں میں سول ججوں کے سامنے پیش ہوں گے۔ البتہ ذاتی نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ مذہبی قانون کے مطابق کیا جائے گا۔

لادینیت (SECULARIZATION)

فکری سطح پر ماڈرنزیشن آدمی کو سیکولرزم تک پہونچاتا ہے۔ سیکولرزم صرف چرچ اور ریاست کی علیحدگی سے کچھ زیادہ معنی رکھتا ہے۔ تاریخی سرگزشتوں اور حال کے واقعات کی تعبیر میں جو مقام خدا کا رہا ہے، وہاں وہ انسان کو لاکر بٹھا دیتا ہے اور ایسی عقلی تعبیر کرتا ہے جس کی بنیاد طبیعیاتی اور نفسیاتی قوتوں پر ہوتی ہے۔ کسی عربی اخبار کی کوئی تازہ اشاعت مشکل سے خدا کے نام کے ذکر سے خالی ہوتی ہے۔ مگر اس ذکر کا تعلق پیدائش اور موت، بیماری اور صحت، خوش قسمتی اور بدبختی ناکامی اور کامیابی وغیرہ چیزوں سے ہوتا ہے۔ یہ گویا گزرے ہوئے فکر کے باقیات ہیں۔ ماڈرنزم کے ذریعہ تباہ شدہ اسلام میں اب صرف اس کے بنیادی عقائد (BASIC DOGMAS) باقی رہ گئے ہیں۔ خدا ایک ہے، محمد خدا کے رسول ہیں، قرآن خدا کی کتاب ہے، بعض اعمال گناہ ہوتے ہیں، انسان کے اندر ایک دائمی روح ہے، ایک انصاف کا دن ہے جبکہ اچھے کو اچھا اور برے کو برا بدلہ ملے گا۔ یہ ہے تجدد پسندوں کا اسلام اور ایک ماڈرن کرسچین کو یہ تمام عقائد چند تحفظات کے ساتھ، قابل قبول ہوں گے۔ آغاز میں ایک وقت تھا جب اسلام، عیسائیت کا ایک فرقہ معلوم ہوتا تھا۔ بعد کی تاریخ میں بعض اقتصادی، فوجی اور سیاسی اسباب سے دونوں میں اجنبیت پیدا ہوگئی۔ مگر جب دونوں قرون وسطیٰ کی اختلافی چیزوں سے اپنے کو پاک کر رہے ہیں اور ماضی کے فسادات بھلائے جا رہے ہیں، دونوں دوبارہ ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ عیسائیت اور اسلام دونوں بہرحال ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ مستقبل میں یہ حقیقت زیادہ واضح ہوتی جائے گی کہ وہ چیزیں جنہیں دونوں کو اتفاق ہے، اس سے زیادہ ہیں جنہیں دونوں اختلاف رکھتے ہیں۔

(اسلام اینڈ دی ویسٹ)

استدراک

از مترجم

ڈاکٹر ہٹی کے جس مضمون کا ترجمہ پچھلے صفحہ میں ختم ہوا ہے ہمارا خیال ہے کہ جہاں تک واقعات کے بیان کا سوال ہے اس میں کوئی غلط بیانی نہیں کی گئی ہے یا کم از کم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، مگر مضمون کے بالکل آخری پیرے میں جب ان کے قلم پر وہ الفاظ آئے جن میں اسلام کی کچھ تشریح کی گئی ہے تو بات غلط ہو گئی اور وہ الفاظ لکھ گئے جو اسلام سے فکری مطابقت نہیں رکھتے ۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں سماجی موضوعات کا مطالعہ جس ڈھنگ سے کیا گیا ہے اس نے مذہب کو مانتے ہوئے اس کی شکل بالکل بدل دی ہے۔ موجودہ دور کے جدید مستشرقین اگرچہ قدیم مستشرقین کے ڈھنگ کی غلط بیانی اور سب و شتم نہیں کرتے۔ مگر ان کے ذہن چونکہ عام طور پر اسی جدید تصور مذہب کے مطابق ہیں اسلئے غلط بیانی نہ کرنے کے باوجود مذہب کے بارہ میں انکی تشریح فکری طور پر غلط ہو جاتی ہے۔ گویا مستشرقین کا جو فتنہ پہلے زیادہ تر تاریخ کے میدان میں تھا وہ اب فکر کے میدان میں آگیا ہے اس طرح ظاہری تبدیلی کے باوجود حقیقی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس جدید تصور مذہب کے مطابق مذہب ایک شخصی تجربہ یا سماجی عمل ہے اور اس کا سرچشمہ الہام ربانی نہیں بلکہ وہ روایات ہیں جو اس مذہب کے ماضی اور اس کے حال میں پائی جاتی ہوں۔ اسی بنیاد پر عیسائیت کو یہودیت سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے۔ اور اسلام کو عیسائیت اور یہودیت دونوں سے۔ اس ذہن یا اسی تصور مذہب کا نتیجہ ہے کہ مصنف کو اسلام عیسائیت کا ایک فرقہ معلوم ہوتا ہے، بلا شبہ یہ بات صحیح ہے کہ اسلام کی بہت سی باتیں عیسائیت سے ملتی جلتی ہیں۔ مگر اس اشتراک کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسلام عیسائیت سے ماخوذ ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یعنی الہام ربانی۔ اس فرق کے ساتھ کہ خدائی الہام، عیسائیت میں نامکمل شکل میں ہے اور اسلام میں کامل اور محفوظ شکل میں۔ اس دعوے پر بہت سی دلیلیں قائم کی جاسکتی ہیں۔ یہاں میں صرف دو باتوں کا ذکر کرتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ کہ دین محمدی کا عیسائیت سے ماخوذ ہونا اسی وقت ثابت ہوگا جب یہ بھی ثابت

کیا جا سکے کہ وہ کون سے ذریعے تھے جن سے عیسائی تعلیمات داعیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آئیں۔ اس سلسلہ میں جدید علماء نے بہت سی شخصیتوں کے نام دئے ہیں جن سے قیاساً آپؐ کو عیسائی تعلیمات کا علم ہوا تھا مگر ابھی تک علمی معیار پر اس دعوے کو ثابت نہیں کیا جا سکا ہے چنانچہ خود بعض عیسائی علماء نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اگرچہ ہمارے پاس بہت سے نام ہیں جنکے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جن سے نبی عربیؐ کو عیسائیت کی تعلیمات کا علم ہوا تھا۔ مگر تاریخی طور پر ہمارے پاس ایسا کوئی اطمینان بخش مواد نہیں ہے کہ ہم کہہ سکیں کہ یہ بات واقعہ کے طور پر ثابت بھی ہوگئی ہے (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس، مقالہ "قرآن")
حقیقت یہ ہے کہ اس کی بنیاد علمی دریافت سے زیادہ ایک مفروضہ پر ہے۔ اور وہ مفروضہ یہ کہ —— "ہر مذہب اپنے ماضی و حال کی روایات سے ماخوذ ہوتا ہے" اور جب ایسا ہے تو اسلام بھی ضرور کسی نہ کسی مذہب سے ماخوذ ہوگا —— اب چونکہ اسلام کی تعلیمات اور قرآن کے قصے بہت سے پہلوؤں سے بائبل کے بیانات سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے خود بخود ثابت ہوگیا کہ اسلام بائبل سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ یہ محض ایک مفروضہ ہے نہ کہ کوئی دلیل۔

دوسری بات یہ کہ اگر آپ بائبل اور قرآن کے ملتے جلتے ٹکڑوں کو لیں اور ان کا تقابلی مطالعہ کریں تو آپ پائیں گے کہ دونوں کے درمیان مماثلت کے باوجود ایک حیرت انگیز فرق ہے اور وہ فرق یہ کہ تعلیمات یا واقعات کے بیان میں بہت سے ان اجزاء کو قرآن یا تو حذف کردیتا ہے یا ان کی تصحیح کرتا ہے جو بائبل میں مذکور ہیں۔ مثلاً توحید کو شرک کی آمیزش سے پاک کرنا یا رسالت کو الوھیت سے الگ کرکے پیش کرنا۔ یا اسی طرح نبیوں کے واقعات میں کثرت سے ایسے اجزاء کو نکال دینا یا اس کی تردید کرنا جن سے بائبل کی تصویر کے مطابق ان مقدس ہستیوں کی زندگی داغدار معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اگر اسلام فی الواقع عیسائیت یا یہودیت سے ماخوذ ہے تو اس کو بائبل کے الفاظ کو جوں کا توں لے لینا چاہیئے تھا کیونکہ جیسا کہ بجا طور پر مشہور ہے، نقل را چہ عقل۔ مگر اس قسم کا اختلاف بتاتا ہے کہ قرآن بائبل کی نقل یا اس کا اعادہ نہیں ہے۔ بلکہ کسی دوسرے ماخذ سے آیا ہے جو اپنے علم کے مطابق واقعات کی تصحیح و تردید کر سکتا ہے۔

دوسری بات جو مصنف نے لکھی ہے وہ یہ کہ "بعد کی تاریخ میں بعض اقتصادی، فوجی

اور سیاسی اسباب سے دونوں میں اجنبیت اور آویزش پیدا ہوگئی۔ اس بیان میں آویزش کی حد تک تو بات مطابق واقعہ ہے مگر اس کی وجہ جو مصنف نے بیان کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان آویزش کو مادی اسباب کا نتیجہ سمجھنا بھی دراصل جدید طریق مطالعہ کی ایک غلطی ہے۔ جدید علماء نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سماج کے اندر جو بھی واقعہ پیش آتا ہے اس کے کچھ نہ کچھ مادی اسباب ہوتے ہیں۔ اس تصور کے مطابق اسلام اور عیسائیت کی آویزش کا بھی کوئی نہ کوئی مادی سبب ہونا چاہیئے۔ حالانکہ یہ بھی محض ایک مفروضہ ہے نہ کہ علمی طور پر کوئی ثابت شدہ چیز

اسلام اور عیسائیت کے درمیان آویزش کی اصل وجہ مذہبی ہے اور وہ بھی ایسی جس کی ذمہ داری عیسائی حضرات پر ہے نہ کہ اسلام پر۔ اللہ تعالیٰ نے بعثت رسالت کا جو نظام دنیا میں قائم فرمایا تھا، اس کے مطابق اللہ کے علم میں تھا کہ بالآخر ایک آخری رسول بھیجا جائے گا، جو ہمیشہ کے لیے دین کو مکمل اور محفوظ شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دے گا۔ چنانچہ بائبل کے تمام انبیاء کے ذریعہ اس کی خبر دی گئی اور بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس کی کھلی کھلی پیشین گوئیاں کیں اور یہ تاکید کی کہ جب وہ نبی آئے تو اس پر ایمان لے آنا۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں اس آخری رسول کی بعثت ہوئی۔ بائبل میں آخری رسول کی جو نشانیاں دی گئی تھیں ان کے مطابق آپ کا فرستادۂ رسول ہوتا اور "وہ نبی" ہونا جس کی پیشین گوئیوں سے ان کے کان معمور تھے، اتنا واضح تھا کہ انھوں نے آخری رسول کو اس طرح پہچان لیا جس طرح کوئی شخص اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے عناد کی وجہ سے آپ کی نبوت کو تسلیم نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ عرب کے مشرکین کے ساتھ مل کر آپ کو اور آپ کی دعوت کو ختم کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔

اس طرح دونوں گروہوں کے درمیان آویزش شروع ہوئی جس کی پہل کرنے والے خود عیسائی اور یہودی تھے۔ اور جب آویزش شروع ہو گئی تو فطری طور پر وہ اپنے آخری مقام کو بھی پہونچی یعنی اللہ تعالیٰ نے یہودیت اور عیسائیت کو زیر کر کے ان کے اوپر اسلام کا اقتدار قائم کر دیا۔

Alfurqan (Regd. N. L 353) Lucknow.

Printed at A.O. Press Aminabad Park, Lucknow

سنہ آغاز
۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

ظور نعمانی

Price 00-65 Paisa

اردو کے اسلامی لٹریچر میں

دینی روح اور عملی افادات سے بھرپور ایک

یعنی اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب

[illegible]

زمانہ کی نفسیات کا لحاظ — ہر سطح کے فہم و فکر کی رعایت — اور حدیث کی اصل مقصدیت پر زور

اور تشریحات کے علاوہ ہر باب کے شروع کے تمہیدی نوٹ، شریعت کے نظام حکمت کے

"ما قل و دل" کی ایک مثال کہے جا سکتے ہیں

تالیف

مولانا محمد منظور نعمانی

جلد اول — ایمان اور آخرت ...

جلد دوم — ...

جلد سوم — طہارت ...

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۷/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

فی کاپی .... ۶۵ پیسے

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا

جلد ۳۴	بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۶ء	شمارہ ۶

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ ہر اکتوبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاک خانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

گزشتہ مہینے میں پاکستان سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے دو کتابچوں کی یکے بعد دیگرے ضبطی کی خبریں آئی ہیں۔ ان کتابچوں کا تعلق برتھ کنٹرول (ضبطِ ولادت) کے موضوع سے تھا۔ اور مصنف نے اسلامی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کو رد کرتے ہوئے، مختلف پہلوؤں سے اس کی قباحتوں کو نمایاں کیا تھا۔ پاکستان کی موجودہ حکومت برتھ کنٹرول کو ملک کی ترقی اور معاشی استحکام کے لیے ضروری قرار دیتی ہے اور اس معاملے میں رائے عامہ ہموار کرنے کو اس نے قریب قریب وہی درجہ دے رکھا ہے جو پاکستان کے دفاع کے لیے فراہمیٔ اسلحہ کی جدوجہد کو۔ یہ بات اُن لوگوں پر صاف ظاہر ہے جو پاکستانی اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضبطیاں بھی "قانونِ دفاعِ پاکستان" کے تحت ہوئی ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ اطلاع بھی آگئی ہے کہ جماعتِ اسلامی پاکستان کے ایک ذمہ دار نے ان کتابچوں کے ناشر کی حیثیت سے مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں اس کارروائی کو چیلنج کیا ہے۔ اس کا جو بھی کچھ نتیجہ ہو۔ لیکن پاکستان گورنمنٹ کا یہ اقدام بہرحال قابلِ بحث ہے اور ہم اسلامی خیر خواہی کے جذبہ سے یہاں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور بھارتی ہند کے چھ کروڑ مسلمان آج تک اُس حصّے کی قیمت ادا کرنے سے فارغ نہیں ہوئے ہیں جو تقسیم کے نتیجہ میں پاکستانی مسلمانوں نے پایا ہے۔ یہ قیمت کس قدر غیر منصفانہ طریقہ پر مسلمانانِ ہند کو ادا کرنا پڑ رہی ہے، اہلِ پاکستان اس سے ناواقف نہیں ہیں۔ بلکہ وہ دور ہونے کی وجہ سے کسی قدر جذباتی مبالغے ہی کے ساتھ اس کا اندازہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ مسلمانانِ ہند کافی صبر و تسکین کا پہلو پا سکتے تھے اگر وہ یہ دیکھتے کہ جس نام پر وہ طرح طرح کی ناانصافیوں کا شکار بنائے جا رہے ہیں پاکستان واقعی اس نام کا حق ادا کر رہا ہے اور اُس اسلام کا وہاں حقیقۃً بول بالا ہے جس کو بالا کرنے کے غیر واقعی الزام میں

بھی اگر کوئی مسلمان پکڑا جائے تو یہ اس کی سعادت ہے اور مغفرت کا سرمایۂ آخرت! مگر یہ مسلمان جب دیکھتے ہیں کہ یہاں تو وہ ایک اسلامی ملک بنانے کے ذمہ دار ٹھہرائے جا کر اپنے وطنی حقوق سے محروم کیے جا رہے ہیں اور اُس ملک میں لوگ اس آزادی سے بھی محروم ہیں کہ حکومتِ وقت کے نظریات کے مقابلے میں اسلامی نظریات کی اشاعت کر سکیں، تو وہ ایک "دوگونہ عذاب" کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

برتھ کنٹرول (بطور ایک عوامی تحریک) کی حمایت میں، حکومتِ پاکستان کے زیرِ سرپرستی چلنے والے تصنیف و تالیف کے کئی اداروں نے بہت کافی لٹریچر پاکستان کی سابق حکومتوں کے دور سے کر اب تک تیار کیا ہے اور اس کا اکثر حصہ ہمارے مطالعہ سے گزرا ہے۔ لیکن یہ لٹریچر اس بات کو ثابت کرنے میں قطعی ناکام ہے کہ برتھ کنٹرول کی تحریک کتاب و سنت کے خلاف نہیں۔ آج کی پاکستانی حکومت، جو اس تحریک کے معاملے میں پہلے کی تمام حکومتوں سے زیادہ سنجیدہ نظر آتی ہے اگر یہ سمجھتی ہے کہ اس تحریک کے حامی لٹریچر نے اس تحریک کا دینی جواز فراہم کر دیا ہے تب بھی وہ مخالف نظریہ کو کم از کم "اسلام کے خلاف" تو نہیں کہہ سکتی! پھر اس کی اشاعت پر قانونی بندش کا حق اُسے کیسے ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ڈرنے کی بات نہیں ہے کہ دینی مسائل میں ایک مخالف رائے جسے خلافِ حق قرار نہ دیا جا سکتا ہو اُس کے اظہار پر ایک مسلمان حکمراں کی طرف سے پابندی عائد کر دی جائے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ وہی رائے زیادہ صحیح ہو! لیکن اگر یہ پوزیشن بھی نہ ہو اور اربابِ حکومت اس بارے میں خود مطمئن نہ ہوں کہ ان کے نظریہ کی تائید کتاب و سنت سے ملتی ہے تب تو یہ بہت ہی ڈرنے کی بات ہے کہ مخالف آواز کو حکمرانی کے زور سے روکا جائے۔ اور یہ اس ملک میں کیا جائے جو دُنیا کے تبکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا" کی طرح "پہلا وہ ملک" کہلایا جاتا ہو جو "اسلام کے لیے وجود میں آیا"! ــ کاش حکومتِ پاکستان کے ذمہ دار سوچیں کہ وہ کسقدر تکلیف دہ بات کر رہے ہیں۔

پتہ نہیں عالمِ اسلام کے لیے کیا مقدر ہے کہ اسلام کو براہِ راست اربابِ حکومت کی سختیاں سب سے زیادہ ان ملکوں ہی میں سہنی پڑ رہی ہیں۔ اور اس سے زیادہ اسلام کی بات زبان سے نکالنا جتنی کہ اہلِ حکومت کو پسند ہو، بجز کمیونسٹ ملکوں کے، کہیں اور اتنی مصیبت کا کام نہیں۔ اس سلسلے میں بعض مسلم ممالک کے حکمراں تو اس حد پر پہونچ گئے ہیں کہ اُن سے کچھ بھی کہنا بے سود ہے۔ وہ تو شاید اس عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو چکے ہیں جس کی تعبیر قرآنِ مجید میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ — اور جو خلاف کرے گا رسول سے ہدایت

مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ( )

واضح ہو جانے کے بعد اور چلے گا اور مومنین سے الگ راستہ، چلائیں گے ہم اس کو جدھر وہ چلے گا اور پہونچائیں گے اس کو جہنم میں اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔

لیکن ذمہ دارانِ مملکتِ پاکستان کو خدا کے فضل سے ہم اس بُری منزل سے بہت دور سمجھتے ہیں۔ اور اسی لیے ان سے کچھ کہنا بے سود نہیں سمجھا ہے، مگر یہ منزل صرف انھیں سے دُور ہے جو اپنا احتساب بھی کر سکتے ہوں اور نصیحت سُن کر پلٹ جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ورنہ قدم اُٹھ جانے کے بعد کوئی منزل بھی دور نہیں رہتی۔

اس سلسلے میں ہم پاکستان کے مخلص علمائے دین سے بھی ایک مؤدبانہ گزارش کریں گے کہ وہ عالم اسلام کے رجحان سے سبق لیں اور جس وقت تک ذرا بھی گنجائش ہے ان واقعات پر برافروختہ ہو کر مقابل بن جانے کے بجائے حکیمانہ اور دردمندانہ موعظت سے اقتدار کا رُخ صحیح کرنے کی کوشش کریں۔ ٹکراؤ کا نتیجہ اب تک اچھا دیکھنے میں نہیں آرہا ——— یہ موضوع خود کافی تفصیل کا محتاج ہے۔ مگر یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ اور شاید اہلِ علم کے لیے اس کی ضرورت بھی نہیں۔

ضروری اِعلان

دفتر الفرقان میں یکم جون ۶۶ء کو ایک منی آرڈر الفرقان کے چندے کا وصول ہوا تھا۔ اس کا پتہ وغیرہ نوٹ نہیں کیا جا سکا جس کی وجہ سے اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی ہے۔ جن صاحب کا یہ منی آرڈر ہے وہ پرانے خریدار معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وی، پی واپس ہو جانے کا ذکر ہے۔ جن صاحب کا بھی یہ منی آرڈر ہے وہ دفتر کو مطلع فرمائیں ——— (مینیجر)

کتاب الاذکار والدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

دُعا:-

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن کمالات و امتیازات سے نوازا اُن میں سب سے بڑا امتیاز و کمال عبدیت کاملہ کا مقام ہے۔

عبدیت کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور میں انتہائی خضوع و تذلل، بندگی و سرافگندگی، اپنی عاجزی ولاچاری اور محتاجی و مسکینی کا پورا پورا اظہار، اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ سب کچھ صرف اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے اس کے در کی فقیری و گدائی ـــــ اس سب کے مجموعہ کا عنوان مقام عبدیت ہے جو تمام مقامات میں اعلیٰ و بالا ہے اور بلاشبہ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس صفت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں کامل ترین اور سب پر فائق ہیں اور اسی لیے افضلِ مخلوقات اور اشرفِ کائنات ہیں ـــــ قاعدہ ہے کہ ہر چیز اپنے مقصد کے لحاظ سے کامل یا ناقص سمجھی جاتی ہے، مثلاً گھوڑا جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے یعنی سواری اور تیز رفتاری، اس کو بڑھیا یا گھٹیا اسی مقصد کے پیمانے سے سمجھا جائے گا۔ اسی طرح گائے یا بھینس کا جو مقصد ہے یعنی دودھ کا حاصل ہونا اس کی قدر و قیمت دودھ کی کمی یا زیادتی ہی کے حساب سے لگائی جائے گی، وقس علیٰ ہذا ـــــ انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے پیدا کرنے والے نے عبدیت اور عبادت بتایا ہے (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ) اس لیے سب سے افضل و اشرف انسان وہی ہوگا۔

جو اس مقصد میں سب سے اکمل و فائق ہو، پس سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ کمال عبدیت میں سب سے فائق ہیں اس لیے آپ افضل مخلوقات اور اشرف کائنات ہیں، اور اسی وجہ سے قرآن مجید میں جہاں جہاں آپ کے بلند ترین خصائص و کمالات اور اللہ تعالیٰ کے آپ پر خاص الخاص انعامات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں معزز ترین لقب کے طور پر آپ کو عبدہی کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے، معراج کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ اسراء میں فرمایا گیا ہے "سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" پھر اسی سفر معراج کی آخری منزلوں کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ النجم میں فرمایا گیا "فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی" اور سب سے بڑی نعمت و دولت قرآن حکیم کی تنزیل کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ فرقان میں ارشاد فرمایا گیا "تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ" اور سورۂ کہف میں فرمایا گیا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَابَ"۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ بندوں کے مقامات میں سب سے بلند عبدیت کا مقام ہے اور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام کے امام یعنی اس وصفِ خاص میں سب کے فائق ہیں۔ اور دعا چونکہ عبدیت کا خاص جوہر اور خالص ترین مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت (بشرطیکہ حقیقی دعا ہو) بندہ کا ظاہر و باطن عبدیت میں ڈوبا ہوتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اوصاف میں غالب ترین وصف اور حال دعا کا ہے اور امت کو آپ کے ذریعہ روحانی دولتوں کے جو عظیم خزانے ملے ہیں اُن میں سب سے بیش قیمت خزانہ اُن دعاؤں کا ہے جو مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ سے خود آپ نے کیں یا امت کو ان کی تلقین فرمائی۔

ان میں سے کچھ دعائیں ہیں جن کا تعلق خاص حالات یا اوقات اور مخصوص مقاصد و حاجات سے ہے اور زیادہ تر وہ ہیں جن کی نوعیت عمومی ہے۔ ان دعاؤں کی قدر و قیمت اور افادیت کا ایک عام عملی پہلو تو یہ ہے کہ ان سے دعا کرنے اور اللہ سے اپنی حاجتیں مانگنے کا سلیقہ اور طریقہ معلوم ہوتا ہے اور اس باب میں وہ رہنمائی ملتی ہے جو کہیں سے نہیں مل سکتی۔ اور ایک دوسرا خاص علمی اور عرفانی پہلو یہ ہے کہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک کو اللہ تعالیٰ سے کتنی گہری اور ہمہ وقتی وابستگی تھی اور آپ کے قلب پر اس کا جلال و جمال کس قدر چھایا ہوا تھا اور اپنی اور ساری کائنات کی بےبسی ولاچاری اور اس مالک الملک کی قدرت کاملہ اور ہمہ گیر رحمت و ربوبیت پر آپ کو کس درجہ یقین تھا کہ گویا یہ آپ کے لیے غیب نہیں شہود تھا ــــ حدیث کے ذخیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سیکڑوں دعائیں محفوظ ہیں ان میں اگر تفکر کیا جائے تو کھلے طور پر محسوس ہوگا کہ ان میں سے ہر دعا معرفت الٰہی کا شاہکار اور آپ کے کمال روحانی وخدا آشنائی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ کے صدق تعلق کا مستقل برہان ہے اور اس لحاظ سے ہر ماثور دعا بجائے خود آپ کا ایک روشن معجزہ ہے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم۔

اس عاجز راقم سطور کا دستور ہے کہ جب کبھی پڑھے لکھے اور سمجھدار غیر مسلموں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کرانے کا موقع ملتا ہے تو آپ کی کچھ دعائیں ان کو ضرور سناتا ہے۔ قریب قریب سو فی صدی تجربہ ہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ آپ کی دعاؤں سے متاثر ہوتے ہیں اور آپ کے کمال خدارسی و خداشناسی میں ان کو شبہ نہیں رہتا۔

اس تمہید کے بعد پہلے چند وہ حدیثیں پڑھیے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس کی برکتیں بیان فرمائی ہیں۔ یا دعا کے آداب بتائے ہیں یا اس کے بارہ میں کچھ ہدایتیں دی ہیں۔ ان کے بعد ایک خاص ترتیب کے ساتھ وہ حدیثیں درج کی جائیں گی جن میں وہ دعائیں مذکور ہیں جو مختلف موقعوں پر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں کیں یا امت کو جن کی تلقین فرمائی۔

دعا کا مقام اور اس کی عظمت:۔

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ " وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ، اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ٥ " ــــ رواه احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجة

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " دعا عین عبادت ہے " اس کے بعد آپ نے سند کے طور پر یہ آیت پڑھی " وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي " الخ (تمھارے رب کا فرمان ہے کہ مجھ سے دُعا کرو اور مانگو، میں قبول کروں گا اور تم کو دوں گا، جو لوگ میری عبادت سے متکبرانہ روگردانی کریں گے ان کو ذلیل وخوار ہوکر جہنم میں جانا ہوگا۔)

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

(**تشریح**) اصل حدیث صرف اتنی ہے کہ آپ نے فرمایا " دعا عین عبادت ہے " غالباً حضور کے اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ بندے جس طرح اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے دوسری محنتیں اور کوششیں کرتے ہیں اسی طرح کی ایک کوشش دُعا بھی ہے جو اگر قبول ہوگئی تو بندہ کامیاب ہوگیا اور اس کو کوشش کا پھل مل گیا اور اگر قبول نہ ہوئی تو وہ کوشش بھی رائیگاں گئی، بلکہ دعا کی ایک مخصوص نوعیت ہے اور وہ یہ کہ وہ حصولِ مقصد کا وسیلہ ہونے کے علاوہ بذاتِ خود عبادت ہے۔ اور عین عبادت ہے اور اس پہلو سے وہ بندے کا ایک مقدس عمل ہے جس کا پھل اس کو آخرت میں ضرور ملے گا۔

جو آیت آپ نے سند کے طور پر تلاوت فرمائی اُس سے یہ بات صراحتہً معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا عین عبادت ہے ۔ آگے درج ہونے والی دوسری حدیث میں دعا کو عبادت کا مغز اور جوہر فرمایا گیا ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ ——————— رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دُعا عبادت کا مغز اور جوہر ہے۔ (جامع ترمذی)

(**تشریح**) عبادت کی حقیقت ہے اللہ کے حضور میں خضوع وتذلّل اور اپنی بندگی ومحتاجی کا مظاہرہ اور دعا کا جزو وکل اور اول وآخر اور ظاہر وباطن یہی ہے اس لیے دُعا بلا شبہ عبادت کا مغز اور جوہر ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ شَیْءٌ اَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَاءِ ـــــــ رواہ الترمذی و ابن ماجۃ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے یہاں کوئی چیز اور کوئی عمل دعا سے زیادہ مکرم نہیں۔

(تشریح) جب یہ معلوم ہو چکا کہ دعا عبادت کا مغز اور جوہر ہے اور عبادت ہی انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے تو یہ بات خود بخود متعین ہو گئی کہ انسانوں کے اعمال اور احوال میں دعا ہی سب سے زیادہ محترم اور قیمتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت کو کھینچنے کی سب سے زیادہ طاقت اسی میں ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ فُتِحَ لَهٗ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ وَمَا سُئِلَ اللّٰهُ شَیْئًا یَعْنِیْ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ اَنْ یُّسْاَلَ الْعَافِیَةَ ـــــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا اس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے — اور اللہ کو سوالوں اور دعاؤں میں سب سے زیادہ محبوب یہ ہے کہ بندے اس سے عافیت کی دعا کریں یعنی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ محبوب نہیں۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) عافیت کا مطلب ہے تمام دنیوی و اخروی اور ظاہری و باطنی آفات اور بلایا سے سلامتی اور تحفظ، تو جو شخص اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا مانگتا ہے وہ برملا اس بات کا اعتراف اور اظہار کرتا ہے کہ اللہ کی حفاظت اور کرم کے بغیر وہ زندہ اور سلامت بھی نہیں رہ سکتا اور کسی چھوٹی یا بڑی مصیبت اور تکلیف سے اپنے کو نہیں بچا سکتا، پس ایسی دعا اپنی کامل عاجزی و بےبسی اور سراپا محتاجی کا مظاہرہ ہے اور یہی کمالِ عبدیت ہے، اس لیے عافیت کی دعا اللہ تعالیٰ کو سب دعاؤں سے زیادہ محبوب ہے — دوسری بات حدیث میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا، یعنی جس کو دعا کی حقیقت نصیب ہو گئی اور اللہ سے مانگنا آ گیا اس کے لیے رحمتِ الٰہی کے دروازے کھل گئے۔

دعا دراصل ان دعائیہ الفاظ کا نام نہیں ہے جو زبان سے ادا ہوتے ہیں ان الفاظ کو تو زیادہ سے زیادہ دعا کا لباس یا قالب کہا جا سکتا ہے، دعا کی حقیقت انسان کے قلب اور اس کی روح کی طلب

اور تڑپ ہے اور حدیث پاک میں اس کیفیت کے نصیب ہونے ہی کو باب دعا کے کھل جانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور جب بندہ کو وہ نصیب ہو جائے تو اس کے لیے رحمت کے دروازے کھل ہی جاتے ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَّمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ ـــــــ رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ سے نہ مانگے اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) دنیا میں کوئی نہیں ہے جو سوال نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہو، ماں باپ تک کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر بچہ ہر وقت مانگے اور سوال کرے تو وہ بھی چڑ جاتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ ایسا رحیم و کریم اور بندوں پر اتنا مہربان ہے کہ جو بندہ اس سے نہ مانگے وہ اس سے ناراض ہوتا ہے اور مانگنے پر اسے پیار آتا ہے، اوپر حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ کی نگاہ میں بندہ کا سب سے محترم اور قیمتی عمل دعا اور سوال ہے ـــ لک الحمد یا رب العالمین ویا ارحم الراحمین!

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّسْأَلَ وَاَفْضَلُ الْعِبَادَةِ اِنْتِظَارُ الْفَرَجِ۔

ـــــــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اللہ سے اس کا فضل مانگو (یعنی دعا کرو کہ وہ فضل و کرم فرمائے) کیونکہ اللہ کو یہ بات محبوب ہے کہ اس کے بندے اس سے دعا کریں اور مانگیں اور فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ کے کرم سے امید رکھتے ہوئے اس بات کا انتظار کرنا کہ وہ بلا اور پریشانی کو اپنے کرم سے دور فرمائے گا، اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ کیونکہ اس میں عاجزانہ اور سائلانہ طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہے۔ (جامع ترمذی)

دعا کی مقبولیت اور نافعیت:۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الدُّعَاءَ

يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللهِ بِالدُّعَاءِ۔

—— رواہ الترمذی ورواہ احمد عن معاذ بن جبل

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! دُعا کارآمد اور نفع مند ہوتی ہے ان حوادث میں بھی جو نازل ہو چکے ہیں اور ان میں بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئے، پس اے خدا کے بندو دعا کا اہتمام کرو۔ (جامع ترمذی)

(اور امام احمد نے مسند میں اس حدیث کو بجائے حضرت عبداللہ بن عمر کے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو بلا اور مصیبت ابھی نازل نہیں ہوئی بلکہ اس کا صرف خطرہ اور اندیشہ ہو۔ اُس سے حفاظت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہیئے۔ انشاء اللہ نفع مند ہوگی اور جو بلا یا مصیبت نازل ہو چکی ہے اُس کے دفعیہ کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے۔ انشاء اللہ وہ بھی نافع ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کو دور فرما کر عافیت نصیب فرمائے گا۔

عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيمٌ يَسْتَحْيِي مِنْ عَبْدِهِ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا۔

—— رواہ الترمذی وابو داؤد

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے پروردگار میں بدرجۂ غایت حیا اور کرم کی صفت ہے جب بندہ اس کے آگے مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس کو شرم آتی ہے کہ ان کو خالی واپس کرے (کچھ نہ کچھ عطا فرمانے کا فیصلہ ضرور فرماتا ہے) (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يُنْجِيكُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَيُدِرُّ لَكُمْ أَرْزَاقَكُمْ تَدْعُونَ اللهَ فِي لَيْلِكُمْ وَنَهَارِكُمْ فَإِنَّ الدُّعَاءَ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ —— رواہ ابو یعلی فی مسندہ

حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں وہ عمل بتاؤں جو تمہارے دشمنوں سے تمہارا بچاؤ کرے اور تمہیں بھرپور روزی دلائے —— وہ یہ ہے کہ اپنے اللہ سے دعا کیا کرو رات میں اور دن میں، کیونکہ دُعا مومن کا خاص ہتھیار یعنی

اس کی خاص طاقت ہے۔ (مسند ابو یعلیٰ موصلی)

(تشریح) دعا دراصل وہی ہے جو دل کی گہرائی سے اور اس یقین کی بنیاد پر ہو کہ زمین و آسمان کے سارے خزانے صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ و اختیار میں ہیں اور وہ اپنے در کے سائلوں، مانگنے والوں کو عطا فرماتا ہے اور مجھے جب ہی ملے گا جب وہ عطا فرمائے گا۔ اس کے در کے سوا میں کہیں سے نہیں پا سکتا۔ اس یقین اور اپنی سخت محتاجی اور کامل بے بسی کے احساس سے بندے کے دل میں جو خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو قرآن مجید میں "اضطرار" سے تعبیر کیا گیا ہے وہ دعا کی روح ہے اور یہ واقعہ ہے کہ کوئی بندہ جب اس اندرونی کیفیت کے ساتھ کسی دشمن کے حملے سے یا کسی دوسری بلا اور آفت سے بچاؤ کے لیے یا وسعتِ رزق یا اس قسم کی کسی دوسری عام و خاص حاجت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو اس کریم کا عام دستور ہے کہ وہ دعا قبول فرماتا ہے اس لیے بلاشبہ دعا اُن بندوں کا بہت بڑا ہتھیار اور میگزین ہے جن کو ایمان و یقین کی دولت اور دعا کی روح و حقیقت نصیب ہو۔

وہ دُعائیں جو خصوصیت سے قبول ہوتی ہیں:-

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَعْوَۃُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ لِاَخِیْہِ بِظَہْرِ الْغَیْبِ مُسْتَجَابَۃٌ عِنْدَ رَأْسِہٖ مَلَکٌ مُوَکَّلٌ کُلَّمَا دَعَا لِاَخِیْہِ بِخَیْرٍ قَالَ الْمَلَکُ الْمُوَکَّلُ بِہٖ اٰمِیْنَ وَلَکَ بِمِثْلٍ۔

رواہ مسلم

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کی اپنے بھائی کے لیے غائبانہ دُعا قبول ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایک فرشتہ ہے جس کی یہ ڈیوٹی ہے کہ جب وہ اپنے کسی بھائی کے لیے (غائبانہ) کوئی اچھی دُعا کرے تو وہ فرشتہ کہتا ہو کہ تیری یہ دُعا اللہ قبول کرے اور تیرے لیے بھی اسی طرح کا خیر عطا فرمائے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) غائبانہ دُعا کی جس خصوصی قبولیت اور برکت کا اس حدیث میں ذکر ہے اس کی خاص وجہ بظاہر یہ ہے کہ ایسی دعا میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ

دَعْوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٍ لَاشَكَّ فِيْهِنَّ دَعْوَةُ الْوَالِدِ وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ ——— رواه الترمذی وابوداؤد وابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین دعائیں ہیں جو خاص طور سے قبول ہوتی ہیں، ان کی قبولیت میں شک ہی نہیں ہے۔ ایک اولاد کے حق میں ماں باپ کی دعا، دوسرے مسافر اور پردیسی کی دُعا، تیسرے مظلوم کی دعا۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

تشریح) ان دُعاؤں کی مقبولیت کا خاص راز بھی یہی ہے کہ یہ دُعائیں اخلاص سے اور دل سے ہوتی ہیں۔ اولاد کے لیے ماں باپ کا خلوص تو ظاہر ہے، اسی طرح بیچارے پردیسی اور مظلوم کا دل شکستہ ہوتا ہے اور دل کی شکستگی میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کھینچنے کی خاص طاقت ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَمْسُ دَعَوَاتٍ يُسْتَجَابُ لَهُنَّ دَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ حَتّٰى يَنْتَصِرَ وَدَعْوَةُ الْحَاجِّ حَتّٰى يَصْدُرَ وَدَعْوَةُ الْمُجَاهِدِ حَتّٰى يَفْقَدَ وَدَعْوَةُ الْمَرِيْضِ حَتّٰى يَبْرَأَ وَدَعْوَةُ الْاَخِ لِاَخِيْهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ ثُمَّ قَالَ وَاَسْرَعُ هٰذِهِ الدَّعَوَاتِ اِجَابَةً دَعْوَةُ الْاَخِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ ——— رواه البیہقی فی الدعوات الکبیر

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچ آدمیوں کی دعائیں خاص طور پر قبول ہوتی ہیں۔ مظلوم کی دعا جب تک وہ بدلہ نہ لیوے، اور حج کرنے والے کی دُعا جب تک وہ لوٹ کے اپنے گھر واپس نہ آئے اور راہ خدا میں جہاد کرنے والے کی دُعا جب تک وہ شہید ہو کے دُنیا سے لاپتہ نہ ہو جائے، اور بیمار کی دُعا جب تک وہ شفایاب نہ ہو اور ایک بھائی کی دوسرے بھائی کے لیے غائبانہ دُعا — یہ سب بیان فرمانے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا اور ان دعاؤں میں سب سے جلدی قبول ہونے والی دعا کسی بھائی کے لیے غائبانہ دُعا ہے۔ (دعوات کبیر للبیہقی)

تشریح) دُعا اگر حقیقۃً دُعا ہو اور خود دُعا کرنے والے کی ذات اور اس کے اعمال میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو قبولیت میں مانع ہوتی ہے تو دُعا عموماً قبول ہی ہوتی ہے۔ لیکن بندۂ مومن کے بعض خاص احوال

یا اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے رحمتِ الٰہی خصوصیت سے متوجہ ہوتی ہے اور دعا کی قبولیت کا خصوصی استحقاق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں جن پانچ آدمیوں کی دعاؤں کا ذکر ہے ان میں سے مظلوم کی دعا اور غائبانہ دعا کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور حج اور جہاد ایسے اعمال ہیں کہ جب تک بندہ ان میں مشغول ہو وہ گویا اللہ کی بارگاہ میں ہے اور اس سے قریب تر ہے۔ اسی طرح مردِ مومن کی بیماری گناہوں سے اس کی تطہیر کا ذریعہ اور قربِ الٰہی کی راہ میں اس کی غیر معمولی ترقی کا وسیلہ ہوتی ہے اور بیماری کے بستر پر وہ ولایت کی منزلیں طے کرتا ہے اس لیے اس کی دعا بھی خاص طور پر قبول ہوتی ہے۔

دعا سے متعلق ہدایات :-

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِّنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ　　ــــــ رواہ الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ سے مانگو اور دعا کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ وہ ضرور قبول کرے گا اور عطا فرمائے گا۔ اور جان لو اور یاد رکھو کہ اللہ اس کی دعا قبول نہیں کرتا جس کا دل (دعا کے وقت) اللہ سے غافل اور بے پروا ہو۔　　(جامع ترمذی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ دعا کے وقت دل کو پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اس کی کریمی پر نگاہ رکھتے ہوئے یقین کے ساتھ قبولیت کی امید رکھنی چاہیئے، تذبذب اور بے یقینی کے ساتھ جو دعا ہوگی وہ بے جان اور روح سے خالی ہوگی۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَعَا اَحَدُکُمْ فَلَا یَقُلْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ اِنْ شِئْتَ ارْحَمْنِیْ اِنْ شِئْتَ اُرْزُقْنِیْ اِنْ شِئْتَ وَلْیَعْزِمْ مَسْئَلَتَہٗ اِنَّہٗ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَلَا مُکْرِہَ لَہٗ　　ــــــ رواہ البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب

تم میں سے کوئی دعا کرے تو اس طرح نہ کہے کہ "اے اللہ تو اگر چاہے تو مجھے بخش دے اور تو چاہے تو مجھ پر رحمت فرما اور تو چاہے تو مجھے روزی دے" بلکہ اپنی طرف سے عزم اور قطعیت کے ساتھ اللہ کے حضور میں اپنی مانگ رکھے۔ بے شک وہ کرے گا وہی جو چاہے گا۔ کوئی ایسا نہیں جو زور ڈال کر اس سے کرا سکے۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ عاجزی اور محتاجی اور فقیری اور گدائی کا تقاضا یہی ہے کہ بندہ اپنے ربِّ کریم سے بغیر کسی شک اور تذبذب کے اپنی حاجت مانگے، اس طرح نہ کہے کہ اے اللہ اگر تو چاہے تو ایسا کر دے، اس میں استغنا کا شائبہ ہے اور یہ مقامِ عبدیت اور دُعا کے منافی ہے، نیز ایسی دُعا کبھی جاندار دُعا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بندے کو چاہیے کہ اپنی طرف سے اس طرح عرض کرے کہ میرے مولا میری یہ حاجت تو پوری کر ہی دے ـــ بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ کرے گا وہ اپنے ارادہ اور مشیت سے کرے گا۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو زور ڈال کر اس کی مشیت کے خلاف اُس سے کچھ کرا لے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَّسْتَجِیْبَ اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَ الشَّدَائِدِ فَلْیُکْثِرِ الدُّعَاءَ فِی الرَّخَاءِ ـــــــــ رواہ الترمذی

جو کوئی یہ چاہے کہ پریشانیوں اور تنگیوں کے وقت اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے تو اس کو چاہیے کہ عافیت اور خوشحالی کے زمانے میں دُعا زیادہ کیا کرے۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) یہ تجربہ اور واقعہ ہے کہ جو لوگ صرف پریشانی اور مصیبت کے وقت ہی خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسی وقت اُن کے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھتے ہیں اُن کا رابطہ اللہ کے ساتھ بہت ضعیف ہوتا ہے اور خدا کی رحمت پر اُن کو وہ اعتماد نہیں ہوتا جس سے دعا میں روح اور جان پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو بندے ہر حال میں اللہ سے مانگنے کے عادی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رابطہ قوی ہوتا ہے اور اللہ کے کرم اور اس کی رحمت پر ان کو بہت زیادہ اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی دُعا قدرتی طور پر جاندار ہوتی ہے ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہی ہدایت دی ہے کہ بندوں کو چاہیئے کہ عافیت اور خوش حالی کے دنوں میں بھی وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سے زیادہ دُعا کیا کریں اور مانگا کریں اس سے ان کو وہ مقام حاصل ہوگا کہ پریشانیوں

اور تنگیوں کے پیش آنے پر جب وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تو ان کی دُعا خاص طور سے قبول ہوگی۔

دُعا کے چند آداب :-

دوسرے سے پہلے اپنے لیے دُعا

دعا کا ایک ادب یہ ہے کہ جب کسی دوسرے کے لیے دعا کرنی ہو تو پہلے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے مانگے اس کے بعد دوسرے کے لیے، اگر صرف دوسرے کے لیے مانگے گا تو اس کی حیثیت محتاج سائل کی نہ ہوگی بلکہ صرف "سفارشی" کی سی ہوگی اور یہ بات دربارِ الٰہی کے کسی منگتا کے لیے مناسب نہیں ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی دستور تھا کہ جب آپ کسی دوسرے کے لیے دُعا فرمانا چاہتے تو پہلے اپنے لیے مانگتے۔ عبدیتِ کاملہ کا تقاضہ یہی تھا۔

عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَکَرَ اَحَدًا فَدَعَا لَہٗ بَدَأَ بِنَفْسِہٖ ——— رواہ الترمذی

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو یاد فرماتے اور اس کے لیے دعا کرنا چاہتے تو پہلے اپنے لیے مانگتے۔ پھر اس شخص کے لیے دعا فرماتے۔ (جامع ترمذی)

ہاتھ اُٹھا کے دعا کرنا :-

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَلُوا اللّٰہَ بِبُطُوْنِ اَکُفِّکُمْ وَلَا تَسْأَلُوْہُ بِظُھُوْرِھَا فَاِذَا فَرَغْتُمْ فَامْسَحُوْا بِھَا وُجُوْھَکُمْ ——— رواہ ابو داؤد

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے اس طرح ہاتھ اُٹھا کے مانگا کرو کہ ہتھیلیوں کا رُخ سامنے ہو، ہاتھ اُلٹے کرکے نہ مانگا کرو اور جب دعا کر چکو تو اٹھے ہوئے ہاتھ چہرے پر پھیر لو۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) دوسری بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب آنے والی اور نازل ہونے والی کسی بلا کو رکوانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تو ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف ہوتی تھی اور جب دنیا یا آخرت کی کوئی خیر اور بھلائی مانگتے تھے تو سیدھے ہاتھ پھیلا کے مانگتے

تھے جس طرح کسی سائل اور منگتا کو ہاتھ پسار کے اور پھیلا کے مانگنا چاہیئے۔ اس کی روشنی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ جب اللہ سے اپنی کوئی حاجت مانگی جائے تو اس کے سامنے فقیروں کی طرح ہاتھ سیدھے پھیلا کے مانگی جائے اور آخر میں وہ پھیلے ہوئے ہاتھ منھ پر پھیر لیے جائیں، اس تصور کے ساتھ کہ یہ پھیلے ہوئے ہاتھ خالی نہیں رہے ہیں، ربّ کریم کی رحمت و برکت کا کوئی حصہ ان کو ضرور ملا ہے۔

عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا دَعَا فَرَفَعَ يَدَيْهِ مَسَحَ وَجْهَهُ بِيَدَيْهِ ــــــــــ رواہ ابوداؤد والبیہقی

سائب بن یزید تابعی اپنے والد یزید بن سعید بن ثمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب آپ ہاتھ اٹھا کے دعا مانگتے تو آخر میں اپنے ہاتھ چہرۂ مبارک پر پھیر لیتے تھے۔　(سنن ابی داؤد، دعوات کبیر للبیہقی)

(تشریح) دعا میں ہاتھ اٹھانا اور آخر میں ہاتھ منہ پر پھیرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب قریب بتواتر ثابت ہے، جن لوگوں نے اس سے انکار کیا ہے اُن کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے صرف غلط فہمی ہوئی ہے، امام نووی نے شرح مہذب میں قریباً تیس حدیثیں اس کے متعلق یک جا کردی ہیں اور تفصیل سے ان حضرات کی غلط فہمی کی حقیقت واضح کی ہے۔

دُعا سے پہلے حمد و صلوٰۃ :-

عَنْ فُضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ قَالَ سَمِعَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يَدْعُوْ فِيْ صَلٰوتِهِ لَمْ يَحْمِدِ اللهَ وَلَمْ يُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَجِلَ هٰذَا ثُمَّ دَعَاهُ فَقَالَ لَهُ اَوْ لِغَيْرِهِ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَءْ بِتَحْمِيْدِ رَبِّهِ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يَدْعُوْ بَعْدُ بِمَا شَاءَ۔

ــــــــــ رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی

فضالہ بن عبید راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سنا اس نے نماز میں

دُعا کی جس میں نہ اللہ کی حمد کی نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا تو حضور نے فرمایا کہ اس آدمی نے دُعا میں جلد بازی کی، پھر آپ نے اس کو بلایا اور اس سے یا اس کی موجودگی میں دوسرے آدمی کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو دعا کرنے سے پہلے اُسکو چاہیئے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے پھر اس کے رسول پر درود بھیجے اس کے بعد جو چاہے اللہ سے مانگے۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، نسائی)

دُعا کے آخر میں آمین:-

عَنْ اَبِیْ زُهَیْرٍ النُّمَیْرِیِّ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَةً فَاَتَیْنَا عَلٰی رَجُلٍ قَدْ اَلَحَّ فِی الْمَسْئَلَةِ فَوَقَفَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَسْتَمِعُ مِنْہُ فَقَالَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوْجَبَ اِنْ خَتَمَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ بِاَیِّ شَیْءٍ یَخْتِمُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ بِاٰمِیْنَ، فَاِنَّہُ اِنْ خَتَمَ بِاٰمِیْنَ فَقَدْ اَوْجَبَ ——— رواہ ابوداؤد

ابو زُہیر نُمیری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باہر نکلے، ہمارا گزر اللہ کے ایک بندہ پر ہوا جو بڑے الحاح سے اللہ سے مانگ رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر اس کی دُعا اور اللہ کے حضور میں اُس کا مانگنا گڑگڑانا سننے لگے، پھر آپ نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ اگر اس نے دُعا کا خاتمہ صحیح کیا اور مُہر ٹھیک لگائی تو جو اس نے مانگا ہے اس کا اس نے فیصلہ کرالیا، ہم میں سے ایک نے پوچھا کہ حضور! صحیح خاتمہ کا اور مُہر ٹھیک لگانے کا طریقہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، آخر میں آمین کہہ کے دُعا ختم کرے (تو اگر اس نے ایسا کیا تو بس اللہ سے طے کرالیا) (رواہ ابوداؤد)

(تشریح) ختم کے معنی ختم کرنے کے بھی ہیں اور مُہر لگانے کے بھی ہیں بلکہ یہ دونوں در اصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں اسلئے ترجمہ میں دونوں ہی لفظوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ حدیث کا اصل سبق یہ ہے کہ ہر دُعا کے خاتمہ پر بندہ کو آمین کہنا چاہیئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میری یہ دعا قبول فرما! اسی پر ہر دعا کا خاتمہ ہونا چاہیئے!۔ اس کی حکمت عنقریب ہی پہلے لکھی جا چکی ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ

(۶)

از- مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

حکمت عملی اور آدابِ معاشرہ کی تعلیم

حضرت محدث دہلویؒ ارقام فرماتے ہیں کہ "حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اس فقیر کو اپنی مجلس مبارک میں، حکمتِ عملی اور آدابِ معاشرت کی بھی بہت کچھ تعلیم دیتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ کی چند باتیں جو میرے حافظے میں باقی رہ گئی ہیں یہ ہیں۔"

(۱) فرمایا ـــــ کہ اپنی مجلس میں کسی قوم کی (یا کسی علاقے کے لوگوں کی) ہرگز برائی نہ کرنا کہ پورب والے ایسے ہوتے ہیں اور پنجاب والے ویسے ہوتے ہیں۔ افغانوں میں یہ عیب ہو اور مغلوں میں یہ خرابی ہے ـــــ ممکن ہے کہ تمھاری مجلس میں اُس قوم یا علاقے کا یا اُن کا حمایت کنندہ کوئی موجود ہو ـــــ اس کو یہ بات ناگوار گزرے گی اور مجلس مکدّر ہو جائے گی۔

(۲) فرمایا کرتے تھے کہ (خواہ مخواہ اور بلا ضرورت) ہرگز کوئی ایسی بات مجلس عام میں زبان پر نہ لانا جو "مخالفِ جمہور" ہو، اگرچہ وہ فی نفسہٖ صحیح ہو، کیونکہ لوگ (ایکدم) اس بات کا انکار کر دیں گے اور تکدّر پیدا ہو جائے گا۔

(۳) فرماتے تھے ـــــ کہ مجلس عام میں کسی خاص شخص کا نام لے کر اعتراض اور رَدِّ صریح نہ کیا جائے (عام بات بغیر نام کے ہو)

(۴) فرمایا کرتے تھے کہ انسان کا لباس اس کے امتیاز و کمال پر اطلاع دینے والا

ہونا چاہیئے۔ اگر وہ عالم ہے تو علماء کا سا لباس پہنے اور ان کی سی زندگی بسر کرے اور درویش ہے تو لباس درویشی زیب تن کرے اور درویشوں کی طرح زندگی گزارے۔

۵۔ فرماتے تھے کہ عیادت و بیمار پرسی کا مقصد اعظم یہ ہے کہ مریض کو تمھارے اس طرز عمل سے) خوشی حاصل ہو، مقصد یہ نہیں ہے کہ فقط اس کے مزاج کی کیفیت معلوم ہو جائے۔ لہٰذا جب کوئی کسی مریض کی عیادت کا قصد کرے تو ایسا نہ ہونا چاہیے کہ مریض کو تو اطلاع نہ ہو اور وہ بالا ہی بالا کسی سے کیفیت مزاج معلوم کر کے واپس ہو جائے۔ ایسا کرنے سے مقصد فوت ہوتا ہے۔ یہی حال تعزیت کا ہے اور یہی حیثیت سفارش کی ہے۔ ان دونوں میں بھی ایسا ہونا چاہیئے کہ جس کو تسلّی دینا ہے اس کو (تعزیت نامہ یا آمد کے ذریعے) اپنے جذبۂ ہمدردی سے مطلع کرو ـــــ اور جس کی سفارش کی ہے اس کو بھی مطلع کر دیا جائے کہ تمھاری سفارش کر دی گئی ہے۔ فرماتے تھے کہ جن جن امور میں "اقامت مصلحت موافقت" کو اور آپس میں انسانوں کے دل جوڑنے اور محبت پیدا ہونے کو مدنظر اور ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اُن سب معاملات میں ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ صاحب معاملہ کو اپنے کام سے مطلع کر دیا جائے۔

(۶) فرماتے تھے کہ اگر وہ لوگ جو (بظاہر) مرتبے میں تم سے کم ہیں اور (محض محبت دینی کی بنا پر) تم کو سلام کرنے میں ابتدا کرتے ہیں، تم اس بات کو اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت سمجھنا اور اللہ کا شکر بجالانا ـــــ ایسے لوگوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا ـــــ اور ان کے حال اور مزاج کو دریافت کرنا۔ بااوقات تمھارا ادنیٰ التفات جس کی تمھارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں، عوام کی نظر میں بڑی چیز بن جاتا ہے اور وہ اس التفات کو بڑی حیثیت دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنی طرف تمھارا ادنیٰ التفات بھی نہ دیکھیں گے تو بہت رنجیدہ ہوں گے

~~صد ملک دل بہ نیم نگہ می تواں خرید~~
صد ملک دل بہ نیم نگہ می تواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

(یعنی سیکڑوں ملک دل ایک ادنیٰ التفات کے عوض خریدے جا سکتے ہیں۔ اس معاملے میں خوبان زمانہ بہت کوتاہی کر رہے ہیں (کہ ادنیٰ التفات کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے اور اتنا بڑا نفع نظر انداز کر رہے ہیں)

(۷) فرماتے تھے ـــــ کہ یہ بات احمقانہ ہے کہ لباس وطعام وغیرہ میں کسی مخصوص چیز کی عادت ڈال لی جائے (جب تک وہ مخصوص ومتعین شئے نہ ملے اُس وقت تک چین نہ آئے۔)

(۸) فرمایا ـــــ بعض دوست ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی محبت 'ذاتی ہوتی ہے کہ جب بتدریج تمہاری محبت اُن کے دل میں جاگزیں ہو جائے گی پھر کسی حال میں وہ محبت ان کے دل سے باہر نہ ہوگی، نہ مفلسی میں نہ خوشحالی میں ـ ایسے دوست کو غنیمت شمار کرنا اور اپنے فرزند سے بھی بہتر سمجھنا ـ بعض دوست ایسے ہوتے ہیں کہ تمہاری کسی فضیلت کے ظہور کی وجہ سے یا کسی غرض سے محبت رکھتے ہیں ان کو اُن کے مقام پر رکھنا چاہیے۔ غرضکہ سب کو ایک درجے میں نہ رکھا جائے اور کسی شخص پر اس کے مرتبے سے زیادہ اعتماد نہ کیا جائے۔

(۹) فرماتے تھے کہ "کار عاقلاں بحیلہاں" یہ ہے کہ کسی چیز سے فقط لذت حاصل کر لینا مقصود نہ ہو بلکہ اس لذت کے ضمن میں دفع ضرورت یا اثباتِ فضیلت ملحوظ ہو یا ادائے سنت کی نیت ہو۔

(۱۰) فرماتے تھے کہ بات کرنے میں، چلنے پھرنے میں اور اُٹھنے بیٹھنے میں قوی لوگوں کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔ اگرچہ تم (قدرے) ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اگر کوئی معیوب بات یا بزدلی یا بخل اتفاقاً تم سے صادر ہو جائے تو اُس کے چھپانے میں حتی الامکان کوشش کرنا اور اس سے شرمندہ رہنا اور بہ تکلف اس کے مقابل کی اچھی صفت کا مظاہرہ کرنا ـــــ ایسا نہ ہو کہ نفس کو کوتاہی وتقصیر کی عادت وخو پڑ جائے۔

دو رباعیاں | حضرت شاہ صاحبؒ ارقام فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت والد ماجدؒ متصلِ نمازِ ظہر میری طرف متوجہ ہوئے اور فی البدیہہ یہ رُباعی فرمائی۔

گر تو راہِ حق بجواہی اے پسر ـــ خاطرِ کس را مرنجاں الحذر
در طریقت رکنِ اعظم رحمت است ـــ ایں چنیں فرمود آں خیر البشرؐ

(اے بیٹے اگر تو راہِ حق اختیار کرنا چاہتا ہے تو کسی کے دل کو ہرگز مت ستانا۔ رحمدلی طریقت میں رکنِ اعظم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رحمدلی کی بہت کچھ تعلیم وتلقین فرمائی ہے)۔

اس رباعی کے متعلق فرمایا کہ دوات و قلم لاؤ اور اس کو لکھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کا میرے دل میں القاء فرمایا ہے تاکہ اس کی تم کو نصیحت کروں۔ پھر فرمایا کہ یہ نصیحت آمیز رباعی اللہ کی بڑی نعمت ہے اس کا بھی شکر لازم ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے انفاس نفیسہ میں یہ رُباعی بھی ہے۔

اے کہ نعمتہائے تو از حد فزوں   شکرِ نعمتہائے تو از حد بروں
عجز از شکرِ تو باشد شکرِ ما   گر بود فضلِ تو مارا رہنموں

(اے وہ ذات کہ تیری نعمتیں جس طرح حد سے زیادہ ہیں۔ تیری نعمتوں کا شکریہ بھی حدِ امکان سے باہر ہے۔ لہذا تیرے شکر سے عاجز ہونے کا اقرار کر لینا ہی تیرا شکر ہے مگر یہ اقرارِ عجز بھی اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ تیرا فضل و کرم ہماری رہنمائی کرے اور ہمارے شاملِ حال ہو۔)

سلکِ فقہی | حضرت محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ایشانؒ اکثر و بیشتر امور میں تو موافقِ مذہب حنفی عمل کرتے تھے البتہ بعض باتوں میں حسبِ حدیث یا حسبِ وجدان کسی دوسرے سلکِ فقہ کو ترجیح دیتے تھے۔

نسبتہائے طرق | حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ایشانؒ کی زبان سے بارہا خلوت میں یہ سُنا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جو نسبت ہم نے پائی ہے وہ صاف تر اور باریک تر ہے۔ اور حضرت خواجہ نقشبندؒ سے جو نسبت ہمیں ملی ہے وہ غالب تر اور موثر تر ہے۔ اور وہ نسبت جو کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ہم نے حاصل کی ہے وہ عشق سے نزدیک تر اور تاثیرِ اسماء اور صفائی قلب سے قریب تر ہے۔

بے ہمہ با ہمہ | ایک مخلص نے حضرت ایشانؒ سے دریافت کیا کہ عام لوگوں کے درمیان کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے، فرمایا اس طرح رہو کہ جیسے تم بھی ان میں سے ایک ہو، اپنے آپ کو ان سے بڑا اور ممتاز نہ سمجھو۔ پھر اس نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کا کیا طریقہ ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ الآیۃ (یہ سورۂ نور کی ایک آیت ہے جس میں دیندار تاجروں کی حضرت حق جل مجدہٗ نے

تعریف فرمائی ہے اور جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تجارتی کاروبار اور جائز اشغال میں مشغول رہ کر بھی انسان وصول الی اللہ کی دولت و نعمت حاصل کر سکتا ہے ترکِ دنیا کی چنداں ضرورت نہیں۔

ایک لطیفہ | حضرت الشانؒ ایک مرتبہ کئی رفقاء کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ بہلی ایک تھی اور سب اس بہلی پر نوبت بہ نوبت سوار ہوتے تھے۔ ایک رفیق اثنا راہ میں اپنی باری سے زیادہ سوار ہوا حضرت الشانؒ نے (جو غالباً پیدل چل رہے تھے) ایک شخص سے فرمایا کہ بہلی کے سواروں سے دریافت کرو کہ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (انصاف کرو انصاف، تقویٰ اور پرہیزگاری سے بہت قریب ہے) یہ آیت کس پارے میں ہے؟ شیخ بدرالحق پھلتیؒ مقصدِ کلام سمجھ گئے اور برجستہ و بے ساختہ عرض کیا کہ سپارہ یعتذرون اسی آیت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ (سپارۂ یعتذرون کا ذکر کرنے سے جواب میں ایک علمی لطافت پیدا ہو گئی اور عمدہ طریقے پر عذر خواہی بھی ہو گئی)

حضرت شیخ اکبرؒ کی تعظیم و تکریم | حضرت شاہ عبدالرحیمؒ فاروقی حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی بہت تعظیم کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "میں اگر چاہوں تو فصوص الحکم کی برسر منبر تقریر کروں اور اس کے تمام مسائل کو آیات و احادیث کے موافق ثابت کروں اور اس طرح بیان کروں کہ کسی کو کوئی شبہ نہ رہے"۔ البتہ وحدتِ وجود کی تصریحات سے پرہیز فرماتے تھے۔ کیونکہ اکثر اہلِ زمانہ اس مسئلہ کو پوری طرح نہ سمجھ سکیں گے اور ورطۂ الحاد و زندقہ میں پڑ جائیں گے۔

چند ملفوظات | شیخ محمد بدرالحق پھلتیؒ نے حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے ملفوظات جمع کیے ہیں جو انفاسِ رحیمیہ کے آخر میں درج ہیں ان میں سے چند یہاں پیش کرتا ہوں۔

فرمایا۔ سالک کو چاہیے کہ رات دن ذکر کا اہتمام رکھے۔ طالب حق کو چاہیئے کہ نمازِ فجر سے لے کر اشراق تک مراقبے میں بیٹھے اور مراقبے کے بعد اس وقت تک کسی سے گفتگو نہ کرے جب تک نمازِ اشراق نہ پڑھ لے۔ اور جب آدھی رات ہو جائے نمازِ تہجد ادا کرے اور فجر تک مراقبے میں رہے۔ جب نیند غلبہ کرے پانی

اپنے منہ پر چھڑک لے تاکہ نیند دور ہو جائے، اس مبارک وقت میں فتوحاتِ غیبی کا بہت کچھ ظہور ہوتا ہے اور بہت کچھ کشادگی محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً شب جمعہ کہ بہت ہی فضیلت رکھتی ہے۔

فرمایا — جب کسی درویش کی صحبت میں جائے اور اس سے متاثر ہو تو اس تاثر کو اپنے پیرو مرشد کا فیض سمجھے کہ یہ قابلیت ان کی نظر سے پیدا ہوئی ہے۔

فرمایا — اگر کسی طالب پر کسی درویش کامل نے ایک بار بھی توجہ کر دی ہے اور قیدِ ہستی سے آزاد کر دیا ہے تو یہی ایک توجہ اس کو عمر بھر کے لیے کافی ہوگی بشرطیکہ مشغول بحق رہے۔ یہ (خوش قسمت) طالب اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک اس کا کام پورا نہ ہو جائے گا۔

فرمایا — طالبِ حق اگر بیگانوں کی صحبت میں کبھی چلا جائے تو تھوڑی دیر سے زیادہ نہ بیٹھے۔

فرمایا — عاشقِ صادق کو اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ قبر میں جانے تک اپنی عمر کو یادِ مولیٰ میں صرف کرے۔ (اور اس کام میں لگا رہے) یہ بات دل میں نہ لائے کہ اس کام سے جلد فارغ ہو جاؤں، جلد بازی کرے گا تو یہ راستہ اس پر کچھ بھی نہ کھلے گا — بلکہ نظر کو حصول اور عدم حصول سے بھی ہٹا لے۔ کمالِ حصول اسی کو جانے کہ حق تعالیٰ نے اپنی یاد کی توفیق عنایت فرما دی ہے۔ حصول کا دار اسی بات پر موقوف ہے۔ جب ہمت و توجہ درست ہو گئی تو پھر کام کیا مقصود سے وابستہ ہو جائے گا۔ اگر کیفیت قبض (قلب میں) پیدا ہو تو ناامید نہ ہو بلکہ بدستور جو کچھ کر رہا ہے اور شغل کرتا رہے، اگر سالہا سال بھی قبض کی کیفیت رہے تب بھی ناامید نہ ہو کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ (اس استقامت کی برکت سے) ایک مرتبہ ہی ایسا بسط عنایت فرمادے کہ جو دولت و نعمت سالہا سال میں حاصل نہ ہوتی ہو وہ ایک لمحے میں حاصل ہو جائے — غرضیکہ اپنے کام کو اچھے طریقے سے انجام دے کر اس دنیا سے جائے —

فرمایا — طالب کو چاہیے کہ ہر حال میں انتظارِ جمالِ محبوبِ حقیقی کرے اور کسی لمحہ اس فکر سے غافل نہ ہو یہاں تک کہ یک بیک اس کا باطن، مثلِ چراغ روشن ہو جائے اور ظلمتِ ہستی باقی نہ رہے۔ ہر وقت اپنے آپ کو مبتدی سمجھے۔ اور اشغال میں اس طرح

جدوجہد کرے گویا کہ اسی وقت مرشد نے ارشاد فرمائے ہیں۔ یادِ حق میں اپنے جگر کو کباب کرے اور جس جگہ قیام ہو اپنی عمر کا خاتمہ اسی جگہ جانے اور اس جگہ سے کسی دوسری جگہ (مستقل طور پر) منتقل ہونے کا خیال منقطع کرے۔ موت کو حاضر جانے تاکہ "مرنے سے پہلے مرجاؤ" والا خاص مقام حاصل ہو۔ پرانی قبروں کا دھیان کرے اور عبرت حاصل کرے کہ ایک دن میرا حال بھی ایسا ہی ہو جائے گا۔ میں بھی قبر میں پہنچ جاؤں گا۔ اور سمجھے کہ میری عمر (فرض کرو) پچاس سال باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی ہوا کی طرح گزر جائے گی۔

اگر کوئی تجھ پر غصہ کرے تو اپنے حال پر غور کر، اگر اپنے اندر ترکِ دنیا اور ترکِ جاہ و عزت پاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، سمجھ لے کہ ایسی حالت میں کوئی چیز ضرر نہیں پہونچائے گی اور کسی کا غصہ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا، اور اگر اپنے اندر دنیا کی طرف میلان محسوس کرے تو جان لے کہ ہر چیز ضرر پہونچا سکتی ہے۔ بلکہ دنیا کی طرف میلان ہونا ہی ایک مستقل ضرر ہے۔ دل کا دنیا میں پھنسنا اور اہلِ دنیا سے محبت کرنا اس سے زیادہ کوئی ضرر نہیں۔

اگر مخلوق (خواہ مخواہ) اظہارِ نفرت کرے تو خوش ہونا چاہیے کہ مردودِ خلق، مقبولِ حق ہو جاتا ہے اور یہ اچھی طرح ذہن نشین کرلے کہ اگر لوگ بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں تو یہ حقارت کا معاملہ چند روز سے زیادہ کا نہیں ہے ــــ اس جہان کی عزت کے لیے اُس جہان کا کام ــــ جس سے ہمیشہ واسطہ پڑنا ہے ــــ برباد نہیں کرنا چاہیئے۔

اس بات پر بھی یقین رکھ کہ ہدایت و ضلالت، از جانبِ خدا ہے۔ حق تعالیٰ کے سوا کسی کی خواہش و آرزو سے یہ دونوں امر نہیں ہوتے ــــ آخر اس جہان سے گزرنا ہے اور اس جہان کو چھوڑنا ہے۔ جس چیز کو اضطرار و مجبوری کے ساتھ کل چھوڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کو آج اپنے اختیار سے چھوڑ دے۔

تو اگر کسی کی طرف سے کوئی تکلیف اٹھائے تو اس کے حق میں دعائے بد نہ کر بلکہ صرف اپنی جمعیت و عافیت کو اللہ سے طلب کر، اب آگے کو خواہ حق تعالیٰ اس موذی کو مبتلائے مصیبت کردے یا توفیقِ نیک بخش دے بس اللہ تعالیٰ کے اوپر چھوڑ دے ــــ جو لوگ دل کے اندھے اور طریقِ اہلِ اللہ کے منکر ہیں اُن کی صحبت میں نہ بیٹھنا ــــ اُن کی صحبت سے

پرہیز کرنا۔ (طالب حق کو چاہیے کہ) کسی مسلمان کو اپنے سے کم درجہ نہ سمجھے شاید حق تعالیٰ اُس کو آخر میں توفیق نیک نہ دے بلکہ کافر شخص کو بھی (انجام پر نظر کرتے ہوئے) بُرا نہ سمجھے اس لیے کہ اس کا احتمال وامکان ہے کہ وہ دُنیا سے مسلمان ہو کر انتقال کرے اور خاتمہ بخیر ہو جائے۔

بزرگانِ سلف کے کمالات صرف پیشِ عوام بیان کرنے میں مشغول نہ رہے بلکہ اپنے اندر بھی ایک حال پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ مطالعۂ احوالِ بزرگاں میں یہی منفعت ہو کہ خود بھی جدوجہد کرنے لگے تاکہ بزرگوں والی کیفیت اللہ تعالیٰ اس کو بھی عنایت فرمادے۔ فقط یہ نہ ہو کہ اپنی مفاخرت کے لیے ان بزرگوں کا افسانہ بیان کیا جائے۔ صرف افسانہ گوئی سے کام نہیں چلے گا۔

اگر کوئی نماز (اتفاق سے) قضا ہو گئی تو جب تک اس کو ادا نہ کرے کسی کام میں مشغول نہ ہو۔ کیونکہ نماز ادا کیے بغیر کسی کام میں مشغول ہونا نحوست کی بات ہے۔

دلِ سالک پر جو کچھ عالمِ ملکوت سے ظاہر ہو وہ کسی پر ظاہر نہ کرے۔ اپنے ابنائے جنس کے علاوہ کوئی شخص اپنے کو دوست ظاہر کرے تو اس پر کلیتہً مائل و مفتون نہ ہو جائے اس لیے کہ اہلِ دُنیا مکار ہوتے ہیں۔ جب تک کسی کو صادق نہ پائے اور کفش بردار اہل اللہ نیز فرمانبردار اہل اللہ نہ دیکھ لے اُس وقت تک کسی سے اپنا راز ظاہر نہ کرے۔

اصلِ کار یہ ہے کہ اپنا اختیار درمیان سے اُٹھا کر اپنے آپ کو اہل اللہ کے سپرد کر دے تاکہ مقصود حاصل ہو جائے ورنہ مقصود ہرگز حاصل نہ ہوگا — اپنے آپ کو بس ایک کا کر دے اور دُو جگہ سے نیت استفاضہ نہ رکھے ورنہ کسی جگہ سے بھی فیض نہ پہونچے گا۔

امامِ اعظم ابو حنیفہ اور علمِ حدیث

(مولانا تقی الدین صاحب ندوی، مظاہری)
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

زیر طبع کتاب "محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے" کا ایک باب

نام و نسب نعمان نام، کنیت ابو حنیفہ، امام اعظم لقب، شجرہ نسب یہ ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی۔ عام طور پر امام صاحب کا عجمی النسل ہونا مسلّم ہے۔ خطیب بغدادی اور مورخ ابن خلکان نے امام صاحب کے پوتے اسمٰعیل کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے کہ ہم پر کبھی غلامی کا دور نہیں آیا۔ ہم لوگ فارسی نسل کے ہیں۔ ہمارے دادا امام ابو حنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ثابت بچپن میں حضرت علی رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ انھوں نے ان کے اور ان کے خاندان کے لیے دعا کی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہیں ہوئی۔[۱] سن پیدائش ۷۰ھ بھی بتایا گیا ہے۔[۲]

سکونت کوفہ امام صاحب کا مولد و مسکن ہے جو اسلام کی وسعت و تمدن کا دیباچہ تھا۔ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علم نبوت کے تین مراکز تھے۔ مکہ، مدینہ اور کوفہ۔ مکہ معظمہ کے صدر معلم حضرت عبد اللہ بن عباس رضؓ تھے اور مدینہ منورہ کے حضرت عبد اللہ بن عمر رضؓ اور کوفہ کے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ تھے۔[۳] حضرت علی رضؓ نے اس شہر کو دار الخلافہ بنایا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کان اغلب قضایاہ بالکوفۃ۔[۴] حضرت علی رضؓ کے بیشتر فیصلے کوفہ سے صادر ہوئے تھے۔ کوفہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے عہد فاروقی میں قرآن و سنت کا دار العلوم بن چکا تھا۔ حافظ

۱؎ البدایہ والنہایہ ص ۱۰۷ ج ۱۰۔ ۲؎ مقدمہ اوجز المسالک ص ۵۵۔ ۳؎ اعلام الموقعین۔ ۴؎ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۳۲ ج ۱۔

ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

ولما ذهب (علیؓ) الی الکوفة کان اهل الکوفة قبل أن یاتیهم قد اخذوا الدین عن سعد بن ابی وقاص وابن مسعود وحذیفة وعمار وابی موسیٰ وغیرهم ممن ارسله عمر الی الکوفة[1]

جب حضرت علیؓ کوفہ تشریف لے گئے ہیں تو آپ کے وہاں آنے سے پیشتر حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت عمار، حضرت ابو موسیٰ وغیرہ (رضی اللہ عنہم) سے (جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ روانہ کیا تھا) کوفہ والے علم دین حاصل کر چکے تھے۔

صحابۂ کرام میں سے ایک ہزار پچاس (۱۰۵۰) حضرات جن میں چوبیس وہ بزرگ بھی ہیں جو غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے تھے، وہاں گئے اور سکونت اختیار کی[2]۔

امام ابوالحسن احمد بن عبداللہ عجلی المتوفی ۲۶۱ھ نے اس سے زیادہ تعداد بتائی ہے وہ فرماتے ہیں کہ کوفہ میں ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) صحابہ آکر اترے[3]۔ علامہ نودی نے کوفہ کو دار الفضل و الفضلاء کا لقب دیا ہے[4]۔

تحصیل علم | امام صاحب بیس سال کی عمر میں تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے ادب و انساب اور اس کے بعد علم کلام حاصل کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد فقیہ وقت امام حماد کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگے۔ حضرت حماد جو مشہور امام اور استاد وقت تھے بڑے بڑے تابعین سے استفادہ کر چکے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو سلسلۂ علم و تفقہ کا چلا آرہا تھا اس کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا۔ حضرت حماد کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا[5]۔

امام صاحب نے اگرچہ مختلف اساتذہ سے فقہ و حدیث کی تحصیل کی ہے لیکن خصوصیت سے حضرت حماد کے تربیت یافتہ ہیں۔ کوفہ میں کوئی محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے امام صاحب نے زانوئے شاگردی تہہ نہ کیا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے امام صاحب کے شیوخ کی تعداد

---

[1] منہاج السنة ص ۱۵۰ ج ۴، [2] فتح المغیث ص ۳۸۲، [3] فتح القدیر ص ۲۴ ج ۱، [4] شرح مسلم باب القراءة فی الظهر والعصر۔ [5] السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی از مصطفیٰ سباعی۔

چار ہزار بتائی ہے[1]۔ علامہ سیوطی نے تبییض الصحیفہ میں اور کردری نے مناقب ابی حنیفہ میں امام صاحب کے شیوخ و اساتذہ کے نام گنائے ہیں۔ اور مولانا عبدالحیؒ نے بھی التعلیق الممجد میں بہت سے شیوخ کا تعارف کرایا ہے۔

امام صاحب کے شیوخ کی ایک خصوصیت علامہ شعرانی کے بیان سے معلوم ہوتی ہے کہ امام صاحب نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس کو خیار تابعین سے حاصل کیا ہے، جسکی سند میں کوئی بھی راوی متہم بالکذب نہیں ہے۔ اگر امام صاحب کے مسلک کے دلائل میں کوئی ضعف بیان کیا گیا ہے تو وہ مابعد کے رواۃ کے لحاظ سے ہے۔ امام صاحب کے شیوخ فقہ و حدیث دونوں کے جامع تھے[2]۔

حرمین وغیرہ کا سفر | اس زمانہ میں حج علمی استفادہ اور افادہ کا بڑا ذریعہ تھا۔ تمام ممالک اسلامیہ کے گوشے گوشے سے اہل کمال موسم حج میں وہاں آآکر جمع ہوجاتے تھے اور درس و افتا کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ امام ابوالحسن مرغینانی نے بسند نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے پچپن حج کیے تھے[3]۔ حرمین کے شیوخ میں سے عطا بن ابی رباح سے مکۂ معظمہ میں اور سالم بن عبداللہ اور سلیمان سے مدینۂ طیبہ میں خصوصیت سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ امام محمد بن علی باقر کی خدمت میں ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے حاضر رہے[4]۔ علاوہ ازیں سنہ ۱۳۰ھ سے لے کر منصور عباسی کے زمانۂ خلافت تک جو چھ سال کا عرصہ ہوتا ہے آپ کا مستقل طور پر قیام مکۂ معظمہ ہی میں رہا۔ بیس مرتبہ سے زیادہ بصرہ کا سفر کیا[5]۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب نے مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، غرض کہ عراق و حجاز دونوں جگہوں کی روایات کو حاصل کیا۔

تلامذہ | حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ کا احصار دشوار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ بعض ائمہ نے کہا ہے ائمہ اسلام میں اتنے شاگرد و تلامذہ کسی اور امام کے نہیں ہوئے۔ علامہ کردری نے آٹھ سو فقہاء اور محدثین کو آپ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ابن حجر مکی کہتے ہیں کہ

---

[1] شرح سفر السعادۃ۔ [2] مسند امام از خوارزمی [3] مناقب الامام از موفق صفحہ ۲۵۳/ج ۱ [4] عقود الجمان
[5] مناقب الامام صفحہ ۲۴/ج ۲۔

جس طرح فقہاء میں امام ابو یوسف و امام محمد و امام زفر اور امام حسن بن زیاد وغیرہ ہیں۔ اسی طرح محدثین میں عبداللہ بن مبارک، لیث بن سعد۔ امام مالک اور مسعر بن کدام۔ اور صوفیاء میں فضیل بن عیاض اور داؤد طائی جیسے ائمہ کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے[1]۔ امام صاحب نے اپنے اصحاب و تلامذہ کی ایک مجلس مرتب کی تھی جس میں مختلف مسائل پیش کیے جاتے تھے۔ غور و فکر کے بعد جب کسی نتیجہ پر سب لوگ متفق ہو جاتے تو اس کو قلمبند کیا جاتا۔ یہ مجلس چالیس ارکان پر مشتمل تھی[2]۔

زہد و تقویٰ عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ پہونچ کر دریافت کیا کہ یہاں پر سب سے زیادہ پارسا کون ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ ابو حنیفہؒ۔ خود انھیں کا بیان ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہ سے بڑھ کر کسی کو پارسا نہیں دیکھا۔ حالانکہ مال و دولت سے ان کی آزمائش کی گئی تھی۔ زرنجری امام صاحب کے حالات بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے افعال و اقوال اور اخلاق اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ صحابہ کرام میں افضل اور علم و فقہ اور پرہیزگاری اور سخاوت میں سب سے آگے تھے اسی طرح امام صاحب تابعین کی جماعت میں ہیں[3]۔

امام صاحب کی ایک اہم فضیلت بخاری و مسلم اور ابو نعیم نے حضرت ابوہریرہؓ سے، طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا "لو کان العلم بالثریا لتناوله أناس من ابناء فارس[4]" اگر علم ثریا کے پاس ہو تو فارس کے کچھ لوگ اس کو حاصل کرلیں گے۔ آپؐ کی اس پیشین گوئی کے اولین مصداق علامہ سیوطی، ابن حجر مکی اور عام طور پر علماء نے امام ابو حنیفہ کو قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں " فقیر گفت امام ابو حنیفہ دریں حکم داخل است[5]" فقیر یعنی شاہ صاحب نے فرمایا کہ امام ابو حنیفہ اس حکم میں داخل ہیں۔

---

[1] مقدمہ اوجز ص۴۰ [2] حسن التقاضی از علامہ زاہد کوثری ص۱۲ [3] مقدمہ اوجز المسالک ص۵۹
[4] مسند امام احمد ص۲۹۶ ج۲ [5] کلمات طیبات ص۱۶۸۔

ذکاوت وذہانت امام صاحب کی ذکاوت وطباعی مشہور ہے۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں "کان فی اذکیاء بنی آدم" یعنی امام ابوحنیفہ کا شمار دُنیا کے منتخب اذکیاء میں ہے۔ امام صاحب کی ذہانت وفراست کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ محمد القصاری کہتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کی ایک ایک حرکت حتیٰ کہ بات چیت میں، دانشمندی کا اثر پایا جاتا تھا۔ علی بن عاصم کا قول ہے کہ اگر آدمی دنیا کی عقل ایک پلّے میں اور دوسرے پلّے میں حضرت امام ابوحنیفہ کی عقل رکھی جائے تو امام صاحب کا پلّہ بھاری ہوگا۔

امام صاحب کا علمی مرتبہ امام وکیع فرماتے ہیں کہ میں کسی عالم سے نہیں ملا جو امام ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ ہو اور ان سے بہتر نماز پڑھتا ہو[۱]۔

نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ فقہ سے لوگ غافل تھے تو امام صاحب نے بیدار کیا۔ اس کو مرتب و ملخص کیا۔ سفیان ثوری نے ایک شخص سے فرمایا جو امام صاحب کی مجلس سے واپس آیا تھا، کہ "روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے واپس آرہے ہو"۔ خارجہ بن مصیب اور عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ علم وعقل میں امام ابوحنیفہ کی نظیر نہیں (علم سے مراد اس دور میں علم حدیث بھی ہوتا تھا) سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ اپنے زمانہ کے عالم تھے اور اس کے بعد امام شعبی اپنے زمانہ کے عالم ہوئے اور اس کے بعد امام ابوحنیفہؒ۔ یعنی یہ تینوں اپنے اپنے دور میں بے مثال تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کی نظیر میری آنکھوں نے نہیں دیکھا[۲]۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ جس کو فقہ کی معرفت منظور ہو وہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا دامن پکڑے۔

امام صاحب کی تابعیت امام صاحب کے آغاز شباب تک چند صحابہ زندہ تھے، جیسے حضرت انسؓ بن مالک جو حضورؐ کے خادم خاص تھے، ۹۳ھ میں وفات پائی، ابوطفیل عامر بن واثلہ نے ۱۰۲ھ میں عبداللہ بن بُسر المازنی نے ۹۶ھ میں وفات پائی۔ بہرحال جمہور محدثین ومحققین کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ امام صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

---

[۱] حدائق ص ۱۹۷/ج۱۔ [۲] موفق ص ۵۱/ج۲

جمال پیغمبری دیکھنے والوں کے دیدار سے عقیدت کی آنکھیں روشن کی تھیں، بعض حضرات نے امام صاحب کی تابعیت کا انکار کیا ہے۔ لیکن جمہور محدثین و محققین کا اس پر اتفاق ہے، علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت انسؓ بن مالک کو بار بار دیکھا، شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے زمانے میں کوفہ میں کئی صحابۂ کرام جمع تھے، لہٰذا امام صاحب کا طبقۂ تابعین میں ہونا ثابت شدہ حقیقت ہے، یہ فضیلت دیگر ائمہ میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی، جیسے امام مالک، و امام اوزاعی وغیرہ[1]۔ صاحب الکمال بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب نے ۲۶ صحابہ کرامؓ کو دیکھا ہے۔ اس لیے تمام محدثین کبار مثلاً حافظ ابن حجرؒ[2]، علامہ ذہبی، علامہ نووی، زین الدین عراقی، ابن جوزی، دار قطنی وغیرہ نے امام صاحب کی تابعیت کو تسلیم کیا ہے۔[3]

البتہ بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آیا امام صاحب کا کسی صحابیؓ سے روایت کرنا ثابت ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے صحابہؓ سے امام صاحب کی روایات کا انکار کیا ہے، امام دارقطنی ۳۸۵ھ نے کہا ہے "لم یلق ابوحنیفة احداً من الصحابةؓ انه رأی انساً بعینه ولم یسمع منه"[4] ابو حنیفہ نے کسی صحابیؓ سے ملاقات نہیں کی مگر حضرت انسؓ کو دیکھا ہے لیکن ان سے سماع حاصل نہیں ہے۔ خطیب بغدادی نے بھی دارقطنی سے پورا اتفاق کیا ہے۔ لکھتے ہیں "لا یصح لابی حنیفة سماع من انس بن مالكؓ" اس لیے ان کے بعد عام طور پر علماء نے انھیں کی تقلید کی ہے، تعجب ہے حافظ ابن حجرؒ جیسے محقق نے بھی ان دونوں سے اختلاف نہیں کیا، حالانکہ لسان المیزان میں ترجمہ عائشہ بنت عجرد کے تحت یحییٰ بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ان اباحنیفة صاحب الرأی سمع عائشة بنت عجرد تقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[5] یقول اکثر جند اللہ الجراد لا آکله ولا احرمه" بیشک ابو حنیفہ (صاحب الرای) نے حضرت عائشہ بنت عجرد

---

[1] تہذیب التہذیب۔ [2] مقدمہ اوجز ص۔ [3] تبییض الصحیفہ ص۔ [4] تاریخ بغداد ص ۱۱۱/ ۹۶
[5] لسان المیزان ترجمہ عائشہ بنت عجرد .... [6] لسان المیزان میں عبارت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی ہو۔ حدیث کا متن ہم نے کنز العمال سے نقل کیا ہے۔

کو فرماتے ہوئے سُنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ روئے زمین پر اللہ کا بہت بڑا لشکر ٹڈیاں ہیں جس کو نہ میں کھاتا ہوں اور نہ میں حرام کرتا ہوں، ـــــ یہاں امام صاحبؒ کا حضرت عائشہؓ بنت عجرد سے سماع واضح طور پر ثابت ہے۔ ان کے علاوہ متعدد صحابہؓ سے امام صاحب نے حدیثیں سنی ہیں بظاہر ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ امام مسلم کے نزدیک ایک معاصر اگر اپنے معاصر سے بطریقۂ عنعنہ روایت کرے تو وہ روایت متصل سمجھی جاتی ہے' اور امام بخاریؒ کے نزدیک ایک مرتبہ ملاقات کا ہونا بھی اتصال کے لیے کافی ہے۔ اس لیے دونوں کی شرطوں پر امام صاحب کا صحابہ سے روایت کرنا اتصال پر محمول ہوگا۔ اس لیے عبدالقادر قریشی، ملا علی قاری، حافظ بدرالدین عینی وغیرہ نے اس کو تسلیم کیا ہے۔

امام صاحبؒ اور امام مالکؒ خطیب بغدادی نے امام مالک کے اقوالِ جرح امام صاحب کے متعلق اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں، مگر شارح موطا ابوالولید باجی مالکی فرماتے ہیں کہ ان کا انتساب امام مالک کی طرف صحیح نہیں بلکہ سعدی، صیمری، موفق اور خوارزمی نے بیان کیا ہے کہ امام مالک امام صاحب کی کتابوں یعنی ان کے تلامذہ کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے[۵]

بعض علماء نے امام ابوحنیفہؒ کو امام مالک کے تلامذہ میں شمار کیا ہے، علامہ ذہبیؒ نے اشہب کا قول نقل کیا ہے، "رأیت اباحنیفۃ بین یدی مالك کالصبی بین یدی ابیہ" "میں نے امام ابوحنیفہ کو امام مالک کے سامنے اس طرح دیکھا جس طرح بچہ باپ کے سامنے ہوتا ہے"۔ اگرچہ امام صاحب کے لیے یہ بات کوئی عار کی نہیں ہے بلکہ یہ تو غایت کسرو انکسار کی دلیل ہے، مگر علامہ کوثری نے اقوم المسالک میں اس واقعہ کی تردید کی ہے۔" ثمایرویہ الذہبی فی ترجمۃ مالك فی طبقات الحفاظ عن اشہب لایصح الا اذا کان فی حق حماد بن ابی حنیفۃ دون ابیہ لان میلاد اشہب سنۃ ۱۴۵ھ کما یقول ابن یونس الخ (علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں امام مالک کے ترجمہ میں اشہب کی جو روایت نقل کی ہے وہ صحیح نہیں ہوسکتی ہے، ممکن ہے کہ امام صاحب کے صاحبزادے حماد کے سلسلے میں ان کا یہ بیان ہو۔

---

[۵] تانیب الخطیب صـ۳۰۔

اس لیے کہ اشہب کی پیدائش ۱۴۵ھ میں ہے اور امام صاحب کا سن وفات ۱۵۰ھ ہے، گویا امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے وقت اشہب کی عمر ۴-۵ سال سے زیادہ کی نہ تھی۔ پھر امام صاحب کے بارہ میں ان کا اس طرح کا کوئی بیان کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اشہب کی پیدائش مصر میں ہوئی تھی تو اس عمر کے بچے کے لیے مصر سے سفر کر کے مدینہ جانا اور امام مالک کی مجلس میں امام صاحب کو دیکھنا ناقابل فہم ہے۔ بلکہ امام صاحب کا امام مالک سے حدیث کی روایت کرنا بھی خود محتاج ثبوت ہے؛ حتیٰ کہ حافظ ابن حجر نے النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح میں لکھا ہے، ان ابا حنیفۃ لم تثبت روایتہ، عن مالک وانما اوردہ الدارقطنی ثم الخطیب فی الرواۃ عنہ لروایتین وقعتا لھما باسنادین فیھما مقال وھما لم یلتزما فی کتابیھما الصحۃ (امام صاحب کا امام مالک سے روایت کرنا ثابت نہیں ہے، دارقطنی اور ان کے بعد خطیب نے امام مالک کے رواۃ میں صرف دو روایتوں کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ کو شمار کیا ہے اور دونوں کی صحت میں کلام ہے اور خود دارقطنی اور خطیب نے اپنی کتابوں میں صحت کا التزام نہیں کیا ہے)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علامہ کوثری کا رسالہ اقوم المسالک فی بحث روایۃ مالک عن ابی حنیفۃ وروایۃ ابی حنیفۃ عن مالک۔

آخذ علم خطیب بغدادی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ امیر المومنین ابو جعفر نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ آپ نے کن صحابہ کا علم حاصل کیا ہے تو امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہؓ ابن عباس، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کے شاگردوں سے علم حاصل کیا۔[۱]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مذہب حنفی کی بنیاد عبد اللہؓ بن مسعود کے فتاویٰ، حضرت علیؓ کے قضایا و فتاویٰ اور قاضی شریح وغیرہ قضاۃ کوفہ کے فتاویٰ پر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے ان حضرات کے آثار کو سامنے رکھ کر استنباط و استخراج مسائل کیا۔ نیز امام ابو حنیفہؒ، ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ کے مذہب سے بہت کم انحراف کیا کرتے تھے، ابراہیم نخعی کے مذہب پر تخریج مسائل میں امام صاحب کو بڑا ملکہ حاصل تھا، فروعی

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۴

مسائل کے وجوہ تخریج میں بہت ہی دقیق النظر واقع ہوئے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں "اگر تم ہمارے قول کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہو تو ابراہیم نخعی کے اقوال، کتاب الآثار لمحمد اور جامع عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ سے نکال لو اور ملا کر دیکھو تو شاید ہی کسی جگہ اختلاف پاؤگے، اور اگر کسی جگہ اختلاف ہے تو فقہائے کوفہ کے خلاف نہ پاؤگے۔[1]

امام صاحب نے فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں جو عظیم الشان مجددانہ خدمات انجام دی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ امام صاحب نے جس قدر مسائل مدون کیے ہیں ان کی تعداد بارہ لاکھ ستر ہزار سے زائد ہے۔[2]

امام صاحبؒ کی وفات | خاندان نبوت میں واقعہ کربلا کے بعد متعدد افراد نے انقلاب حکومت کی کوشش کی، محمد ذوالنفس الزکیہ نے مدینہ طیبہ میں اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ امام صاحب نے برملا ان کی تائید کی۔ مشہور ہے کہ منصور نے امام صاحب کے سامنے منصب قضاء کی پیشکش کی تھی، مگر امام صاحب نے انکار کردیا، جس کے نتیجہ میں منصور نے ۱۴۶ھ میں قید کردیا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ منصور نے ان کے خلاف جو سخت کارروائی کی اس کی وجہ عہدۂ قضاء سے انکار نہ تھا بلکہ محمد و ابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا، بہرحال بے خبری میں منصور نے آپ کو زہر دلوادیا۔ جب اس کا اثر امام صاحب نے محسوس کیا تو سجدہ میں چلے گئے اور اسی حالت میں رجب ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔[3] انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادے حماد تھے۔

(باقی)

---

[1] الانصاف فی سبب الاختلاف [2] النکت الطریفہ ص۱۵۱ ۔ از کوثری ص۱۵۱ [3] البدایہ والنہایہ ج۱۰ ص۱۰۷

لکھنؤ کے مشہور معالج ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنیؒ کے

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابیطس :۔ اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہو۔ چند ہفتے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہو جتنی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیئے۔ چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہو۔ یہی اس دوا کی سب سے بڑی خصوصیت ہے .... قیمت دس تولہ ...... -/4

مرہم سرخ :۔ پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں اس مرہم کے استعمال کرتے ہی جلن کا فور ہو جاتی ہو اور رفتہ رفتہ پورا چھتہ صاف ہو جاتا ہو۔ اسکے علاوہ ہر قسم کے پھوڑوں میں اس کا لگانا مفید ہو۔ قیمت آٹھ آونس ..... -/4

شربت جذام :۔ جذام میں یہ دوا بیحد مفید ثابت ہوئی ہو۔ پانچ چھ ماہ کے استعمال کر لینے سے یہ مرض بالکل جاتا رہتا ہو۔ (جذام کی آسان پہچان یہ ہو کہ ایک شیشی میں گرم پانی اور دوسری میں ٹھنڈا لے کر جلد میں لگایا جائے۔ اگر فرق محسوس نہ ہو تو جذام سمجھنا چاہیئے۔) .. .. قیمت ایک پونڈ۔ 5/50

شربت کبد :۔ پتہ کی پتھریوں کا درد، یرقان، ورم جگر۔ ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بہت مفید ہے ... . قیمت ایک پونڈ 5/50

ملنے کا پتہ :۔ **حسنی فارمیسی، ۳۷ گوئن روڈ، لکھنؤ**

مذہب اور قانون

از جناب وحید الدین خاں صاحب

انسانی روابط کو جو چیز منصفانہ طور پر متعین کرتی ہے، وہ قانون ہے۔ مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آج تک انسان اپنی زندگی کا قانون دریافت نہ کرسکا۔ کہنے کو اگرچہ ساری دنیا میں قانونی حکومتیں قائم ہیں۔ مگر یہ تمام "قوانین" نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ جبری نفاذ کے سوا ان کی پشت پر کوئی حقیقی وجہ جواز بھی موجود نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رائج الوقت قوانین اپنے حق میں علمی اور نظریاتی بنیاد سے محروم ہیں۔ فلر (L. L. FULLER) کے الفاظ میں قانون نے ابھی اپنے آپ کو نہیں پایا ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے — قانون خود اپنی تلاش میں (THE LAW IN QUEST OF ITSELF)

دور جدید میں ان مسائل پر بے شمار لٹریچر تیار ہوا ہے۔ بڑے بڑے دماغ اپنی اعلیٰ صلاحیتیں اور اپنے بہترین اوقات اس کے لیے صرف کرتے رہے ہیں اور چیمبرز انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں "قانون کو ایک زبردست فن کی حیثیت دے کر اس کو عظیم ترقی تک پہونچا دیا ہے۔" مگر اب تک کی ساری کوششیں قانون کا کوئی متفقہ تصور حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں حتیٰ کہ ایک عالم قانون کے الفاظ میں "اگر دس قانون دانوں کو قانون کی تعریف بیان کرنے کے لیے کہا جائے تو بلا مبالغہ ہم کو گیارہ مختلف قسم کے جوابات سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے" ماہرین قانون کی مختلف اقسام کو الگ کرنے کے لیے انھیں مختلف مکاتب فکر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مگر ان کی قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ بہت سے مصنفین اس طرح کی اختیار کردہ وسیع ترین قسم کی حد بندیوں میں بھی نہیں آتے۔ مثال کے طور پر جان آسٹن (JOHN AUSTIN) کے متعلق پروفیسر پیٹن (G.W. PATON) نے لکھا ہے کہ وہ

تمہاری وسیع قسم بندی (BROAD DIVISIONS) میں سے کسی ایک میں بھی پوری طرح موزوں نہیں بیٹھتا۔"

A TEXT-BOOK OF JURISPRUDENCE (1953) P.5

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین قانون کو وہ صحیح اساس ہی نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ مطلوبہ قانون کی تشکیل کر سکیں۔ وہ قانون کے اندر جن ضروری قدروں کو یکجا کرنا چاہتے ہیں جب وہ انھیں یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکجا نہیں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ماہرین قانون کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مینڈکوں کی پنسیری بنا رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ پانچ مینڈکوں کو یکجا کرے گا تو دوسرے پانچ اس کے پلڑے میں سے پھدک کر نکل چکے ہوں گے۔ اس طرح معیاری قانون کو حاصل کرنے کی کوششیں اب تک صرف ناکامی پر ختم ہوئی ہیں۔ فرائڈمین (W. FRIEDMANN) کے الفاظ میں:

" یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرے۔"

LEGAL THEORY, P.18

جان آسٹن جس کی کتاب پہلی بار ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی، اس نے دیکھا کہ قوت نافذہ کے بغیر کوئی قانون قانون نہیں بنتا۔ اس لیے اس نے قانون کی تعریف یہ کی:

"قانون ایک حکم ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ شخص (POLITICAL SUPERIOR) نے سیاسی طور پر ادنیٰ شخص (POLITICAL INFERIOR) کے لیے نافذ کیا ہو۔"

A TEXT-BOOK OF JURISPRUDENCE, P.56

اس تعریف میں قانون بس ایک صاحب اقتدار کا فرمان (COMMAND OF THE SOV-) (-EREIGN) بن کر رہ گیا۔ (دیپٹن صفحہ ۹)

چنانچہ بعد کو اس پر شدید اعتراضات کیے گئے نیز حکمرانوں کی بدعنوانی دیکھ کر ذہنوں میں یہ تصور ابھرا کہ قانون سازی میں قوم کی مرضی کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ چنانچہ ایسے علمائے قانون پیدا ہوئے جنھوں نے کسی ایسے ضابطہ و قاعدہ کو قانون تسلیم کرنے سے انکار کیا جس کی پشت پر قوم کی

رضامندی نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ضابطہ تمام اہلِ علم اور معلمین اخلاق کے نزدیک صحیح اور مفید ہونے کے باوجود محض اس لیے رائج نہیں ہو سکتا کہ رائے عامہ اس کے خلاف ہے۔ مثلاً امریکا میں شراب پر پابندی کے قانون کو امریکی قوم کی رضامندی نہ ملنے کی وجہ سے قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ اسی طرح برطانیہ میں قتل کی سزا میں ترمیم کرنی پڑی اور ہم جنسی جیسی قبیح حرکت کو قانون کی حد میں لانا پڑا حالانکہ ملک کے جج اور سنجیدہ لوگ اس کے خلاف تھے۔

اسی طرح یہ بات بھی زبردست بحث کا موضوع رہی ہے کہ قانون قابلِ تغیر ہے یا ناقابلِ تغیر۔ قرونِ وسطیٰ اور زمانۂ قبل تجدید میں قانونِ طبیعی یا قانونِ فطرت کو کافی فروغ ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کی جو فطرت ہے وہی قانون کا بہترین ماخذ ہے:۔

"فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شے پر حکومت کا حق خود اسی کے فطری تقاضوں اور رہنما اصولوں کو پہونچتا ہے اور انسان کے لیے قدرت نے یہ رہنما اصول اس کی عقل کی شکل میں پیدا کیے ہیں۔ لہذا انسان پر حکومت خود اپنی عقل کے زور سے ہی قائم کی جا سکتی ہے۔"

JURISPRUDENCE, BY BODENHEIMER, P. 164

اس تصور نے قانون کو ایک آفاقی بنیاد فراہم کی یعنی وہ ایک ایسی چیز سمجھا جانے لگا جس کو ہمیشہ ایک ہی رہنا چاہیے۔ یہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کا قانونی تصور تھا۔ اس کے بعد دوسرا مکتبِ فکر پیدا ہوا اور اس نے دعویٰ کیا کہ قانون کے آفاقی قواعد معلوم کرنا بالکل ناممکن ہے۔ کوہلر (KOHLER) لکھتا ہے:۔

"یہاں کوئی ابدی قانون (ETERNAL LAW) نہیں ہے۔ ایک قانون جو ایک عہد کے لیے موزوں ہے وہی لازمی طور پر دوسرے عہد کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ ہم صرف اس بات کی کوشش کر سکتے ہیں کہ ہر کلچر کے لیے اس کے مناسب حال نظام قانون فراہم کر دیں۔ کوئی چیز جو ایک کے لیے خیر ہو وہی دوسرے کے لیے مہلک ہو سکتی ہے۔"

PHILOSOPHY OF LAW, P. 5

اس تصور نے پہلے پیش رو نظریہ کی غلطی واضح کی۔ مگر اس نے دوسری خرابی یہ پیدا کی کہ فلسفۂ قانون کا سارا استحکام ختم کر دیا۔ یہ تصور انسانی فکر کو اندھا دھند تغیر پذیری (RELATIVISM) کی طرف لے جاتا ہے اور چونکہ یہ کسی بنیاد سے محروم ہے اس لیے اس کی کوئی منزل نہیں۔ یہ تصور زندگی کی تمام اقدار کو تلپٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔

پھر ایک گروہ نے ہر طرف سے سمٹ کر عدل کے پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ لارڈ برائٹ (BRIGHT) ڈین رَاسکو پاؤنڈ (DEAN ROSCOE POUND) کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"راسکو پاؤنڈ ایک ایسی بات کہتا ہے جس کی صداقت پر میں اپنے تمام تجربات اور قانونی مطالعہ کے نتیجے میں بالکل مطمئن ہو چکا ہوں وہ یہ کہ قانون کا ابتدائی اور بنیادی مقصد ____ انصاف کی تلاش (QUEST OF JUSTICE) ہے۔"

مگر یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انصاف کیا ہے اور اس کو کیسے متعین کیا جائے۔ نتیجہ یہ کہ بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں پہونچ جاتی ہے جہاں آسٹن کو ہم نے چھوڑا تھا۔ اس طرح سیکڑوں برس کی تلاش و تحقیق کے باوجود انسان اب تک قانون کی تشکیل کے لیے کوئی واقعی بنیاد فراہم نہ کر سکا۔ یہ احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ جدید فلسفہ، مقاصد قانون کے اہم مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ پروفیسر پیٹن لکھتے ہیں :۔

"کیا مفادات ہیں جن کا تحفظ ایک معیاری قانونی نظام کو کرنا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اقدار (VALUES) سے متعلق ہے۔ اور وہ فلسفۂ قانون کے دائرۂ بحث میں آتا ہے۔ مگر اس معاملے میں ہم فلسفہ سے جتنی زیادہ مدد لینا چاہتے ہیں اتنا ہی اس کا حصول مشکل معلوم ہوتا ہے، کوئی بھی قابل قبول پیمانۂ اقدار اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ درحقیقت صرف مذہب ہی میں ایسا ہے کہ ہم اس کی ایک بنیاد پا سکتے ہیں۔ مگر مذہب کی صداقتیں عقیدہ یا وجدان کے تحت قبول کی جاتی ہیں نہ کہ منطقی استدلال کی بنیاد پر۔"

آگے وہ کچھ علمائے قانون کا یہ خیال نقل کرتا ہے کہ وہ مدتوں فلسفۂ قانون کی بھول بھلیاں میں گردش کرنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ فلسفۂ قانون نے قانون کے مقصد کے فلسفیانہ مطالعہ کی جو کوشش کی ہے وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہونچی (صفحہ ۱۰۶) پھر وہ سوال کرتا ہے، کیا کچھ معیاری اقدار ہیں جو ارتقائے قانون میں اس کی رہنمائی کرتی ہیں" ایسی اقدار اگرچہ اب تک دریافت نہیں ہو سکیں لیکن وہ قانون کے لیے ناگزیر ہیں۔ مگر دقت یہ ہے کہ مذہب کو الگ کرنے کے بعد اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

یہ طویل تجربہ انسان کو دوبارہ اسی طرف لوٹنے کا اشارہ کرتا ہے جہاں سے اس نے انحراف کیا تھا۔ قدیم زمانے میں قانون کی تدوین و تشکیل میں مذہب کا بہت بڑا حصہ ہوتا تھا۔ چنانچہ تاریخ قانون کا ماہر سر ہنری مین (SIR HENRY MAINE) لکھتا ہے :۔

"تحریری طور پر منضبط قانون کا کوئی ایسا نظام، جیسن سے پیرو (PERU) تک ہمیں نہیں ملتا جو اپنے دور آغاز ہی سے مذہبی رسوم و عبادات کے ساتھ ہم رشتہ نہ رہا ہو۔"

EARLY LAW AND CUSTOM, P.5

اب وقت آگیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ خدا کی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لیے قانون وضع نہیں کر سکتا۔ لاحاصل کوشش کو مزید جاری رکھنے کے بجائے اب ہمارے لیے بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر فرائڈمین کے الفاظ میں ہم اعتراف کر لیں کہ :۔

"ان مختلف کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انصاف کے حقیقی معیار کو معین کرنے کے لیے مذہب کی رہنمائی حاصل کرنے کے سوا دوسری ہر کوشش بے فائدہ ہوگی اور انصاف کے مثالی تصور کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لیے مذہب کی دی ہوئی اساس بالکل منفرد طور پر حقیقی اور سادہ بنیاد ہے۔"

LEGAL THEORY. P.450

مذہب کے اندر ہم کو وہ تمام بنیادیں نہایت صحیح شکل میں مل جاتی ہیں جو ایک معیاری قانون کے لیے ماہرین تلاش کر رہے ہیں مگر وہ اب تک اسے نہ پا سکے۔

۱۔ قانون کا سب سے پہلا اور لازمی سوال یہ ہے کہ قانون کون دے، وہ کون ہو جس کی منظوری (SANCTION) سے کسی قانون کو قانون کا درجہ عطا کیا جائے۔ ماہرین قانون ابتک اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکے۔ اگر حاکم کو بحیثیت حاکم یہ مقام دیں تو نظری طور پر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک یا چند اشخاص کو دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق کیوں دیا جائے اور نہ عملاً یہ مفید ہے کہ ایک شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جو چاہے قانون بنائے اور جس طرح چاہے نافذ کرے۔ اور اگر معاشرہ اور اجتماع کو "قانون ساز" قرار دیں تو یہ اور زیادہ مہمل بات ہے۔ کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم و عقل ہی نہیں رکھتا جو قانون سازی کے لیے ضروری ہے۔ قانون بنانے کے لیے بہت سی مہارتوں اور واقفیتوں کی ضرورت ہے۔ جس کی نہ عام لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ان کو اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ ان میں درک حاصل کر سکیں۔ اسی طرح عملاً بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرہ کی کوئی ایسی رائے معلوم کی جا سکے جو سارے معاشرہ کی اپنی رائے ہو۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلہ کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ پوری آبادی کے عاقل اور بالغ افراد اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ منتخب لوگ اجتماع کے نمائندے کی حیثیت سے اجتماع کے لیے قانون بنائیں۔ مگر اس اصول کی غیر معقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ ۵۱ فیصدی کو صرف دو عدد کی اکثریت کی بنا پر یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ ۴۹ فیصدی کی نام نہاد اقلیت پر حکمرانی کریں۔ مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طریقے کے اندر اتنے خلا ہیں کہ عموماً ۵۱ فیصدی کی اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی اور مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں اس وقت ہم جس حکومت کے ماتحت ہیں وہ سنہ ۱۹۶۲ء میں تیسرے عام الکشن کے ذریعہ برسر اقتدار آئی ہے۔ کانگرس کو ملک میں یہ اقتدار ستر فیصدی نشستوں پر قبضہ کرکے حاصل ہوا ہے جبکہ اس کو ووٹ صرف چالیس فیصدی ملے تھے۔ یہی حال آزادی کے بعد پچھلے دونوں الکشنوں کا بھی تھا۔ ہر بار کانگرس کو پچاس فیصدی سے کم ووٹ ملے مگر اس کے باوجود ہر بار اسی نے حکومت بنائی کیونکہ بقیہ ووٹ پچاس فیصدی سے زائد ہونے کے باوجود مختلف پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے اور کسی ایک پارٹی کے مقابلے میں کانگرس کے رائے دہندگان کی تعداد زیادہ تھی۔

اس طرح فلسفۂ قانون کو آج تک اس مسئلہ کا کوئی واقعی حل معلوم نہ ہو سکا۔ مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون کا ماخذ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کا اور ساری طبیعی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے، اسی کو حق ہے کہ وہ انسان کے تمدن و معاشرت کا قانون وضع کرے۔ اسکے سوا کوئی بھی نہیں ہے جس کو یہ حیثیت دی جاسکے۔ یہ جواب اتنا سادہ اور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلے کا کوئی اور جواب نہیں ہو سکتا۔ یہ جواب اصل سوال پر اسی طرح بالکل راست آرہا ہے جیسے کوئی ڈھکن غلط شیشیوں پر بیٹھ نہ رہا ہو اور جیسے ہی اس کے اصل مقام پر اسے لایا جائے وہ ٹھیک ٹھیک اس پر بیٹھ جائے۔

اس جواب میں قانون بنانے اور حکم دینے کا حق ٹھیک اس جگہ پہونچ گیا جہاں نہ پہونچنے کی وجہ سے ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ ہم اس کو کہاں لے جائیں۔ انسانوں کے اوپر انسان کو حاکم اور قانون ساز نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کا حق تو صرف اسی کو ہے جو سارے انسانوں کا خالق اور بالفعل ان کا طبیعی حاکم ہے۔

۲۔ قانون کا ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اس کا سارا حصہ اضافی ہے یا اس کا کوئی جز حقیقی نوعیت بھی رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر وہ قانون جو آج رائج ہے وہ کل بدلا جاسکتا ہے۔ یا اس کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو ناقابلِ تغیر ہے۔ اس سلسلے میں طویل ترین بحثوں کے باوجود آج تک کوئی قطعی بنیاد حاصل نہ ہو سکی۔ علمائے قانون

اُصولی طور پر اسی کو ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون میں ایک ایسا عنصر ضروری ہے جو دوامی نوعیت رکھتا ہو اور اسی کے ساتھ اس میں ایسے اجزا بھی ہونے چاہئیں جن میں لچک ہو تاکہ بدلتے ہوئے حالات پر انھیں بآسانی منطبق کیا جا سکے۔ دونوں میں سے کسی ایک پہلو کی کمی بھی قانون کے لیے سخت مضر ہے۔ امریکہ کے ایک جج مسٹر کارڈوزو (JUSTICE CARDOZO) لکھتے ہیں :-

"آج قانون کی اہم ترین ضرورتیات میں سے ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا فلسفۂ قانون مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متحارب تقاضوں کے درمیان توافق پیدا کرے۔"

THE GROWTH OF THE LAW, P.

ایک اور عالم قانون لکھتا ہے :

"قانون کو ضرور مستحکم ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں جمود نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے قانون کے متعلق مفکرین نے اس بارے میں کافی جد و جہد کی ہے کہ کس طرح استحکام اور تبدیلی کے دو طرفہ تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔"

ROSCOE POUND, INTERPRETATIONS OF LEGAL HISTORY. P.1

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی قوانین میں اس قسم کا فرق پیدا کرنا ناممکن ہے کیونکہ قانون کے کسی حصہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ دائمی اور ناقابل تغیر ہے، کوئی دلیل چاہتا ہے اور انسانی قانون ایسی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہے۔ آج کچھ لوگ ایک قانون کو اپنی عقل سے دائمی قرار دیں گے اور کل کچھ لوگوں کی عقل کو نظر آئے گا کہ وہ دائمی ہونے کے قابل نہیں ہے اور وہ دوبارہ اس کے قابل تغیر ہونے کا اعلان کر دیں گے۔ اور چونکہ دونوں "انسان" ہیں، اس لیے آپ نہیں کہہ سکتے کہ کیوں ایک کو صحیح مانیں اور دوسرے کو غلط قرار دیں۔

خدا کا قانون ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔ خدا کا قانون ہم کو وہ تمام بنیادی اصول دے دیتا ہے جو غیر تبدیل طور پر ہمارے قانون کا لازمی جزو ہونے چاہئیں۔ یہ قانون کچھ بنیادی اُمور کے بارے میں بنیادی پہلوؤں کا تعین کرتا ہوا اور بقیہ امور اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں خاموش ہے۔ اس طرح وہ اس فرق کا تعین کر دیتا ہو کہ قانون کا کون سا حصہ دائمی اور کون سا حصہ قابل تغیر ہے پھر وہ خدا کا قانون ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ یہ ترجیحی دلیل بھی رکھتا ہے کہ کیوں ہم اس تعیین کو مبنی بر حق سمجھیں اور اس کو لازمی قرار دیں۔

یہ خدائی قانون کی ایک بہت بڑی دین ہے۔ بلکہ ایک ایسی دین ہے جس کا بدل فراہم کرنا انسان کے لیے

قطعی ناممکن ہے۔

۳۔ اسی طرح قانون کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس اس بات کی کوئی معقول وجہ موجود ہو کہ وہ کیوں کسی چیز کو "جرم" قرار دیتا ہے۔ انسانی قانون کے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ جو عمل "امن عامہ یا نظم مملکت" میں خلل ڈالتا ہو وہ جرم ہے اس کے بغیر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی فعل کو جرم کیسے قرار دے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون مروجہ کی نگاہ میں زنا، اصلاً جرم نظر نہیں آتا بلکہ وہ صرف اسی وقت جرم بنتا ہے جبکہ طرفین میں سے کسی نے دوسرے پر جبر کیا ہو۔ گویا انسانی قانون کے نزدیک اصل جرم زنا نہیں بلکہ جبر واکراہ ہے۔ جس طرح زبردستی کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنا جرم ہے اسی طرح زبردستی اس کی آبرو پہ دست درازی بھی جرم ہے۔ لیکن باہمی رضامندی سے جس طرح ایک کا مال دوسرے کے لیے جائز ہو جاتا ہے اسی طرح گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت بھی دوسرے پہ حلال ہو جاتی ہے۔ اس باہمی رضامندی کی شکل میں قانون، زنا کا حامی و محافظ بن جاتا ہے اور اگر غیر شخص مداخلت کر کے انھیں روکنا چاہے تو الٹا وہی شخص مجرم بن جائے گا۔

زنا کا ارتکاب سوسائٹی میں زبردست فساد پھیلاتا ہے، وہ ناجائز اولاد کے مسائل پیدا کرتا ہے، وہ رشتۂ نکاح کو کمزور کر دیتا ہے، وہ سطحی لذتیت کا ذہن پیدا کرتا ہے وہ چوری اور خیانت کی تربیت کرتا ہے، وہ قتل اور اغوا کو فروغ دیتا ہے، وہ سارے سماج کے دل و دماغ کو گندا کر دیتا ہے مگر اس کے باوجود قانون اسے کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس کے پاس زنا با لرضا کو جرم قرار دینے کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی قانون کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ شراب نوشی کو جرم کیوں قرار دے۔ کیونکہ اکل و شرب انسان کا ایک فطری حق ہے اس لیے وہ جو چاہے کھائے اس میں قانون کو مداخلت کرنے کی کیا ضرورت اس لیے اس کے نزدیک نہ شراب پینا جرم ہے اور نہ اس سے پیدا شدہ بدمستی اصلاً قابل مواخذہ ہے۔ البتہ نشے کی حالت میں اگر مخمور کسی سے گالم گلوج کر بیٹھا یا ہاتھا پائی کی نوبت آگئی، یا شارع عام پر وہ اس طرح جھومتا ہوا چلا کہ خمار اس کی حرکات سے بالکل نمایاں تھا، تب کہیں جا کر قانون اس پر ہاتھ ڈالنا جائز سمجھے گا، گویا انسانی قانون کی رو سے فی الحقیقت شراب نوشی کا فعل قابل گرفت نہیں ہے بلکہ اصل قابل گرفت جرم دوسروں کو ایک خاص شکل میں ایذا پہونچانا ہو۔

شراب نوشی صحت کو تباہ کرتی ہے، وہ مال کی ضیاع اور بالآخر اقتصادی بربادی تک لے جا سکتی ہے، اس سے اخلاق کا احساس کمزور پڑتا ہے اور انسان دھیرے دھیرے حیوان بن جاتا ہے۔ شراب مجرمین کی بہترین

مددگار ہے جس کو پینے کے بعد لطیف احساسات مفلوج ہو جاتے ہیں اور پھر قتل، چوری، ڈاکہ اور عصمت دری کے واقعات کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر قانون اسے بند نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کیوں لوگوں کے اختیاری اکل و شرب پر پابندی عائد کرے۔

اس مشکل کا جواب صرف خدائی قانون میں ہے۔ کیونکہ خدا کا قانون مالک کائنات کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے۔ کسی قانون کا خدائی قانون ہونا بذات خود اس بات کی کافی وجہ ہے کہ وہ بندوں کے اوپر نافذ ہو اس کے بعد اس کے لیے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں۔ اس طرح خدائی قانون قانون کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے کہ کس بنیاد پر کسی فعل کو قانون کی زد میں لایا جائے۔

۴۔ قانون کبھی خود مکتفی نہیں ہو سکتا۔ مختلف وجوہ کی بنا پر اس کے ساتھ اخلاق کا ہمرشتہ ہونا ضروری ہے۔

الف۔ مثلاً ایک مقدمہ قانون کے سامنے آتا ہے۔ اس وقت اگر خالص سچائی منظر عام پر نہ آئے تو قانون کا عادلانہ مقصد کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا اور اسکے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔ گویا قانون کے ساتھ کسی ایسے ماورائے قانون تصور کی بھی لازمی ضرورت ہے جو لوگوں کے لیے سچ بولنے کا محرک بن سکے۔ سچائی کے لازمہ قانون و انصاف ہونے کا اعتراف دنیا بھر کی عدالتیں اس طرح کرتی ہیں کہ وہ ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم کھائے اور حلف اٹھا کر اپنا بیان دے۔ قانون کیلئے مذہبی اعتقادات کی اہمیت کی یہ ایک نہایت واضح مثال ہے مگر جدید سوسائٹی میں مذہب کی حقیقی اہمیت چونکہ ہر پہلو سے ختم کر دی گئی ہے اس لیے عدالتوں کی مذہبی قسمیں اب صرف ایک روایت بلکہ مسخرہ پن بن کر رہ گئی ہیں اور ان کا کوئی واقعی فائدہ باقی نہیں رہا ہے۔

ب۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قانون جس فعل کو جرم قرار دے کر اس پر سزا دینا چاہتا ہے اسکے بارے میں خود سماج کے اندر بھی یہ احساس موجود ہو کہ یہ فعل جرم ہو۔ محض قانونی کوڈ میں چھپے ہوئے الفاظ کی بنا پر وہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی جو کسی جرم پر سزا کے اطلاق کے لیے درکار ہو۔ ایک شخص جب جرم کرے تو اس کے اندر مجرمانہ احساس (GUILTY MIND) کا پایا جانا ضروری ہے، وہ خود اپنے آپ کو مجرم سمجھے اور سارا سماج اس کو مجرم کی نظر سے دیکھے، پولیس پورے یقین کے ساتھ اس پر دست اندازی کرے، عدالت میں بیٹھنے والا جج پوری آمادگی قلب کے ساتھ اس پر سزا کا حکم جاری کرے۔ دوسرے لفظوں میں ایک فعل کے "جرم" ہونے کے لیے اس کا "گناہ" ہونا ضروری ہو۔ قانون کے تاریخی مکتب فکر کا یہ کہنا کہ — "قانون سازی جبھی کامیاب ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس نسل کے

داخلی اعتقادات (INTERNAL CONVICTIONS) کے مطابق ہو جس کے لیے قانون وضع کیا گیا ہے، اگر وہ اس سے غیر متعلق ہو تو ایسے قانون کا ناکام ہونا یقینی ہے[۱]۔ اپنے مخصوص مکتب فکر کے استدلال کے طور پر تو صحیح نہیں ہے مگر اس میں ایک خارجی صداقت بے شک موجود ہے۔

ج۔ ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہو کہ قانون کے عمل درآمد سے پہلے سماج کے اندر ایسے محرکات موجود ہوں جو لوگوں کو جرم کرنے سے روک سکتے ہوں۔ صرف پولس اور عدالت کا خوف اس کے لئے کافی محرک نہیں بن سکتا۔ کیونکہ پولس اور عدالت کے اندیشہ سے تو رشوت، سفارش، غلط وکالت اور جھوٹی گواہیاں بھی بچا سکتی ہیں۔ اور اگر ان چیزوں کو استعمال کر کے کوئی شخص اپنے آپ کو جرم کے قانونی انجام سے بچا لے جائے تو پھر اسے مزید کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

خدائی قانون میں ان تمام چیزوں کا جواب موجود ہے۔ خدائی قانون کے ساتھ مذہب و آخرت کا عقیدہ وہ ماورائے قانون فضا پیدا کرتا ہے جو لوگوں کو بھلائی پر ابھارے۔ وہ اس درجہ موثر ہے کہ اگر کوئی شخص وقتی مفاد کے تحت جھوٹا حلف اٹھالے تو اپنے دل کو ملامت سے نہیں بچا سکتا۔ ویسٹرن سرکٹ کی عدالت میں ایک پتھر نصب ہے جو اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے کہ ایک گواہ نے قسم کے عام کلمات دہرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ "اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان یہیں قبض کرلے" چنانچہ وہ شخص وہیں دھڑام سے گرا اور گر کر اس کا خاتمہ ہو گیا[۲]۔ اس طرح کے واقعات اور بھی پیش آتے ہیں۔ اسی طرح جرم کے فعل شنیع ہونے کا عام احساس بھی محض اسمبلی کے پاس کردہ ایکٹوں کے ذریعہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کی بھی واحد بنیاد خدا اور آخرت کا عقیدہ ہو۔ اسی طرح جرم نہ کرنے کا محرک بھی صرف مذہب ہی پیدا کر سکتا ہو کیونکہ مذہب صرف قانون نہیں دیتا بلکہ اسی کے ساتھ یہ تصور بھی لاتا ہے کہ جس نے یہ قانون عائد کیا ہو وہ تمھاری زندگی کو دیکھ رہا ہو۔ تمھاری نیت، تمھارا قول، تمھاری تمام حرکتیں اس کے ریکارڈ میں مکمل طور پر ضبط ہو چکی ہیں۔ مرنے کے بعد تم اس کے سامنے پیش کئے جاؤگے

---

[۱] A TEXTBOOK OF JURISPRUDENCE, P. 15

[۲] THE CHANGING LAW, P. 103

اور تمھارے لئے ممکن نہ ہوگا کہ تم اپنے جرائم پر پردہ ڈال سکو۔ آج اگر سزا سے بچ گئے تو وہاں کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ بلکہ دنیا میں اپنے جرم کی سزا سے بچنے کے لئے اگر تم نے غلط کوششیں کیں تو آخرت کی عدالت میں تمھارے اوپر دوہرا مقدمہ چلے گا اور وہاں ایک ایسی سزا ملے گی جو دنیا کی سزا کے مقابلے میں کروروں گنا زیادہ سخت ہو۔

۵۔ انگلستان کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے۔ جیمز اول (JAMES I) نے اعلان کیا کہ وہ مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کر سکتا ہے اور عدالتوں میں استغاثہ اور مرافعہ کے بغیر معاملات میں آخری فیصلے دے سکتا ہے۔ یہ مشہور چیف جسٹس لارڈ کوک (COKE) کا زمانہ تھا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھے اور اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا "تمھیں فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہو۔ تمام مقدمات عدالت میں جانے چاہئیں"۔ بادشاہ نے کہا "میرا خیال ہو اور یہی میں نے سنا بھی ہو کہ ہمارے قوانین کی بنیاد عقل پر رکھی گئی ہو۔ تو کیا مجھ میں ججوں سے کم تر عقل ہو" "چیف جسٹس نے جواب دیا" تم بلاشبہ بہت علم و صلاحیت کے مالک ہو۔ لیکن قانون کے لئے بڑے تجربے اور مطالعہ کی ضرورت ہو۔ یہ تو ایک سنہری پیمانہ ہو جس سے رعایا کے حقوق کی پیمائش کی جاتی ہو اور خود جناب والا کی حفاظت کی جاتی ہو۔ بادشاہ نے انتہائی غصہ ہو کر کہا "کیا میں بھی قانون کے ماتحت ہوں، ایسا کہنا تو غداری ہو"۔ لارڈ کوک نے برکٹین (BRACTON) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:

"بادشاہ کسی آدمی کا ماتحت نہیں مگر وہ خدا اور قانون کا ماتحت ہے"۔

THE CHANGING LAW BY SIR ALFRED DENNING 9 (1953) 117—18

حقیقت یہ ہو کہ اگر ہم خدا کو قانون سے الگ کر دیں تو ہمارے پاس یہ کہنے کی کوئی معقول بنیاد نہیں رہتی کہ "بادشاہ قانون کے ماتحت ہو" کیونکہ جن افراد نے خود اپنی رایوں سے قانون بنایا ہو، جن کے اذن (SANCTION) سے وہ قانونی طور پر جاری ہوا ہو، جو اس کو باقی رکھنے یا بدلنے کا حق رکھتے ہوں۔ آخر کس بنا پر وہ اس کے ماتحت ہو جائیں گے۔ جب انسان ہی قانون ساز ہو تو بالکل فطری طور پر وہ خدا اور قانون دونوں کا جامع ہو جاتا ہو۔ وہ خود ہی

خدا اور خود ہی قانون ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں قانون سازوں کو قانون کے دائرے میں لانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ تمام جمہوریتوں میں شہری مساوات کے اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود قانونی طور پر سب یکساں نہیں ہیں۔ اگر آپ ہندوستان کے صدر، گورنر، وزیر یا کسی افسر اعلیٰ پر مقدمہ چلانا چاہیں تو آپ اسی طرح اس کے خلاف مقدمہ نہیں چلا سکتے جیسے ایک عام شہری کے خلاف آپ کر لیتے ہیں۔ بلکہ ایسے کسی مقدمے کو عدالت میں لے جانے سے پہلے حکومت سے اس کی اجازت لینی ہوگی۔ دستور ہند کی دفعہ ۳۶۱ کے تحت صدر جمہوریہ اور ریاستوں کے گورنر کے لئے یہ تحفظ دیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر کسی عدالت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے خلاف کسی دعوے کی سماعت کر سکے، اسی طرح وزرار کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لئے حکومت سے پیشگی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ بلکہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۹۷ کی رو سے "کوئی جج، مجسٹریٹ یا کوئی سرکاری ملازم، جو مرکزی یا صوبائی حکومت کی اجازت کے بغیر اپنے عہدہ سے معزول نہ کیا جا سکتا ہو، اگر اس کے خلاف کسی بدعنوانی کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تو اس کی سماعت کا حق کسی عدالت کو اس وقت تک نہیں ہے جب تک مرکزی یا ریاستی حکومت سے اس کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے جس سے کہ اس شخص کی ملازمت متعلق ہو"۔ دوسرے لفظوں میں اگر آپ کسی اعلیٰ سیاسی یا انتظامی شخصیت پر مقدمہ چلانا چاہیں تو خود انھیں سے یہ پوچھنا ہوگا کہ آپ کے اوپر مقدمہ چلایا جائے یا نہیں ــــ

یہ ہندستان کے قانونی نظام کا نقص نہیں ہے بلکہ انسانی قانون کا نقص ہے اور یہ نقص ہر اس جگہ پایا جاتا ہے جہاں انسانی قانون سازی کا اصول رائج ہے صرف خدائی قانون میں یہ ممکن ہے کہ ہر شخص کی حیثیت قانون کی نظر میں بالکل یکساں ہو اور ایک حاکم پر اسی طرح عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکے جس طرح محکوم پر چلایا جاتا ہے کیونکہ ایسے نظام میں قانون ساز خدا ہوتا ہے اور بقیہ تمام لوگ یکساں طور پر اس کے محکوم۔

۶۔ قانون کی آخری اور سب سے بڑی خصوصیت جس کو ہمارے ماہرین صدیوں سے تلاش کر رہے ہیں اور اب تک وہ اسے حاصل نہ کر سکے، وہ بھی صرف مذہبی قانون میں موجود ہے۔

یعنی قانون کی منصفانہ بنیاد۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ منصفانہ قانون کی بنیاد کا حاصل نہ ہونا تلاش کے ناکمل ہونے کا ثبوت ہے نہ کہ اس بات کا ثبوت کہ انسان اسے حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ طبیعی قوانین کی دریافت میں انسان نے بے حساب ترقی کی ہے اور اس کے مقابلے میں تمدنی قوانین کی دریافت میں اسی درجہ کی کوششوں کے باوجود ایک فی صد بھی کامیابی نہیں ہوئی، تو ہم یہ جاننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ محض تلاش کے ناکمل ہونے کا ثبوت نہیں ہے بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو چیز تلاش کی جا رہی ہے اس کا پانا انسان کے بس ہی میں نہیں۔

دنیا میں سب سے پہلا فوٹو ایک فرانسیسی سائنسداں نے ۱۸۲۶ء میں کھینچا۔ اس میں آٹھ گھنٹے کا وقت لگا اور اس نے اپنے کمرے کے برآمدے کا فوٹو کھینچا تھا۔ لیکن تصویر کشی کی موجودہ رفتار کا حال یہ ہے کہ فلم کا ریکارڈنگ کیمرا ایک سکنڈ میں دو ہزار سے بھی زیادہ تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے جتنی دیر میں صرف ایک تصویر کھینچی جا سکتی تھی، اتنی دیر میں آج چھ کروڑ تصویریں لی جا سکتی ہیں۔ گویا رفتار کے معاملے میں ۱۴۰ سال میں انسان نے چھ کروڑ گنا زیادہ ترقی کی ہے۔ امریکا میں بیسویں صدی کے آغاز میں سارے ملک میں صرف چار موٹر کاریں تھیں اور اب تقریباً دس کروڑ کاریں وہاں کی سڑکوں پر دوڑتی ہیں۔ انسان کی باریک بینی کا یہ حال ہے کہ آج وہ $\frac{1}{1000000000}$ سکنڈ کو بھی ہزارویں حصے تک تقسیم کر سکتا ہے یعنی ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصے کا ہزارواں حصہ — چنانچہ زمین کی گردش میں فرق پڑنے سے اگر ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصے کے بقدر دن چھوٹا یا بڑا ہو تو رصدگاہوں میں اسے معلوم کر لیا جاتا ہے۔ آج ایسے حساس آلے دریافت ہو چکے ہیں کہ اگر تیس جلدوں کی انسائیکلو پیڈیا میں کسی ایک صفحہ پر دو الفاظ بڑھا دیے جائیں تو اس کی سیاہی سے وزن میں جو فرق پڑے گا اس کو وہ فوراً بتا دیں گے — یہ طبیعی قوانین کی دریافت میں انسان کی ترقی کا حال ہے مگر جہاں تک تمدنی قوانین کا معاملہ ہے، وہ اس میں ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ کیا یہ اس بات کا قرینہ نہیں کہ کیمرہ اور موٹر کار کے اصول معلوم کرنے کا جو ماخذ ہے وہی انسانی زندگی کے اصول معلوم کرنے کا ماخذ نہیں، اس کا ماخذ کہیں اور ہے —

کراچی اور لاہور کی مطبوعات

بخاری شریف	اردو ترجمہ۔ کامل		زادالمعاد	اردو ترجمہ	مکمل
	۳ جلدوں میں	۳۶/= مجلد		۴ جلدوں میں	۴۸/=
ترمذی شریف	اردو ترجمہ۔ کامل		تاریخ اسلام	اکبر شاہ خاں	۳۸/=
	۲ جلدوں میں	۱۸/= مجلد	آئینہ حقیقت نما	”	۱۲/=
زبدۃ البخاری	اردو	۱۲/= مجلد	تاریخ الخلفاء	اردو	۱۲/=
مشارق الانوار	”	۱۵/= مجلد	تاریخ غرناطہ کامل	اردو	۲۲/=
تحفۂ اثنا عشریہ		۱۵/= مجلد	خلافت بنو امیہ۔ کامل	”	۲۱/=
تقویۃ الایمان		۹/= مجلد	تاریخ فلاسفۃ الاسلام	اردو	۹/=
کتاب الروح	اردو	۱۰/= مجلد	فلسفۂ اسلام	”	۷/=
سیرۃ محمدیہ		۱۲/= مجلد	دعوت اسلام	اردو (از آرنلڈ)	۹/=
انسان کامل	اردو	۱۱/= مجلد	نظام الملک طوسی		۱۲/=
سفینۃ الاولیاء	”	۷/= مجلد	الاحکام السلطانیہ	اردو	۱۰/=
طبقات الاولیاء	”	۱۳/= مجلد	مکاتیب امام غزالی	اردو	۴/=

مفید، علمی و دینی کتابیں

قاموس القرآن

یعنی مکمل قرآنی ڈکشنری

جس میں تمام الفاظ قرآنی کا اردو ترجمہ، ان کی مکمل صرفی و نحوی تشریح نیز وضاحت طلب الفاظ پر آسان زبان میں مختصر اور جامع نوٹ لکھے گئے ہیں۔ از مولانا قاضی زین العابدین سجاد ۸۰۰ صفحات، قیمت مجلد ۹/۰

بیان اللسان

اردو عربی ڈکشنری

عربی زبان کے طالبعلموں کیلئے ایک متوسط ڈکشنری جو جدید طرز پر مرتب کی گئی ہے اور کسی لفظ کے معنی دیکھنے کیلئے اسکے مادہ کی تلاش نہیں کرنا پڑتی۔ از مولانا قاضی زین العابدین سجاد

صفحات ۸۶۴، قیمت مجلد ۱۰/۰

پیغمبر عالم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر ایک نئی مستند فاضلانہ کتاب۔ از مولانا عبد الصمد رحمانی (نائب امیر شریعت بہار و اڑیسہ) مجلد ۶/۷۵

حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی رح

کی مفید دینی تصنیفات

پہلی تقریر بشیر	۱/۷۵	جنت کی کنجی	۳/۲۵
دوسری تقریر بشیر	۲/۵۰	جنت کی ضمانت	۱/۰
رسول کی باتیں	۲/-	مشکل کشا (مجموعہ وظائف)	۲/۲۵
رسول اللہ کے معجزات	۱/۷۵	نماز کی باتیں	۱/۳۷
صلوٰۃ و سلام	۱/-	فاطمہ کا چاند	۲/۲۵
غدر کے چند علماء: از مفتی انتظام اللہ شہابی			۱/۵۰

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

دربار عالمگیری

(از مولانا ڈاکٹر مصطفٰے حسن علوی ایم اے پی ایچ ڈی)

(۱۴)

عالمگیر کے کچھ نہیں تو پچاس سالہ دور سطوت و حکومت اور ان کے قلمرو کی وسعت میں بسنے اور جینے والوں کی ممتاز شخصیتیں تھیں جو دہائیوں نہیں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تک پہونچتی ہیں میری سوجھ نے غلطی کی اور مجھے اندازہ نہ ہوا کہ اس عنوان " دربار عالمگیری" کے تحت جو مواد ہوگا وہ اتنا طویل ہوگا اب سوچتا ہوں کہ اگر چند حدود و قیود اور پابندیاں نہ لگاؤں تو کتنا اور طویل ہوتا جائے گا۔ اس لئے اس بادشاہ کے دینی اور مذہبی نقطۂ نگاہ سے ایک اہم شاہکار "فتاوی عالمگیری" کے کچھ پہلو اور پرانی شراب کو نئے جام میں پیش کرکے اس کے معاونین فضلا اور علماء کو فی الجملہ متعارف کرادوں بس وہوالموفق

جس طرح یہ بات کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" ایک جچی تلی بات ہے اسی طرح احکام شرعیہ کا استنباط نفاذ اور اجرابھی امت مسلمہ میں حسب ضرورت ہی ہوتا رہا۔ ضرورتوں کا اختلاف احکام کے اختلاف کا موجب ہوتا ہے۔ احکام میں ابہام اجتہاد اور قوت استنباط کا مقتضی ہوتا ہے اور مجتہد کا ذوق سلیم اور مزاج قانونی اور فقہی اس کا ممد و معاون بن کے ابہام کو رفع کردیتا ہے۔

ضرورتوں کے پیش نظر صحابہ کے فتوے

سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صورت حال یہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس کتاب اللہ موجود تھی اور احادیث نبوی کا منتشر ذخیرہ تھا جنہیں افعال و اعمال نبوت کے متعلق وہ بیانات تھے جو ان افعال کو بتاتے تھے جن کو صحابہ نے دیکھا یا سنا۔ فتوحات اسلامیہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ صحابہ مختلف صوبجات اور بلاد و امصار میں پھیل گئے۔ وہ حسب ضرورت

مسائل پیش آنے پر اپنا دیکھا سنا بیان کر دیتے تھے اور لوگ اس پر عمل پیرا ہوتے تھے یہ ان کا کہا اور دیکھا کہیں قید کتابت میں نہ آیا تھا نہ کسی ترتیب کے ساتھ مدون ہوا۔ یہ ذی علم و معرفت صحابہ جب ایسے معاملات سے دوچار ہوتے جن کی نظائر عہد رسالت میں نہیں ملتی تھیں تو کتاب اللہ اور احادیث کی روح اور اسپرٹ کو سامنے رکھ کے فیصلے کر دیا کرتے اور ان کو اصطلاحاً فتاوی صحابہ سے تعبیر کیا جاتا۔ ان میں مقامی عادات و رسوم اور اجتماعی حالات کے مقتضیات کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا تھا۔ جب تک اسلام عرب تک محدود رہا تو صحابہ کو زیادہ تر مناسک حج اور تجارتی نئی نئی صورتیں پیش آنے پر احکام کا اجرا کرنا پڑتا۔ لیکن مدینہ میں مکہ کے مقابل قدرے زراعتی معاملات بھی تھے۔ اور عراق و شام و مصر میں آب پاشی۔ خراج، جزیہ اور رقیت (غلامی) کے متعلق بھی نئی نئی شکلیں نکلیں اور گتھیاں پیدا ہوئیں۔ جن کا حل نہ ظواہر قرآن تھا نہ صریح احادیث میں اس لئے قرآن و حدیث کے بتائے ہوئے رہنما اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کرنا ناگزیر ہوا۔

عہد صدیقی و فاروقی میں مسائل کا حل

حضرت ابوبکر صدیق کا وطیرہ یہ تھا کہ جب کوئی نیا قضیہ پیش آتا اور اس کا حل کتاب اللہ اور سنت رسول میں نہ ملتا تو اور صحابہ سے دریافت فرماتے کہ شاید ان کے سامنے کوئی واقعہ گذرا ہو یا اس مسئلہ میں کوئی خاص حکم دربار نبوت سے ملا ہو جو ان تک نہ پہونچا ہو۔ اور صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کرتے اور موافق اور مخالف آرا معلوم کر کے فیصلہ کر دیتے، خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کا عہد آیا تو انھوں نے بھی ایسا ہی کیا مگر ایک زیادتی اور خصوصیت کے ساتھ کہ قبل فیصلہ اس بارے میں خلیفۂ اول کے حکم اور عمل کی بھی۔ تلاش و جستجو کر لیتے[۱]۔ پھر اپنے اجتہاد کو کام میں لاتے۔

وھوانہ حین لم یجد نصًا فی الکتاب ولا فی السنۃ کان یرجع اولاً الی قضیۃ الی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ فان لم یجد فیھا شیئًا عمد حین ذالک الی استشارۃ الصحابۃ فی الامر والاجتھاد برایہ الثاقب	ان کا طرز عمل یہ تھا کہ جب قرآن پاک اور سنت نبوی میں حکم ظاہر نہ ملتا تو پہلے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کی طرف رجوع کرتے اگر اس میں بھی کچھ نہ ملتا تو اس معاملہ میں صحابہ سے مشورہ کر کے یا اپنی ثاقب

[۱] اعلام الموقعین جلد اول صفحہ ۷۱

رائے سے اجتہاد کر لیتے۔

چنانچہ آپ نے قاضی شریح کو اس باب میں جو تحریر بھیجی اس کے الفاظ یہ تھے:۔

اذا حضرك امر لا بد منه فانظر ما في كتاب الله فاقض به فان لم يكن ففيما قضى به رسول الله صلى الله عليه وسلم فان لم يكن ففيما قضى به الصالحون وائمة العدل۔ فان لم يكن فانت بالخيار فان شئت ان تجتهد رأيك وان شئت ان تؤامرني ولا ارى مؤامرتك الا خيراً لك۔

والسلام

جب کوئی مسئلہ یا معاملہ پیش آئے تو اس کا حل کتاب اللہ میں تلاش کرو اور اسی کے مطابق فیصلہ دو اگر اس میں حل نہ ملے تو جو فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اس پر عمل کرو اگر وہاں بھی حل نہ ملے تو عدل کے اماموں خیار امت اور صلحاء کے فیصلہ پر عمل پیرا ہو اگر ایسا بھی کوئی حل نہ ملے تو تمہیں دو باتوں میں سے ایک پر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر چاہو تو اپنی قوت اجتہادیہ اور فقہی سوجھ بوجھ سے فیصلہ کرو نہیں تو پھر مجھ سے مشورہ کر لو' مجھ سے مشورہ کرنا تمہارے لئے موجب فلاح و صلاح ہی ہوگا۔ والسلام

اجتہاد اگر ہوتا تو نصوص کتاب اللہ اور سنت رسول کی توضیح اور تشریح کی شکل میں یا کتاب اللہ اور احادیث رسول میں اس کے امثال اور نظائر پر قیاس کر کے۔ عراق، مصر و شام پر اسلامی افواج کا قبضہ ہوا اور بظاہر بعض کے خلاف حضرت عمر نے وہاں کی زمینوں کی تقسیم فوجیوں پر نہ کی بلکہ وہاں کے باشندوں کے ہی سپردگی میں رکھی اور ان سے خراج وصول کرنے کے طریقے رائج کئے اور مصلحت عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے نصوص کی عملی تفسیر و توضیح کر دی

چنانچہ ابو عبید القاسم بن سلام اپنی کتاب الاموال میں لکھتے ہیں:۔

وهكذا ارى هذا الامام العادل بثاقب نظره السديد واجتهاده الحميد ان المصلحة العامة التنفيذ ولها اولية على المصلحة الخاصة وانه قام بذلك العمل وفي سبيل الله وفي سبيل رعاية مصالح المسلمين

اسی طرح شریعت اسلامیہ میں نانی کو وراثت میں حصہ ملنے کی خاص شکلوں کی عملی مثالیں ملتی تھیں لیکن دادی کے لئے وراثت میں حصہ ملنے کی عہد نبوت میں کوئی مثال موجود نہ تھی۔

سرکشی بجنور

(از سرسید احمد خاں)

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت سرسید احمد خاں ضلع بجنور میں صدر امین کے عہدہ پر فائز تھے، ایک خاص نقطۂ نظر سے انھوں نے اس معرکہ میں انگریزوں کی کھلی مدد کی تھی، ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد اپنے اسی نقطۂ نظر کے مطابق انھوں نے یہ کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ ضلع بجنور کے اس سلسلہ کے واقعات کا گویا تفصیلی روزنامچہ ہے جو اپنے اندر بڑی عبرتیں رکھتا ہے۔ مدتوں سے یہ کتاب نایاب تھی ــــ قریباً ۸۰ صفحے کے مقدمہ اور قریباً ۵۰ صفحات کے ضمیموں اور بہت سے حاشیوں کے اضافہ کے ساتھ اس کا یہ ایڈیشن چھپا ہے۔ قیمت مجلد ۶/-

مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط

مرزا صاحب کے مطبوعہ اور قلمی فارسی خطوط اور دیگر نثری تحریروں کا اردو ترجمہ شروع میں مرتب و ترجم کی طرف سے قریباً ۵۰ صفحے کا مقدمہ ہے جس میں مرزا صاحب کے سوانح حیات اور افکار و نظریات کے علاوہ اس دور کے سیاسی و مذہبی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان میدانوں میں مرزا صاحب کا کیا رول رہا۔

قیمت مجلد ۴/-

ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں

(از مولانا سید محمد میاں صاحب)

جس میں سلاطین مغلیہ کے نظام حکومت، تعلیمی حالت، عدل و انصاف، ہندو مسلم تعلقات اور ہندوستان کی خوش حالی، صنعتی و تجارتی ترقی، یوروپین اقوام کی آمد، ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط، دولت مغلیہ کا زوال اور اس کے حقیقی اسباب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت مجلد ۷/-

تاریخ ادبیات ایران

(مصنفہ ڈاکٹر رضا زادہ شفق پروفیسر جامعہ طہران)

مترجمہ سید مبارز الدین رفعت ایم اے جس میں اسلام ایرانی ادبیات سے لے کر صفوی اور قاچاری دور تک کی ادبیات شاعری اور اس کے اثرات کی مکمل تفصیل مؤرخانہ اور محققانہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔

قیمت مجلد ۹/-

جارج برنارڈ شاہ ایک نظر میں

سوانح، فن اور ادب، چار منتخب ڈرامے

قیمت مجلد ۳/۵۰

Alfurqan (Regd.L N. 353) Lucknow.

Cover Printed A.O Press Aminabad Park, Lucknow

سنہ آغاز ۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

نومبر ۱۹۶۶ء

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

قیمت
فی پرچہ پینسٹھ پیسے

مسئول
محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ

ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

فی کاپی .... ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ...... -/۸
پاکستان سے .... -/۸
ششماہی
ہندوستان سے ...... -/۴
پاکستان سے .... -/۴

جلد ۳۴ | بابت ماہ رجب المرجب ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۶ء | شمارہ ۷

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ نومبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور ڈاکخانہ کی پہلی رسید کے ساتھ ہمیں براہ راست اطلاع دے دیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کریں۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اس کی اطلاع ۱۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولانا) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر، دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از محمد منظور نعمانی

الفرقان سے اس کی قریباً ۴۴ سالہ زندگی میں اگر ملتِ اسلامیہ کو کچھ دینی نفع پہونچا ہے تو بنیادی طور پر یہ سب دارالعلوم دیوبند کا فیض ہے، اس کے بانی مدیر (ناچیز راقم) نے اپنی رسمی طالب علمی کی تکمیل اسی مرکزِ علم دین میں کی اور موجودہ مرتب (مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ اللہ تعالیٰ) کی تعلیم بھی یہیں مکمل ہوئی۔ اس علمی نسبت کے علاوہ تئیس ۲۳ سال سے میرا ایک خادمانہ تعلق یہ بھی ہے کہ میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا ایک رکن ہوں جو اس کے سارے نظم و نسق کی ذمہ دار ہے، اور اس وقت اتنا قدیم منتخب رکن میرے سوا کوئی نہیں ہے، مجھ سے پہلے جو میرے پیشرو تھے وہ سب، بلکہ میرے بعد منتخب ہونے والے بعض رفقا بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور بظاہر اپنا وقت بھی بہت دور نہیں ہے۔ یغفر اللہ لنا ولھم وجمع بیننا فی دار السلام

الغرض دارالعلوم دیوبند سے میرا دوگونہ تعلق ہے اور ان میں سے ہر تعلق اس نوعیت کا ہے کہ دارالعلوم کی عزت و حرمت میری عزت و حرمت ہے اور اس کی ذلت و فضیحت میری ذلت و فضیحت!

پچھلے مہینے اکتوبر کی ۱۴ تاریخ کو دیوبند میں مجلس مشاورت کے جلسۂ عام کے موقع پر ہونے والے ہنگامے کی جو خبریں ملک بھر میں پھیل گئی ہیں اُن سے دارالعلوم کے محبین و متنسبین کو بجا طور پر رنج ہوا ہے۔ مجھے بھی اس سلسلہ میں بہت سے بزرگوں اور دوستوں کے خطوط اس حیثیت سے ملے ہیں کہ اس ہنگامہ کی زد میں کسی حد تک میری ذات بھی آگئی تھی۔

بہت سے حضرات کو میرے متعلق یہ اطلاع ملی کہ اس ہنگامہ میں مجروح ہونے والے دوسرے حضرات کے ساتھ میں بھی مجروح ہوا ہوں اس لئے انہوں نے مجھے مزاج پرسی اور اظہار رنج و الم کے خطوط لکھے ہیں

پہلے تو میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جسمانی طور پر میں بالکل مجروح نہیں ہوا، اگرچہ عالم اسباب کے لحاظ سے مجھے خود حیرت ہے کہ ڈائس پر ہونے والی سنگ باری میں میں کیونکر اور کس طرح بالکل محفوظ رہا جبکہ میں بالکل آگے بیٹھا ہوا تھا اور میرے برابر والے بھی مجروح ہوئے اور پیچھے والے بھی، بہرحال اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم نے میری نگہبانی کی اور مجھے کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچی فللہ الحمد والمنۃ ہاں روحانی اور قلبی اذیت شاید سب سے زیادہ مجھے ہی پہونچی ——— واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس جلسہ کی شرکت سے ابتداءً معذرت کر دی تھی، اسی لئے جلسہ کے اشتہار میں میرا نام بھی نہیں دیا گیا تھا، لیکن ۴، ۵ دن پہلے مجھے خود خیال ہوا کہ جب مجلس مشاورت کی مرکزی شخصیتوں میں سے اس کے جنرل سکریٹری مسٹر ایم انور، ایم پی (مدراس) اس کے سکریٹری سید مظہر امام سابق ایم پی (بہار) ریاست اتر پردیش کی مجلس کے صدر ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی اور پنڈت سندر لال جی، جیسے حضرات دیوبند کی خاص اہمیت کی وجہ سے جا رہے ہیں تو دار العلوم سے اپنے خاص تعلق کی وجہ سے مجھے بھی اس موقع پر وہاں ہونا چاہیئے۔ میں ان حضرات کو بتا سکوں گا کہ دیوبند، سہارنپور ضلع کا صرف ایک قصبہ نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کا دینی روحانی مرکز، قلعہ اور اکبر الٰہ آبادی مرحوم کی زبان میں ملت اسلامیہ ہندیہ کا قلب ہے اور دار العلوم اور اس کے بانیوں، معماروں اور اس سے وابستہ جماعت کی یہ خدمات ہیں اور یہ ہماری سو سالہ تاریخ ہے۔ منتظمین جلسہ نے تقریروں کا جو پروگرام بنایا تھا اس میں اُنھوں نے سب سے پہلی میری تقریر رکھی تھی اور میں نے ان سے کہدیا تھا کہ میں مجلس مشاورت کے بارہ میں کچھ نہیں کہوں گا، میری حیثیت یہ ہے کہ میں گھر والا بھی ہوں اور براتی بھی اس لئے میں مجلس مشاورت کے بیرونی معزز ارکان سے دیوبند اور سلسلۂ دیوبند کا بس تعارف کراؤں گا، اور انھوں نے یہ بات منظور بھی کر لی تھی۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ مجلس مشاورت میں ہر خیال و مسلک اور ہر مکتب فکر کے ملت کا درد رکھنے والے مسلمان شامل ہیں، بلکہ یہی اس کا امتیاز ہے۔ مجلس کے جو معزز مرکزی ارکان دیوبند کے اس جلسہ میں شریک ہونے والے تھے، میرا ان کا مجلس کے دوروں میں بار بار ساتھ ہوا تھا اور میرا احساس تھا کہ ان میں سے بعض ہمارے مجلسی ساتھی کس قدر اس پروپگنڈے سے متاثر ہیں جو حکومت برطانیہ کی مصلحت میں جماعت دیوبند اور اس کے اکابر کے خلاف قریباً پون صدی سے ہندوستان میں بلکہ حجاز مقدس تک بڑے زور و شور سے

ہوتا رہا ہے اور جس نے ایک زمانہ میں حرمین شریفین کے علماء کبار تک کو اتنا متاثر کیا تھا کہ انھوں نے اکابر جماعت دیوبند کے خلاف کفر کے فتوے تک جاری کئے تھے۔ جن سے انھوں نے حقیقت حال معلوم ہونے کے بعد رجوع کیا۔ یہ بات اب سے ۶۰ سال پہلے کی ہے[1]۔

میرے نزدیک اس بیماری کے علاج اور اس پروپیگنڈے کے کاٹ کی سب سے کارگر تدبیر یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو تھوڑے سے وقت کے لئے کسی طرح دارالعلوم دیوبند پہونچا دیا جائے اور ان کو اچھی طرح اس کو دیکھنے کا موقع مل جائے یہ وہ حکمت عملی ہے جس سے کام لے کر زلیخا نے زنان مصر کی زبانیں بند کر دی تھیں ـــــ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ۝

بارہا کا میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جن لوگوں کا مسموم اور پروپیگنڈہ زدہ ذہن لمبی مناظرانہ بحثوں اور سیکڑوں صفحات والی کتابوں کے مطالعہ سے صاف نہیں ہو سکا وہ جب ایک دن کے لئے دیوبند چلے گئے اور اسلاف دارالعلوم کی ورثہ میں چھوڑی ہوئی اس دینی اور روحانی فضا کو انھوں نے دیکھا جو سب کچھ لٹ جانے کے بعد اب تک بھی کچھ بچی کھچی باقی رہ گئی تھی تو وہ بول اٹھے کہ ہم بڑی غلط فہمی میں تھے اور ہم سے یہاں کے بارہ میں بڑی خراب باتیں کہی گئی تھیں۔

الغرض مجلس مشاورت کے دیوبند کے اس جلسہ میں شرکت کا خاص محرک میرے لئے یہی میری طمع تھی کہ میں اس موقع پر مجلس کے اپنے ان ساتھیوں کو دارالعلوم دیوبند اور جماعت دیوبند سے اچھی طرح واقف کرا سکوں گا اور اس طرح اس دینی سلسلہ کے بارہ میں ان کا ذہن انشاءاللہ صاف ہو جائے گا اور یہ میری طرف سے دارالعلوم یا اُس سے وابستہ جماعت اور اس کے مسلک کی نہیں بلکہ اپنے ان مجلسی رفیقوں کی خدمت ہوگی اور اس سے مسلمانوں کے اتحاد ملی کے عظیم مقصد کو خاص تقویت پہونچے گی۔

لیکن اس کو اپنی بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بات بالکل الٹی ہو گئی۔ میں ۱۴ اکتوبر کو مغرب کے کچھ ہی پہلے دیوبند پہونچا تھا، ڈاکٹر فریدی صاحب دوپہر ہی کو پہونچ گئے تھے۔ سید مظہر امام

---

[1] اسکی پوری تفصیل اسی زمانہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے الشہاب الثاقب میں لکھی تھی، اُسوقت حضرت مولانا دارالعلوم دیوبند کے ایک جواں عمر فاضل تھے اور انکا قیام مدینہ طیبہ میں تھا ۱۲

اور سندر لال جی اور سید مجتبیٰ صاحب ایڈووکیٹ عشاء سے کچھ پہلے، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ دہلی سے آئے اور بعد عشاء ہم سب جلسہ گاہ چلے گئے۔

پھر جلسہ میں جو کچھ ہوا اور جو اپنی بدنصیب آنکھوں نے دیکھا کاش میں نہ دیکھتا اور کاش اسکی خبر کسی کو نہ ہوتی، مگر اخبارات نے اگلے ہی دن اس کو دنیا بھر میں پھیلا دیا اور پھر ان حضرات کو بھی بیانات شائع کرنے پڑے جو جلسہ میں شریک تھے اور انھوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ان میں ڈاکٹر فریدی، سندر لال جی اور سہارن پور کے ہفتہ وار "بیباک" کے اڈیٹر ذکریا اسعدی صاحب کے بیانات کے بارہ میں اس ناچیز کو شرمندگی کے ساتھ اعتراف ہے کہ ان میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بنیادی طور پر صحیح ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ دارالعلوم کو رسوائی سے بچانے کے مقصد کو ان بیانات میں کافی حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جزوی طور پر یا طرز بیان میں مجھے اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر بنیادی طور پر میرے مشاہدہ کی حد تک بالکل صحیح ہیں۔

جلسہ کے درہم برہم ہو جانے کے بعد یہ عاجز اور یہ سب مہمان دارالعلوم کے مہمان خانہ میں آ گئے تھے، وہیں ان کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا، یہاں مہمان خانہ پر بھی ساری رات بلکہ صبح ۸۔۹ بجے تک جس طرح کا ہنگامہ طلبہ کے اس گروہ نے جاری رکھا اور جس طرح کے خونی نعرے لگتے رہے، کاش ان میں سے بھی کسی بات کی خبر کسی کو نہ ہوئی ہوتی، مگر اس کا بھی کچھ ذکر مذکورۂ بالا اخباری بیانات میں آ چکا ہے بعض طلبہ کے ہاتھوں مولانا مفتی عتیق الرحمان کے لاٹھیوں سے مضروب ہونے کی خبر بھی عام ہو چکی ہے یہ سب باتیں ظاہر ہے کہ دارالعلوم کے طلبہ بلکہ اس کے تمام متعلقین و منتسبین کے لئے کس قدر شرم اور رسوائی کا باعث ہیں لیکن میرے لئے ان باتوں میں انتہائی رنج اور صدمہ کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ان محترم مہمانوں نے (جو دارالعلوم کے لئے بالکل اجنبی اور اس کی واقعی عظمت سے یکسر ناواقف تھے بلکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ان میں سے بعض مخالفِ دیوبند پروپگنڈے سے متاثر بھی تھے) دیوبند آ کر اور دارالعلوم کے مہمانخانہ میں مقیم ہو کر اس کا صرف یہ رخ دیکھا کہ یہاں تعلیم پانے والے اور یہیں کے ماحول میں رہنے اور بسنے والے طلبہ اس سیرت و کردار اور ان اخلاق کے حامل ہیں، اور افسوس صد افسوس کہ اس کے سوا دارالعلوم کی کوئی بھلی چیز وہ بالکل نہیں دیکھ سکے۔

کیا عرض کیا جائے، ان اجنبی معزز مہمانوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان طلبہ کے محترم اساتذہ انکو مہمانخانہ پر یورش کرنے سے روکتے ہیں اور وہ ان کی ایک نہیں سنتے اور اُن بیچاروں کو بار بار اپنے ان ہوش رفتہ

شاگردوں سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ دیکھو پہلے ہماری جان جائے گی اس کے بعد تم ان مہمانوں تک پہونچ سکوگے!
لیکن اس کے بعد بھی وہ یورش جاری رکھتے ہیں، حد یہ ہے کہ مہمان خانہ میں بند یہ مہمان (جن کے ساتھ یہ ناچیز بھی تھا) فجر کی نماز پڑھنے مسجد بھی نہیں جاسکے جو مہمان خانہ کے بالکل دروازے پر ہے —— ہر صاحبِ احساس اندازہ کرسکتا ہے کہ ان حالات میں دار العلوم سے گوناگوں تعلق رکھنے والے اور دیوبندی نسبت پر فخر کرنے والے میرے جیسے کسی آدمی کو اپنے ان محترم رفیقوں اور مہمان خانۂ دار العلوم کے مقیم مہمانوں کی طرف دیکھنا بھی کتنا مشکل کام ہوگا، اور میری روح پر اور خود دار العلوم کی روح پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی —— بار بار زبان پر بے اختیار وہ کلمہ آتا تھا جو رسوائی کے شدید احساس کے تحت حضرت مریم صدیقہ کی زبان سے نکلا تھا اور جسے قرآن پاک نے محفوظ کردیا ہے —— يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (آل عمران) (اے کاش میں آج سے پہلے مرچکا ہوتا اور کسی کو میں یاد بھی نہ ہوتا) مجھے ندامت اور شرم کے شدید احساس کے ساتھ ان محترم مہمانوں کو بتانا پڑتا تھا کہ دار العلوم میں تقریباً ڈیڑھ ہزار طالب علم ہیں اور یہ ہنگامہ کرنے والے ان میں سے بہت تھوڑے ہیں (اور میری یہ بات بالکل صحیح تھی) لیکن قدرتی طور پر ان کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ طلبہ کی وہ بڑی تعداد جو اس شرارت اور ہنگامے میں شریک نہیں ہے، آخر وہ ایسے وقت میں کہاں ہے؟ اور دار العلوم کے ذمہ دار اکابر کو جو عموماً دار العلوم ہی میں رہتے ہیں کیا اس طوفان اور ہنگامہ کی کوئی خبر نہیں ہے؟ میرا جی چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی اپنے دل کی یہ خلش ظاہر کرے تو مجھے کہنے کا موقع ملے کہ ایسے طوفانی ہنگامے جب بالکل اچانک رونما ہو جاتے ہیں تو ایسی حیرت انگیز باتیں بھی وقوع میں آجاتی ہیں جن کی توجیہ سے عقل بالکل عاجز ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے صرف ۲۴ سال کے بعد مدینہ طیبہ کی بھری آبادی میں مصر کے بلوائیوں کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پہونچ کر آپ کو شہید کر ڈالنا اسلام کی تاریخ میں اس کی سبق آموز مثال ہے —— لیکن میرے ان ساتھیوں میں کسی نے اس طرح کی کوئی بات مجھ سے کہی نہیں، البتہ ایک صاحب نے کوفہ کے ایک گھر میں مسلم بن عقیل کے محصور کر لئے جانے اور سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے کربلا میں گھیرے میں لے لئے جانے کے واقعہ کو اس طرح یاد کیا کہ گویا وہ وہی خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت میری روح اور میرے دل کا کیا حال ہوگا، اسی لئے میں نے

کہا کہ اس المناک اور شرمناک واقعہ سے جتنا دکھ میری روح کو پہونچا یقیناً اتنا کسی کو نہ پہونچا ہوگا۔

اور اب ایک تازہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ان طلبا میں سے ایک طالب علم کا، جمعیۃ الطلبہ کے صدر کی حیثیت سے، ایک بیان نکلا ہے جس میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ ان کے دو ساتھی حامیان مجلس کی خشت باری سے لہو لہان ہو کر جلسہ گاہ میں بیہوش ہو گئے مگر ہم لوگوں نے جو ڈائس پہ بیٹھے تھے، ڈائس سے اتر کر ایک نظر بھی اُن پر نہ ڈالی اور نہ کسی قسم کا اظہار افسوس مائک سے کیا گیا۔ اس بیان میں کہا گیا ہو کہ مہمان خانے پر طلبا نے ہم لوگوں کے خلاف جو اظہار نفرت کیا اُس کا باعث ہم لوگوں کی یہی سنگدلی تھی۔

میرا خیال یہ تھا کہ یہ طلبا اپنے کئے پر پشیمان ہوں گے اور ان کی اکثریت کے بارے میں مجھے اب بھی یہی امید ہے کہ وہ اگر عام انسانی فطرت کے مطابق کوئی عذر سامنے لائیں گے تو اس کا انداز بھی نادمانہ ہوگا۔ مگر اس بیان سے معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض طلبہ کو اس امید سے مستثنیٰ ہی رکھنا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ دار العلوم کے کسی طالب علم کی طرف سے یہ بیان کم از کم میرے لئے مہمان خانے کے واقعات سے کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈائس کے لوگ جن میں پنڈت سندر لال جیسے نیک دل اہنسا پرور کے علاوہ میرے اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب جیسے دار العلوم سے فرزندانہ اور ذمہ دارانہ تعلق رکھنے والے بھی تھے، اپنی آنکھوں سے لہو لہان طلبہ تڑپتے دیکھتے رہے اور ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کم از کم میرا احساس یہ ہے کہ اگر مہمان خانے میں میرے ساتھ بیرونی حضرات نہ ہوتے تو میں ان "اظہار نفرت" کرنے والے طلبہ کی مجنونانہ حرکتوں سے اتنا ملول ہرگز نہ ہوتا جس قدر دلی اذیت ان میں سے ایک کے اس بیان سے میں نے محسوس کی ہے۔ ہماری دینی درسگاہوں میں جو تغیر طلبہ کے حال میں آتا جارہا ہے وہ مجھ سے مخفی نہیں ہے۔ خود دار العلوم ہی میں برابر اس کے تجربے ہوتے رہتے ہیں اور الفرقان ہی کے صفحات میں میں ان پر خون کے آنسو بہاتا رہا ہوں اور اس کے ناظرین کو معلوم ہے کہ میں اس تغیر کے لئے تنہا طلبہ کو ذمہ دار نہیں سمجھتا جیسا کہ بعض مواقع پر الفرقان ہی میں تفصیل سے لکھ بھی چکا ہوں اور ۱۴ اور ۱۵ اکتوبر کے اس تازہ واقعہ میں جو نہایت تکلیف دہ غلطیاں طلبا سے ہوئیں ان کی بھی کچھ توجیہہ و تاویل اپنے ذہن میں کر چکا ہوں جس کے بعد میں ان طلبہ کو بھی بجائے غصہ کے ترحم اور دعا کا مستحق سمجھتا ہوں ـــــــ پھر بھی اس بیان پر میں حیران ہوں کہ آخر کس قسم تک کے طلبہ ہمارے ان

مدارس میں آنے لگے ہیں کہ وہ اپنے بڑوں پر (وہ رسمی ہی طور سے بڑے سہی) شنیع سے شنیع الزام لگاتے ہوئے بھی اس درجہ حریفانہ انداز دکھا سکتے ہیں کہ انھیں اپنی شکایت سے آگاہ تک نہ کریں اور ایسی قطعیت کے ساتھ الزام لگائیں کہ جیسے بالکل قطعی اور ناقابل رنگ انکار واقعہ ہو۔ کاش یہ طلبہ سوچیں کہ علم دین سے اپنی نسبت پر وہ یہ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں۔

اسی طرح انتہائی صدمہ بعض اخبارات کی اس روش کو دیکھ کر ہو رہا ہے کہ انکے ذمہ داروں کو یقین کیسا تھ معلوم ہے کہ ۱۲ اکتوبر کو دیوبند میں کیا ہوا اور وہ خوف خدا اور انسانی اور دینی ذمہ داری سے بالکل بے پروا ہو کر سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسکے لیے روزانہ بلا ناغہ کالم کے کالم وقف کیے جا رہے ہیں۔ قریباً ۴۰ سال کی اپنی اخبار بینی کی عمر میں مجھے کبھی یاد نہیں کہ کسی اخبار میں جو کسی دینی و مذہبی حلقہ سے کچھ تعلق رکھتا ہو، شدید سے شدید اختلاف کے موقع پر بھی کسی معاملہ میں دیدہ و دانستہ حقائق کو مسخ کر کے پیش کرنے کی ایسی مہم چلائی گئی ہو، جوش اختلاف اور غناد کی بھی آخر کوئی حد ہونی چاہیئے۔ ع وائے گر بس امروز بود فردائے

بہر حال جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا اور دار العلوم کی جس قدر رسوائی ملک میں مقدر تھی وہ ہماری بدقسمتی سے ہو کر رہی۔ طلبہ چاہیں تو اپنی مقدس مادر علمی کا یہ داغ دھو بھی سکتے ہیں۔ اور یہ کام انھیں طلبہ پر موقوف نہیں ہے جن سے یہ داغ لگا ہے بلکہ ان طلبہ کا دامن صاف ہے اور انکی تعداد یقیناً کئی گنی زیادہ ہے، صرف ان کی فرض شناسی بھی اس داغ کو دھونے کے لئے کافی ہو سکتی ہے ـــ کچھ فرائض اس سلسلے میں ذمہ داران دار العلوم کے بھی ہیں اور امید ہے کہ وہ بھی اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ محترم مولانا محمد طیب صاحب کے بیان نے اس سلسلے کا ایک فرض ادا بھی کر دیا ہے اور بعض اگلے اقدامات کی بھی اطلاع دی ہے جن سے انشاء اللہ باقی امور میں ذمہ داران دار العلوم اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ دار العلوم سے باہر خصوصاً ہندوستان کے اندر جو دار العلوم کے معاونین و مخلصین اور ہمدرد ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے اس محبوب ادارے کی اصلاح کے مسئلہ سے پوری دلچسپی لیں اور بزرگان دیوبند کی اس مقدس امانت کو سیاسی طالع آزمائیوں یا خود پرستیوں کی آماجگاہ بن کر مقصدی اعتبار سے برباد ہو جانے کے انجام سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ وباللہ التوفیق۔

کتاب الاذکار والدعوات

معارف الحدیث

(مسلسل)

اپنے چھوٹوں سے بھی دعا کی درخواست:۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ اِسْتَاذَنْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْعُمْرَةِ فَاَذِنَ وَقَالَ اَشْرِكْنَا يَا اُخَيَّ فِي دُعَائِكَ وَلَا تَنْسَنَا فَقَالَ كَلِمَةً مَا يَسُرُّنِي اَنَّ لِي بِهَا الدُّنْيَا۔

(رواہ ابو داؤد والترمذی)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ جانے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی تو آپ نے مجھے اجازت عطا فرمادی اور ارشاد فرمایا بھیّا ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں شامل کرنا اور ہم کو بھول نہ جانا۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ آپ نے مجھے مخاطب کرکے یہ بھیّا کا جو کلمہ کہا اگر مجھے اس کے عوض ساری دنیا دے دی جائے تو میں راضی نہ ہوں گا۔ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا ایسی چیز ہے جس کی استدعا بڑوں کو بھی اپنے چھوٹوں سے کرنی چاہیئے۔ بالخصوص اس وقت جبکہ وہ کسی ایسے مقبول عمل کے لیے یا ایسے مقدس مقام کو جارہا ہو جہاں قبولیت کی خاص امید ہو،

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو "اُخَيَّ" کے لفظ سے خطاب

فرمایا جو اُخیّ کی تصغیر ہے اور جس کا لفظی ترجمہ "بھیا" ہے۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جتنی خوشی ہوئی جس کا انھوں نے اظہار بھی فرمایا ہے وہ بالکل برحق ہے، اسی کے ساتھ اس حدیث سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقام کی رفعت اور بارگاہِ الٰہی میں ان کی مقبولیت کی جو شہادت ملتی ہے وہ بجائے خود بہت بڑی سند ہے۔

دُعا میں عجلت طلبی کی ممانعت :-

دُعا بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں معروضہ کی پیشی ہے اور وہ مالک کل اور قادر مطلق ہے چاہے تو اسی لمحہ دعا کرنے والے بندہ کو وہ عطا فرما دے جو وہ مانگ رہا ہے لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ ظلوم و جہول بندہ کی خواہش کی ایسی پابندی کرے، بلکہ بسا اوقات خود اس بندہ کی مصلحت اسی میں ہوتی ہے کہ اس کی مانگ جلدی پوری نہ ہو لیکن انسان کے خمیر میں جو جلد بازی ہے اس کی وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ جو میں مانگ رہا ہوں وہ مجھے فوراً مل جائے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو وہ مایوس ہو کر دعا کرنا بھی چھوڑ دیتا ہے۔ یہ انسان کی وہ غلطی ہے جس کی وجہ سے وہ قبولیت دعا کا مستحق نہیں رہتا اور گویا اس کی یہ جلد بازی ہی اس کی محرومی کا باعث بن جاتی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ يُسْتَجَابُ لِاَحَدِكُمْ مَالَمْ يَعْجَلْ فَيَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِيْ۔

—————— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھاری دعائیں اس وقت تک قابل قبول ہوتی ہیں جب تک کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ (جلد بازی یہ ہے) کہ بندہ کہنے لگے کہ میں نے دعا کی تھی مگر وہ قبول ہی نہیں ہوئی۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ بندہ اس جلد بازی اور مایوسی کی وجہ سے قبولیت کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ اس لیے چاہیے کہ بندہ ہمیشہ اس کے در کا فقیر بنا رہے اور مانگتا رہے یقین

کو ارحم الراحمین کی رحمت دیر سویر ضرور اس کی طرف متوجہ ہوگی ــــ کبھی کبھی بہت سے بندوں کی دعا جو وہ بڑے اخلاص و اضطرار سے کرتے ہیں اس لیے بھی جلدی قبول نہیں کی جاتی کہ اس دعا کا تسلسل ان کے لیے ترقی اور تقرب الی اللہ کا خاص ذریعہ ہوتا ہے اگر ان کی منشاء کے مطابق ان کی دعا جلدی قبول کر لی جائے تو اس عظیم نعمت سے وہ محروم رہ جائیں۔

حرام کھانے اور پہننے والے کی دعا قبول نہیں :-

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا وَ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا اَمَرَ بِہِ الْمُرْسَلِیْنَ فَقَالَ "یَا اَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحاً اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ" وَقَالَ "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ" ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ یَمُدُّ یَدَیْہِ اِلَی السَّمَاءِ یَا رَبِّ یَا رَبِّ وَمَطْعَمُہٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُہٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُہٗ حَرَامٌ وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ۔

ـــــــــــ رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ صرف پاک ہی کو قبول کرتا ہے اور اس نے اس بارہ میں جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے وہی اپنے سب مومن بندوں کو دیا ہے پیغمبروں کے لیے اس کا ارشاد ہے "اے رسولو تم کھاؤ پاک اور حلال غذا اور عمل کرو صالح میں خوب جانتا ہوں تمہارے اعمال" اور اہل ایمان کو مخاطب کر کے اس نے فرمایا ہے کہ اے ایمان والو تم ہمارے رزق میں سے حلال اور طیب کھاؤ" (اور حرام سے بچو) اس کے بعد حضور نے ذکر فرمایا ایک ایسے آدمی کا جو طویل سفر کر کے (کسی مقدس مقام پر) ایسی حالت میں جاتا ہے کہ اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم اور کپڑوں پر گرد و غبار ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کے دعا کرتا ہے، اے میرے رب اے میرے پروردگار!! ..... اور حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے۔

اس کا لباس بھی حرام ہے، اور حرام غذا سے اس کا نشو ونما ہوا ہے تو اس آدمی کی دُعا کیسے قبول ہوگی۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) آج بہت سے دعا کرنے والوں کے دلوں میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب دُعا اور اس کی قبولیت برحق ہے اور دُعا کرنے والوں کے لیے اللہ کا وعدہ ہے "ادعونی استجب لکم" (تم دعا کرو میں قبول کروں گا) تو پھر ہماری دُعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟ — اس حدیث میں اس کا پورا جواب ہے۔ آج دعا کرنے والوں میں کتنے ہیں جن کو اطمینان ہے کہ وہ جو کھا رہے ہیں جو پی رہے ہیں جو پہن رہے ہیں وہ سب حلال اور طیب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

وہ دعائیں جن کی ممانعت ہے :-

انسان بے صبرا اور جلد گھبرا جانے والا ہے اور اس کا علم بھی بہت محدود اور ناقص ہے اس لیے بعض اوقات وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی دُعائیں بھی کرنے لگتا ہے جو اگر قبول ہو جائیں تو اس میں خود اسی کا خسارہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی دعاؤں سے منع فرمایا ہے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰى اَوْلَادِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰى اَمْوَالِكُمْ لَا تُوَافِقُوْا مِنَ اللّٰهِ سَاعَةً يُسْاَلُ فِيْهَا عَطَاءٌ فَيَسْتَجِيْبَ لَكُمْ۔

—— رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کبھی اپنے حق میں یا اپنی اولاد اور مال وجائداد کے حق میں بد دعا نہ کرو، مبادا وہ وقت دعا کی قبولیت کا ہو اور تمہاری وہ دعا اللہ تعالیٰ قبول فرمالے جس کے نتیجہ میں خود تم پر یا تمہاری اولاد یا مال وجائداد پر کوئی آفت آجائے۔) (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَمَنَّىٰ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ وَلَا يَدْعُ بِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهٗ اِنَّهٗ اِذَا مَاتَ اِنْقَطَعَ عَمَلُهٗ وَاِنَّهٗ لَا يَزِيْدُ الْمُؤْمِنَ عُمُرُهٗ اِلَّا خَيْرًا۔ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں سے کوئی اپنی موت کی تمنا نہ کرے، نہ جلدی موت آنے کے لیے اللہ سے دُعا کرے، کیونکہ جب موت آجائے گی تو عمل کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا (اور اللہ کی رضا و رحمت حاصل کرنے والا کوئی عمل بندہ نہیں کرسکے گا، جو عمل بھی کیا جاسکتا ہے جیتے جی ہی کیا جاسکتا ہے) اور بندۂ مومن کی عمر تو اس کے لیے خیر ہی میں اضافہ اور ترقی کا وسیلہ ہے (اس لیے موت کی تمنا اور دُعا کرنا بڑی غلطی ہے) (صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتَدْعُوْا بِالْمَوْتِ وَلَاتَتَمَنَّوْهُ فَمَنْ كَانَ دَاعِيًا لَابُدَّ فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِىْ مَا كَانَتِ الْحَيٰوةُ خَيْرًا لِّىْ وَتَوَفَّنِىْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّىْ۔

رواہ النسائی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ موت کی دُعا اور تمنا نہ کرو، اگر کوئی آدمی ایسی دُعا کے لیے مضطر ہی ہو (اور کسی وجہ سے زندگی اس کے لیے دوبھر ہو) تو اللہ کے حضور میں یوں عرض کرے "اے اللہ! جب تک میرے لیے زندگی بہتر ہے مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لیے موت بہتر ہو تو دنیا سے مجھے اٹھا لے!" (سنن نسائی)

(تشریح) ان حدیثوں میں دراصل موت کی اس دُعا اور تمنا سے ممانعت فرمائی گئی ہے جو کسی تکلیف اور پریشانی سے تنگ آکر زبان پر آجاتی ہے، بعض حدیثوں کے الفاظ میں اس کی صراحت بھی ہے، چنانچہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ لِضُرٍّ نَزَلَ بِهٖ ۔۔ الحدیث (تم میں سے کوئی کسی پیش آجانے والی تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے۔)

اس صورت میں موت کی تمنا اور دُعا سے ممانعت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ صبر کی صفت کے خلاف ہے اور دوسری اس سے بھی اہم وجہ یہ ہے کہ آدمی جب تک زندہ ہے اس کے لیے توبہ و استغفار کے ذریعہ اپنے کو پاک صاف کرنے کا اور حسنات و طاعات کے ذریعہ اپنے ذخیرۂ آخرت میں اضافہ بعد اللہ تعالیٰ کا مزید تقرب حاصل کرنے کا راستہ کھلا ہوا ہے، پس موت کی دُعا اس

کھلے دروازے کو بند کرنے کی دعا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس میں بندہ کے لیے خسارہ ہی خسارہ ہو —
البتہ اللہ کے خاص مقرب بندے جب ان کا وقت موعود قریب آتا ہے تو لقاء الٰہی کے غلبۂ شوق کی وجہ سے کبھی کبھی ان سے موت کی تمنا اور دعا کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا "فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۞" اور آخری وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا "اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی" (اے اللہ میں رفیق اعلیٰ کا طالب و سائل ہوں) اسی قبیل سے ہیں۔ واللہ اعلم۔

لہ اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے تو ہی میرا مولا ہے دنیا اور آخرت میں۔ مجھے اٹھا لے اس حالت میں کہ تیرا فرمانبردار بندہ ہوں اور مجھے ساتھ کر دے اپنے اچھے نیک بندوں کے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ

(۷)
مکتوبات

(مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے مکتوبات کا مختصر مجموعہ ہے جس کو حضرت شاہ اہل اللہؒ نے مرتب کیا ہے اور جو مطبع احمدی (متعلق مدرسہ عزیزی دہلوی) اور مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہو چکا ہے۔ ان مطبوعہ نسخوں میں کثرت سے اغلاط کتابت پائی جاتی ہیں۔ ایک قلمی نسخہ بھی اس مجموعے کا نظر سے گزرا اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ مطبوعہ نسخے میں بہت گڑبڑ کر دی گئی ہے ـــ کہیں ایک مکتوب کا کچھ حصہ دوسرے مکتوب میں شامل کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے دونوں مکتوب ناقابل فہم بن گئے، کہیں نفی کی جگہ اثبات اور اثبات کی جگہ نفی ہے جس سے مفہوم ہی بدل گیا ہو بعض جگہ لفظ دو مرا رکھ دیا گیا ہے جس کی بنا پر مطلب خبط ہو گیا ہے۔ طولِ تحریر کا خوف ہے ورنہ میں ہر قسم کے اغلاط کے چند نمونے اس موقع پر پیش کرتا۔

مکتوبات کے شروع میں حضرت شاہ اہل اللہ کا دیباچہ ہے جس میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ "میں نے یہ مکتوبات، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں جمع کر لیے تھے ایک دن میرے ہاتھ میں یہ مجموعہ دیکھ کر حضرت والاؒ نے ارشاد فرمایا کہ اے اہل اللہ! تم ان خطوط کو ترتیب دے دو تاکہ

ان سے پورا پورا فائدہ حاصل ہو ۔ میں نے حکم عالی کی بجا آوری کی اور اس مجموعہ مکتوبات کا انفاس رحیمیہ نام رکھا ۔ اللہ تعالے ہی توفیق دینے والا ہے اور اسی پر میرا بھروسہ ہے "

اس مجموعہ مکتوبات میں سب سے پہلے ایک تحریر ہے جو غالباً کسی کے نام مکتوب ہے شروع میں مکتوب الیہ کا نام درج نہیں ۔ یہ تحریر اچھا خاصہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں بہت سے اہم مضامین آگئے ہیں ۔

اس کی ابتدا اس مشہور حدیث سے کی گئی ہے ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس ۔	اللہ تعالے اس شخص پر اپنی رحمت نازل نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا ۔

اس کے بعد دوسری حدیث لکھی ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ الراحمون یرحمہم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء ۔	رحمٰن جل شانہ، ان لوگوں پر رحمت فرماتا ہے جو اس کی مخلوق پر ترحم و شفقت کرتے ہیں تم زمین پر رہنے والے تمام انسانوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحمت کرے گا ۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں ۔

اس حدیث میں تمام انسانوں پر رحم کرنے کو فرمایا گیا ہے چاہے وہ نیک ہوں یا بد ۔ بدوں پر رحم کرنا یہ ہے کہ ان کو بدی سے باز رکھا جائے ۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو بھی قابل رحم ہو اس پر رحم کرو ۔ کوئی بھی ہو ۔ من فی السماء میں آسمان کی تخصیص اللہ تعالے کے کمال رفعت اور علو و ارتفاع کی بنا پر ہے یا "من فی السماء" سے ملائکہ مراد ہیں کہ وہ رحم کرنے والوں کے لئے اللہ تعالے سے رحمت کی درخواست کرتے ہیں ۔ یا یہ مراد ہے کہ ملائکہ، رحم کرنے والوں کی شیاطین جن و انس سے حفاظت کرتے ہیں یہ حفاظت کرنا گویا کہ رحم کرنا ہے ۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں ۔ اے طالب قرب مولیٰ اور راہ قاصد سعادت دنیا عقبیٰ، اللہ کے بندوں پر شفقت اور ترحم کرنا خاصہ حضرت خداوندی ہے اور انبیاء و اولیاء کا منصب ہے اور لیکن بہت سے لوگ اپنے منصب کے تو اس امر کی کوشش کرو کہ سورج کی طرح ہر ایک

پر چکے۔ مخلوق کی بد اخلاقی کو برداشت کر اور اس سے رحمت و شفقت کو موقوف نہ کر۔

... حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَنْفَعُ النَّاسَ لوگوں میں سب سے اچھا وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہونچاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا اور اس کی ضرورت پوری کرتا ہو اللہ تعالیٰ اس بندے کی نصرت و حاجت روائی فرماتا ہے۔

اس کے بعد ان دو عورتوں کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق حدیث میں مذکور ہے کہ ان میں ایک عورت نیک اور پارسا تھی ایک بلی کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرنے کی وجہ سے عذاب ہوا۔ اور دوسری عورت جو نیک چلن نہیں تھی ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے اجر یاب ہوئی اور بخشی گئی ___ پھر کچھ عبارت کے بعد فرماتے ہیں ___ "آخر اس دار فنا کو چھوڑنا ہے اور دار جزا و بقا میں پہونچنا ہے لہذا نفسانیت اور تکبر کو اپنے اندر سے نکال کر پھینک دے اور اعمال پر بھروسہ نہ کر فضل و کرم غفار پر نظر رکھ ___ جہاں تک ہو سکے لوگوں کے دلوں کو راحت پہونچا اور مخلوق سے ترحم و شفقت کا معاملہ کر۔ اور اپنے آپ کو بری صفات سے علیحدہ رکھ۔ اے طالب مولیٰ غور کر کہ ایک حیوان کو راحت پہونچانے کی وجہ سے ایک جہنمی کو جنتی کر دیا گیا اگر انسان کو راحت پہونچانے سے حضرت رحمٰن تجھ کو اپنا مقرب بنا لیں تو کیا بعید ہے۔ اور ایک حیوان کو تکلیف پہونچانے سے ایک انسان دوزخ میں پہونچا تو اگر کسی بندہ کے دل کو جو کہ حرم انوار حق اور محل اسرار خدا ہے ___ کوئی شخص تکلیف پہونچائے اور اس کے نتیجے میں اسفل سافلین میں گر جائے تو کیا تعجب ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیکس بڑھیوں کا کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتے تھے! پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے رحمت کے سو حصوں میں سے ایک حصہ تمام حیوانات اور مخلوقات کو تقسیم فرما دیا ہے جس کی بنا پر مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتی اور ان کی پرورش کرتی ہیں اور سُم والا جانور اپنی ٹاپوں اور سُم سے اپنے بچے کو محفوظ رکھتا ہے اور کو ایذا سے بچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے باقی ننانوے حصے اپنے پاس محفوظ ہیں۔

معیت خداوندی پر ایک محققانہ بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ ــــ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ

ان آیتوں کے پیش نظر معیت کو سمجھنا چاہیئے۔ آیت کے ظاہری معنی یہی ہیں کہ خداوند کریم تمھارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ اور وہ انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ پس جاننا چاہیئے کہ ایک چیز کے دوسری چیز کے ساتھ ہونے کو معیت کہتے ہیں۔ یہ معیت یا تو مجازی مانی جائے گی یا حقیقی۔ علمار ظاہر کا قول یہ ہے کہ یہ معیت مجازی ہے حقیقی نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم تمام ذرات کے ساتھ ہے مگر از روئے علم نہ کہ از روئے ذات۔ یہی بات حضرات متکلمین فرماتے ہیں لیکن صوفیائے کرام ظاہری معنی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ حقیقت کو طلب کرتے ہیں، ان کا قول ہو کہ معیت حق تعالےٰ تمام ذرات کائنات کے ساتھ حقیقی معنیٰ میں ہے یعنی حق تعالےٰ بذات خود جمیع اشیائے کائنات کے ساتھ ہے۔

اس کی معیت وہ نہیں ہے جس کو متکلمین اور علمار ظاہر بیان فرماتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی معیت نہ تو معیت عرض با جسم کی طرح ہے ــــ نہ معیت جسم با جسم کی مانند ہے، نہ معیت عرض با عرض کے طور پر ہے نہ معیت عرض با جوہر کے طریق پر ہے۔ بلکہ وہ ایسی معیت ہے جو ان چاروں قسم کی معیتوں سے علحدہ ہے۔ آیت "ما یکون من نجویٰ" الآیۃ کو غور سے پڑھو اس میں اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہو کہ نہیں ہوتے۔ مشورہ کرنے والے تین شخص مگر کہ خدا ان میں چوتھا ہوتا ہے اور وہ ان کے اعمال و اقوال آشکارا و پنہاں کا جاننے والا ہے اور ان کے تمام صفات و خطرات اور کیفیات ظاہری و باطنی سے خبردار ہے اور پانچ آدمی راز کی بات آپس میں نہیں کرتے مگر چھٹا ان میں خدا ہوتا ہے ــــ اسی طرح جتنے بھی اشخاص ہوں کم ہوں، یا زیادہ مگر خدا ان کے ساتھ ہے جہاں بھی ہوں ساتوں آسمانوں میں ہوں یا ساتوں زمینوں میں ہوں ــــ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اس آیت کو بھی غور سے پڑھو اس سے بھی حقیقی قرب و معیت کا پتہ چل رہا ہے ؎

زیں معیت دم مزن بنشیں خموش ایں معیت در نیابد عقل و ہوش

(اس معیت پر زیادہ گفتگو نہ کر بس خاموش ہو جا اس معیت کو عقل و ہوش پوری طرح نہیں

پا سکتے)۔

اے بھائی تمام موجودات کے ساتھ قرب و معیت حق کو سمجھانے کے لئے سب سے زیادہ قریب الفہم مثال۔ قرب روح باجساد کی ہے کہ روح 'عالم امر سے ہے نہ بدن کی حقیقت میں داخل ہے نہ اس سے خارج ہے' نہ بدن سے متصل ہے نہ منفصل۔ وہ صفات جسم سے مبرّا اور ملابست کے نقص سے معرّا ہے اس کے باوجود وہ جمیع اجزائے بدن میں متصرف ہے۔ اگر ہزار سال بھی یہ روح 'بدن سے تعلق رکھے اس کی طہارت و صرافت میں کوئی خلل و نقصان نہیں آئے گا جس طرح یہ روح بدن کے تعلق سے پہلے تھی اسی طرح اب بھی رہے گی کوئی کثافت اس میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح قربِ حق کو مخلوق کے ساتھ سمجھو کہ عالم امکان کی پستی و ذلت اس قرب و معیت کی وجہ سے ذرہ برابر بھی واجب الوجود کی منزہ و مقدس ذات پر اثر انداز نہیں ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ احسَنُ الخَالِقِين۔ جب تم نے حقیقتِ معیّت روح 'جسم کے ساتھ سمجھ لی تو مشہور قول مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ عَرَفَ رَبَّهٗ'۔ (جس نے اپنے کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا) کو بھی سمجھ لوگے۔

شیخ محمد بہلتی کو تحریر فرماتے ہیں۔ ۔

دوام شہود و حضوری کو اپنا نصب العین بنا لو پھر کسی بھی (جائز) شغلے میں مشغول رہو تو وہ عین حال ہے اور بے شہود و حضوری صلوٰۃ و تلاوت میں بھی مشغول ہو تو وہ عین وبال ہے۔

سر رشتۂ دولت اے برادر بکف آر   ایں عمر گرامی بخسارت مگذار

دائم ہمہ جا با ہمہ کس در ہمہ کار   میدار نہفتہ چشم دل بجانب یار

(اے برادر دولت سرمدی کو ہاتھ میں لاؤ اور اس عمر گرامی کو خسارے کے ساتھ مت ضائع کرو۔ ہر جگہ ہر کسی سے ہر ضروری کام میں مشغول رہ سکتے ہو مگر چشم دل کو ہمیشہ جانب یار ہی رکھا، میاں محمد معظم (بہلتی) کو واضح رہے کہ غفلت اگرچہ ایک ہی ساعت ہو (طریقت میں) کفر ہو۔ مسلمان بن کر زندگی گزارنا چاہیئے۔ بے یاد خدا جینا، موت کی مانند ہے بلکہ موت سے بھی بدتر ہے میاں دلدار بیگ کو کیا لکھوں وہ خود دانا اور فہیم ہیں وہ بھی احسن و اہم کام میں مشغول رہیں ـــــــ

تم نے (شیخ محمد بہلیتیؒ نے) لکھا تھا کہ میں کوئی کتاب لکھوں۔ مخدوما! چونکہ فرصت کم ہے لکھنا میسر نہیں ہوتا۔ پھر بھی جو کچھ تم دریافت کروگے اس کا جواب مفصل و مشرح لکھا جائے گا، بے سوال کیئے کچھ لکھا نہیں جاتا ـــــ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ (بہ طور تحدیث نعمت کہتا ہوں) علمائے وقت کا علم میرے علم کے برابر نہیں ہے مگر میرا علم صوفیائے کرام کے صرف ایک مقولے کے برابر نہیں ہے (اور وہ مقولہ یہ ہے) الوقتُ سیفٌ قاطعٌ فعلیکَ الوقت ـ (وقت کاٹنے والی تلوار کی مانند ہے تمہارے اوپر وقت کی حفاظت لازم ہے)

ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں ـــ برادر شیخ محمد و شیخ معظم اور دلدار بیگ کو اس درویش دلریش کی جانب سے بعد سلام مسنون واضح ہو کہ الوقت سیف قاطع ـ تم کو آگاہی دوام کے حصول کی سعیٔ تمام کرنا چاہیئے ـ عبادت میں سعادت ہے اور فراغت (بے فکری) میں شقاوت ... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکر مند اور غمگین رہتے تھے ـ جو چیز تمھیں یاد حق سے باز رکھے تم اس سے باز رہو ـ

چیست دنیا از خدا غافل شدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(دنیا کیا ہے؟ خدا سے غافل ہونا ـــ یہ کپڑا، چاندی اور فرزند وزن دنیا نہیں ہیں)

شیخ محمد بہلیتیؒ کو ایک مکتوب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں ـ

تتمۂ وصیت آنکہ یا دوست یا یادِ دوست و ہر چہ جز اوست نہ نکوست ـ یعنی یا تو دوست ہو یا یادِ دوست ہو اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہو ٹھیک نہیں ـ ٹھیک نہیں ـ

ایک مکتوب میں شیخ محمد اور دلدار بیگ کو ارقام فرماتے ہیں ـ

درویش دلریش عبد الرحیم کی جانب سے برادرم شیخ محمد اور دلدار بیگ بعد از سلام مسنون مطالعہ کریں ـــ اللہ اللہ کرو اور ماسوی سے منھ موڑ و، دوام آگاہی میں سعی بلیغ ہو، زندگانی پر بھروسہ نہ کیا جائے ـ حدیث خیرُ النّاسِ مَن ینفعُ النّاس (لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہونچائے) پر عمل کرتے ہوئے مخلوق کو خدا تک پہونچانا چاہیئے ـ آگاہ باش، آگاہ باش آگاہ باش ـ

زوجہ شیخ محمدؒ اُمّ عبیداللہ پھلتی یعنی اپنی خوشدامن کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں ـــــ

حامداً و مصلیاً و مسلماً ــ امابعد ــ سالکۂ طریقت، طالبۂ حقیقت اُمّ عبیداللہ ان کو ذاکرات و اصلات، قانتات اور عارفات میں سے کر دے۔ اور مقام فنا و بقا سے کیف عطا فرمائے بعد سلام خیر انجام مطالعہ کریں ــ اشغال ظاہریہ میں اتنی مشغول نہ ہو لس کہ احوال باطنہ کی بلندی سے باز رہیں۔ . . . . . دل بیدار حاصل کرو (بالفرض) اگر تعلقات کونین بھی تم پر آگریں تو ذرا سا حجاب تمہارے قلب پر نہ ہونا چاہیئے . . . . راہ خدا میں مونث و مذکر ہونے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ جو عورتیں عشق خدا رکھتی ہیں وہ درحقیقت ہمت کے اندر مرد ہیں جو مرد عشق خدا سے بے تعلق ہیں وہ عورتوں سے بدتر ہیں۔

اپنے برادر نسبتی شیخ عبیداللہ پھلتیؒ (والد ماجد شیخ محمد عاشقؒ) کو تحریر فرماتے ہیں۔ برادر دینی، محب یقینی یعنی صلاح آثار میاں شیخ عبیداللہ جیو ہمیشہ یا دخدا سے محظوظ اور حفظ خدا کے اندر محفوظ رہ کر ذاکر و شاکر رہیں۔ بعد سلام مسنون تحریر آنکہ ــ.... دل فقیر کو اس کی فکر ہو کہ تم کس طرح ہو اور تمہارے حالات کیا ہیں، اپنے ظاہری و باطنی حقائق و معارف مفصل لکھ کر بھیجو ــ اور لکھو کہ اب سیر و سلوک کی کس منزل میں ہو ــ اس کی فکر کرو کہ تم سوائے خدا کے کسی کے بندے نہ بننے پاؤ اور ایسا کام کرو کہ کل کو شرمندگی نہ ہو ــ حیات دنیا کی کوئی حیثیت نہیں۔ حق تعالیٰ سے غافل رہنا جہل مطلق ہے ــــ .... دنیا فانی ہے، حق کے ساتھ مشغول رہنا، سعادت دوجہانی ہے۔ ذرہ یاد آگاہی ہزار بادشاہی سے بہتر ہے۔ طلب مولیٰ از مہ اولیٰ طالب دوست میں اہل معرفت کا غور و فکر کرنا خلاصی و نجات کا ذریعہ ہے خلاف نفس کام کرنا فرض عین ہے۔ . . . اہل یاد و ذاکر لوگ ہمیشہ شاد رہتے ہیں۔ (بظاہر اسباب)، اگرچہ معاش میں امیر و سلطان کی رضامندی درکار ہوتی ہے۔ لیکن معاد آخرت کے معاملے میں رضائے رحمن ضروری ہو رضامندیٔ حق ہی درکار ہے، تدبیر دنیا اور اہل دنیا کا کیا اعتبار ــ دنیا چند روزہ ہے آخر کار سابقہ خداوند کریم سے ہی پڑے گا۔ دینی خدمات کی طرف مائل رہو اور اپنے نفس پر غالب.... اگر در خانہ کس است یک حرف بس است ــ

ایک مرید کو تحریر فرماتے ہیں -

سید السند! فیض حق ناگاہ پہونچتا ہے - مگر کہاں پر پہونچتا ہے؟ دل آگاہ پر - دل آگاہ کی علامت کیا ہے؟ ذکر خدا سے دل میں نور و سرور کا داخل ہونا اور دارالغرور (دنیا سے) دور رہنا — بیشک، لذتِ یادِ حق تمام لذتوں سے اونچی ہے جس نے یہ ذائقہ چکھا اس نے چکھا — اور جس نے بات کو سمجھا اس نے سمجھا — اور جس نے نہیں چکھا اس نے نہیں جانا . . . .

شیخ حسام الدین سہارنپوری کو اجازت نامہ تحریر فرماتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں -

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین - فقیر عبدالرحیم کی طرف سے مجمع کمالات ظاہری و باطنی، منبع حسنات صوری و معنوی (شیخ حسام الدین) کی خدمت میں سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ اشتیاقِ ملاقات حدِ بیان سے باہر ہے - دوسری بات یہ ہے کہ بعض طالبین اور اخوان الصدق والصفا خدمت عالی میں اخذ طریق کے سلسلے میں رجوع کرتے ہیں لیکن آپ خوداری کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ اس زمانے کے طالبین میں بے استعدادی ہے - اظہار طریقہ علیہ اور اجرائے خیر کثیر کی جانب توجہ نہیں فرماتے (ان لوگوں کو بیعت نہیں کرتے) بیشک یہ بات صحیح ہے - طالبین کی کوتاہیٔ نظر اور بے استعدادی پر نظر کی جائے تو اسرار حق میں سے ایک بات بھی ان سے کہنا مناسب نہیں — لیکن اچھی بات یہ ہے کہ اہل طلب کے سامنے قواعد طریقہ بیان کر دئے جائیں ان میں جو جس استعداد کا ہوگا بہرہ ور ہو جائے گا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب کرے جس نے مجھ سے جو کچھ سنا وہ دوسروں تک پہونچایا کیونکہ بعض لوگ جن تک دین کی بات پہنچتی ہو، ان لوگوں سے زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں جنھوں نے براہ راست دین کی بات سنی ہے۔ اور بزرگوں کا طریقہ بھی جو اس وقت تک چل رہا ہے یہی ہے — چاہیئے کہ آپ اس حدیث کو پیش نظر رکھیں اور جو بھی طالب صادق آئے اس پر اظہار طریقت کریں جس کے نصیب میں جتنا ہوگا پالے گا — اور اگر عدم اظہار طریقہ کی

لہ شاہ عطیہ محمد پھلواری کے نسخہ میں یہ اجازت نامہ ص ۲۵ تا ۲۶ پر درج ہے مگر وہاں مکتوب الیہ کا نام مذکور نہیں۔ قلمی نسخے

سے حوالہ یہ شیخ حسام الدین سہارنپوری کے نام ہے -

وجہ یہ ہے کہ آپ کو کہیں سے اجازت نہیں ہے کہ وہ شرط اظہار طریقہ ہے۔ تو اس فقیر کی جانب سے اجازت سمجھیں اس فقیر کو . . . . ظاہر میں عارف ربانی ماہر اسرار سبحانی حضرت حافظ سید عبد اللہ اکبر آبادی قدس سرہ سے ان کو حضرت شیخ آدم بنوریؒ سے ان کو حضرت مجددؒ الف ثانی قدس سرہ سے اجازت ہے۔ نیز اس فقیر کو قدوۃ العارفین خواجہ ابو القاسمؒ سے بھی ــــ جو کہ خلیفہ کے لقب سے مشہور تھے ــــ اجازت حاصل ہے ان کو اعلم علماء اعرف عرفا ملا ولی محمد قدس سرہ سے اور ان کو صاحب طریقۂ جذب و سلوک میر ابو العلیٰ اکبر آبادی قدس سرہ سے ان کو خواجہ عبد اللہؒ سے ان کو اپنے ماموں خواجہ محمد یحییٰ سے ان کو مولانا خواجہ عبد الحقؒ سے ان کو اپنے ماموں پیشوائے ابرار خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہ سے اجازت ہے۔ طریقۂ قادریہ و چشتیہ کے مشائخ طریقت کے نام جو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اوپر ہیں پھر لکھ کر بھیجے جائیں گے۔

اپنے ایک مرید فیض اللہ کو تحریر فرماتے ہیں۔ بعد الحمد والصلوٰۃ۔ برادرم فیض اللہ ہمیشہ منتظر فیض اللہ رہیں۔ اے برادر فیض اللہ اچانک اور ناگاہ پہونچتا ہے۔ لیکن دل آگاہ پر پہونچتا ہے، جانتے ہو دل آگاہ کیسا ہوتا ہے؟ وہ دل جو آداب کا پابند ہو۔ ادب تین قسم کا ہے ادب خدا، ادب رسول خدا اور ادب خلق خدا ــ جس نے ادب کی محافظت و رعایت کر لی وہ مردان راہ خدا کے مقام پر پہونچ گیا۔ امام مالکؒ مدینے کی گلیوں میں کبھی سوار نہ ہوئے اس خیال سے کہ محبوب رب العالمین، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پیدل چلے ہوں گے۔ امام موصوفؒ جب کسی قدیم عمارت کو دیکھتے تھے ادب کے ساتھ اس کو بوسہ دیتے تھے اس خیال سے کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک اس کو لگا ہوگا۔ جب فیض پہونچے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ تماشائے فیض ربانی تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے اور اسرار فیض تک پہونچو گے۔ اتنا افاضہ و فیض دیکھو گے کہ افاضہ و فیض کا اثر تمہاری نگاہ بصیرت سے چھپ جائے گا اور بجز فیاض کے اور کوئی نظر نہ آئے گا . . . .

شیخ محمد بہلتیؒ کو ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں۔

. . . . جس کے دو دن ساوی حالت میں گزرے اور کوئی ترقی نہ کی، وہ خسارے میں ہے۔ پس چاہیئے کہ کوئی سانس غفلت کے ساتھ نہ آئے اور کمیت و کیفیت نسبت کی زیادتی

واضافہ کی پوری پوری کوشش کی جائے۔ اگر عمر نوح اس میں صرف ہو جائے تب بھی اس کا حق ادا نہ ہوگا۔ متفرق اشغال اور اوراد سے دست برداری ہونی چاہیے اور پوری عزیمت اور قوت کے ساتھ ہمیشہ نسبت کی جانب متوجہ رہا جائے۔ . . . . ماضی و حال کا موازنہ کرنا واجبات طریق سے ہے۔ اصولِ پنجگانہ جو اس فقیر کو القا ہوئے ہیں ان کی ادائیگی میں "صرف ہمت" کرنا چاہیے (وہ اصول پنجگانہ یہ ہیں) (۱) دوام ذکر (۲) ہر حال میں تقوی (۳) عام مخلوق خدا کو بغیر تفریق ملک وملت نفع پہونچانا (۴) اپنے نفس کو کسی پر فضیلت و ترجیح نہ دینا۔ (۵) امر اللہ اور خلق اللہ سے تواضع کا معاملہ۔

شیخ محمد بہلیؒ کو ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

درگاہ الہٰی سے قریب کرنے والی کوئی چیز شغل آگاہی سے بہتر نہیں ہے۔ آگاہ کون ہے؟ وہ جو خود کو آگاہ نہیں سمجھتا. . . . . امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ علمائے وقت کا علم میرے علم کو نہیں پہونچتا اور صوفیائے کرام کے ایک جملے کو میرا علم نہیں پہونچتا وہ جملہ یہ ہے۔ الوقت سیف "قاطع" ۔ جس کام میں نفع نہ ہو اس کو پسند نہ کرو . . . چاہیے کہ درس بھی اس طرح ہو کہ آگاہی باقی رہے اور اعتدال کے ساتھ ہو اور . . . . دست جو موافق شریعت ہوں ان کی طرف التفات کریں۔ مراقبہ، مجاہدہ وغیرہ سے ایک لحظ خالی نہ رہیں۔

ایک خاتون صالحہ کو تحریر فرماتے ہیں۔

بعد سلام واضح ہو کہ اپنے اوقات عزیز کو غفلت و بیکاری میں ضائع نہ کریں اور اپنے انفاس نفیس کو بجز ذکر حق تعالیٰ کے نہ گزاریں۔

؎ ہر یک نفس کہ میرود از عمر گوہریست کا نرا خراج ملک دو عالم بود بہا
مپسند کایں خزانہ و بہی رائگاں باد و انگہ روی بہ خاک تہی دست بے نوا

(عمر کا جو سانس بھی گزر رہا ہے وہ اتنا قیمتی ہے کہ ملک دو عالم کا خراج اس کی قیمت ہے اس بات کو پسند نہ کر کہ اس خزانے کو یوں ہی رائیگاں اور برباد کر دے اور خالی ہاتھ مفلس ہو کر قبر میں جائے۔) مخلوق سے توجہ ہٹا کر خالق کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اپنے اوقات کو "تلاوتِ قرآن" "ذکر دوام" اور "آگاہی بتوجہ تام" میں مشغول رکھو. . . . جو شغل میں نے تلقین کیا

ہے اس کو اپنا نصب العین بنالو اور ایک سانس بھی غفلت سے نہ نکالو۔ اوپر نظر کرو تو اللہ ہے۔ نیچے نظر کرو تو اللہ ہے دائیں طرف دیکھو تو اللہ ہے بائیں طرف نگاہ کرو تو اللہ ہے۔ اگر خود اپنی ذات کے اندر نظر کرو تو اللہ موجود ہے۔ تمام حرکات و ارادات بجانب اللہ ہیں بس اسی نسبت میں کوشش کرو اور خود کو اپنی نظر سے پوشیدہ کر لو۔۔۔۔ قل اللہ ثم ذرھم اللہ بس باقی ہوس۔۔۔ وظیفہ درود، اشراق وچاشت اور تہجد، نسبت باطنی حاصل کرنے کے پیچھے فوت نہ ہونے پائیں اس لئے کہ ان میں بے شمار کمالات ہیں

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است تعلیم کن اگر ترا دسترس است
گفتم کہ الف گفت دگر، گفتم ہیچ درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

(دل نے مجھ سے کہا کہ مجھے علم لدنی کی آرزو ہے اگر تم کو یہ علم آتا ہو تو مجھے تلقین کر دو۔ میں نے الف بتا دیا اس نے کہا اور کچھ؟ میں نے کہا بس اور کچھ نہیں اگر کوئی لائق آدمی ہے تو اس کو ایک ہی حرف کافی ہے۔

دو دن

مرکزِ تبلیغ نظام الدین میں

(از جناب وحید الدین خاں)

اپر انڈیا ایکسپرس اپنی پوری رفتار سے فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ راستہ میں دونوں طرف سرسبز کھیتوں اور ڈبڈبائے ہوئے نالوں اور ندیوں کا مسلسل منظر نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا، مگر ٹرین کے لیے ان خوشنما مناظر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پستی اور بلندی، خشکی اور پانی اس کی رفتار میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتے تھے۔ راستہ میں چھوٹے چھوٹے اسٹیشن آتے مگر وہ ان کو چھوڑتی ہوئی اس طرح بھاگی چلی جا رہی تھی گویا اسے کہیں ٹھہرنا نہیں ہے۔

دل نے کہا: حق کے مسافر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ دُنیا کے خوشنما مناظر اس کو لُبھانے کے لیے سامنے آتے ہیں مگر وہ اُن سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ سلسلے اور اقامت گاہیں اس کو ٹھہرنے اور آرام کرنے کی دعوت دیتے ہیں مگر وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مقاصد اس کا راستہ روکتے ہیں۔ مگر وہ ہر ایک سے دامن بچاتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز اس سے ٹکراتے ہیں مگر اس کے عزم اور اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ حق کا مسافر ایک بے مقصد دُنیا میں بھٹکے ہوئے شخص کے مانند نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ذہن میں ایک مقصد ہے اور اس کے سامنے ایک معلوم منزل ہے۔ پھر وہ کیسے کہیں اور رُک سکتا ہے۔ کیسے دوسری چیزوں میں اُلجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کو پسند کر سکتا ہے۔ اسے تو بڑھنا ہے اور بڑھتے ہی رہنا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد کو پالے، یہاں تک کہ وہ اپنی منزل پر پہونچ جائے۔

یہ ماہ اگست ۱۹۶۶ء کی چودہ تاریخ تھی۔ دن کے دس بجے ہم اپنی منزل پر پہونچے۔ دہلی کے مشرقی کنارے پر خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار سے تھوڑے فاصلے پر "بنگلہ والی مسجد" ہماری منزل تھی جو تیس سال سے تبلیغ و اصلاح کی مشہور تحریک کا مرکز ہے۔ کسی وقت یہ جگہ شہر سے الگ تھلگ بالکل سنسان حالت میں تھی۔ مگر اب وہ "بستی نظام الدینؒ" کے نام سے مشہور ہے جہاں اچھی خاصی آبادی ہو چکی ہے۔ اور جو دہلی کارپوریشن کا ایک حصہ ہے۔ یہ بھی تحریک تبلیغ کا گویا ایک تمثل ہے۔ جس وقت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں کام کا آغاز کیا تو یہاں کی سنسان آبادی کی طرح وہ ایک نامانوس اور غیر مقبول آواز تھی۔ مگر آج ایک عالم اس دعوت کی طرف متوجہ ہے۔ جس طرح یہ آبادی اب ایک پُر رونق شہر میں تبدیل ہو چکی ہے ــــ نظام الدین آج ایک ملک گیر بلکہ عالم گیر تحریک کا مرکز بنا ہوا ہے، اس کی مثال قلب کی سی ہے۔ جس طرح قلب سے خون چلتا ہے اور سارے جسم میں گھوم کر پھر قلب کی طرف واپس آتا ہے۔ اسی طرح بے شمار انسان یہاں سے نکل نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلتے ہیں اور پھر واپس آکر نئی قوت لیتے ہیں اور دوبارہ اپنے تبلیغی سفر کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی حرکت کے سرے ملتے ہیں جس کا آغاز تو ہے مگر جس کا کوئی اختتام نہیں۔

میرے سامنے ایک بوڑھا شخص تھا۔ چہرے پر ہڈیاں نکلی ہوئی، حلیہ سے افلاس اور جہالت نمایاں۔ قدیم طرز کے دو گول شیشے کپڑے اور چمڑے کی مدد سے باندھ کر دونوں کانوں میں اٹکائے گئے تھے۔ یہ اس کی عینک تھی۔ دوسری طرف وہ چہرے اور جسم بھی تھے جن پر مکھیاں پھسلتی ہیں اور جن کے وضع و لباس میں علم و امارت کی شان نمایاں تھی۔ اور یہ سب لوگ یکساں توجہ اور انہماک کے ساتھ مقرر کی تقریر سن رہے تھے۔ ایسی تقریر جو علمی تعریف کے مطابق نہ تقریر کہی جاسکتی ہے اور نہ وعظ۔ مگر اس کے باوجود اس کے اندر جادو کی سی کشش تھی، اور سارے لوگ بے اختیاری طور پر اس کی طرف کھنچے چلے جارہے تھے۔

۱۔ "بنگلہ والی مسجد" کی اس دنیا میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلی چیز جو آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ یہاں کا مجمع ہے۔ ناظر دیکھتا ہے کہ انسانوں کا ایک ہجوم ہے جو پروانہ وار اُمنڈا چلا آرہا ہے۔ اس میں جاہل بھی ہیں اور عالم بھی۔ تہمد پوش بھی ہیں اور پتلون پوش بھی۔ موٹے بھی ہیں اور دُبلے بھی۔ جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ قریب کے بھی ہیں اور دور کے بھی۔ حتیٰ کہ ملک کے باہر دوسرے دوسرے جغرافی علاقوں کے بھی۔ جن کی صورتیں الگ، جن کے لباس مختلف، جن کی زبانیں ہم سے جدا۔ اور یہ سارے لوگ اس طرح آرہے ہیں اور جا رہے ہیں جیسے کوئی سیلاب ہے جو بہہ رہا ہے اور کسی طرح ختم ہونے کا نام

نہیں لیتا۔

"آخر وہ کیا چیز ہے جو ان بے شمار انسانوں کو اس بستی کی طرف کھینچ رہی ہے"۔ یہ سب سے پہلا سوال ہے جو نووارد کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کسی سے پوچھ کر اس کا جواب معلوم کرے وہ خود ہی اس سوال کا جواب پالیتا ہے۔ جب وہ یہاں کے پروگراموں میں شریک ہوتا ہے، یہاں کی باتوں کو سنتا ہے۔ یہاں کی جلبلا دینے والی دعاؤں پر آمین کہتا ہے، تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی تسخیری قوت ہو جو اس کے دل و دماغ پر قبضہ کیے جا رہی ہے۔ کوئی روحانی مقناطیس ہے جو بے پناہ کشش سے اس کو اپنی طرف کھینچے چلا جا رہا ہے۔ وہ خود اپنے ذاتی تجربے میں اس سوال کا جواب پالیتا ہو کہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے اتنے سارے لوگ کیوں پروانوں کی طرح اس بستی پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ کیوں یہ مسجد بے شمار انسانوں کی نقل و حرکت کا مرکز بن گئی ہے۔

مسجد کے اوپر کے ایک کمرے میں میں سو رہا تھا کہ دور سے سُننے والی الارم کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ یہ رات کے ساڑھے تین بجے تھے۔ اب تبلیغ کے اس مرکز میں سرگرمیوں کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ چاروں طرف انسانوں کی چہل پہل نظر آنے لگی۔ سیکڑوں لوگوں نے اُٹھ کر وضو کیا اور تہجد کی نماز میں مشغول ہو گئے۔ نماز کے بعد کوئی دُعا کر رہا ہے، کوئی ذکر کر رہا ہے، کوئی رو رہا ہے، کوئی تلاوت کر رہا ہے، کوئی اپنی اور اُمت کی اصلاح کی درخواست لیکر خدا کے حضور سجدہ میں پڑا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی آواز کے ساتھ مؤذن نے اعلان کیا کہ فجر کا وقت شروع ہو گیا ہے۔ اب فجر کی سُنتیں پڑھی گئیں اور سوا پانچ بجے فجر کی نماز ہوئی۔ تکبیر ہوئی تو تقریباً تین سو آدمی بیک وقت جماعت کے لیے کھڑے ہو گئے۔

"نماز کے فوراً بعد بیان ہوگا۔ سب لوگ یہیں مسجد میں ٹھہرے رہیں"۔ جماعت سے فراغت کے بعد ایک شخص نے اعلان کیا۔ اب تقریر شروع ہوئی۔ موضوع تھا دین اور دنیا کا تعلق۔ سادہ الفاظ، بے تکلف انداز، قریب کی آسان مثالیں، دینی جذبہ ابھارنے والی نفسیاتی باتیں، جگہ جگہ جان ڈالنے والا [illegible] دلائل سے استدلال، نہ تقریر کی خطابت، نہ وعظ کی اکتاہٹ ——— یہ تھا تقریر کا خلاصہ۔ صبح [illegible] گیا مگر تقریر میں اتنی جاذبیت [illegible] رہ گئی، لوگوں [illegible] بے کے بعد باہر نکلنے کی [illegible]

اس کے بعد اجتماعی ناشتہ ہوا۔ ناشتہ کے بعد پھر تعلیم و تقریر کی مجلس شروع ہوگئی جس میں اللہ سے تعلق قائم کرنے اور اس پر بھروسہ کرنے کی تلقین تھی۔ آخر میں طویل دُعا ہوئی۔ مجلس کے درمیان میں امیر بیٹھ کر دُعا کر رہا تھا اور حاضرین رو رو کر آمین کہہ رہے تھے۔ دُعا میں انسانی کمزوریوں اور اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کو اس طرح نمایاں کیا جارہا تھا۔ اور انسان کی فطرت میں دبے ہوئے جذبات کو اس طرح اُبھارا جارہا تھا کہ دل دہلے پڑ رہے تھے۔ دعا کے بعد جماعتوں کی روانگی کا پروگرام تھا۔ جن لوگوں نے اپنے نام تبلیغی سفروں کے لیے لکھوائے تھے ان کی الگ الگ علاقوں کے اعتبار سے فہرستیں تیار کرلی گئی تھیں۔ ایک شخص کھڑے ہو کر ہر جماعت کے افراد کے نام پکارتا تھا۔ اور لوگ آکر امیر سے مصافحہ کرکے روانہ ہورہے تھے۔ عجب منظر تھا۔ جو مسجد نبویؐ کے اُس منظر کو یاد دلاتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ترغیب دے کر مختلف علاقوں کو سرایا روانہ فرمایا کرتے تھے۔ امیر ہر ایک سے مصافحہ کرکے کہتا تھا — یغفر اللہ لنا و لکم۔ میں تم کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ اور تمھارے لیے خیر کی دعا کرتا ہوں، اللہ قبول فرمائے تم کو بھی، مجھ کو بھی اور پوری اُمت کو۔" ایک جماعت میں ایک ایسے شخص نے بھی نام لکھوایا تھا جو ایک پاؤں سے معذور تھا وہ لنگڑاتا ہوا آیا اور لنگڑاتا ہوا واپس گیا۔ ایک اور شخص اپنے چھوٹے بچے (عمر تقریباً ۵ سال) کو بھی ساتھ لے جارہا تھا یہ سب مناظر اس قدر پرکشش تھے کہ مشکل ہی سے کوئی ان سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔

ساڑھے بارہ بجے یہ پروگرام ختم ہوا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کے لیے وقفہ دیا گیا۔ تین بجے ظہر کی نماز پڑھی گئی۔ اور نماز کے بعد پھر وہی تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ درمیان میں عصر کی نماز ہوئی۔ اور عصر کی نماز کے بعد پھر مغرب تک مسلسل تقریر، مغرب بعد عشا تک تقریر، عشا کے بعد کھانے کا وقفہ، کھانے کے بعد پھر تقریر اور درس نصف شب میں جاکر یہ سلسلہ ختم ہوا۔

یہ پروگرام جو میں نے لکھا کسی ایک دن کا قصہ نہیں، بلکہ یہی بیان کا روزانہ کا معمول ہے۔ کسی ... کے سالانہ اجتماع کے موقع پر اجتماع گاہ میں رات دن جو ہماہمی اور مصروفیت ہوتی ہے۔ وہ بیان ... جاری رہتی ہے۔ تعلیم، تقریر، درس، بیان، دعا، وضو، نماز، ذکر، تضرع، گریہ و زاری ... اخلاق، شرافت، سیکڑوں انسان ہر آن ان مشاغل میں مصروف رہتے ہیں ایسا اسلامی ماحول ... تحمل اور ایک اسلامی گرم بازاری ہے جو ہر وقت جاری ہے۔

۲۔ یہ اس دُنیا کی سب سے پہلی خصوصیت ہے جو ایک نو وارد یہاں محسوس کرتا ہے۔ اُس وقت اُسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "مرکز تبلیغ" دوسری جماعتوں اور پارٹیوں کے مراکز سے کس قدر مختلف ہے۔ تمام جماعتیں خواہ وہ دینی ہوں یا غیر دینی، بلا استثناء ان کے مراکز آج "ایک دفتر" میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جماعتوں اور پارٹیوں کے مرکز میں جا کر کوئی شخص ان کی تحریک کو نہیں پاتا۔ اس کے سامنے بس ایک دفتر ہوتا ہے جس کے مختلف شعبے ہیں۔ کہیں صدر کی تختی لگی ہوئی ہے کہیں سکریٹری کی، کوئی مہمان خانہ کا کمرہ ہے اور کوئی طعام خانہ کا، اور ان دفتروں میں جو سرگرمیاں روزانہ ہوتی ہیں وہ کیا ہیں ــــ اخبارات کا مطالعہ، پارٹی کے نقطہ نظر سے ملکی حالات پر تبصرے، رجسٹروں کی خانہ پری، رپورٹوں کی تیاری، خط وکتابت، سرکلر کی روانگی، تنظیمی مسائل پر بحثیں، لیڈروں کے استقبال کی تیاریاں، غرض وہی سب کچھ جو عام قسم کے دفتروں میں ہوتا ہے۔ وہی ان جماعتی دفاتر میں بھی روزانہ ہوتا ہے۔

یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا فرق ہے جو نظام الدین کی اس بنگلہ والی مسجد کو مدینہ کی قدیم مسجد نبویؐ سے مشابہ کر دیتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے زمانے میں مسجد نبویؐ اسلامی تحریک کا مرکز تھی۔ مگر یہ مرکز اس قسم کی رسمی کارروائیوں کا دفتر نہیں تھا جیسے آجکل کی جماعتوں کا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ خود اسلام اور اسلامی زندگی کا مرکز تھا۔ وہاں نماز کی اقامت، ذکر کی مجلسیں، خدا سے لپٹنا، اپنے دوسرے بھائیوں کی خدمت، قرآن کی تلاوت، سنت کا چرچا، اسلام کے پھیلانے کی فکریں ہوا کرتی تھیں۔ مسجد نبویؐ میں آکر ایک شخص ویسا ہی محسوس کرتا تھا جیسے سخت سردی یا سخت گرمی کے زمانے میں باہر کی فضا سے چل کر کوئی شخص یکایک ایرکنڈیشنڈ عمارت میں داخل ہو جائے۔ ابتدائی دور کی مسجد نبویؐ میں نہ عمارت کی شان وشوکت تھی نہ سامانِ آرائش کا ہجوم، البتہ وہاں آدمی اسلام کو دیکھتا تھا، وہاں تعلق باللہ کے مناظر اس کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ وہاں دین کا درد تڑپتا ہوا نظر آتا تھا، وہاں قرآن واقعہ بننے کی کوشش کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ جو شخص مسجد نبویؐ کے اسلامی ماحول میں داخل ہوتا تھا وہ متاثر ہوئے بغیر باہر نہیں آتا تھا۔

بنگلہ والی مسجد کا یہ ماحول جو چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے جاری ہے، یہ سنت نبویؐ کے ایک ایسے پہلو کا احیاء ہے جس کی نظیر شاید سارے عالم اسلامی میں کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ آج دُنیا میں اسلامی دفاتر تو اتنے ملیں گے کہ ان کو شمار کرنا مشکل ہے۔ مگر مسجد نبویؐ کے نمونہ کا اسلامی مرکز کہیں بھی نہیں مل سکتا۔

اور یہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ تنہا یہی واقعہ کسی کوشش کی طرف نصرتِ الٰہی کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق سُنا کہ وہ ایک بار یہاں آئے اور یہاں کا منظر دیکھا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا۔ "میں سمجھتا تھا کہ نظام الدین اولیاء ختم ہو گئے۔ مگر میں نے بستی نظام الدین میں آکر دیکھا کہ نظام الدین اولیاء تو ابھی تک زندہ ہیں۔ وہاں جا کر میں دوبارہ مسلمان ہوا ہوں۔ جس کو مسلمان بننا ہے وہ وہاں جائے۔"

۳۔ کام کا یہ انداز اس تحریک کے طریق کار کا اہم ترین جزء ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے تحریک کے آغاز میں جانا پڑے گا۔ مرکز نظام الدین میں میں ایک شخص سے بات کر رہا تھا۔ میرے قریب ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ وضع قطع سے دیہاتی اور بالکل اَن پڑھ معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھی نے ایک موقع پر شہادت کی موت کا ذکر کیا۔ اس درمیان میں خاموش دیہاتی نے نہایت اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اس میں اپنے ایک جملے کا اضافہ کیا ــــــ "اور شہادت بھی وہ جو دعوت کی راہ میں پیش آئے"۔ اُس نے کہا۔ اس کے اس جملہ سے اندازہ ہوا کہ وہ خواہ جاہل ہو مگر صاحبِ معرفت ہے۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ "ایک میواتی بزرگ" ہیں جو ۱۵ سال کی عمر میں مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کی دعوت میں شریک ہوئے تھے، اور جب سے اب تک اسی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔

یہ میواتی بزرگ ادھیڑ عمر کے بھاری بھرکم آدمی ہیں۔ سانولے رنگ کے چہرے پر پُرشکوہ داڑھی کے ساتھ جب وہ سادگی اور اعتماد کے الفاظ بکھیر رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی قرنِ اول کی ہستی سے مخاطب ہوں۔ ایک اَن پڑھ شخص کے آگے میرے سارے الفاظ اور میرا تمام علم گم ہو گیا تھا اور میں اس طرح ہمہ تن گوش ہو کر اُن کی باتیں سُن رہا تھا جیسے کوئی سعادت مند شاگرد اپنے شفیق اُستاد کے درس کو سنتا ہے۔ مگر افسوس کہ ایک اتفاقی سبب سے یہ گفتگو مکمل نہ ہو سکی اور ہم دونوں قبل از وقت ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

یہاں مجھے ان کی صرف ایک بات کا ذکر کرنا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ۵۰ میل چوڑے اور ۵۰ میل لمبے میوات کے علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی تھی۔ مگر عالم یہ تھا کہ گوبر اور پتھر پوجتے تھے۔ سید سالار غازی کے علم کا سالانہ تہوار ان کے نزدیک سب سے بڑا کام تھا۔ عمل سے لے کر وضع قطع تک کہیں اسلامیت نہیں تھی۔ ان کی اصلاح کے لیے مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میوات کے علاقے میں مکاتب کھولے۔ ان مکاتب کو قائم کرنے میں سخت دقتیں پیش آئیں، کیونکہ جاہل میواتی اپنے بچے اس میں دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ کہتے کہ

ہمارا بچہ کھیت اور مویشی کے کام دیکھے گا، پڑھ کر کیا کرے گا۔ غرض بڑی مشکلوں سے مدرسہ جاری ہوا۔ مگر جب لڑکے وہاں سے پڑھ کر نکلے تو اخلاقی اور دینی اعتبار سے وہ بھی ویسے ہی بن گئے جیسی ان کی آبادی تھی۔ حتیٰ کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی بستی سے آنے والے لڑکے پڑھنے کے بعد خود بھی چور اور ڈاکو بن گئے۔ اس وقت میوات کے رہنے والے مسلمان اس قدر اجڈ تھے کہ ایک بار مولانا الیاس صاحب ایک شخص کے اوپر تبلیغ کر رہے تھے، میواتی ان کی تبلیغ سے اسقدر خفا ہوا کہ انھیں ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ مولانا دبلے پتلے کمزور آدمی میواتی کے گھونسے کی تاب نہ لاکر گر پڑے اور کچھ دیر غشی کی سی حالت میں پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو اٹھ کر میواتی کا دامن پکڑ لیا اور کہا :-

"تم اپنا کام کر چکے، اب میری بات سنو"

یہ سن کر میواتی کا عجیب حال ہوا۔ وہ خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے کہا ـــ "مولوی ـــ! مجھے معاف کر دو، ورنہ میری بخشش نہیں ہوگی۔"

غرض مکاتب کے ناکام تجربہ کا مولانا الیاس صاحب پر سخت اثر ہوا۔ وہ درد و کرب سے تڑپتے اور کہتے "ہائے اللہ میں کیا کروں" یہاں تک کہ ان پر کھلا کہ موجودہ ماحول میں تعلیم و تبلیغ کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ـــ "استاد لفظ پڑھا دے، تربیت دے ماحول" میواتی نے اپنے سادہ الفاظ میں کہا۔ آج کا ماحول بالکل بگڑ چکا ہے، اور جب آدمی ماحول کے اندر ہوتا ہے تو وہ ہر وقت اس کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے، ایک طرف کان میں تبلیغ کی آواز جاتی ہے اور عین اسی کے ساتھ ماحول کی آواز بھی داخل ہوتی رہتی ہے، اس لیے تعلیم و تبلیغ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

پھر ماحول کہاں سے آئے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ ماحول پر تو ہمیں قدرت نہیں کہ مٹا دیا کر اس کو بدل دیں، اس کا حل یہ ہے کہ مسجدوں کے اندر چھوٹے چھوٹے ماحول بنائے جائیں جن میں ایک مدت تک کے لیے وہی باتیں چلائی جائیں جو ہم پوری سوسائٹی میں چاہتے ہیں، یعنی ذکر، نماز، دعا، تلاوت، خدمت اور توجہ الی اللہ کا ماحول۔ چھوٹے سے دائرہ میں ایسی فضا بنائی جائے کہ وہاں اس کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو۔ اس کے بعد لوگوں کو ان کے ماحول سے کاٹ کر اس طرح کے ماحول میں لایا جائے اور وہاں ایک مقرر مدت تک رکھ کر ان کو ایمان و اسلام کی باتیں بتائی جائیں۔

تبلیغی طریق کار کا خاص فلسفہ یہ ہے کہ لوگوں کو اگر ان کی کھیتیوں میں، ان کی ملازمتوں میں،

انکی تجارتوں میں اور ان کی دنیاوی مشغولیتوں میں سمجھانے کی کوشش کروگے تو وہ سمجھ نہیں سکتے، اس لیے انھیں ان کے مشاغل سے نکال کر مسجد میں لاؤ اور مسجد کے اندر ایک اسلامی فضا بنا کر ان کے اوپر اسلام کی تبلیغ کرو۔ اس وقت ان کا ذہن بالکل خالی ہوگا اس لیے وہ بات کو فوراً سمجھ جائیں گے۔ بستی نظام الدین میں بنگلہ والی مسجد اسی طریق کار کا ایک مستقل عملی مرکز ہے جہاں ہر وقت اسلامی اور تبلیغی ماحول رہتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں - وہاں ہر آن بس ایک ہی چیز کا چرچا ہے اور وہ یہ کہ خدا سے تعلق جوڑو، کیونکہ خدا ہی سے سب کچھ ہوتا ہے، کسی اور چیز سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہی وہاں کا قول ہے اور یہی وہاں کا عمل ہے۔

تبلیغی کارکنوں کا ہر جگہ یہی کام ہے کہ وہ سفر و حضر میں اسی طرح کے ماحول وقتی طور پر بنائیں۔

جماعتی وفود جو کثیر تعداد میں روزانہ نکلتے رہتے ہیں وہ جب کسی مقام پر پہونچتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ مقامی طور پر گشت کر کے لوگوں کو مسجد میں آنے کی دعوت دیں۔ پھر مسجد میں جمع کر کے انھیں نماز پڑھوائی جائے، تلاوت کرائی جائے، سیرت پاک اور صحابہ کرام کے واقعات سنائے جائیں، دعائیں یاد کرائی جائیں، اعمال صالحہ کے فضائل بیان کیے جائیں اور ان کی دینی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں۔ انھیں دعا اور عبادت میں مشغول کیا جائے۔ اس فضا میں کچھ وقت گزارنے کے بعد جب ان کے دل نرم ہو جائیں تو انھیں چلّہ پورا کرنے کی دعوت دی جائے۔ "چلّہ" کے لفظ سے بعض لوگوں کو توحش ہوگا حالانکہ چلّہ دراصل مسجد کی اس چند گھنٹہ کی دینی زندگی کی گویا توسیع (EXTENSION) ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ چالیس دن تک اپنے دنیوی مشاغل کو چھوڑ کر مسجدوں میں زندگی گزارنا۔ گشت کر کے دوسرے مسلمانوں تک پہونچنا اور ان کو اسلامی زندگی کی طرف بلانا، اسلامی فضا میں ایک عرصہ تک رہ کر دین کو اس حد تک سیکھ لینا اور پکڑ لینا کہ آدمی پختہ ہو جائے۔ اور جب دوبارہ اپنے ماحول میں واپس آئے تو اس کا ارادہ اور شعور اس حد تک بیدار ہو چکا ہو کہ آئندہ اسلامی طرز پر زندگی گزار سکے۔ گویا چلّہ ایک قسم کا متحرک تربیتی کیمپ ہے۔ یہ ایک سراپا عمل ہے نہ کہ دھیان گیان قسم کی کوئی چیز۔

یہ طریق کار جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ پر کھولا تھا۔ اس کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے ہیں، بلا مبالغہ لاکھوں لوگ جو نہایت غلط قسم کی زندگی میں پڑے ہوئے تھے انھوں نے اس سے متاثر ہو کر اپنی زندگیاں بدل ڈالیں۔ ہزاروں ایسے لوگ جو اجتماع اور چلّہ اور گشت کا مذاق اڑاتے تھے جب ان کو ان کے ماحول سے نکال کر دینی فضا میں رکھا گیا اور وہاں ان کے اوپر تبلیغ کی گئی تو وہ اسکے

فریفتہ ہوگئے۔ ڈاڑھی کے بغیر نکلے اور ڈاڑھی والے ہوکر لوٹے، سوٹ، ٹائی میں نکلے اور واپس آئے تو ان کا لباس کرتا پاجامہ ہوچکا تھا۔ بے نمازی، زکوٰۃ نہ دینے والے، لڑائی جھگڑا کرنے والے، اور بدکاریوں میں لت پت نکلے اور واپسی اس حالت میں ہوئی کہ یہ پہچاننا مشکل ہوگیا کہ یہ وہی شخص ہے۔ حتیٰ کہ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ شراب کی بوتلیں ساتھ لے کر نکالا گیا کیونکہ انھیں اصرار تھا کہ ہم شراب کو چھوڑ نہیں سکتے، مگر شراب کے ماحول کے بجائے دینی ماحول میں روز و شب گزارنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اپنے ہاتھ سے انھوں نے شراب کی بوتلیں توڑ ڈالیں اور تائب ہوکر مسلمان کی سی زندگی گزارنے لگے۔ ایک کارکن نے بتایا کہ افریقہ میں جب پہلی جماعت گئی تو تبلیغ کے لوگ کرتا پاجامہ میں تھے اور وہاں کے جن لوگوں کو انھوں نے کہہ سن کر اپنے ساتھ گشت کے لیے تیار کیا تھا وہ کوٹ پتلون میں، بعد کو یہ لوگ متاثر ہوئے اور جماعت کے ساتھ نکل کر ہندوستان آئے مگر اس وقت ان کا حلیہ اور وضع قطع اتنی بدل چکی تھی کہ پاسپورٹ پر پہلے کی تصویر سے جب سرحد کے افسروں نے ان کا حلیہ ملایا تو وہ کہنے لگے یہ پاسپورٹ تمہارا ہے یا کسی اور کا۔ یہ تو کوٹ اور ٹائی کی تصویر ہے اور تم لوگ دوسرا لباس پہنے ہوئے ہو۔

۴۔ تبلیغ کے اس کام کی ایک حیرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ اس کی عمر تیس برس سے زیادہ ہوگئی اور اس دوران میں اس کے رہنماؤں میں تین بار تبدیلی ہوئی مگر اس کے باوجود اس کا کام برابر بڑھ رہا ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو جدید تاریخ میں کسی بھی دینی یا غیر دینی جماعت کو حاصل نہیں۔

تقریباً ہر جماعت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ابتداء میں تو اس نے انسانوں کو متاثر کرنے کا کام کیا۔ اور بہت سے اچھے اچھے ذہنوں کو کھینچنے میں کامیاب ہوئی۔ مگر کچھ ہی دن گزرنے کے بعد اس کا یہ کام رک گیا۔ جو لوگ شروع میں آ گئے تھے بس انھیں پر جماعت محدود ہو کر رہ گئی۔ کسی بھی تحریک کی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ بعد کے مرحلے میں اس کے اندر ذہنی اضافہ کا وہ کام جاری رہا جو ابتدائی مرحلہ میں انجام پایا تھا۔ اگرچہ تحریکیں دوسرے مرحلہ میں پہنچنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں اور ایک لحاظ سے ان میں اضافہ بھی نظر آتا ہے۔ مگر یہ اضافہ اس نوعیت کا نہیں ہوتا جس نوعیت کا پہلے دور میں ہوا تھا۔ بعد کے مرحلہ میں ہر تحریک اس طرح نظر آئے گی کہ اس کے افراد بے روح ہو چکے ہیں۔ کاروباری نوعیت کی چیزوں میں تو بہت اضافہ ہو رہا ہے مگر مقصدی نوعیت کی چیزوں میں کوئی اضافہ نہیں۔ دور سے موافقت یا ہمدردی ظاہر کرنے والے بڑھ رہے ہیں اور وہ بھی اس اعلیٰ مقصد کی خاطر نہیں جو شروع میں اختیار کیا گیا تھا بلکہ ان کمتر

وجہ کے نعروں کی بنیاد پر جن کو تحریک نے اپنے گرتے ہوئے ڈھانچہ کو سنبھالنے کے لیے بعد میں اختیار کیا تھا۔

ان مثالوں کے اندر تبلیغی تحریک کی یہ ایک منفرد خصوصیت ہے کہ آج بھی اس کے اندر انسانوں کے لیے اپیل ہے۔ بلکہ پہلے سے زیادہ ہے۔ یہ لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ نئے نئے افراد کثرت سے اس کی دعوت سے متاثر ہو رہے ہیں زندگیوں میں تغیر کا کام پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ نئے نئے طبقات میں دعوت پھیل رہی ہے اور یہ پھیلنا اس مفہوم میں نہیں ہے کہ کسی سستے اور جذباتی اشو (ISSUE) پر اتفاق کرنے والے بڑھ رہے ہیں۔ بلکہ عین اسی ٹھوس اور کھرے اسلامی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں اس کے داعیٔ اول نے اپنے دعوتی کام کا آغاز کیا تھا۔

اس کی وجہ جو میں سمجھ سکا ہوں وہ غالباً یہ ہے کہ عام طور پر جماعتیں یا پارٹیاں اپنے ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں کسی خاص حالات یا زمانے کے اندر وقت کے طبائع کے مطابق ایک تحریک اٹھتی ہے۔ اس طرح کی تحریکیں اگرچہ عام طور پر دائمی نوعیت کی اصطلاحیں استعمال کرتی ہیں اور اپنے فکر کا سرا ابدی حقائق سے ملاتی ہیں۔ مگر حقیقۃً یہ ایک زمانی چیز ہوتی ہے اور اگر اس کے اندر ابدی پیغام کی آمیزش ہو جب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ ابدی پیغام کا صرف وقتی اڈیشن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تبلیغ کا یہ کام فطرت کے دائمی تقاضوں کی تکمیل ہے۔ فطرت کے وہ تقاضے جو اس کے خالق نے اول روز سے اس کے اندر رکھ دیئے ہیں اور جو حالات اور زمانہ سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں۔ بس یہی تقاضے اس تحریکِ تبلیغ کا موضوع ہیں۔ دین کی ابدی صداقتوں کے سوا اس تحریک کو اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اگر اس تشریح کو صحیح مان لیا جائے تو اس میں ہمیں اس کا جواب مل جاتا ہے کہ تبلیغ اور دوسری جماعتوں میں یہ فرق کیوں پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری جماعتوں کی بنیاد وقتی حالات پر ہے اور تبلیغ کی بنیاد دائمی قدروں پر۔ دوسری تحریکوں میں جو چیز اپیل پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے، وہ زیادہ تر باہر کا ماحول ہے۔ اس کے برعکس "تبلیغ" میں جو چیز اپیل پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ خود انسان کی وہ فطرت ہے جو کبھی بدلتی نہیں، خارجی حالات تغیر پذیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ حالات رہتے ہیں اور انسانی ذہن ان کے مطابق سوچتا ہے، اس وقت تک ان کی بنیاد پر پیدا ہونے والی تحریکوں میں لوگوں کے لیے اپیل رہتی ہے اور وہ اس کی طرف کھنچتے ہیں مگر جب حالات بدل جاتے ہیں تو یہ اپیل

بھی ختم ہوجاتی ہے اور اس کے بعد اپنے وقت کے حالات کی طرح یہ تحریک بھی محض ایک تاریخی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس تبلیغ کا یہ کام چونکہ انسان کی دائمی فطرت کے اوپر قائم ہے اس لیے اس کی اپیل کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جب تک یہ کام اخلاص کے ساتھ جاری رہے گا اس کے اندر اپیل بھی باقی رہے گی خواہ زمانہ کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے۔

زمانی تحریکیں زمانہ ختم ہونے کے بعد لازماً معدوم نہیں ہوجاتیں، وہ اکثر اس کے بعد بھی باقی رہتی ہیں مگر بعد کے زمانے میں ان کی حیثیت تحریک سے زیادہ فرقہ کی ہوجاتی ہے۔ وہ ایک لگا بندھا گروہ ہوتا ہے جو محض گروہی تعصب کے سہارے اپنا وجود باقی رکھتا ہے جبکہ تحریک کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر شعور ہو اور اسی کے ساتھ وہ ارتقا پذیر بھی ہو۔ تحریک سے جب اس کا ابتدائی شعور رخصت ہوجائے اور جب نئے افراد کا اضافہ نہ ہورہا ہو تو اس کے لیے تحریک کے بجائے فرقہ کا نام زیادہ صحیح ہوگا۔ اس کے برعکس وہ تحریک جو دائمی قدروں کی بنیاد پر اٹھی ہو اس میں ہمیشہ شعور اور ارتقا کی صلاحیت باقی رہتی ہے زمانہ اس کو ختم نہیں کرتا، اور اگر کارکنوں کی غفلت سے کبھی وہ سست پڑجائے تو دوبارہ لے زندہ کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ نظام الدین میں ایک شخص نے لپک کر مجھے اس طرح سلام کیا جیسے وہ میرا پرانا شناسا ہو۔ میں نے دیکھا تو خوبصورت ڈاڑھی کے ساتھ ایک نوجوان چہرہ مسکرا رہا تھا۔ تعارف کے بعد میں نے پہچانا کہ یہ وہی شخص ہے جن سے تعلیم کے زمانے میں ان کے سرپرستوں کو شکایت تھی۔ ان کے بڑے بھائی نے دیکھا کہ علی گڑھ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد انھیں اگلی زندگی کے آغاز سے پہلے تبلیغی جماعت کے ساتھ ایک چلہ میں بھیج دیا۔ چالیس دن جماعتوں میں رہنے کے اس پروگرام میں اب صرف چند دن باقی تھے اور اس مدت میں وہ اچھے خاصے "مسلمان" بن چکے تھے۔

نظام الدین کے اس سفر سے واپسی کے فوراً بعد مجھے چند ہفتے علی گڑھ میں قیام کرنا پڑا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اسی طرح کے نوجوان سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور یہ صرف پچھلے چند سالوں کے اندر ہوا ہے۔ علی گڑھ کے ایک تبلیغی کارکن، جو ایک شعبہ میں لکچرر ہیں، انھوں نے مجھ سے بڑے جوش کے ساتھ کہا — "ہم تو جب کسی شخص کو نظام الدین لے جاتے ہیں تو اس اعتماد کے ساتھ لے جاتے ہیں کہ وہاں سے وہ خالی نہیں لوٹ سکتا۔" اور میں نے دیکھا کہ واقعات اس کے ان الفاظ کی تائید کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبا جو ہمیشہ سے اپنی "نیچریت" اور مغرب زدگی کے لیے مشہور تھے اور جن کی تعلیم بھی ایسی ہے جس کا

دین سے کوئی تعلق نہیں، وہ جب نظام الدین جاتے ہیں اور چلّوں میں نکلتے ہیں تو ایسا بدل جاتے ہیں کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں یا کسی عربی درس گاہ کے۔ بلکہ ان میں سے کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کا اخلاق، جن کی دینداری اور جن کی خدا ترسی اس درجہ کو پہونچ گئی ہے کہ عربی مدارس کے طلبا بھی ان پر رشک کریں۔ سیکڑوں طلبا ہیں جن کے اندر خدا ترسی، نماز باجماعت، نوافل، خدمتِ خلق، انفاق، دعا، ذمہ داری اور اسلامی وضع قطع کی صفات پیدا ہو گئی ہیں۔ حتیٰ کہ وہاں ایسے مناظر نظر آتے ہیں جو عربی مدارس میں بھی مشکل سے دکھائی دیں گے۔ مثلاً امتحان کے زمانہ میں اگر آپ ہاں .... ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ طلبہ جوق در جوق مسجد میں آتے ہیں۔ وضو کر کے دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھتے ہیں اور اس کے بعد دعا کر کے امتحان ہال میں پرچہ حل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔

علی گڑھ میں آج عام طور پر ایک دینی فضا معلوم ہوتی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ صرف چند سال پہلے کی بات ہے مولانا قاری محمد طیب صاحب وہاں تقریر کرنے کے لیے تشریف لائے۔ مگر اس وقت تک طلبا میں دین کے استخفاف کا ایسا ذہن تھا کہ فقرے بازی اور شور وغل کی وجہ سے مولانا اپنی تقریر مکمل نہ کر سکے اور قبل از وقت اٹھ کر چلے گئے۔ اب پچھلے سال وہ دوبارہ یونیورسٹی میں آئے اور ڈھائی تین ہزار کے مجمع میں ان کی تقریر ہوئی۔ مگر سارا مجمع آخر تک بالکل ساکت و صامت بنا رہا — یونیورسٹی کی فضا میں یہ تبدیلی خاص طور پر تبلیغی جماعتوں کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں دینیات کا مضمون تمام طلبا کے لیے لازمی ہے۔ ہر ہاسٹل میں باقاعدہ مسجد اور امام اور مؤذن کا انتظام ہے، دینی امور کی نگرانی کے لیے ایک مستقل ناظم کا عہدہ ہے اور اس کے علاوہ وہ سب کچھ جس کو یونیورسٹی کا "اسلامی کردار" کہا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی ساری تاریخ میں کبھی بھی دین کا وہ وقار و احترام پیدا نہیں ہوا جو آجکل وہاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہے اس تحریک کا نتیجہ جو محدود اور دقیانوسی تحریک سمجھی جاتی ہے اور اس مقام پر جو ہندستان میں مغربیت کا سب سے بڑا گڑھ ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ تو اس عظیم مسئلہ کا ایک نہایت آسان حل ہے جو ہماری ملت کو عرصہ سے درپیش ہے مگر ہمارے رہنما جس کا حل نکالنے میں ناکام رہے ہیں، یعنی جدید سیکولر تعلیم کے بعد نوجوانوں کو اس کے برے اثرات سے بچانا۔ موجودہ زمانے میں مغربی طرز کی سیکولر تعلیم زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی ہے۔ اس تعلیم کا تعلق نہ صرف معاش سے بہت گہرا ہو چکا ہے، بلکہ قرآن کے الفاظ میں وہ وقت

کی "قوت" ہے اور دنیا میں باوقار اور مستحکم قومی زندگی کی تعمیر کے لیے اس کا حصول ناگزیر ہے۔ مگر اس تعلیم کے ساتھ کچھ ایسی روایات شامل ہوگئی ہیں اور اس کا ایسا ماحول بن گیا ہے کہ اس تعلیم کے بعد دہریت ورنہ کم از کم بے عملی کا شکار ہو جانا عام ہو گیا ہے۔ پھر جب اس تعلیم کے لازمی نتیجہ کے طور پر خوش حالی اور مادی فراوانی حاصل ہوتی ہے، اور اس وقت تو یہ سیکولر تعلیم روایتی دیوار قہقہہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ جو اس پر چڑھتا ہے وہ دین سے بے تعلق ہو کر بے ساختہ دوسری طرف کود پڑتا ہے۔ مگر علی گڑھ اور نظام الدین میں کالجوں کے طلبہ کا جو منظر میں نے دیکھا وہ ہماری رہنمائی اس طرف کرتا ہے کہ ہم ایک اور دیوار قہقہہ تعمیر کر سکتے ہیں جبکہ ہمارے نوجوان سیکولر تعلیم کی دیوار پر چڑھیں اور اسلام کی سرزمین میں کود دیں۔

خدا کے فضل سے نظام الدین اور تبلیغی تحریک کی شکل میں یہ دوسری قسم کی دیوار قہقہہ تعمیر ہو چکی ہے۔ اب ہر شخص جو اپنے بچوں کو جدید تعلیم دلانا چاہتا ہے، اسی کے ساتھ اسے یہ بھی طے کر لینا چاہیے کہ وہ اپنے بچہ کو دوران تعلیم میں، چھٹیوں کے زمانے میں کبھی کبھی نظام الدین بھیجتا رہے گا، اور ختم تعلیم پر عملی زندگی شروع کرنے سے پہلے اس کو ایک چلہ ضرور کرائے گا۔

تعلیم کے ساتھ یہ اضافہ انشاء اللہ اس کی دینی زندگی کی ضمانت ہو گی۔ بغیر اس کے کہ اس کی تعلیم کو کسی قسم کا نقصان پہونچے۔ میں نے علی گڑھ میں دیکھا کہ تبلیغی نوجوان نہایت دل جمعی کے ساتھ اپنی تعلیمی زندگی میں مشغول رہتے ہیں۔ اور بہتر نمبروں سے پاس ہوتے ہیں۔ اصل میں دین کا جزو جب زندگی میں داخل ہو جاتا ہے تو آدمی کے اندر ایک طرح کی ذہنی تنظیم پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سنجیدہ اور باشعور ہو جاتا ہے۔ اس کے اوقات بہت سے فضول کاموں سے بچ جاتے ہیں۔ وہ ایک بامقصد نقطۂ نظر کا حامل ہو جاتا ہو۔ ان چیزوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ احساس ذمہ داری اور زیادہ باقاعدگی سے گزارنے لگتا ہے۔ اس اضافہ کے ساتھ کہ ہر معاملے میں اسے اللہ کی یاد بھی آتی رہتی ہے۔ اور وہ خدا کی اطاعت کا پابند ہو کر اپنے سارے کام انجام دیتا ہے۔ جو زندگی میں برکت کا نور پیدا کرتا ہے۔

تبلیغی کام کو اللہ تعالیٰ نے یہ برکت دی ہے کہ عرب ممالک سے لے کر یورپ اور امریکہ تک اس کا کام ہو رہا ہے۔ کثرت سے تبلیغی وفود باہر جاتے ہیں اور باہر سے ہندوستان آتے ہیں۔ اور یہاں جماعتوں میں رہ کر پھر واپس جاتے ہیں۔ اکثر بیرونی مقامات پر باقاعدہ تبلیغ کا مرکز ہے اور اس کا نظم قائم ہے۔ اور تبلیغ کے مستقل حلقے وجود میں آگئے ہیں۔ یہ صورت حال ہم کو ایک مزید موقع فراہم

کرتی ہے۔ وہ یہ کہ طلبہ کو باہر بھیجنا ہو تو ان کو کسی تبلیغی وفد کے ساتھ بھیجا جائے۔ اور اگر بہ وقت یہ ممکن نہ ہو تو یہ کوشش کی جائے کہ طالب علم جس ملک میں جائے وہاں حتی الامکان وہ وہاں کے تبلیغی حلقے سے قریب رہے۔ اس طرح کی سیکڑوں مثالیں وجود میں آ چکی ہیں اور اس طریقہ کو اختیار کرکے نوجوانوں کے بیرونی تعلیمی سفر کو بڑی حد تک خطرات سے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

آج مسلم قوم سیکولر تعلیم کے میدان میں پوری طرح کود پڑی ہے۔ ہمارے تمام بہترین نوجوان سیکولر اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ مندرجۂ بالا پروگرام کو بھی شامل کر لیا جائے تو تعلیم یا آئندہ معاشی تنقل میں کسی قسم کا نقصان کیے بغیر ایک عظیم فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ہمارے ذہنوں کا نہ صرف ضائع ہونے سے بچا لیکہ اپنی زندگی کی تعمیر کے ساتھ ملک کے اندر اور ملک کے باہر تبلیغ دین کا زبردست ذریعہ بن جانا۔ اگر اس پر عمل درآمد ہو تو انشاء اللہ وہی واقعہ دوبارہ ظہور میں آ سکتا ہے جو عرب کے مسلمان تاجروں کے دنیا بھر میں پھیلنے سے ہوا تھا۔

۷۔ تبلیغ کے اس کام میں زیادہ تر شخصی طور پر بات پہونچانے پر بھروسہ کیا جا رہا ہے۔ یعنی گفتگو، تقریر، ملاقاتوں اور سفروں کے ذریعہ براہ راست طور سے اپنے خیالات دوسروں کو منتقل کرنا۔ اس طریقہ میں پریس کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ فضائل اعمال اور واقعات صحابہ کی کچھ کتابیں لکھ کر چھپوائی گئی ہیں۔[1] جو تعلیم کے حلقوں میں پڑھ کر سنانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں اور جن سے کارکنوں کو اپنی تبلیغ کے لیے مواد ملتا ہے۔ جبکہ حقیقتہً پریس کے جدید تصور کے مطابق یہ نفی کے برابر ہے۔ تبلیغ کی طرف سے کبھی کوئی رپورٹ شائع نہیں کی جاتی، حالانکہ رپورٹ کے لیے ان کے یہاں اتنا زیادہ اور کبھی ختم نہ ہونے والا مواد ہے کہ شاید ہی کسی جماعت کے پاس اتنا مواد ہو۔ ریلیف ورک اور ملی خدمات کے سلسلے میں بھی ان کے یہاں کہنے کی باتوں کی کمی نہیں۔ مگر کبھی اس قسم کی کوئی چیز اخباروں میں دیکھی نہیں گئی۔ ہر سال اتنے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں کہ بلا مبالغہ ہندوستان یا پاکستان میں کسی بھی دینی جماعت کا اتنا بڑا اجتماع نہیں ہوتا، مگر ان کے لیے ایک بھی اشتہار یا ہینڈبل کبھی شائع نہیں کیا گیا اور نہ لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا گیا۔ مستقل طور پر ہزاروں انسان تبلیغ کے کام میں روز و شب متحرک رہتے ہیں، مگر ان لوگوں کو جمع کرنے، انھیں متحرک کرنے اور انھیں ہدایات دینے کے لیے کوئی رسالہ یا اخبار اس کی طرف سے جاری نہیں کیا گیا۔ اس بارے میں تبلیغ کے لوگ اس قدر شدید ہیں کہ بعض بزرگوں نے اپنے طور پر تبلیغ کے کارکنوں کو لٹریچر

[1] الفرقان۔ واضح رہے کہ ان کتابوں کے لکھوانے میں مرکز نظام الدین کا ضرور دخل ہے مگر کوئی کتاب اس مرکز کی

فراہم کرنے کے لیے کتابیں لکھیں مگر وہ تبلیغ کے حلقہ میں پھیل نہ سکیں، حتیٰ کہ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ایک اجتماع کے موقع پر ایک بار مقامی اخبار نے اپنے طور پر اجتماع کی خبر شائع کر دی تو اڈیٹر سے مل کر اس کی شکایت کی گئی۔

یہ شدت بہت سے لوگوں کو پسند نہیں آئے گی، مگر اس شدت نے تبلیغ کے اس کام میں ایک خاص قدر پیدا کر دی ہے جو اس وقت کسی بھی تحریک میں موجود نہیں۔ اور وہ ہے تاثیر کی قوت۔ یہ ایک واقعہ ہو کہ آدمی جب بذاتِ خود اپنے عقیدہ کی تبلیغ کر رہا ہو تو اس کی شخصیت کا پورا نفوذ اس کی تبلیغ کے اندر آجاتا ہے، اس کے الفاظ میں اس کے کردار کی شیرینی، اس کے لہجہ میں اس کے قلب کا سوز و گداز، اس کے انداز میں اس کے یقین کی جھلک اور اس کے خیالات میں ایک جیتی جاگتی زندگی کا مجسم وزن شامل ہو جاتا ہے نیز اگر یہ گفتگو ماحول کے اندر ہو رہی ہے تو ماحول اس وزن کے اضافہ میں مزید شریک ہو جاتا ہے، ریڈیو سے کمنٹری سننے اور کرکٹ میچ کے سامنے موجود ہونے میں جو فرق ہے، وہی فرق مزید شدت کے ساتھ زبانی تبلیغ اور کتابی تبلیغ میں پایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ زبانی تبلیغ میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ مثلاً اگر دورانِ تبلیغ میں ضرورت محسوس ہو تو طریقِ تبلیغ میں بروقت تبدیلی کی جا سکتی ہے جبکہ کتاب یا رسالہ یہ کام نہیں انجام دے سکتا۔ نظام الدین کی ایک تقریر میں یہ واقعہ بتایا گیا ہے کہ ایک جگہ مداری بندر نچا رہا تھا، تبلیغ کے لوگوں کو خیال ہوا کہ اس کو نماز پڑھانی چاہئے، مدرسہ کے کچھ معلمین اس پر تبلیغ کے لیے بھیجے گئے مگر وہ ناکام واپس آئے اور انھوں نے کہا کہ ہم نے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانتا تو ہم کیا کریں ما علینا الا البلاغ۔ اس کے بعد تین ایسے آدمی اس کے پاس بھیجے گئے جو ذہنی اور معاشرتی اعتبار سے مداری ہی کی سطح کے تھے۔ انھوں کہا: "میاں بندر نچا نچا کر زندگی خراب کر رہے ہو، آخرت میں تم کو خدا کے فرشتے اسی طرح نچائیں گے"۔ یہ جملہ مداری کو لگ گیا، تھوڑی سی گفتگو کے بعد وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو لیا اور مسجد میں پہونچ کر بندر بندیا کو باہر باندھا اور خود اندر جا کر نماز پڑھی۔

اسی طرح زبانی مبلغ کو یہ موقع حاصل رہتا ہے کہ اگر مخاطب بات نہ سمجھ رہا ہو تو بروقت اس کی ایسی عملی وضاحت کر دے کہ اس کے لیے سمجھنا آسان ہو جائے۔ ایک صاحب جو تبلیغ کے سلسلے میں عرب گئے تھے انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ عرب علماء کو جب انھوں نے تبلیغی کام میں شرکت کی دعوت دی تو انھوں نے

کہا کہ یہ قرآن اترنے کی زمین اور رسول کی بعثت کی جگہ ہے۔ یہاں تو سارے لوگ دین سے واقف ہیں۔ یہاں تبلیغ کی کیا ضرورت۔ اس کے بعد ان سے کہا گیا اچھا ہمارے ساتھ چلئے اور چل کر دیکھئے کہ آپ کے عوام کی کیا حالت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہیں کے ایک شخص کو ہم نے پکڑا اور اس سے کہا کہ قل اعوذ برب الفلق پڑھ کر سناؤ، تو عرب کے اس مسلمان شہری نے کہا "اعوذ برب الفلق" (قل کے بغیر) یہ کہتے تھے: قل اعوذ برب الفلق تو اس کو سن کر عربی کہتا تھا اعوذ برب الفلق اصل میں وہ نہ تو یہ جانتا تھا کہ یہ قرآن کی کوئی سورۃ ہے اور نہ اُسے سورہ یاد ہی تھی۔ اس لیے "قل" کو "پڑھ" کے معنی میں لے کر اس کے آگے کے الفاظ "اعوذ برب الفلق" اپنی زبان سے ادا کر دیتا تھا۔ اسی طرح کئی بار ہوا یہاں تک کہ تبلیغی کارکن نے کہا "قل قل اعوذ برب الفلق" تب جا کر اس نے سورۂ فلق کو اپنی زبان سے دُہرایا۔ اسی طرح طائف کے کچھ لوگوں سے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے لیے کہا گیا تو صرف سورۂ فاتحہ میں ایک درجن غلطیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر عرب کے علمار رو پڑے اور انھوں نے کہا "ہم نہیں جانتے تھے کہ ہمارے عوام علم دین سے اتنے کورے ہیں"

پھر زبانی طور پر اور گھوم پھر کر بات پہونچانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مخاطب سے ارتباط اور اختلاط داعی کے ذہن میں نئے نئے مضامین لانے کا سبب بنتا ہے۔ بات کو مؤثر بنانے کے لیے نئی نئی مثالیں ملتی ہیں اور گفتگو زیادہ سے زیادہ سادہ اور حقیقی ہو کر مخاطب کے ذہن سے قریب ہوتی چلی جاتی ہے جبکہ تصنیف میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح کے اور بہت سے فائدے ہیں جو اس طریق تبلیغ سے حاصل ہوتے ہیں۔

۷۔ امیر تبلیغ نے دُعا کی تو ان کی دُعا میں یہ فقرہ بھی تھا — "خدایا اس نقل و حرکت کو دین کے تمام شعبوں کو زندہ کرنے کا ذریعہ بنا" یہ فقرہ اس واقعہ کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کام محض کلمہ و نماز کی تبلیغ کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ ان کی نگاہ پورے دین پر ہے اور وہ پورے دین کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس معاملے میں تبلیغ اور دوسرے لوگوں میں جو فرق ہے وہ اصلاً طریق کار کا فرق ہے نہ کہ اس بات کا فرق کہ دوسرے لوگ کسی چیز کو دین کا جزو سمجھتے ہیں اور یہ حضرات اس کو دین کا جزو نہیں سمجھتے یا اس کے احیار کو اپنی فہرست سے خارج قرار دیئے ہوئے ہیں۔ تبلیغ کو لوگ کلمہ و نماز کی تحریک سمجھتے ہیں۔ زیادہ صحیح لفظوں میں وہ یقین پیدا کرنے کی تحریک ہے وہ یقین جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ غیبی

حقائق پر ایمان، خدا پر ایمان، چنانچہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ تبلیغ کو "تحریک الایمان" کہا کرتے تھے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ دنیا میں جن طریقوں کا چلن ہے اور جن سے بظاہر کام ہوتا ہوا نظر آتا ہے وہ نتیجہ پیدا کرنے کے لیے بذاتِ خود موثر نہیں ہیں، بلکہ موثر وہ ذات ہے جو ان شکلوں کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ مگر عام طور سے لوگ شکلوں ہی کو اصل سمجھ لیتے ہیں۔ ایک مقرر کے الفاظ میں "کائنات کی شکلوں کو تو نہیں چھوڑنا ہے البتہ کائنات کی شکلوں پر یقین کو چھوڑنا ہے، وہ اسباب و وسائل کے اشتغال کی نفی نہیں کرتے۔ مگر اسباب و وسائل پر "اتکال" کی نفی کرتے ہیں۔

ان کی دعوت یہ ہو کہ "خدا سب کچھ کے بغیر سب کچھ کر سکتے ہیں، سب کچھ خدا کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ کائنات کی ساری شکلوں کے یقین کو دل سے نکالو، اس کے بعد ہی عمل میں طاقت آئے گی"۔ گویا تبلیغی جماعت اور دوسری جماعتوں میں جو فرق ہو وہ دین کے محدود تصور یا دین کے وسیع تصور کا فرق نہیں ہے بلکہ اس بات کا فرق ہے کہ وہ کون سا میدان ہے جہاں دین کے احیا و اقامت کے لئے محنت کی جائے۔ بہت سے لوگ پارلیمنٹ ہاؤس یا پریڈ گراؤنڈ یا الکشن کے موسم اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو محنت کا میدان سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس تبلیغ والوں کے نزدیک خدا کی کار فرمائیوں پر یقین پیدا کرنا اور اس سے نصرت کا طالب ہونا مومن کی محنت کا میدان ہو۔ خدا پر محنت کر کے آدمی سب کچھ پا لیتا ہے کیونکہ ساری چیزوں کا سرا خدا کے ہاتھ میں ہو اور وہی جس کے لئے چاہتا ہو کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے۔ "تکوینیات تابع ہیں تشریعیات کے۔ اگر ہم تشریعی قوانین کے پابند ہوں گے تو تکوینی نظام ہمارے ساتھ معاون ہوگا"۔ قوم سبا نے زراعت پر، قوم شعیب نے صنعت و تجارت پر، فرعون نے ملک پر، قارون نے مال پر محنت کی مگر سب ناکام ہوئے۔ صحابہ نے ایمان اور نماز پر محنت کی، ہر چیز کے مالک ہو گئے۔ کامیابی و ناکامی کی بنیاد انسان کے اندر قائم ہوتی ہے، باہر کی شکلوں میں قائم نہیں ہوتی۔ سعد بن ابی وقاص نے خواب دیکھا کہ پانی کے اوپر چل رہا ہوں اس کے بعد گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ ابوموسیٰ اشعری اور بارہ ہزار لشکر دریا کے پار اتر گئے۔ یہ غیبی نظام پر یقین کا نتیجہ تھا۔ ہم مشاہدہ والے نظام پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ یقین جب مومن کے دل میں پیدا ہو جائے تو نہ صرف بازار اور کارخانے اور حکومت اس کے لئے مسخر کر دی جاتی ہو بلکہ ہوا پر اس کا حکم چلتا ہو، جیسے حضرت عمر کی آواز مدینہ سے جا کر ایران میں نہاوند کی پہاڑیوں میں

سنائی دی، جانور اور صحرا و بیاباں اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ (جیسا کہ صحابہ نے ایک بار جنگل کے جانوروں کو پکار کر کہا اور وہ جنگل سے نکل گئے) سمندروں اور دریاؤں کو اس کے لئے مسخر کر دیا جاتا ہو (جیسا کہ صحابہ کی فوج نے گھوڑے اور گدھوں، اور اونٹوں کے ساتھ دریا کو پار کیا تھا)۔

تبلیغی جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ خدا مسبب الاسباب ہے۔ وہی تقدیر بناتا ہے، وہی رزق دیتا ہے، حکومت کا دینا اور نزع (عطا کرنا اور چھین لینا) اسی کے اختیار میں ہو۔ غرض ہر واقعہ جو دنیا میں ہوتا ہے اس کے پیچھے خدا ہی کی ہستی کارفرما ہوتی ہے۔ پھر کسی مقصد کے حصول کے لئے خدا کے سوا اور کہیں محنت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کمرہ روشن کرنے کے لئے سوئچ بورڈ پر ہاتھ پہنچانے کے بجائے بلب کو پکڑ کر اسی سے منت سماجت کی جائے۔ اب چونکہ پورے دین کا بروئے کار آنا اور اہل ایمان کا غلبہ و سربلندی جن اسباب سے بندھی ہوئی ہو اس کا سرا بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہو، اسلئے اس مقصد کے حصول کا بھی یہی طریقہ ہے کہ خدا کو راضی کرکے اس معاملے میں اس کی نصرت کا استحقاق پیدا کیا جائے "حالاتِ عالم اس وقت بدلیں گے جب لوگوں میں دین آئے گا۔ اس کے بغیر حالات عالم بدل نہیں سکتے۔"

۸۔ تبلیغ کے اس کام کو ایک اور موقع (A D V A N T A G E) یہ حاصل ہے کہ اس کی تبلیغ کا تمام تر انحصار وجدانیات پر ہے نہ کہ عقلیات پر۔ دعوت کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک ہے ذہن کی راہ سے مخاطب کے اندر گھسنا، دوسرے وجدان واحساس کی راہ سے گھسنا۔ پہلی صورت میں عقلی اور منطقی طور پر بات کو ثابت کرکے اس کو مخاطب کے لئے قابل قبول بنایا جاتا ہو دوسری صورت میں جذبات کو ابھار کر مخاطب کو اس طرف لے جانے کی کوشش کی جاتی ہو۔

جو لوگ فلسفیانہ افکار سے آشنا ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ پہلا راستہ کس قدر نازک اور مشکل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ خالص عقلی اور منطقی طور پر کسی نقطۂ نظر کو ثابت کرنا بے حد مشکل بلکہ بہت سے لوگوں کے نزدیک کم از کم اب تک کے علمی ارتقاء کے مطابق ناممکن ہے، حتیٰ کہ موجودہ عقلی زمانے میں بھی اگر اس نوعیت کی کسی تحریک کو کامیابی ہوئی ہے تو وہ اس کے علمی استدلال کی بنا پر نہیں بلکہ زیادہ تر اس بنا پر کہ اس کے ساتھ اتفاق سے جذباتی پہلو بھی شامل تھا۔ یہاں اشتراکیت، جمہوریت اور ارتقا کے نظریات کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اشتراکیت ابھی تک

خالص علمی اعتبار سے ثابت شدہ نہیں، جمہوریت پر علمی اعتبار سے ایسے کثیر اعتراضات کئے گئے ہیں کہ اس کے حامی ابھی تک اس کا کوئی جواب فراہم نہیں کرسکے۔ حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ علمی اعتبار سے اپنے اندر اس قدر خلا رکھتا ہے کہ اس کو نظریہ کے بجائے اعتقاد کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ ان نظریات کی کامیابی کا راز ان کی عقلی و منطقی بنیادوں میں نہیں بلکہ اس جذباتی فضا میں ہے جو اس طرح کے کسی تصور کو قبول کرنے کے لئے پہلے سے آمادہ تھی۔

یہی صورت مذہب کے معاملہ میں بھی ہے۔ امام رازی سے لے کر ڈاکٹر اقبال تک اور اگر تاریخ کو اور قریب تک لانا چاہیں تو بہت سی زندہ شخصیتوں کے نام بھی اس فہرست میں شامل کرسکتے ہیں، بہرحال جن نے بھی خالص عقل اور منطق کی سطح پر مذہبی حقائق کا اثبات کرنے کی کوشش کی ہے اس کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی ہے، اگر کسی شخص کو اس طرح کی کوشش میں کامیابی کے عناصر نظر آتے ہیں تو وہ محض اس کے تصور علم کی بنا پر ہوگا نہ کہ اس بنا پر کہ فی الواقع کوئی اس میدان میں کامیاب ہوا ہے۔

جو لوگ فلسفیانہ ڈھنگ پر سوچنے کے عادی نہیں ہیں، ان کو میری یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی۔ کیونکہ صورت واقعہ یہ ہے کہ ہر شخص خواہ وہ جذباتی مبلغ ہو یا عقلی مصنف، اپنی بات کو مدلل شکل ہی میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ استدلال (R E A S O N I N G) کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ مخاطب کے ذوق، اس کے وجدان اور اس کے لاشعور کے مطابق بات کو قابل فہم اور موثر بنایا جائے اور دوسرے یہ کہ خالص علمی اور منطقی اعتبار سے نہ کہ کسی خاص مخاطب کے پیش نظر، بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے پہلی صورت جذباتی ہے اور دوسری عقلی۔

مثال کے طور پر ایک شخص صحبت کا فلسفہ ثابت کرنے کے لئے کہتا ہو کہ "چراغ سے چراغ جلتا ہے، اسی طرح شخصیتوں سے شخصیتیں روشن ہوتی ہیں"۔ اس کے جواب میں دوسرا شخص نہایت آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک مثال ہے نہ کہ دلیل، اور محض مثال سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر ایک شخص اس نظریہ پر یوں استدلال کرے کہ "انڈا مرغی کے پروں کی صحبت بزرگ کی صحبت سے کیا کچھ [illegible]

نتیجہ نہ نکلے گا" تو اس کے جواب میں بھی کوئی سرپھرا نہایت آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ انڈے سے بچہ نکلنے کا تعلق حرارت سے ہے نہ کہ صحبت سے اور حرارت بھی صرف اس انڈے سے بچہ نکال سکتی ہے جس کے اندر پہلے سے بچہ کا جرثومہ موجود ہو۔ غیر زرخیز انڈا (Infertile eggs) جن سے کسی بھی طرح بچہ برآمد نہیں کیا جا سکتا۔

جذباتی تبلیغ کرنے والوں کے تمام دلائل اسی قسم کے ہیں،

اس اضافہ سے میرا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ تبلیغ والوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ عملی طور پر ان لوگوں سے زیادہ مفید اور موثر ہے جو عقل و منطق کی راہ سے دین کا اثبات کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ خالص عقل کی راہ سے ثابت کرنے کی کوشش دراصل ایک ایسے عنقا کو پکڑنے کی کوشش کی ہے جو ابھی تک دریافت نہیں ہوئی۔ مگر دوسری ایک چیز اور ہے جو آج بھی موجود ہے۔ اور وہ ہے فطرت اور روایت۔ اور میں مبالغہ نہیں کروں گا اگر میں کہوں کہ آج بھی ۹۹ فیصدی لوگوں کی شخصیت حقیقتاً فطرت اور روایت ہی کے تحت بنی ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دین فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اور یہ فطرت لازمی طور پر ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ مگر جو لوگ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں ان کے ساتھ فطرت کے علاوہ ایک اور موافق عنصر بھی شامل ہے، اور وہ ہے روایت، تاریخی اور نسلی اثرات، خاندان اور ماحول کی تربیت اور بہت سے لوگوں کے لئے ان کی تعلیم، کم از کم ابتدائی تعلیم، آج بھی لاشعور کی سطح پر انھیں مسلمان بنائے ہوئے ہے، وہ بظاہر خواہ بے دین نظر آتے ہیں، مگر فطرت اور روایت نے مل کر ان کا جو اندرونی سانچہ بنایا ہے وہ تقریباً ہر ایک کا اسلامی ہے یہی وجہ ہے کہ تبلیغ کے لوگ جب جذباتی باتیں کرتے ہیں تو سننے والوں کا ذہن جاگ اٹھتا ہے جب وہ جنت اور جہنم کی تفصیلات بتاتے ہیں تو ان کے دل دہلنے لگتے ہیں، جب وہ دعاؤں کے ذریعہ اندرونی احساسات کو چھیڑتے ہیں تو بڑے بڑے "بے دینوں" کی آنکھ سے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ یہ باتیں خواہ عقلی و منطقی اعتبار سے بے بنیاد (INVALID) سہی مگر وہ کم از کم اب تک کے انسانوں کے اندر ایک وجدانی اپیل رکھتی ہیں اور اس طرح کی آوازوں کے سایہ میں جب کچھ دن زندگی گزرتا ہے تو اس کا شعور زندہ ہو کر اس کی شخصیت پر چھا جاتا ہے اور اس

کو دوبارہ "مسلمان" بنا دیتا ہے ـــــ تبلیغ والوں کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے انھوں نے عقلی عنقا کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ موجودہ جذباتی بنیاد، اگرچہ غیر منطقی بنیاد کو استعمال کیا۔ اور تجربہ بتاتا ہے کہ اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے۔

۹۔ اب گفتگو ایک ایسے مقام پر پہونچ گئی ہے جہاں ہم اپنی آخری بات کہہ سکتے ہیں۔ "جماعت تبلیغ جو کچھ کر رہی ہے کیا یہی دین کا صحیح اور مکمل کام ہے" یہ سوال ہم میں سے اکثر لوگوں کو پریشان کرتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک ایسا جواب پا سکتے ہیں جس میں تبلیغ کی بھی پوری اہمیت تسلیم کی گئی ہو اور اسی کے ساتھ ان لوگوں کی ذہنی تسکین بھی اس کے اندر موجود ہو جو تبلیغ کے باہر بھی کچھ کرنے کا کام سمجھتے ہیں۔ مگر ان کو فکری طور پر اس طرح مربوط نہیں کر پاتے کہ دونوں کو ان کی واقعی جگہ دیتے ہوئے دونوں کے تقاضے پورے ہو سکتے ہوں۔

قرآن و سنت کے مطالعہ سے دین کا جو مطلب میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ دین کے تقاضے دو قسم سے متعلق رکھتے ہیں۔ اگر ہم دونوں کو الگ الگ رکھیں تو کوئی پیچیدگی نہیں پیدا ہوتی، لیکن اگر دونوں کو ملا دیا جائے تو دین کا سارا نظام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ ایک تقاضا تو وہ ہے جو دین کا اصل اور اس کی روح ہے ـــــ یہ ہے اللہ کی معرفت، اس سے خشیت و محبت کا تعلق، اس کے اوپر اعتماد، اور پھر اس طرح مومن و قانت بن کر خدا کی عبادت اور معاملات زندگی میں اس کی تابعداری۔ دوسرا تقاضا وہ ہے جو مادی دنیا اور دین کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ دین کو فکری اور عملی طور پر غالب و سربلند رکھنے کے لئے مختلف صورتیں پیش آتی ہیں اور موقع کے اعتبار سے ہر جگہ مومن کو نمٹنا ہوتا ہے ـــــ کہیں رکانہ سے کشتی لڑنی ہوتی ہے کہیں حسان بن ثابت کو حکم دیا جاتا ہے کہ نظم سنائیں، کہیں وقت کے عقلا کو مطمئن کرنے کے لئے حجت اللہ البالغہ ظہور میں آتی ہے، کہیں بدر و حنین کے معرکے پیش آتے ہیں۔ کہیں غیر مسلموں سے معاہدہ کیا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک پہلے تقاضے کا تعلق ہے۔ وہ دین کی اصل ہے اور دائمی طور پر دین کے مطلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر دوسری چیز کی یہ حیثیت نہیں وہ دین کا اضافی جزء ہے نہ کہ حقیقی۔ حالات جس وقت اس طرح کے کسی تقاضے کو بروئے کار لا چکے ہوں، اس وقت تو اضافی جزء بھی

عملی طور پر حقیقی جزو کی طرح مطلوب ہو جاتا ہے۔ مگر جب حالات نے اس کی ضرورت نہ پیدا کی ہو، اس وقت مومن کے اوپر اس سلسلے میں کوئی ذمے داری نہیں ہوتی۔

اگر اس تشریح کو مان لیا جائے تو میرا خیال ہو کہ ہمارے دینی و ملی کاموں میں وہ ربط اور وہ منصوبہ بندی وجود میں آ سکتی ہو جس کے ہم سب لوگ دل سے متمنی ہیں مگر اس کے باوجود وہ ہمارے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ جہاں تک تبلیغ کے کام کا تعلق ہے اس کے کارکنوں کو بھی اور دوسرے لوگوں کو بھی اسے یہ حیثیت دینی چاہیئے کہ وہ حقیقت دین کو زندہ کرنے کی کوشش ہے۔ زیر بحث بات میں تبلیغ کی اصل دعوت کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں نہ کہ اس کے مخصوص طریق کار کے اعتبار سے۔ کیونکہ طریق کار خواہ وہ کسی بھی جماعت یا تحریک کا ہو ہمیشہ اضافی ہوتا ہے۔ تبلیغی کارکن اپنے کام کو صرف اسی ایک کام تک محدود رکھیں، اور دوسری طرف پوری امت حقیقتِ دین پیدا کرنے کے لئے اس کے اوپر اعتماد کرے۔

مگر جیسا کہ میں نے کہا تبلیغ کی ساری اہمیت تسلیم کرنے کے بعد بھی دین کے لئے کچھ اور کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے، اس دوسرے میدان میں امت کے دوسرے موزوں افراد کو جدوجہد کرنی چاہیئے اور خود تبلیغ والوں کو اخلاص کی شرط کے ساتھ ان کی کوششوں کو تسلیم کرنا چاہیئے اور انفرادی طور پر اس میں وہ حصہ بھی بٹانا چاہیئے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہم اس نوعیت کے جن مسائل سے دوچار ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: مغربی افکار کے حملہ کے مقابلے میں علمی طور پر دین کی مدافعت، جدید دنیا میں مسلمانوں کو عزت و سربلندی کا مقام دلانے کی تدبیریں، جدید ضرورتوں کے مطابق اسلامی قانون کی تدوین، موجودہ حالات کے لحاظ سے مسلمانوں کا ایک نیا نظامِ تعلیم، جمہوریت اور سیکولرزم سے وقتی طور پر پیدا شدہ مسائل کا حل، جدید ذہن کے لحاظ سے اسلام پر دعوتی لٹریچر کی تیاری وغیرہ وغیرہ۔

یہ دونوں کام کوئی ایک شخص یا گروہ انجام نہیں دے سکتا جو کچھ ممکن ہو وہ صرف یہ کہ دونوں ایک دوسرے کو تسلیم کریں، دونوں ایک دوسرے کے مشورے سے اپنے امور انجام دیں اور دونوں کم از کم انفرادی سطح پر ایک دوسرے سے تعاون کو گوارہ کرتے ہوں۔ بجلی پاور ہاؤس میں پیدا کی جاتی ہو اور مشینیں لوہے کے کارخانوں میں، مگر دونوں اس بنیاد پر کام کرتے ہیں کہ دونوں کو ایک جگہ ملنا ہو، اسی ملنے میں ساری برکت ہو اور اسی سے دونوں کی معنویت پوری طرح نمایاں ہو۔ اس قسم کا ذہنی اتحاد اگر امت کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے عظیم نتائج برآمد ہوں گے۔ حتیٰ کہ ہم دیکھیں گے کہ احیائے اسلام کا وہ خواب مہینوں اور سالوں میں واقعہ بن رہا ہو جس کا ہم صدیوں

امام اعظم ابو حنیفہؒ اور علم حدیث

—(۲)—

از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری (استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

امام ابو حنیفہ کا علم حدیث میں مرتبہ

مشہور ہو کہ فن حدیث میں امام صاحب کی کوئی تصنیف نہیں ہو، اور صحاح ستہ میں بجز ایک دو جگہ کے ان کا نام تک نہیں پایا جاتا، سب سے زیادہ یہ کہ ان کی شہرت اہل الرائے کے لقب سے ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ حدیث سے ان کو کم تعلق تھا، مگر واقعہ یہ ہو کہ کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ یہ ایسی غلط فہمی ہے جس کا پردہ چاک کرنے کی ضرورت ہو، تاکہ حقیقت اپنی اصل صورت میں سامنے آجائے، حضرت شاہ ولی اللہ اور دیگر محققین نے مجتہد کی یہ تعریف کی ہو کہ مجتہد وہی شخص ہو سکتا ہے جو قرآن، حدیث، آثار، تاریخ، لغت و قیاس ان پانچ چیزوں پر کافی عبور رکھتا ہو[1]

امام صاحب کے مجتہد مطلق ہونے پر اجماع ہے، اس کے بعد ان پر قلتِ حدیث کے طعن کو نادانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، اس لئے ہم ائمہ حدیث کے چند اقوال نقل کرتے ہیں تاکہ حقیقت آشکارا ہو جائے، حافظ ذہبی نے مسعر بن کدام کا (جو عہد طالب علمی میں امام صاحب کے رفیق رہ چکے ہیں) بیان نقل کیا ہے، طلبت مع ابی حنیفۃ الحدیث فغلبنا واخذنا فی الزھد فبرع علینا وطلبنا معہ الفقہ فجاء منہ ما ترون[2] (میں نے اور ابو حنیفہ نے ساتھ ساتھ علم حدیث حاصل کیا تو وہ ہم پر غالب رہے، اور زہد میں بھی وہ ہم پر فائق رہے اور فقہ ان کے ساتھ شروع کی تو تم دیکھتے ہو کہ کیسا کمال ان سے ظاہر ہوا) یحییٰ بن سعید قطان جو جرح و تعدیل کے امام ہیں وہ فرماتے

---

[1] عقد الجید فی مباحث الاجتہاد والتقلید [2] مناقب ابی حنیفہ از ذہبی ص ۲۷

ہیں" انه واللہ لاعلم ھذہ الامة بما جاء عن اللہ ورسولہ (واللہ ابو حنیفہ اس امت میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ وارد ہوا ہے اس کے سب سے بڑے عالم ہیں) مکی بن ابراہیم نے امام صاحب کو اعلم اہل زمانہ فرمایا ہے۔[۱]

ابو المحاسن شافعی نے اپنی کتاب عقود الجمان میں مستقل ایک باب قائم کیا ہے، جس میں امام صاحب کی روایات حدیث کی کثرت اور ان کا اعیان حفاظ حدیث میں ہونا بیان کیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ باین وسعت نظر ہمیشہ اس کے لئے کوشاں رہے کہ کوفہ میں جب بھی کوئی محدث آتا تو اس سے استفادہ فرماتے، امام صاحب کے ایک مشہور شاگرد محدث عبدالعزیز بن ابی رزمہ کے بیان کو علامہ موفق نے بسند نقل کیا ہے " ذکر علم ابی حنیفة بالحدیث فقال قدم الکوفة محدث فقال ابوحنیفة لاصحابہ انظروا ھل عندہ شیئ من الحدیث لیس عندنا قال وقدم علینا محدث آخر فقال لاصحابہ مثل ذالک"[۲] (عبدالعزیز بن رزمہ نے امام ابو حنیفہ کے علم حدیث کا تذکرہ کیا اور اسی سلسلے میں یہ بتایا کہ ایک بار کوفہ میں ایک محدث آئے تو امام ابو حنیفہ اپنے اصحاب سے فرمانے لگے، دیکھو تو ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے پاس نہ ہو، عبدالعزیز کا بیان ہے کہ دوبارہ ایک اور محدث ہمارے پاس آئے جب بھی آپ نے اپنے اصحاب سے یہی فرمایا) امام حسن بن زیاد کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ چار ہزار حدیثیں روایت کیا کرتے تھے جن میں دو ہزار حماد کی حدیثیں تھیں اور دو ہزار بقیہ دیگر شائخ کی[۳] صاحب عقود الجمان لکھتے ہیں کہ امام صاحب سے روایات کی قلت کی وجہ حفظ حدیث کی وسعت کے باوجود استنباط مسائل سے اشتغال ہے اور اسی طرح مالکؒ و شافعیؒ سے ان کی مسموعات کی نسبت کم روایات منقول ہیں جیسے صحابہؓ میں حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ سے ان کی معلومات کی کثرت کے باوجود دیگر صحابہؓ کے مقابل میں کم روایات پائی جاتی ہیں۔[۴]

روایت حدیث میں احتیاط امام صاحب روایت حدیث میں بہت محتاط واقع ہوئے تھے، جس کا اعتراف بڑے بڑے محدثین تک کو ہے، یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ کان ابوحنیفة ثقة لایحدث الا ما یحفظ ولا یحدث بما لا یحفظ"[۵] امام صاحب ثقہ ہیں جو حدیث ان کو حفظ ہوتی

---

[۱] ما تمس الیہ الحاجہ محمد مقدمہ اوجز ص[۲] ۶۰ [۲] مناقب للامام الاعظم از صدر الائمہ مکی ص[۳] ۲۰ [۳] مناقب للامام الاعظم از موفق بن احمد مکی ص ۹۶ [۴] عقود الجمان [۵] تاریخ بغداد ص ۴۱۹ ج ۱۳

ہے وہی بیان کرتے ہیں اور جو یاد نہیں ہوتی اسے بیان نہیں کرتے امام صاحب کی اس احتیاط کا اندازہ امام وکیع کی اس شہادت سے ہوتا ہے جو انھوں نے دی ہے فرماتے ہیں "جیسی احتیاط امام صاحب سے حدیث میں پائی گئی کسی دوسرے سے نہیں پائی گئی۔ (مناقب الامام از موفق ج ۲ ص ۱۹۷)

امام صاحب کے شرائط | امام صاحب کو ایک دوسری حیثیت سے بھی اپنے معاصرین اور بعد کے ائمہ پر خصوصیت حاصل ہے، وہ یہ کہ احادیث کی تنقید اور بہ لحاظ ثبوت احکام ان کے مراتب کی تفریق، امام صاحب کے زمانے تک بہت سے احادیث کے دفتر تیار ہو چکے تھے، لیکن ضرورت تھی کہ احادیث کے قبول و رد کے قاعدے مرتب کئے جائیں چنانچہ امام صاحب نے اس کی بنیاد ڈالی اور ان کے اصول تنقید بہت سخت تھے، اسی لئے متشدد فی الروایۃ کا لقب دیا گیا امام صاحب کے قلیل الروایۃ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں، والامام ابوحنیفۃ انما قلت روایتہ لما شدد فی شرط الروایۃ والتحمل یعنی امام ابوحنیفہ سے روایت کم ہے، اس لئے کہ انھوں نے روایت اور تحمل کی شرط میں سختی کی ہے، وہ شرائط کیا ہیں؟ امام طحاوی نقل کرتے ہیں "حدثنا سلیمان بن شعیب حدثنا ابی قال املی علینا ابو یوسف قال قال ابوحنیفۃ لا ینبغی الرجل ان یحدث من الحدیث الا ما حفظہ من یوم سمع الی یوم یحدث[۱] یعنی امام صاحب فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو اس وقت تک حدیث نہیں بیان کرنا چاہیئے جب تک کہ سننے کے دن سے بیان کرنے کے دن تک یاد نہ ہو، امام صاحب کا عمل اسی اصول پر تھا، چنانچہ عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں "وقد کان الامام ابوحنیفۃ یشترط فی الحدیث المنقول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل العمل بہ ان یرویہ عن ذالک الصحابی جمع اتقیاء عن مثلھم وھکذا[۲] جو حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کے متعلق امام صاحب عمل سے پہلے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت اس صحابی سے نقل کرتی چلی آتی ہو، عمل بالحدیث کی جس شرط کا علامہ شعرانی نے تذکرہ فرمایا ہے اس کو علامہ ذہبی نے عموماً امام صاحب سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں "اخذ بکتاب اللہ فما لم اجد فبسنۃ رسول اللہ والآثار الصحاح عنہ التی فشت فی ایدی الثقات عن الثقات فان لم اجد فبقول

---

[۱] اصول سرخسی ج ۱ ص ۳۲۲ [۲] الجواہر المضیۃ ترجمہ امام ابوحنیفہ [۳] المیزان الکبریٰ ج ۱ ص ۶۲

اصحابہ آخذ بقول من شئت و اما اذا انتہی العصر الی ابراھیم والشعبی و الحسن والعطاء فاجتہد کما اجتہدوا[۱] ۔۔۔ میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں، اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اور آپ کے ان صحیح آثار کو جو ثقات کے ہاتھوں میں خود ثقات ہی سے مشہور ہوئی ہیں، پس اگر یہاں نہ مل سکا تو پھر آپ کے اصحابؓ میں کسی کے قول کو اختیار کرتا ہوں، لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعی وشعبی وحسن وعطار تک پہونچ آتا ہو تو پھر اجتہاد سے کام لیتا ہوں جیسا کہ ان حضرات نے اجتہاد سے کام لیا،

امام صاحب کے اس بیان سے ان کا طریقہ استنباط معلوم ہوا، نیز یہ کہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ جن روایات سے استدلال فرماتے ہیں وہ قوت وصحت کے سب سے اعلیٰ ترین مقام پر ہیں علامہ سیوطی نے بھی امام صاحب کے مذہب کو سخت بتایا ہو، فرماتے ہیں" ھذا مذھب شدید و قد استقر العمل علی خلافہ فلعل الرواۃ فی الصحیحین ممن یوصف بالحفظ لا یبلغون النصف[۲] یہ سخت مذہب ہے اور عمل اس کے خلاف قرار پایا ہے کیونکہ غالباً صحیحین کے ان رواۃ کی تعداد جو حفظ سے موصوف ہیں نصف تک نہیں پہنچتی ہے" امام صاحب کا یہ طرز عمل قابل قبول تھا، مگر بعض محدثین نے جن کے مزاج میں حدیث کا رنگ غالب تھا بہت سے فروعی مسائل میں امام صاحب پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے،

حافظ ابن عبد البر مالکی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں" کثیر من اھل الحدیث قد استجازوا الطعن علی ابی حنیفۃ لردہ کثیراً من اخبار الاحاد العدول لانہ کان یذھب فی ذالک الی عرضہا علی ما اجتمع علیہ من الاحادیث ومعانی القرآن فما شذ من ذالک ردہ وسماہ شاذاً[۳]

بہت سے محدثین نے امام ابوحنیفہ پر اس لئے طعن کیا ہے کہ انھوں نے بہت سے ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا، اصل بات یہ ہے کہ امام صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ خبر واحد کو اس باب کی دوسری احادیث وقرآن سے ملا کر دیکھتے تھے، اگر اس کا مضمون ان سے مطابقت کھاتا تھا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے اور اس کو شاذ حدیث سمجھتے۔

---

[۱] مناقب ابی حنیفہ الذہبی ص۲۱ [۲] تدریب الراوی ص۱۶ [۳] الموافقات ج۳ ص۲۶

امام صاحب کے ان شرائط اور احتیاط کی وجہ سے جن روایات سے وہ استدلال کرتے ہیں وہ صحت کے لحاظ سے اعلیٰ مقام پر ہوتی ہیں، علی بن جعد جوہری جو امام بخاری وابو داؤد کے استاد ہیں بیان کرتے ہیں "ابو حنیفة اذا جاء بالحدیث جاء بمثل الدر" امام اعظم جس حدیث کو بیان کرتے ہیں وہ موتی کی طرح چمکتی ہوتی ہے، اس کا صحیح اندازہ امام کے مسانید بالخصوص امام محمد کی کتاب الآثار اور صاحب قاموس علامہ سید مرتضیٰ زبیدی کی کتاب الدرر المنیفة فی ادلة مذهب الامام ابی حنیفة سے لگایا جا سکتا ہے۔

امام صاحب پر ایک بے بنیاد الزام — امام صاحب نے قیاس و اجتہاد کی جو دقیق راہ کھولی تھی اس کی بنا پر عوام محدثین جو ظاہر حدیث ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں اور جدید مسائل میں غور و خوض کو معیوب سمجھتے ہیں، انھوں نے امام صاحب پر یہ الزام لگایا ہے کہ امام صاحب قیاس کے مقابلے میں حدیث کو قبول نہیں کرتے (معاذ اللہ) مگر امام صاحب سے جو اقوال منقول ہیں وہ خود اس دعوے کی تکذیب کرتے ہیں، امام صاحب کا یہ قول نقل کیا گیا ہے "ہر وہ شے جس کے بیان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہم نے سنا ہو یا نہ سنا ہو وہ بسر و چشم قبول ہے، ہمارا اس پر ایمان ہے اور ہم شہادت دیتے ہیں کہ وہ ایسی ہی ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے" [۱]

حافظ ابن عبد البر مالکی نے الانتقاء میں امام صاحب سے یہ روایت بیان کی ہے: "لعن اللہ من یخالف رسول اللہ بہ اکرمنا وبہ استنقذنا" [۲] یعنی اللہ کی لعنت ہو اس پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا ہو، آپ کے ذریعہ ہمیں اس نے عزت بخشی اور آپ کے ذریعہ ہمیں کفر و شرک سے بچایا..... علامہ شعرانی نے میزان میں امام صاحب کی یہ روایت نقل کی ہو کہ فرمایا "واللہ ہم پر جھوٹ افترا ہے جو شخص اس کا جو الزام لگاتا ہو کہ ہم نص پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں، کیا نص کے بعد بھی قیاس کی ضرورت ہوگی؟

البتہ تابعین کے متعلق امام صاحب فرماتے تھے کہ "ہم رجال وہم رجال" کیونکہ امام صاحب بھی تابعی ہیں [۳] امام محمد نے المبسوط میں بالتفصیل لکھا ہے کہ امام صاحب حدیث صحیح کے مقابل

---

[۱] تانیب الخطیب ص۸۶ [۲] السنة ومکانتها از مصطفیٰ السباعی [۳] المیزان الکبریٰ ج ۱ ص۵۱

میں کسی بھی رائے کا اعتبار نہیں کرتے تھے، بلکہ علامہ ابن حزم نے فقہاء عراق کا اجماع نقل کیا ہے کہ وہ حدیث ضعیف کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں، ایسے ہی حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ "ان ضعیف الحدیث عندہ اولیٰ من القیاس" اس کی مذہب حنفی میں بکثرت مثالیں موجود ہیں، حدیث وضو بالقہقہہ فی الصلوٰۃ حدیث وضو بنبیذ التمر وغیرہ باوجود ضعیف ہونے کے ان کو امام صاحب نے قیاس پر مقدم کیا ہے، اس کی تفصیل کرتے ہوئے حافظ ابن قیم فرماتے ہیں "تقدیم الحدیث الضعیف وآثار الصحابۃ علی القیاس والرای قولہ (قول الامام ابی حنیفۃ، واحمد بن حنبل" یعنی امام ابو حنیفہ وامام احمد دونوں کے نزدیک ضعیف حدیث کو قیاس پر مقدم رکھا گیا ہے۔ البتہ حدیث ضعیف کی تعریف میں علماء سلف اور متاخرین میں اختلاف ہے، متاخرین جس حدیث کو حسن کہتے ہیں اس کو متقدمین اپنی اصطلاح میں حدیث ضعیف کہتے تھے[1] علامہ ابن حزم اور حافظ ابن قیم نے امام صاحب کے مسلک پر بکثرت تنقیدیں کی ہیں، مگر انھیں بھی اعتراف ہے کہ امام صاحب کے نزدیک حدیث ضعیف قیاس پر مقدم ہے، مرسل حدیث کو قبول کرنا اور قیاس پر مقدم کرنا حنفیہ کا مشہور ومعروف ضابطہ ہے اور حالانکہ امام شافعی نے اس کو قبول کرنے کے لئے شرائط مقرر کئے ہیں اور محدثین کی ایک جماعت نے بالکل ہی ترک کر دیا ہے۔

امام اعظم اور فن جرح وتعدیل اگرچہ اس فن کا آغاز دور صحابہ وتابعین میں ہوچکا تھا مگر تابعین کے دور اخیر میں باقاعدہ اس فن کی ابتدا ہوئی، حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ جب "تابعین کا آخری دور آیا یعنی ۱۵۰ھ کے قریب تو ائمہ نے ایک جماعت کی توثیق وتضعیف کے لئے زبان کھولی، چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ مارایت اکذب من جابر الجعفی، میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا[2] امام ترمذی نے بھی کتاب العلل میں اس کو روایت کیا ہے۔

مسانید امام اعظم امام صاحب کی متعدد تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو ان کے حالات کے ساتھ مذکور ہیں، مگر ہمیں خاص طور سے یہ بتانا ہے کہ آیا فن حدیث پر کوئی مجموعہ موجود ہے یا نہیں، عام طور پر یہ غلط فہمی ہے کہ امام صاحب کی کوئی تصنیف نہیں ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ امام

---

[1] السنۃ ومکانتہا ص۴۳۸ [2] فتح المغیث ص۴۷۱

صاحب نے جس طرح فقہ کو باقاعدہ مدون ومرتب کرایا جو امام صاحب کے تلامذہ بالخصوص قاضی ابو یوسف اور امام محمد نے اپنی تصانیف میں جمع کر دیا ہے، امام شافعی نے بالکل صحیح فرمایا ہے "الناس عیال لابی حنیفة فی الفقه (بعد کے سب آنے والے فقہ میں امام ابو حنیفہ کے خوشہ چیں ہیں) اسی طرح علم حدیث کو بھی باقاعدہ فقہی ترتیب پر مرتب کرایا، علامہ سیوطی لکھتے ہیں من مناقب ابی حنیفة التی انفرد بها انه اول من دون علم الشریعة ورتبه ابوابا ثم تبعه مالک بن انس فی ترتیب الموطا ولم یسبق ابا حنیفة احد[۱] امام ابو حنیفہ کے ان مناقب خصوصی میں سے جن میں وہ متفرد ہیں ایک یہ بھی ہے کہ وہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم شریعت کو مدون کیا اور ان کو ابواب پر ترتیب دیا پھر امام مالک نے موطا کی ترتیب میں انھیں کی پیروی کی اور اس سلسلے میں امام ابوحنیفہ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں۔

علامہ کوثری نے ان مسانید کی تعداد اکیس بتائی ہے، اور فرماتے ہیں کہ ان سب کی اسانید متصل ہیں، ان مسانید کو امام صاحب کے تلامذہ نے جمع کیا تھا، محدث خوارزمی المتوفی ۶۶۵ھ جو ان مسانید کے جامع ہیں، ابتدا رکتاب میں لکھتے ہیں کہ "میں نے شام کے بعض جاہلوں سے سنا کہ وہ امام اعظم کی تنقیص کرتے ہیں اور ان پر قلت روایت حدیث کا الزام لگاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مسند شافعی اور موطا مالک تو مشہور ہیں مگر امام ابو حنیفہ کی کوئی مسند نہیں بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے صرف چند احادیث کی روایت پر اکتفا کیا ہے اس لئے میری دینی حمیت نے آمادہ کیا کہ امام صاحب کی ان پندرہ مسانید کو یکجا جمع کر دوں جن کو بڑے بڑے علما رحدیث نے جمع کیا ہے" ان جامعین کے حالات بھی خوارزمی نے بیان کر دئے ہیں، ان کی فہرست حسب ذیل ہے (۱) امام صاحب کے صاحبزادے حماد کی مسند (۲) امام ابو یوسف کی کتاب الآثار (۳) مسند حسن بن زیاد لؤلؤی (۴) امام محمد کی کتاب الآثار ان حضرات نے براہ راست امام صاحب سے روایت کیا ہے (۵) مسند حافظ ابو محمد عبد اللہ بن یعقوب حارثی بخاری جو عبد اللہ الاستاد کے لقب سے مشہور ہیں اور ابو حفص کبیر کے شاگرد ہیں (۶) مسند حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ

---

[۱] تبییض الصحیفہ ص ۳۶

اصبہانی صاحب کتاب الحلیہ (۷) مسند ابوالقاسم طلحہ بن محمد بن جعفر (۸) مسند حافظ ابو احمد عبد اللہ بن عدی جرجانی (۹) مسند عمرو بن حسن اشنانی (۱۰) مسند ابوالحسین محمد بن مظفر ان پچھ حضرات کا شمار حفاظ حدیث میں ہے۔ (۱۱) مسند ابو بکر احمد بن محمد کلاعی (۱۲) مسند حافظ ابوبکر محمد بن عبد الباقی انصاری (۱۳) مسند حافظ سعدی (۱۴) مسند حسین بن محمد خسروی (۱۵) مسند موسیٰ بن زکریا حصفکی ان کے مسند کی شرح ملا علی قاری نے لکھی ہے۔

ان مسانید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اکثر روایات صرف دو واسطے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں، اس سے ان کی قوت وصحت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہو ائمہ اربعہ میں صرف امام مالک اس خصوصیت میں شریک ہیں مگر ان کی روایات میں سب سے عالی یہی روایات ہیں جب کہ امام اعظم کی مرویات میں وحدانیات بھی ہیں۔ علامہ شعرانی نے بڑے فخر ومسرت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ میں امام اعظم کی مسانید ثلاثہ کے صحیح نسخوں کی زیارت و مطالعہ سے مشرف ہوا جن پر حفاظ حدیث کے دستخط تھے[1] علامہ کوثری فرماتے ہیں: امام صاحب کے مسانید کو محدثین سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے[2]

اگرچہ امام صاحب کے فقہی مسائل کے مقابلے میں ان کو زیادہ شہرت نہیں ہوئی مگر واقعہ ہو کہ بعد والوں کے لئے بہت بڑا نمونہ چھوڑ گئے جس سے بعد کے مصنفین نے استفادہ کیا۔ محدث خوارزمی نے ان کو مسانید کے نام سے موسوم کیا ہو اسلئے بعد کے علماء بھی ان کو مسند کہنے لگے مگر بہت سے اہل علم نے کتاب الآثار وسنن کے نام سے بھی یاد کیا ہو، بلکہ امام ابو یوسف کی مسند کتاب الآثار کے نام سے چھپ بھی گئی ہو، امام محمد کی مسند تو کتاب الآثار کے نام سے مشہور رہی ہو چنانچہ ملک العلماء علامہ علاء الدین کاسانی نے بھی اسکو بدائع الصنائع میں "ذکر آثار ابی حنیفہ" ہی کے نام سے یاد کیا ہو[3] کتاب الآثار محمد کے متعلق حافظ ابن حجر تعجیل المنفعۃ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں "والموجود من حدیث ابی حنیفۃ مفرداً انما ھو کتاب الآثار التی رواھا محمد بن الحسن عنہ" امام ابو حنیفہ کی حدیث میں مستقل طور پر جو کتاب موجود ہو وہ کتاب الآثار ہو جسکو امام محمد بن حسن نے ان سے روایت کیا ہو، حافظ ابن حجر عسقلانی کے تلمیذ حافظ قاسم بن قطلوبغا نے اسکے رجال پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، حافظ ابن حجر کی کتاب کا نام "الایثار بمعرفۃ الآثار" ہے۔

---

[1] مقدمہ اوجز المسالک [2] تانیب الخطیب [3] بدائع الصنائع ج ۱ ص ۲۳۰

محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے

از مولانا تقی الدین صاحب استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء

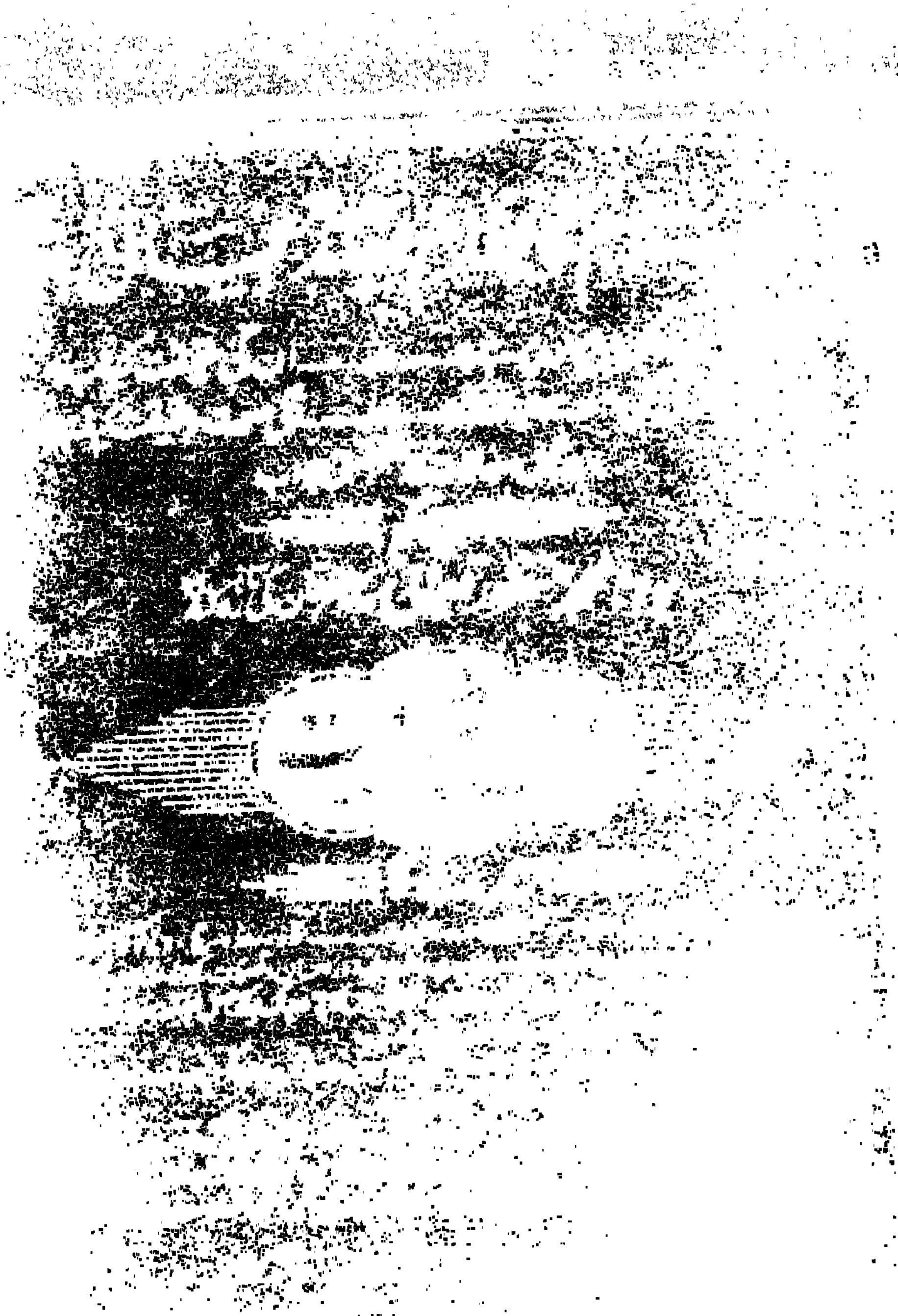
اسلام کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے مسلمانوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور ان کو طریق نبوی سے ہٹانے کے لیے اپنی پوری ذہانت اور محنت اس پر صرف کی ہو کہ حدیث پاک کا یہ ذخیرہ مسلمانوں کی نظروں میں ناقابل اعتماد ہو جائے۔ اسکے لیے انھوں نے ائمہ حدیث کو اپنی جاہلانہ تنقیدوں کا نشانہ بنایا اور ان کے کام میں کیڑے نکالے، اس کا توڑ یہی ہے کہ محدثین نے جس تحقیق و تنقیح اور انتہائی درجہ کی احتیاط کے ساتھ یہ ذخیرہ اپنی کتابوں میں جمع کیا ہو اسکو تاریخ کی روشنی میں سامنے رکھدیا جائے۔

یہ کتاب اس سلسلہ کی تازہ ترین علمی کوشش ہو، اس میں تفصیل سے دکھایا گیا ہو ائمہ اربعہ اور اصحاب صحاح ستہ وغیرہ ائمہ حدیث نے کس تحقیق و تنقیح کے ساتھ اپنی مؤلفات میں احادیث کو جمع کیا ہو اور ان میں سے ہر ایک نے کن اصول اور ضوابط کی پابندی کی ہو۔ حدیث کے اساتذہ اور طلباء کے لیے بھی بہترین تحفہ ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ ہو...... قیمت مجلد ۴/۵۰

دار المصنفین کی چند علمی و تاریخی کتابیں

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ	۴/-	ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	۸/-
الغزالی از علامہ شبلی نعمانی	۵/۲۵	ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	۸/-
مقالات شبلی ۸ جلدوں میں کامل	۲۱/۵۰	بزم تیموریہ مجلد	۸/-
گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں	۶/-	ہماری بادشاہی	۳/-
خطبات مدراس سید سلیمان ندوی	۳/-	المامون از شبلی نعمانی	۳/۷۵
الفاروق مولانا شبلی نعمانی	۸/-	بزم مملوکیہ	۵/۵۰
ہندوستان کی کہانی۔ از عبدالسلام قدوائی	۱/۲۵	حکمائے اسلام (کامل ۲ جلد)	۱۳/-

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ



الفرقان
لکھنؤ

مدیر

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سرپرست

محمد منظور نعمانی

قیمت فی پرچہ 65 P.

الفرقان

لکھنؤ

[illegible]

بابت ماہ شعبان المعظم [illegible] مطابق ستمبر [illegible]

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

[illegible] سمجھئے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ [illegible] اطلاع [illegible] آ جانی چاہیے [illegible]

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ [illegible] لاہور کو بھیجیں [illegible] کے نام ہمیں براہ راست اطلاع دے دیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت و منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے [illegible] مطلع فرمائیں اس کی اطلاع [illegible] تک آ جانی چاہیے [illegible]

دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ———— عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہمارا ملک جن حالات سے گزر رہا ہے ان میں مستقبل کی تمام روشنیاں بجھتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے تمام خوابوں کی بنیاد پانچ پانچ سال کے پانچ منصوبوں کی اسکیم پر رکھی گئی تھی۔ اس اسکیم کی چوتھی قسط اس وقت چل رہی ہے۔ مگر ملک کسی اطمینان سے ہمکنار ہونے کے بجائے خاص کر اس چوتھے مرحلے میں ایسے حال کو پہونچ گیا ہے جیسے پندرہ سال تک تعمیر و ترقی کے بجائے بڑی دھوم سے تخریب و تنزل کے پروگرام چلے ہوں اور اب ان کوششوں کے کڑوے پھل ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بکھر گئے ہوں۔

کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟ اور ارباب اقتدار نے نیت اور ارادے کے ساتھ اپنا ملک اس حال کو پہونچایا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ نیتیں تمام تر ملک کو فلاح یاب کرنے ہی کی رہی ہیں۔ اور ارادے کے ساتھ تو وزراء ہی نہیں بلکہ ان کے نیچے درجہ بدرجہ ذمہ داروں میں سے بھی کسی نے ملک دشمنی نہیں کی ہوگی۔ اسکیم اور عمل میں غلطیاں بیشک ہوسکتی ہیں۔ مگر ایسی کوئی قیامت خیز غلطی اب تک سامنے نہیں آسکی جس کے سر تمام منصوبوں اور کوششوں کی ناکامی ہی نہیں بلکہ ان کا الٹا نتیجہ بھی لکھا جاسکے! — لیکن کوئی چیز تو ہے جس نے قیامت مچادی ہے اور ملک دشمنی کی کسی اسکیم کے بغیر یہ حال ہوگیا ہے! پھر وہ کیا ہے؟

وہ چیز بہت صاف ہے اور وہ وہ ہے جس کی طرف کسی اور نے نہیں خود ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی

"ہر شخص اپنے لیے زیادہ سے زیادہ حاصل کر لینے کی فکر میں لگا ہوا ہے"

یہی وہ مرض ہے جو اچھا اچھی شکل [illegible] کو بھی لگ جائے تو نچوڑ کر رکھ دیتا ہے!

چہ جائیکہ وہ مفلس خستہ حال اور ڈیڑھ سو دو سو برس کی لوٹ کھسوٹ کا مارا ہوا ملک جو بیرونی قرضے لیکر اپنے آپ کو سنوارنے کا سفر بھی شروع کرے اور قوم بے صبری کے ساتھ اس تعمیری مرحلے ہی میں اپنا اپنا گھر بھرنے لگ جائے اگر اس مرحلے کی تکمیل تک بھی صبر کر لیا جائے تو اس کے پکے ہوئے پھل بہت دن کی نفسی نفسی کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔ مگر پودے ہی چاچرا کر بیچے جانے لگیں، شاخیں ہی کاٹ کاٹ کر لکڑی کے دام بنانے کی ریت چل پڑے تو پھر باغ نہ بن سکے گا۔ نہ پھلوں کا مزہ اس سے کوئی لے سکے گا۔ بڑی بڑی قومیں اور سلطنتیں اپنے افراد کی اس خود پرستی کا شکار ہوئیں۔ مسلمانوں کی جیسی دنیا پر چھائی ہوئی قوم کو جس چیز نے بالکل ہی ڈبو کر چھوڑا وہ سب کی نہیں صرف برسر اقتدار یا اقتدار میں دخیل طبقوں کی یہی نحوست تھی۔ لیکن جب تک یہ گھن نہیں لگا وہ تنزل کی آخری حد کو نہیں پہونچے۔ اور یہ گھن انھیں سارے گھنوں کے بعد لگا۔ ان کے اسلامی مزاج میں اس مرض کی بہت ہی کم گنجائش تھی۔ اور جس طرح ان کو ساری کمزوریوں کے بعد بھی عرصے تک تھامے رہنے میں اس مزاج کا بڑا دخل ہے اسی طرح ان کے آناً فاناً دنیا پر چھا جانے میں بھی اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمان عرب کی اس قوم سے اٹھے تھے جن کی مفلسی پر اُس وقت کی ترقی یافتہ قومیں ہنستی تھیں۔ انھیں کھانے اور پہنے کو بھی پورا میسر نہیں تھا۔ عجیب عجیب الفاظ میں روم اور ایران کے درباروں میں ان کے اس حال کی تصویریان کے منھ پر کھینچی گئی۔ اور وہ انکار نہیں کر سکے لیکن اجتماعی فرض شناسی کا یہ مزاج انھیں اسلام نے دیدیا تھا کہ دشمن سپہ سالاروں اور شہنشاہوں کے تاج اور زریں قبائیں ان کے معمولی سپاہیوں کے ہاتھ میں آتیں تو قومی امانت سمجھ کر اپنے سپہ سالار کے پاس لے آتے۔ ایک حبہ برابر اس میں خورد برد کرنے کے کبھی روادار نہ ہوتے، وقت آنے پر انھیں سب کچھ ملا۔ اور اتنا ملا کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ مگر یہ اسطرح ملا کہ افراد بھی سیر ہوئے اور قوم کے آگے بڑھنے کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں۔ ورنہ آگے بڑھنے کے منصوبے بھی دھرے رہ جاتے اور کچھ افراد کے سوا پوری قوم بھی ویسی ہی مفلس و کنگال رہ جاتی۔

یہ آج ہم جو کچھ ملک کی گت دیکھ رہے ہیں کہ نہ پیسہ ہو نہ غلہ، یہ نہ ارباب اقتدار کی نیت اور ارادے کا نتیجہ ہے اور نہ تعمیری اسکیموں اور ان پر عملدرآمد میں غلطی کا نتیجہ۔ یہ سب اسی خود پرستانہ مزاج کا نتیجہ ہے جسکی طرف صدر جمہوریہ نے بہت کھل کر اور بہت تڑپ کر اشارہ کیا ہے اور اس قومی مزاج سے ارباب اقتدار تک مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ورنہ قوم کے اس مزاج کی موجودگی میں کھل کھیلنے کا ہرگز موقع نہ ملتا۔ ملک دشمن کوئی نہیں ہو لیکن ملک سے پہلے اپنے دوست شاید سب

ہی ہیں۔ اور یہ دوستی اپنی اپنی سطح اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق ہر ایک کی الگ ہے۔ کوئی دولت کا رسیا ہو، کسی کو عہدہ چاہیئے، کسی کو اقربا نوازی، اور کسی کو اقتدار پر اپنی گرفت، اپنی اپنی ان شرائط کے ساتھ ملک ترقی کرے تو یقیناً سب خوش۔ ورنہ ان چیزوں کی خاطر ملک کو بھول جانا بالکل مجبوری۔ اور یہ ایک مجبوری تعمیر و ترقی کی ساری اسکیموں پر پانی پھیرے دے رہی ہے —

لیکن ہم ان لوگوں کو اس پر کیا ملامت کریں جو درویشی اور فقیری کا دعویٰ نہیں رکھتے۔ اور کسی ایسے لباس کے بغیر تخت اقتدار پر بیٹھ گئے ہیں جس میں اقتدار کی غلط ترغیبات سے بچائے رکھنے کی صلاحیت ہو، پھر اقتدار بھی ایسا جس میں آگے اور پیچھے ترغیبات کا ایک سیلاب ہو۔ جبکہ ہم خود اپنے یہاں درویشی اور فقیری کے لباسوں اور آخرت طلبی کے دعووں کے ساتھ پیشہ وروں اور بہروپیوں میں نہیں، نیتوں کے اعتبار سے اچھے اور سچے لوگوں میں اور نسبتوں کے اعتبار سے بھی بجا حسن ظن کے مستحق لوگوں میں، تخت حکومت پر نہیں، صرف جماعتوں اور اداروں کی سربراہی میں، اسی "مجبوری" کا شکار ہونے کی مثالیں دیکھ رہے ہیں۔ اور سربراہی کی سطح پر اس طرح کی کمزوریوں کے مشاہدے سے اعوان و انصار میں جو خوشامد یا کشمکش و رقابت کا ذہن پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں ادارے یا جماعت کے پورے ڈھانچے میں فساد سرایت کرتا اور گل کر پھوٹتا ہے، وہ سب کچھ بھی مرض کی مقدار کے مطابق ہو رہا ہے۔ خالص خدا طلبی، اس کی رضا جوئی، اس کے دین کی اشاعت یا اس کے نبی کی امت کی حفاظت کیلئے کمال بے لوثی اور ایثار و جاں سپاری کی نقش آفریں روایات کے ساتھ، بلکہ ان روایات کی برقراری کے ممکن انتظامات کے بھی ساتھ جو جماعتیں اور ادارے اس ملک میں خدا کے مخلص ترین بندوں نے قائم کیے تھے۔ اخلاق کی ان کمزوریوں کی بدولت ان کے مقاصد کو آنچ لگ رہی ہے، منافع یا بالکل ختم ہو گئے ہیں یا مفاسد سے آلودہ ہو کر نکل رہے ہیں۔ اور اندر کا حال تو کہیں کہیں ایسا ہے کہ بس خدا ہی اپنے مخلصین کی ان یادگاروں کا پردہ رکھے۔

ہمیں ملک کی بھی فکر ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ پہلے اپنے اندر کی فکر ہو۔ ہم میں کا کوئی کبھی کبھی ملک کے برسر اقتدار لوگوں کو گاندھی جی کی وصیت یاد دلاتا ہے کہ حکومت کے لیے ابوبکر و عمر کے طریقے پر نظر رکھو۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب ہم میں کوئی ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کے طریقے کا حوصلہ نہیں پاتا تو ہم دوسروں کو کیا یاد دلائیں۔ جن لوگوں کی زبان و قلم سے ابوبکر و عمر کا نام زندہ ہے وہی اپنے اقتدار کے چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں ابوبکر و عمر بن کر دکھائیں تو دوسروں کو اس کی تلقین کچھ اچھی بھی لگے۔ آج تو اپنا ماتم کیجیے دوسروں کا ماتم کم از کم ہمیں زیب نہیں دیتا۔

اعلان تعطیل

رمضان مبارک کی وجہ سے جنوری [illegible] میں الفرقان شائع نہیں ہوگا۔
اس شمارہ کے بعد ان شاء اللہ یکم فروری کو اشاعت ہوگی۔

منیجر

کتاب الاذکار والدعوات

مَعَارِفُ الحَدِيث

(مُسَلسَل)

قبولیتِ دُعا کے خاص احوال واوقات :-

دُعا کی قبولیت میں بنیادی دخل تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دُعا کرنے والے کے تعلق اور اس اندرونی کیفیت کو ہوتا ہے جس کو قرآن مجید میں "اضطرار اور ابتہال" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ خاص احوال اور اوقات بھی ایسے ہوتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کی خاص طور سے امید کی جاتی ہے۔ مندرجۂ ذیل حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احوال واوقات کی خاص طور سے نشاندہی فرمائی ہے۔

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى فَرِيْضَةً فَلَهٗ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ وَمَنْ خَتَمَ الْقُرْاٰنَ فَلَهٗ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ ——— رواه الطبرانی فی الکبیر

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ فرض نماز پڑھے (اور اس کے بعد دل سے دعا کرے) تو اس کی دُعا قبول ہوگی۔ اسی طرح جو آدمی قرآن مجید ختم کرے (اور دُعا کرے) تو اس کی دُعا بھی قبول ہوگی۔

(معجم کبیر للطبرانی)

(تشریح) نماز اور خاص کر فرض نماز میں اور قرآن پاک کی تلاوت کے وقت بندہ اللہ تعالیٰ سے قریب تر اور اس سے ہمکلام ہوتا ہے، بشرطیکہ نماز اور تلاوت کی صرف صورت نہ ہو بلکہ حقیقت

ہو، گویا یہ دونوں عمل بندۂ مومن کی معراج ہیں۔ پس ان دونوں کے ختم پر بندہ اللہ تعالیٰ سے جو دُعا کرے وہ اس کی مستحق ہے کہ رحمتِ الٰہی خود آگے بڑھ کے اس کا استقبال کرے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الدُّعَاءُ لَا یُرَدُّ بَیْنَ الْاَذَانِ وَالْاِقَامَۃِ ——— رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ اذان اور اقامت کے درمیان دُعا رد نہیں ہوتی قبول ہی ہوتی ہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تُفْتَحُ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَیُسْتَجَابُ الدُّعَاءُ فِیْ اَرْبَعَۃِ مَوَاطِنَ عِنْدَ اِلْتِقَاءِ الصُّفُوْفِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَعِنْدَ نُزُوْلِ الْغَیْثِ وَعِنْدَ اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ وَعِنْدَ رُؤْیَۃِ الْکَعْبَۃِ ——— رواہ الطبرانی فی الکبیر

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، چار موقعے ہیں جن میں دُعا خصوصیت سے قبول ہوتی ہے۔ راہِ خدا میں جنگ کے وقت، اور جس وقت آسمان سے بارش ہو رہی ہو (اور رحمت کا سماں ہو) اور نماز کے وقت، اور جب کعبۃ اللہ نظر کے سامنے ہو۔ (معجم کبیر طبرانی)

عَنْ رَبِیْعَۃَ بْنِ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَۃُ مَوَاطِنَ لَا تُرَدُّ فِیْھَا دَعْوَۃٌ رَجُلٌ یَکُوْنُ فِیْ بَرِّیَّۃٍ حَیْثُ لَا یَرَاہُ اَحَدٌ اِلَّا اللّٰہُ فَیَقُوْمُ وَیُصَلِّیْ وَرَجُلٌ یَکُوْنُ مَعَہٗ فِئَۃٌ فَیَفِرُّ عَنْہُ اَصْحَابُہٗ فَیَثْبُتُ وَرَجُلٌ یَقُوْمُ مِنْ آخِرِ اللَّیْلِ۔

——— رواہ ابن مندۃ فی مسندہ

حضرت ربیعہ بن وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا [illegible] رد نہیں ہوگی (بلکہ لازماً قبول ہی ہوگی) [illegible] کے سوا کوئی اُسے دیکھنے والا نہ ہو وہاں

وہ خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر نماز پڑھے اور پھر دعا کرے) دوسرے یہ کہ کوئی شخص میدان جہاد میں (دشمن کی فوج کے سامنے) ہو، اس کے ساتھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں مگر وہ دشمنوں کے نرغہ میں ثابت قدم رہا ہو (اور اس حال میں دعا کرے) تیسرے وہ آدمی جو رات کے آخری حصہ میں (بستر چھوڑ کے) اللہ کے حضور میں کھڑا ہو اور پھر دعا کرے۔ تو ان بندوں کی یہ دعائیں ضرور قبول ہوں گی) (مسند ابن مندہ)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي اللَّيْلِ لَسَاعَةً لَا يُوَافِقُهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ يَسْأَلُ اللّٰهَ فِيْهَا خَيْرًا مِنْ اَمْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِلَّا اَعْطَاهُ اِيَّاهُ وَذَالِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے کہ رات میں ایک خاص وقت ہے جو مومن بندہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ سے دنیا یا آخرت کی کوئی خیر اور بھلائی مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور عطا فرما دے گا، اور اس میں کسی خاص رات کی خصوصیت نہیں بلکہ اللہ کا یہ کرم ہر رات میں ہوتا ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث معارف الحدیث کی تیسری جلد میں تہجد کے بیان میں صحیحین کے حوالے سے ذکر کی جا چکی ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سماء دنیا کی طرف نزول فرماتے ہیں. اور خود ان کی طرف سے پکار ہوتی ہے کہ کوئی ہے مانگنے والا کہ میں اس کو عطا کروں، کوئی ہے بخشش چاہنے والا کہ میں اس کی بخشش کا فیصلہ کروں، کوئی ہے مجھ سے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں، ــ اس حدیث کی روشنی میں یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ بالا حدیث میں ہر رات میں قبولیت دعا کے جس خاص وقت کا ذکر کیا گیا ہے وہ رات کا آخری حصہ ہے۔ واللہ اعلم.

مندرجہ بالا احادیث سے دعا کی قبولیت کے جو خاص احوال و اوقات معلوم ہوئے ہیں وہ

یہ ہیں :-

فرض نمازوں کے بعد، ختمِ قرآن کے بعد، اذان اور اقامت کے درمیان، میدانِ جہاد میں جنگ کے وقت، بارانِ رحمت کے نزول کے وقت، جس وقت کعبۃ اللہ آنکھوں کے سامنے ہو، ایسے جنگل بیابان میں نماز پڑھ کے جہاں خدا کے سوا کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ میدانِ جہاد میں جب کمزور ساتھیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہو، اور رات کے آخری حصہ میں ۔

وہ حدیثیں اپنے موقع پر پہلے ذکر کی جا چکی ہیں جن میں شب قدر میں اور عرفہ کے دن میدانِ عرفات میں اور جمعہ کی خاص ساعت میں اور روزہ کے افطار کے وقت اور سفرِ حج اور سفرِ جہاد میں اور بیماری اور مسافری کی حالت میں دعاؤں کی قبولیت کی خاص توقع دلائی گئی ہے۔

لیکن یہ بات برابر ملحوظ رہنی چاہیے کہ دُعا کا مطلب، دُعا کے الفاظ اور صرف اس کی صورت نہیں ہے بلکہ اس کی وہ حقیقت ہے جو پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔ پورا اسی دانے سے اُگتا ہو جس میں مغز ہو ـــ اسی طرح آگے درج ہونے والی احادیث سے دُعا کی قبولیت کا مطلب بھی سمجھ لینا چاہیئے۔

دُعا قبول ہونے کا مطلب اور اُس کی صورتیں :-

بہت سے لوگ ناواقفیت سے قبولیتِ دُعا کا مطلب صرف یہ سمجھتے ہیں کہ بندہ اللہ سے جو کچھ مانگے وہ اس کو مل جائے۔ اور اگر وہ نہیں ملتا تو سمجھتے ہیں کہ دُعا قبول نہیں ہوئی ـــ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے ـــ بندہ کا علم بیحد ناقص ہے بلکہ اپنی خلقت کے لحاظ سے وہ ظلوم و جہول ہے۔ بہت سے بندے ہیں جن کے لیے دولتمندی نعمت ہے۔ اور بہت سے ہیں جن کے لیے دولت فتنہ ہے، بہت سے بندے ہیں جن کے لیے حکومت اور اقتدار قربِ خداوندی کا وسیلہ ہے اور حجاج اور یزید کی طرح بہت سے ہیں جن کے لیے حکومت و اقتدار خدا سے دوری اور اُس کے غضب کا سبب بن جاتا ہے ـــ بندہ نہیں جانتا کہ کیا چیز میرے لیے بہتر ہے اور کیا میرے لیے فتنہ اور زہر ہے، اس لیے بسا اوقات وہ ایسی چیز اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جو اس کے لیے بہتر نہیں ہوتی یا اس کا عطا کرنا حکمتِ الٰہی کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جو حکیم و دانا ہے

یہ بات اُس کے علم و حکمت کے خلاف ہے کہ ہر بندہ جو مانگے وہ اس کو ضرور عطا فرمائے ۔ دوسری طرف اُس کی کریمی کا یہ تقاضا ہے کہ جب اُس کا بندہ ایک محتاج اور مسکین کی طرح اُس کے حضور میں ہاتھ پھیلائے اور دُعا کرے تو وہ اُس کو خالی ہاتھ نہ لوٹائے ، اس لیے اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ وہ دُعا کرنے والے بندہ کو محروم تو نہیں لوٹاتا ، کبھی تو اس کو وہی عطا فرما دیتا ہے جو دُعا میں اُس نے مانگا اور کبھی اسکی دُعا کے عوض آخرت کی بیش بہا نعمتوں کا فیصلہ فرما دیا جاتا ہے اور اس طرح اس کی یہ دُعا اس کے لیے ذخیرہ آخرت بن جاتی ہے ۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس دُنیا میں اسباب و مسببات کا جو سلسلہ ہے اس کے حساب سے اس دُعا کرنے والے بندہ پر کوئی آفت اور مصیبت نازل ہونے والی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اس دُعا کے نتیجہ میں اُس آنے والی بلا اور مصیبت کو روک دیتا ہے ۔ بہرحال دعا کے قبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دُعا رائیگاں نہیں جاتی اور دُعا کرنے والا محروم نہیں رہتا ، اللہ تعالیٰ اپنے علم و حکمت کے مطابق مذکورۂ بالا صورتوں میں سے کسی نہ کسی طرح اس کو ضرور نوازتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے ۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُوْ بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيْهَا اِثْمٌ وَلَا قَطِيْعَةُ رَحِمٍ اِلَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ بِهَا اِحْدٰى ثَلٰثٍ اِمَّا اَنْ يُّعَجِّلَ لَهٗ دَعْوَتَهٗ وَاِمَّا اَنْ يَّدَّخِرَهَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ وَاِمَّا اَنْ يَّصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا قَالُوْا اِذًا نُّكْثِرُ قَالَ اللّٰهُ اَكْثَرُ ۔۔۔۔۔۔ رواہ احمد

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مومن بندہ کوئی دعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ کی بات نہ ہو اور نہ قطع رحمی ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ضرور عطا ہوتی ہے یا تو جو اُس نے مانگا ہے وہی اس کو ہاتھ کے ہاتھ عطا فرما دیا جاتا ہے ۔ یا اس کی دُعا کو آخرت میں اس کا ذخیرہ بنا دیا جاتا ہے ، یا آنے والی کوئی مصیبت اور تکلیف اس دُعا کے حساب سے روک دی جاتی ہے ۔ صحابہ نے عرض کیا جب بات یہ ہے کہ ہر دُعا ضرور قبول ہوتی ہے اور اُس کے حساب میں کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے) تو ہم بہت زیادہ دُعائیں

کریں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

رواہ احمد

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اللہ کا خزانہ لاانتہا اور غیر فانی ہے اگر سارے بندے ہر وقت اس سے مانگیں اور وہ ہر ایک کے لیے عطا فرمانے کا فیصلہ کرے تو اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اس بندہ کو جس نے دنیا میں بہت سی ایسی دعائیں کی ہوں گی جو بظاہر دنیا میں قبول نہیں ہوئی ہوں گی ان دعاؤں کے حساب میں جمع شدہ ذخیرہ آخرت میں عطا فرمائیں گے تو بندہ کی زبان سے نکلے گا

يَا لَيْتَهُ لَمْ يُعَجَّلْ لَهُ شَيْءٌ مِنْ دُعَائِهِ۔ (کنز العمال ص)

اے کاش میری کوئی بھی دعا دنیا میں قبول نہ ہوئی ہوتی اور ہر دعا کا پھل مجھے یہیں ملتا۔

مذہب کی ملحدانہ تشریح

(جناب وحید الدین خاں صاحب)

دورِ جدید کے مفکرین کسی ایسے ذریعہ علم کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو مخصوص شخص کو وہبی طور پر حاصل ہوا اور عام تجربے میں اس کا آنا ممکن نہ ہو سکے۔ ان کے نزدیک جو بات عام لوگوں کے ادراک سے باہر ہو۔ اس کا عام لوگوں سے مطالبہ کرنا نہ صرف غیر منطقی بات ہے بلکہ یہی اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ وہ غیر حقیقی ہے، کیونکہ اگر وہ حقیقی ہوتی تو دوسرے انسانوں کے لیے بھی اس کا حصول ممکن ہوتا اب چونکہ مذہب اور مذہبی معتقدین ساری تاریخ میں بطور واقعہ موجود رہے ہیں اور آگسٹ کامٹے (۱۷۹۸ - ۱۸۵۷) کی پیشین گوئی کے علی الرغم اب تک موجود ہیں۔ اس لیے مذہب کی صداقت تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی وہ اس کی تشریح کرنے پر مجبور ہیں، اس کی تشریح کے لیے قدرتی طور پر ان کا ذہن ایسے مماثل واقعات کی طرف جاتا ہے جو عام انسانوں کے لیے قابل فہم ہوں اور "شاعری" کی شکل میں بہت جلد انھیں اس کا جواب مل جاتا ہے۔ وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ دوسرے ذہنی اعمال کی طرح مذہب بھی محض ایک ذہنی عمل (MENTAL ACTIVITY) ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

ٹائن بی کے الفاظ میں حقیقت کے ادراک کے دو طریقے ہیں۔ ایک سائنسی طریقہ جس کا انحصار مشاہدہ اور تجربہ پر ہے اور دوسرا شاعرانہ طریقہ جو اندر سے ابلتا ہے۔ پہلے طریقے سے جو چیز دریافت ہو وہ سائنسی حقیقت (SCIENTIFIC TRUTH) ہے اور دوسرے طریقے سے جو چیز ملے وہ شاعرانہ حقیقت (POETIC TRUTH) وہ کہلاتی ہے۔

ON THE POETIC LEVEL OF THE SUBCONSCIOUS

PSYCHE, THE COMPREHENSIVE VISION IS PROPHECY

AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION, P. 123

یعنی لاشعور کی شاعرانہ سطح پر قابلِ فہم مشاہدہ کا نام پیغمبری ہے۔

علومِ اجتماعی کی انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں مذہب (RELIGION) کی مثال آرٹ سے دی جا سکتی ہے۔ جس طرح بعض لوگ دوسروں کے مقابلے میں آرٹ کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں اور اس میدان میں غیر معمولی مظاہرے کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں میں اندرونی بصارت و سماعت (INNER EYES AND EARS) سے دیکھنے اور سننے کی منفرد خصوصیات ہوتی ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس نے مذہب کے تجربات سے انسان کو آشنا کیا ہے۔

ENCYCLOPAEDIA OF THE SOCIAL SCIENCES (1951)
Vol. 13, P. 230

ٹی، آر، مائلز (T. R. MILES) لکھتا ہے:

"مذہب کی مابعد الطبیعی حقیقتیں اگر مذہب کے اپنے لفظی معنی میں لی جائیں تو وہ بے معنی ہیں، البتہ اگر ان کو مجازی زبان (LANGUAGE OF PARABLE) کی حیثیت دی جائے تو وہ بامعنی ہو سکتی ہیں۔ جیسے کوئی شخص ایک نئی دریافت کرتا ہے تو ہم کہہ اٹھتے ہیں:

IT WAS AN ABSOLUTE REVELATION

یہ تو بالکل الہام تھا۔ اس طرح شاعر پر الہام ہوتا ہے اور اسی طرح پیغمبر پر الہام ہوتا ہے"

RELIGION THE SCIENTIFIC OUTLOOK
195–96

مائلز کے نزدیک وحی کو اگر اس معنی میں لیا جائے کہ وہ خدا کے اپنے الفاظ ہیں جو فرشتے کے ذریعہ کسی خاص انسان پر اترتے ہیں تو یہ ایک بے معنی بات ہوگی، البتہ اگر اس کو بصیرت کی روشنی (FLASH OF INSIGHT) کہیں تو وہ سمجھ میں آتا ہے، کیونکہ اس طرح ایک فن کار یا ایک مفکر کے اندر یکایک کسی خیال کا آ جانا ایک معلوم بات ہے (صفحہ ۱۹۹) اسی طرح مرنے کے بعد دوبارہ زندگی

پانا بالکل لفظی معنوں میں سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ تمثیلی زبان تسلیم کرلی جائے تو ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ جسم کے متعلق ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ مرنے کے بعد منتشر ہو جاتا ہے اور روح بھی اسی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اس لیے دوبارہ زندگی کا تصور لفظی معنوں میں ناقابل فہم ہے

(صفحہ ۲۰۴)

الکسس کیرل الہام کو صوفیانہ معرفت (MYSTICISM) قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کی تلاش مکمل طور پر ایک ذاتی مہم (PERSONAL UNDERTAKING) ہے۔ جس طرح ایک شخص جسمانی ورزش کرکے پہلوان بنتا ہے، اسی طرح ایک شخص ترک دنیا اور تپسیا کے ذریعہ روحانیت کے سایہ میں پہونچنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"اپنے شعور کی مشق کرکے آدمی ایک ایسی ناقابل مشاہدہ حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے جو ایک خلقی (IMMANENT) حقیقت بھی ہے اور مادی دنیا سے بالاتر بھی۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو ایسے ٹبے جوکھم میں ڈالتا ہے جس کی کوئی شخص جرأت کرسکتا ہے۔ وہ کسی کو ہیرو نظر آسکتا ہے اور کسی کو دیوانہ، مگر کوئی شخص یہ سوال نہیں کرسکتا کہ عارفانہ تجربہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ کوئی خود ساختہ چیز ہے یا وہم ہے یا روح کا ہماری دنیا کے ابعاد (DIMENSIONS) سے پرے کوئی سفر ہے جہاں وہ اعلیٰ حقیقت سے جاکر مل جاتی ہے ...... معرفت آدمی کی اعلیٰ ترین آرزوؤں کو تسکین دیتی ہے۔ اندرونی قوت، روحانی روشنی، خدائی محبت، بعید سکون، مذہبی وجدان اتنا ہی حقیقی ہے جتنا جمالیاتی احساس[1] مافوق آدمیت حسن کے تصور کے ذریعہ عارف اور شاعر آخری صداقت (ULTIMATE TRUTH) تک پہونچتے ہیں۔"

MAN THE UNKNOWN, P. 134

اوپر کی سطروں میں مذہب کی جو جدید تشریح نقل کی گئی ہے اس کے بارے میں میں الکسس کیرل کے وہ الفاظ دہراؤں گا جو اس نے خود اپنے بارے میں لکھے ہیں:

---

[1] RELIGIOUS INTUITION IS AS REAL AS ESTHETIC INSPIRATION

"مصنف کو تسلیم ہے کہ مذہب سے متعلق ذہنی اعمال کی تشریح جو اُس نے کی ہے، وہ نہ سائنسدانوں کو پسند آئے گی اور نہ مذہبی لوگوں کو۔ سائنسداں اس قسم کی کوشش کو طفلانہ یا بے معنی کوشش سمجھیں گے اور مذہبی علماء اس کو غلط اور فضول قرار دیں گے۔"

(ایضاً صفحہ ۱۳۲)

مذہب کی مندرجۂ بالا تشریح میں اگرچہ مذہب کے الفاظ باقی ہیں مگر حقیقۃً اس میں اور خالص الحاد میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس تشریح کے مطابق مذہب ایک غیر حقیقی چیز قرار پاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور آخرت اور الہام فی الواقع اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے، بلکہ وہ ہماری قوتِ تخیل کے کرشمے ہیں۔ مگر مذہب نے جس شدت کے ساتھ ذہنوں میں جگہ بنائی ہے اس کے لحاظ سے یہ بات بالکل ناقابلِ قیاس ہے کہ وہ محض ایک تخیلاتی چیز ہو۔ دورِ حاضر کا مشہور مورخ ٹائن بی لکھتا ہے:

"اگر ہم مذاہب کے ایک سروے پر نکلیں جو مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں بیشمار انسانی سماج اور گروہوں میں رائج رہے ہیں جن کے متعلق ہم کچھ معلومات رکھتے ہیں۔ ہمارا پہلا تاثر حیران کن طور پر لامحدود قسم کا ہوگا۔ تاہم غور و فکر اور تجزیہ سے یہ ظاہری اقسام انسان کی پرستش یا تلاش تین چیزوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ یعنی فطرت، انسان خود اور حقیقت مطلق (ABSOLUTE REALITY) جو کہ نہ فطرت ہے، نہ خود انسان ہو بلکہ وہ ان کے اندر ہوتے ہوئے ان سے باہر ہے۔"

AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION P. 16

گویا تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم ترین زمانے سے لے کر اب تک انسان ایک حقیقت اعلیٰ کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بالکل فرضی چیز اس طرح انسانی تاریخ پر چھا جائے۔ کیا دوسری کسی ایسی چیز کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو غیر حقیقی ہونے کے باوجود اس طرح انسان کی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہو۔

۲۔ اس تشریح میں فطری طور پر مذہب کسی ایک چیز کا نام نہیں رہتا، بلکہ وہ ہزار چیز بن جاتا ہے کیونکہ جب مذہب آدمی کا اپنا ذہنی عمل ہے تو وہ ہر شخص کی اپنی استعداد، اپنے مزاج

اور اپنی ساخت کے لحاظ سے الگ الگ ہوگا۔ حالانکہ مذہب کا حکم الٰہی ہونا یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایک متعین شکل میں ہو تاکہ اس کی بنیاد پر ہر شخص کے رویے کے صحیح اور غلط ہونے کا تعین کیا جا سکے۔ اس طرح تصور مذہب کے فرق کی وجہ سے حقیقت مذہب میں بنیادی فرق ہو جاتا ہے۔ یہاں میں ٹائن بی کا ایک اقتباس نقل کروں گا:

"مختلف لوگوں کے عقائد بہر حال مختلف ہوں گے۔ کیونکہ حقیقت مطلق (ABSOLUTE REALITY) ایک راز ہے جس کی صرف ایک جزوی جھلک انسانی ذہن نے دیکھی ہو۔ اتنی بڑی حقیقت صرف ایک راستہ پر چل کر معلوم نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ کتنا ہی مضبوط اور پختہ کیوں نہ ہو کہ میرا ادراک صحیح ہے، مجھے اس سے باخبر رہنا چاہیے کہ میری روحانی نظر محدود ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دوسرا کوئی مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ مذہبی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ مجھے یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ دوسرے لوگوں کو خدا کا الہام نہیں ہوا۔ اور اسی طرح یہ بھی امکان ہے کہ دوسروں کا الہام اس سے زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ ہو جو مجھ کو ہوا ہو۔ میں اور میرا ساتھی دونوں مختلف راستوں سے ایک ہی منزل کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ تمام انسان مخفی حقیقت تک پہونچنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی حقیقت مطلق کی مناسبت سے تعمیر کر سکیں یا مذہبی اصطلاح کے مطابق خدا کی مرضی پر چل سکیں، یہ تمام لوگ ایک ہی قسم کی تلاش میں مصروف ہیں۔ انھیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ سب روحانی بھائی ہیں اور رواداری اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ محبت میں تبدیل نہ ہو جائے۔"

AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION, P. 251

اسی طرح جامعی سطح پر خدا کے بہت سے تصورات بن جاتے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مؤلفین نے سماجی سطح پر خدا کے بائیس تصورات دریافت کیے ہیں اور بائیس الگ الگ عنوانات کے تحت ان کی تشریح کی ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ۵، عنوان خدا (GOD)۔

۴۔ اسی طرح اس تشریح کے خانے میں نبوت اور ختم نبوت سب بے معنی الفاظ ہو جاتے ہیں۔ ٹائن بی اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھتا ہے:

"موصوف کا نقطۂ نظر اس سے متصادم نہیں ہے کہ خدا نے انسان کے ذریعہ الہام کیا تاکہ

روحانی نجات کے لیے انسان کی مدد کرے جو کہ بلا واسطہ کوشش سے انسان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ مگر مؤرخ اس ابتدائی مقدمہ کو بیان تک پہونچانے میں مشتبہ ہے کہ یہ دعویٰ کیا جائے کہ خدا کی طرف سے ایک مخصوص اور آخری الہام ہوا ہے جو اس کہکشانی نظام میں سورج کے ایک کرہ پر ایک متعین وقت میں ایک خاص گروہ کو عطا ہوا ہے۔ "خدا اپنی مخلوق پر الہام کرتا ہے" کے مقدمہ کے اس ذاتی (SELF - CENTRED) انطباق میں مؤرخ شیطانی شرارتوں کی جھلک دیکھتا ہے۔ کیونکہ الہام اور مخصوص الہام میں منطقی طور پر کوئی لازمی رشتہ نہیں ہو۔ یعنی یہ کہ "میں" ہی وہ شخص ہوں جس پر تمام لوگوں کے درمیان خدا کا الہام ہوا ہے، اور میرا الہام مخصوص اور آخری ہے"۔ (صفحہ ۱۲۲)

میں کہوں گا کہ اس غلطی کی بنیاد خود اس تصور الہام میں ہے جو مؤرخ مان رہا ہے۔ ورنہ اسے معلوم ہوتا کہ فی الواقع الہام اور مخصوص الہام میں اتنا قریبی اور منطقی رشتہ ہے کہ دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جدید مفکرین کا تصور الہام یہ ہے کہ وہ اسی قسم کی ایک چیز ہے جیسے کسی آرٹسٹ کے ذہن میں کسی عمدہ تصویر کا خیال آجائے یا شاعر کو کوئی عمدہ شعر سوجھ جائے۔ خدا ان کے نزدیک کوئی شعوری وجود نہیں جو بالارادہ ایک خاص مقصد کے تحت کسی کو اپنی مرضی کے القاء کے لیے چنتا ہو، بلکہ وہ کسی قسم کی مجہول خارجی حقیقت ہے جو ہماری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کی پرچھائیاں ہم پر پڑتی ہیں، اور بعض لوگوں کے نزدیک یہ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ صرف ہمارا تحت شعور ہے جو وحی و الہام کی صورت میں بولتا ہو۔ ظاہر ہے کہ مذہبی نقطۂ نظر سے صورت حال اس سے قطعی مختلف ہے اس لیے مذہب کا تصور الہام جدید مفکرین کی سمجھ میں کیسے آسکتا ہے۔

۲۔ اس جدید تشریح میں مذہب صرف ایک دُنیوی ضرورت بن کر رہ جاتا ہے۔ جب کہ مذہب دراصل ایک اُخروی ضرورت ہے۔ یعنی خالص مذہبی نقطۂ نظر سے مذہب کا اصل کام انسان کو دوسری زندگی کی نجات کا راستہ بتانا ہے۔ مگر اس تشریح میں مذہب کا مقصد صرف یہ ہو جاتا ہے کہ دُنیا میں سماجی تنظیم کے لیے ایک موزوں بنیاد فراہم کرے۔ وہ ایک مفروضہ عقیدہ ہے نہ کوئی واقعی حقیقت:

INDEED A DOGMA IS ONLY A WORKABLE THOUGHT-ARRANGEMENT ON WHICH COULD BE BUILT A

UNITY OF PURPOSE AND PRACTICE AMONG THE BELEVERS OF A PARTICULAR RELIGION

HINDUSTAN TIMES, OCT, 1961

یعنی مذہبی عقیدہ صرف ایک قابلِ عمل تنظیمِ فکر ہے جس کی بنیاد پر ایک مخصوص مذہب کے ماننے والوں کے درمیان مقصد اور جدوجہد کا اشتراک قائم رکھا جا سکتا ہے۔

۵۔ اس جدید تصور کے پیدا ہونے میں کسی قدر دخل یہودیت کا بھی ہے جس کا تعلق حضرت موسیٰ کی تعلیمات سے نہیں ہے بلکہ وہ ان کے بگڑے ہوئے پیرووں کا اپنا عقیدہ ہے۔ ٹائن بی لکھتا ہے:۔

"درحقیقت یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ خدا جس کا ذہن اور جس کا ارادہ پوری کائنات کے نظام پر حکومت کرتا ہے، وہ اسی قسم کی وہمی حرکت کرے گا۔ یہ نہایت بعید از قیاس بات ہے کہ وہ تمام لوگوں میں سے "مجھ" کو اور میرے گروہ کو چن لے گا اور مجھ کو اپنا پیغمبر اور میرے قبیلہ کو اپنا محبوب گروہ (CHOOSEN PEOPLE) قرار دے گا۔ اس قسم کا کوئی بھی تصور حقیقت سے زیادہ ایک فریب ہے جو آدمی نے خود ہی اپنے ذہن میں پیدا کر لیا ہے۔"

AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION P. 135

جہاں تک "محبوب گروہ" کا تعلق ہے اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ کوئی گروہ محض ایک خاص نسل یا ایک خاص شخص سے منسوب ہونے کی وجہ سے محبوب ہے تو یہ ایک لغو تصور ہے اور غالباً یہود کے عقیدہ کی بنا پر یہی مورخ کے ذہن میں ہے۔ مگر یہ اصل مذہبی تصور کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا کے الہام کی جو لوگ پیروی کریں گے وہ خدا کی نظر میں محبوب لوگ قرار پائیں گے، اس سے قطع نظر کہ وہ نسلی اعتبار سے کس خاندان میں پیدا ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی اس تشریح کا مطلب 'مذہب کے نقطۂ نظر سے' اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مذہب کو مانتے ہوئے مذہب کا انکار کر دیا جائے۔ ایک ایسا مذہب جس پر عذاب و ثواب مترتب نہ ہوتا ہو، جو بس ایک قسم کی شخصی تھم ہو اور دوسرے انسانوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، جو کسی زندہ اور باشعور خدا کی طرف سے نہ ہو، بلکہ خود انسان کے اپنے ذہن اور نفسیات کا کرشمہ ہو، ایسا مذہب لا الٰہ الا الانسان کے کلمہ کے تحت بن سکتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کے کلمہ کے تحت نہیں بن سکتا۔ ایسے کسی فکر کو "مذہب" کہنا، اگر مصلحت اندیشی کی بنا پر ہے تو وہ سادہ لوحی ہے اور اگر علمی مغالطہ ہے تو فریب۔

ہندوستان کے موجودہ قانون ساز اداروں کی حیثیت

اور شرعی نقطۂ نظر سے ان کی شرکت

> ماہنامہ زندگی رام پور بابت ماہ نومبر ۶۶ء میں مذکورۂ بالا مسئلہ پر ایک علمی مراسلت شائع ہوئی ہے، جو ابھی ناتمام ہے۔ مسئلہ چونکہ عام دلچسپی کا اور شرعی لحاظ سے اہم ہے۔ اس لیے الفرقان میں بھی اس کو نقل کرنا طے کیا گیا ہے۔ اور پورا مسئلہ سامنے آجانے کے لیے زندگی ماہ ستمبر ۶۶ء کا وہ اداریہ بھی لے لیا گیا ہے جس پر یہ بحث پیدا ہوئی ہے۔
>
> ——— مرتب

توحید کا اثبات اور شرک کی نفی، دین اسلام کے تمام قطعیات و واضحات میں سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ واضح حقیقت ہے اور کتاب و سنت کے سیکڑوں نصوص میں یہ نفی و اثبات ملتا ہے۔ اس لیے توحید کا اثبات اور شرک کی نفی واضح ترین منصوصات میں داخل ہے۔ اب اگر کسی چیز کے بارے میں کوئی پڑھا لکھا شخص یہ کہے کہ "فلاں چیز شرک تو ہے لیکن غیر منصوص اور اجتہادی شرک ہے" تو یہ ایک ایسی بات ہوگی جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کہنے والے نے عالم استغراق میں کہہ دی ہوگی یا یہ کہ وہ منصوص و غیر منصوص اور اجتہادی و غیر اجتہادی مسائل و احکام کے درمیان فرق کرنے سے قاصر رہا ہوگا۔ سبھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اجتہاد کا تعلق ظنیات سے ہے، قطعیات سے نہیں۔ اسی طرح جو حکم منصوص ہو اُس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، اس کی ضرورت تو وہیں پیش آتی ہے جہاں نص موجود نہ ہو ——— ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اصلاً شرک کا تعلق انسان کے عقیدہ و خیال سے ہوتا ہے، اس کا حقیقی محل قلب و دماغ ہے۔ خارج میں شرک کے صرف مظاہر پائے جاتے ہیں کیونکہ شرک کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات، اس کی خصوصی صفات اور مخصوص حقوق میں کسی دوسرے کو اس کا شریک مان لیا جائے یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اگر کسی کو اللہ کی ذات، اس کی خصوصی صفات و حقوق میں شریک

مانتا ہے تو وہ مشرک ہوگا. چاہے اپنی زندگی میں اُس نے کبھی اس کے سامنے سجدہ نہ کیا ہو اور مراسم عبودیت میں کوئی رسم ادا نہ کی ہو اور وہ شخص یا گروہ مشرکوں کا امام تسلیم کیا جائے گا جو اپنے آپ کو مستحق عبادت سمجھے، خود کسی کی عبادت نہ کرے اور دوسروں سے اپنی عبادت کرائے، خود کسی کے سامنے نہ جھکے اور دوسروں کو اپنے سامنے جھکائے. اس سے بھی آگے کی صورت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالے، اپنے سوا کسی کو مستحق اطاعت نہ سمجھے اور نفسِ امّارہ کے احکام پر بے چون وچرا عمل کرتا ہے تو وہ مشرک ہوگا حالانکہ اپنے سامنے نہ کوئی رکوع کرتا ہے نہ سجدہ۔

غیر اللہ کے لیے رکوع اور سجدہ اور اس طرح کے دیگر مظاہرِ شرک کو شریعتِ اسلامیہ نے دو وجوہ سے شرک قرار دیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ عموماً عملی شرک کے پیچھے عقیدے کا شرک موجود ہوتا ہے اس طرح شرک کی جڑ اس سے پھوٹی ہوئی شاخیں، پتیاں، پھول اور پھل مل کر ایک پورا شجرِ خبیث تیار ہوجاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے موحد ومومن بندے، صورتاً اور عملاً بھی ان مظاہر کے قریب نہ پھٹکیں ورنہ اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ عملی شرک انھیں عقیدے کے شرک میں مبتلا کردے۔ شرک چونکہ ایک ایسا ظلمِ عظیم اور ایک ایسی معصیتِ کبریٰ ہے جسے اللہ کبھی معاف نہ کرے گا اس لیے شریعتِ اسلامیہ نے اس کے تمام رخنوں کو بند کردیا ہے۔

جس شرک کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے وہ کسی خاص بُت، کسی خاص شے، کسی خاص شخص یا اشخاص کے کسی خاص مجموعے کے ساتھ محدود ومخصوص نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ لات، ہبل، عزیٰ، ود، سواع، نسر اور اسی طرح کے چند خاص بتوں کو جن کا ذکر قرآن میں ہے، خدا کے مخصوص حقوق میں شریک ماننا تو منصوص شرک ہو اور دُنیا کے ان ہزاروں بتوں کو جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہو شریک ماننا غیر منصوص اور اجتہادی شرک بن جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ مشرکین عرب نے اپنے جن سرداروں کو حق تشریع دے دیا تھا یا یہودیوں نے اپنے جن احبار ورہبان کو قانونِ الٰہی کے علی الرغم قانون سازان لیا تھا اُن کا ارباب من دون اللہ ہونا تو منصوص ہو اور یہی حق آج انسانوں کے کسی گروہ کو دیدیا جائے تو اس کا ارباب من دون اللہ ہونا غیر منصوص اور اجتہادی بن جائے۔ پہلے تو یہ تھا کہ کسی ملک یا کسی قوم کا ایک خاندان یا چند افراد معبود ہوتے تھے اور پورا ملک اور پوری قوم ان کی عبادت گزار، اور آج اس دورِ ارتقاء میں شرک نے بھی مدارج ارتقا طے کرلیے ہیں اور جمہور کی خدائی کا دور آگیا ہے

اب ہر ملک کا ہر فرد ایک چھوٹا خدا بن گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے تو کیا اس ارتقائی شرک کو غیر منصوص اور اجتہادی سمجھنا صحیح ہوگا۔

جو حال شرک کا ہے وہی اعمالِ شرک اور مظاہرِ شرک کا بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن اور احادیث میں تمام مظاہرِ شرک کا ذکر عبارۃ النص میں موجود ہو، یہ عملاً ممکن نہ تھا بلکہ اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص سے جن سے مظاہرِ شرک کی حرمت ثابت ہو وہ سب منصوص ہیں۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ مظاہرِ شرک میں سب سے بڑا مظہر کسی غیر حق کے سامنے سجدہ کرنا ہے اسکی ممانعت کیلئے جو آیت آئی ہے وہ یہ ہے:-

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَ
الْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا
لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ
تَعْبُدُوْنَ ٥ (حٰم السجدہ۔ ر۵)

اور اس کی نشانیوں میں رات، دن، سورج اور چاند
ہیں، نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو اور اللہ کو
سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا اگر تم صرف
اس کی عبادت کرتے ہو۔

شاید پورے قرآن میں غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت صریح الفاظ میں اسی جگہ موجود ہو۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صرف سورج اور چاند کو سجدہ کرنے کی ممانعت منصوص ہے اور باقی اشیاء کو سجدہ کرنے کی ممانعت منصوص نہیں ہے۔ تو کیا اس کا یہ قول صحیح ہوگا؟ کھلی بات ہے کہ بالکل غلط ہوگا۔ دوسرے نصوص کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ صرف اس آیت کے لحاظ سے بھی اصولاً ہر غیر اللہ کے لیے سجدہ کی ممانعت منصوص ہے۔ شجر و حجر سے لے کر انبیاء و اولیاء تک کو سجدہ کرنے کی ممانعت کے لیے یہ آیت نصِ قطعی ہے:-

حاکمیت جمہور کے عقیدہ و نظریہ کی بنیاد پر دنیا میں جو اسمبلیاں اور پارلیمنٹیں کام کر رہی ہیں اُن کی حیثیت و نوعیت اسکے سوا اور کیا ہے کہ لوگوں نے اپنے اس عقیدے پر عمل کرنے کے لیے انتخابات کا ایک نظام وضع کر لیا ہے، چند عمارتیں بنا لی ہیں اور وہاں بیٹھ کر پورے ملک کے لیے وہ جو قانون چاہتے ہیں بناتے ہیں اور یہ پارلیمنٹیں اپنے بنائے ہوئے قوانین کے لیے خود آخری سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر یہ شرک کا منصوص مظہر نہیں ہیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ منصوص شرک اور اسکے مظاہر ہیں کیا؟ غیر تسلی بخش تاویلیں کر کے تو لات و منات اور فرعون و نمرود کے شرک کی بھی نفی کی جا سکتی ہے لیکن عقل و نقل نے کبھی ان تاویلوں کو قبول نہیں کیا ہے۔ لات و منات کی جگہ جو بُت بھی بنا لیے جائیں اور ان بتوں کے جو لوگ بھی پاسبان مقرر کیے جائیں نصِ قطعی ان کو

شرک ہی قرار دیتی ہو۔ آج لات و منات کی جگہ پر قوم و وطن کو رکھ دیا گیا ہو اور ان کے استھانوں کی نمائندگی اسمبلیاں اور پارلیمنٹیں کرتی ہیں تو کیا اس کی وجہ سے شرک کی حقیقت بدل جائے گی؟۔

حاکمیت الٰہ کے عقیدے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ حاکمیت جمہور[1] کا انکار کیا جائے۔ کفر بالطاغوت کے بغیر ایمان باللہ کا دعویٰ ایک بے معنی دعویٰ ہے۔

لَاۤ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ	دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں، بیشک ہدایت
الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّکْفُرْ	گمراہی سے جدا ہو چکی ہو۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار
بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ	کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے مضبوط حلقہ
فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی	تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ہو۔ اور اللہ سب
لَا انْفِصَامَ لَھَا ؕ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝	کچھ سنتا ہو، جانتا ہو۔ اللہ ایمان لانے والوں کا
اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ	مددگار ہو۔ انھیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَالَّذِیْنَ	نکال لاتا ہو۔ اور کافروں کے رفیق طاغوت ہیں

[1] حاکمیت جمہور کے نتائج ان ملکوں میں دیکھئے جہاں سے یہ گندہ چشمہ پھوٹا ہے۔ جرمنی میں دو مردوں کے درمیان جنسی تعلق کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرد دوسرے مرد سے شادی بھی کر سکتا تھا۔ "نازی دور سے پہلے جرمنی کے ایک صاحب ڈاکٹر ماگنوس ہرشفیلڈ تھے جو دنیا کی مجلس اصلاح صنفی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے عمل قوم لوط کے حق میں چھ سال تک زبردست پروپگنڈا کیا آخر کار جمہوریت کا آلہ اس حرام کو حلال کر دینے پر راضی ہو گیا اور جرمن پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے طے کر دیا کہ اب یہ فعل حرام نہیں ہے بشرطیکہ طرفین کی رضامندی سے اس کا ارتکاب کیا جائے اور معمول کے نابالغ ہونے کی صورت میں اس کا ولی ایجاب و قبول کی رسم ادا کرے۔"

اور اب سنہ ۶۶ء میں انگلینڈ کے ہاؤس آف لارڈس میں دو بالغ مردوں کے درمیان در پردہ جنسی تعلقات کو جائز قرار دے دیا ہے۔ اس ہاؤس کے ایک لاٹ صاحب نے اس کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں اپنے ملک کے دس لاکھ افراد کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ یہ اس ملک کا حال ہے جس کے بادشاہ حامیٔ دین مسیح کے لقب سے ملقب ہیں اور چرچ میں باقاعدہ ان کی حاضری ہوتی رہتی ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ انگلینڈ کے لاٹ پادری صاحب نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ جمہوریت کے ان بت اداروں کے ملعون ہونے میں کس مومن کو شک ہو سکتا ہے۔

كَفَرُوْا أَوْلِيَاءُهُمُ الطَّاغُوْتُ	جو انھیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف لے
يُخْرِجُوْنَهُمْ مِنَ النُّوْرِ إِلَى الظُّلُمَاتِ	جاتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی ہیں وہ اسی میں
أُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ	ہمیشہ رہیں گے۔

مشرکین مکہ اللہ کے وجود کے قائل تھے اور اس کی بہت سی صفات کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ مشرک تھے۔ اس کی وجہ یہی تو تھی کہ انھوں نے اللہ کی ذات اور اس کے صفات وحقوق میں دوسروں کو شریک قرار دے لیا تھا۔ ان کا دارالندوہ بھی قانون سازی میں بالکل آزاد تھا۔ قبائل کے سردار اور ان کے شیوخ ہر فیصلے کی آخری سند تھے وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ان کر اپنی پوری زندگی اللہ کو سپرد کرنے پر تیار نہ تھے۔ آزاد قانون سازی کے اعتبار سے مکہ کے دارالندوہ اور آج کی پارلیمنٹوں میں کوئی جوہری و بنیادی فرق نہیں ہے۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہی جرم مکے کے لوگ کریں تو مشرک ہیں اور وہی جرم آج دنیا کے اکثر ممالک کریں تو مشرک نہیں ہیں۔ اور اگر مسلمان کریں تو ان کی توحید پہ آنچ بھی نہ آئے مکے کی پارلیمنٹ (دارالندوہ) کا شرک ان کی سمجھ میں آتا ہے لیکن ہندوستان کی پارلیمنٹ کا شرک ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اپنے آپ کو فریب دینے سے کیا فائدہ؟ اس کا انجام بخیر نہیں ہوتا۔

موجودہ نظام حکومت کو صحیح سمجھتے ہوئے اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے الکشن میں حصہ لینے کو ناجائز کہنا جماعت اسلامی ہند کی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو عقل ونقل اور کتاب وسنت سے الگ ہو اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ہمارا مقصود کسی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ اپنا دین وایمان محفوظ رکھنے اور عذاب آخرت سے بچنے کے لیے ہم یہ بات کہتے اور اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ شرک کی معافی کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں نرم رویہ اختیار کرنے سے مسلمانوں کے وجود اور ان کے دنیوی مفادات کا تحفظ تو مشکوک وموہوم ہے لیکن اُخروی مفاد کی تباہی یقینی ہے۔ اللہ ہم سب کو آخرت کی تباہی سے بچائے۔ آمین!

شرک اور اہل شرک، ظلم اور اہل ظلم کی طرف میلان کو قرآن مجید نے اتنی سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ ان آیتوں کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں:۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ	پس تم اور تمھارے ساتھی جو (کفر وبغاوت)
مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	سے تائب ہو چکے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک راہ راست

بَصِيْرٌ ٥ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ
لَا تُنْصَرُوْنَ ٥

(ہود۔ آیت ۱۱۲-۱۱۳)

پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہو
اور (راہ) بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو بیشک
تمھارے عمل کو وہ دیکھ رہا ہے اور ظالموں کی
کی طرف نہ جھکو ورنہ آگ تمھیں پکڑ لے گی
اور اللہ کے سوا تمھارا کوئی مددگار نہیں پھر
تم کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

"راہ راست پہ جمے رہو" یہ امر ہے جس کی تعمیل ضروری ہے "حد سے آگے نہ بڑھو اور ظالموں کی طرف نہ جھکو" یہ دو چیزیں ہیں جن سے روکا گیا ہے، ان سے اجتناب واجب ہے۔ ظالموں کی طرف میلان کی جو سزا بیان کی گئی ہے وہ ہر مومن اور ہر داعی حق کو لرزا دینے والی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم ظالموں کی طرف مائل ہوئے تو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کے مستحق بن جاؤ گے اور دوسری طرف یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ کی نصرت وحمایت سے محروم ہو جاؤ گے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے:۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ
الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ
لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا
لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ٥ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ
لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا
قَلِيْلًا ٥ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ
الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا
تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ٥

(بنی اسرائیل - ۷۳ تا ۷۵)

وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تمھیں اس چیز
سے پھیر دیں جو وحی ہم نے تمھاری طرف کی ہو
تاکہ تم ہمارے نام پہ اسکے سوا کوئی جھوٹ گھڑ
لاؤ اور تب وہ تمھیں اپنا دوست بنا لیتے اور
اگر ہم تمھیں سنبھالے نہ رکھتے تو تم ان کی طرف
کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو
ہم تمھیں دنیا میں بھی دہرے عذاب کا مزہ چکھاتے
اور آخرت میں بھی دہرے عذاب کا۔ پھر ہمارے
مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔

مکے کے ان حالات کا تصور کیجئے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمان گھرے ہوئے تھے اور پھر ان آیات کو پڑھئے۔ غور کیجئے کہ یہ باتیں حضورؐ کو مخاطب کرکے کہی گئی ہیں۔ آپ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مشرکوں اور ظالموں کی طرف

آپ کا میلان کسی ذاتی مفاد کے لیے ہو سکتا تھا۔ اگر میلان ممکن تھا تو یقیناً اس دین ہی کے مفاد کی خاطر ممکن تھا جس کے آپ داعی تھے۔ اور یہ میلان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا کہ کفر و شرک کے مقابلے میں اپنا رویہ کچھ نرم کرلیا جائے۔ لیکن بے حد نازک اور اذیت رساں حالات کے باوجود جن شدید ترین الفاظ و اسلوب میں تنبیہ کی گئی ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔

اس سے اندازہ کیجئے کہ ظالمانہ و مشرکانہ اداروں کی برضا و رغبت رکنیت، اس کے لیے دوڑ دھوپ اور ان اداروں کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی خواہش و کوشش کس نوعیت کا جرم ہوگا اور اس کی سزا کیا ہوگی۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں عقیدۂ توحید اتنا ضعیف ہو چکا ہے کہ اب یہ باتیں ان کے لیے سراسر اجنبی بن کر رہ گئی ہیں۔

حق کی دعوت بلند ہو کر جب پھیلنے لگتی ہے اور باطل پرست قوتیں اسے روکنے کی تدابیر اختیار کرکے یہ دیکھ لیتی ہیں کہ اس کا روکنا آسان نہیں تو وہ اس دعوت میں بگاڑ پیدا کرنے اور داعیانِ حق سے مصالحت پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ یہی موقع ہوتا ہے جب داعیانِ حق کی طرف سے مداہنت کے ارتکاب کا اندیشہ ہو سکتا ہو اسلئے قرآنِ حکیم نے ان کو دین کے معاملے میں مداہنت و مصالحت سے بھی روک دیا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ○ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ○ (القلم۔ ۱۰)

پس تم تکذیب کرنے والوں کی اطاعت نہ کرو۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر تم ڈھیلے پڑو تو وہ بھی ڈھیلے ہو جائیں۔

مشرکینِ مکہ کش مکش سے بچنے کے لیے اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان کے شرک اور ان کے معبودوں کی تردید ترک کردیں تو وہ بھی اپنے شہر میں اسلام کے وجود کو گوارا کرلیں گے۔ "کچھ ہم بڑھیں کچھ تم بڑھو" کی فضا پیدا ہو جائے تو کش مکش ختم ہو سکتی ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک تیار ہو گئے تھے کہ اگر شرک کی مذمت اور تردید ترک کردی جائے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار تسلیم کرلیں گے۔ اگر حضورؐ اس کو منظور فرما لیتے تو اسی وقت مکے میں مسجدیں تعمیر ہو جاتیں۔ مسلمان وہاں جا کر خدا کی عبادت کر لیتے اور مشرک مندروں میں اپنے معبودوں کو پوج لیتے۔ پھر مشرک اور مومن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ "رواداری" کی ٹھنڈی فضا میں رہتے بستے۔ لیکن قرآن نے یہ راہ بند کردی تھی اس لیے حضورؐ نے ان کے مطالبہ کو بالکلیہ رد

فرمایا، مشرکین کی خواہشات کی پیروی سے اجتناب کا حکم ایک جگہ ان الفاظ میں دیا گیا ہے :۔

وَكَذٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ ۝

(الرعد : آیت ۔۳۷)

اور اسی طرح ہم نے عربی زبان میں یہ واضح فرمان نازل کیا اور اب اس کے بعد کہ تمھارے پاس علم آچکا ہے۔ اگر تم نے ان کی خواہشات و آرا کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ تمھارا کوئی حامی ہوگا اور نہ اس کی سزا سے بچانے والا۔

نزول قرآن کے وقت مشرکین مکہ کی رائے ان کی خواہش اور ان کا مطالبہ یہ تھا کہ شرک کی تردید اور نظام شرک کی مذمت ترک کردی جائے۔ اور آج کل کے برسر اقتدار لوگوں کی رائے ان کی خواہش اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ قومی دھارے میں غوطے لگاؤ۔ قومی ادغام اور انضمام کے مبلغ بنو۔ رہن سہن اور کلچر میں اپنے آپ کو ایسا بناؤ۔ تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری۔ مذہب کو سیاست سے بالکلیہ نکال باہر کرو حاکمیت جمہور کو برحق مانو اور سیکولرزم کو ہر مرض کی دوا جانو۔ تمھارے پاس جو قرآن و حدیث ہے اس کو ان باتوں کے تابع ہونا چاہیے۔ اور اگر ان کے احکام ان باتوں کے خلاف ہوں تو ان کی تاویلیں کرو، نئی تعبیریں پیش کرو اور انھیں وقت کے سانچے میں کسی نہ کسی طرح فٹ کردو۔ اب دُنیا میں تمھارے اسلام کا یہ ماڈرن ایڈیشن ہی چل سکتا ہے۔ قدیم اسلام کو تھامے رہوگے تو نقصان اٹھاؤگے۔ ہم یہ مطالبہ تمھارے فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ اگر نہیں مانتے تو تم جانو اور تمھارا کام۔

ان خواہشوں، رایوں اور مطالبوں کے پتھر ہر طرف سے اس طرح برس رہے ہیں کہ عام مسلمان تو الگ رہے۔ ان کے خواص اور علما بھی بدحواس ہو رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کھائیں کدھر کی چوٹ۔ بچائیں کدھر کی چوٹ۔

ان حالات میں ہمیں مداہنت فی الدین سے یہ یقین ہی بچا سکتا ہے کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہماری آخرت برباد ہو جائے گی اور آخرت کی ابدی بربادی پر دُنیا کی عارضی آبادی کو ترجیح دینا بدترین قسم کی حماقت ہے۔

(ماہنامۂ زندگی ماہ ستمبر ۶۶ء)

اشکال

(جو زندگی کے اشارات پر ایک مکتوب نگار نے پیش کیا)

زندگی کا تازہ شمارہ (ستمبر ۱۹۶۶ء) ابھی چند دن پیشتر ملا ہے۔ اس کے "اشارات" پر ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے اگر آئندہ اشاعت میں آپ اس پر گفتگو فرمائیں تو اچھا ہو۔

ان اشارات میں آپ نے جماعت اسلامی ہند کے اس موقف کو مدلل کیا ہے کہ "ہندوستان کے "موجودہ نظام حکومت کو صحیح سمجھتے ہوئے اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے الکشن میں حصہ لینا ناجائز ہو لیکن آپ کے استدلال سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ نظام کو غیر صحیح سمجھتے ہوئے بھی اس کی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں حصہ لینا جائز نہ ہوگا جب کہ جماعت اسلامی کے مذکورۂ بالا موقف سے صرف اقتضاءً بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ غیر صحیح سمجھتے ہوئے حصہ لینا جائز ہوگا بلکہ مجلس شوریٰ کی تازہ قرارداد میں جہاں یہ موقف ظاہر کیا گیا ہے وہاں صراحتہً یہ بھی کہا گیا ہے کہ

" موجودہ نظام حکومت کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے اس کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لئے الکشن میں حصہ لینا جائز ہے۔

(۲) موجودہ نظام حکومت کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے لئے الکشن میں حصہ لینا جائز ہے۔

جماعتی مجلس شوریٰ کی قرارداد کے یہ الفاظ زندگی کے اسی شمارے میں "روداد اجلاس شوریٰ" کے زیر عنوان صفحہ ۵۰، ۵۸ پر درج ہیں۔ اب میرا اشکال یہ ہے کہ آپ نے جماعت کے موقف کے مثبت حصے کا ثبوت جب اس استدلال سے بہم پہنچایا ہے کہ یہ جمہوری اسمبلیاں اور پارلیمنٹیں ٹھیک وہی حکم رکھتی ہیں جو لات و منات کے استھانوں کا تھا تو ان کو "غیر صحیح" خلاف حق اور خلاف اسلام" سمجھتے ہوئے بھی ان میں شرکت کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے؟ اور جمہوریت کے "مشرکانہ نظام" کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے" نہ سہی محض "اسلام اور مسلمانوں کے کسی اہم مفاد کے لئے بھی اس نظام کے تحت الکشن میں حصہ لینے اور پارلیمنٹ یا اسمبلی میں سیٹ حاصل کرنے کی اجازت ایک مومن کو کیوں کر مل سکتی ہے جب کہ یہ کام شرک کے ویسے ہی مظاہر مانے جائیں جیسے

کہ چاند اور سورج کو سجدہ کرنا۔

غالباً یہ بات آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ارکان کو دستور سے وفاداری کا حلف بھی اٹھانا پڑتا ہے اور یہ وہی دستور ہے جو جمہوریت پر مبنی ہے۔ پس ان اداروں کی رکنیت حاصل کرنا گویا ہی شرک کا مظہر نہ ہوگا بلکہ حقیقۃً اس شرک کا مظاہرہ کرنا بھی پڑے گا۔

میرا اصولی اور بنیادی سوال تو بس یہی ہے اور اسی کی طرف آپ کو توجہ دلانا مقصود ہو لیکن ضمناً اس سوال پر بھی توجہ فرمانے کی ضرورت ہے کہ کیا اسلام کا کوئی مفاد ایسا ہو سکتا ہو؟ بایں معنی کہ وہ معتبر ہو اور اسلام نے کسی درجے میں بھی ہم کو اس کے حصول کے لیے مکلف کیا ہو؟ جو عقیدۃً یا عملاً شرک کا ارتکاب کر کے حاصل کیا جا سکتا ہو؟ اور یہی سوال مسلمانوں کے کسی مفاد کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔

غالباً اسلام کے سب سے برتر مفاد کی حیثیت سے مجلس شوریٰ نے "اسلامی نظام کے قیام" کو الکشن میں حصہ لینے کی اجازت کا ایک منفرد سبب قرار دیا ہے۔ لہذا میں خصوصیت سے اس کے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام اس کی اجازت دے گا کہ اس کا حکم قائم کرنے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کیا جائے جس میں صریح شرک کا ارتکاب کرنا پڑے! شوریٰ کی قرارداد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بالفرض اگر اس آنے والے الکشن ہی تک "مطلوبہ رائے عامہ ہموار" ہو جائے تو جماعت اسلامی کو الکشن میں حصہ لینے سے کوئی اور چیز مانع نہ ہوگی۔ بایں صورت آپ کے اشارات کی روشنی میں جماعت کے ایسے اقدام کا کیا حکم ہوگا؟

آپ نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲، تا ۵، پیش کر کے فرمایا ہے:۔

"کمے کے ابتدائی حالات کا تصوّر کیجیے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمان گھرے ہوئے تھے اور پھر ان آیات کو پڑھیے۔ غور کیجیے کہ یہ باتیں حضور کو مخاطب کر کے کہی گئی ہیں۔ آپ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مشرکوں اور ظالموں کی طرف آپ کا میلان کسی ذاتی مفاد کے لیے ہو سکتا تھا۔ اگر میلان ممکن تھا تو یقیناً اس دین ہی کے مفاد کی خاطر ممکن تھا جس کے آپ داعی تھے اور یہ میلان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا کہ کفر و شرک کے مقابلے میں اپنا رویہ کچھ نرم کر لیا جائے لیکن بے حد نازک اور اذیت رساں حالات کے باوجود جن شدید ترین الفاظ اور اسلوب میں

تبنیہ کی گئی وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ ظالمانہ اور مشرکانہ اداروں کی برضا و رغبت رکنیت اس کے لیے دوڑ دھوپ اور ان اداروں کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی خواہش کس نوعیت کا جرم ہوگا اور اس کی سزا کیا ہوگی؟"

اس کے بعد سورۂ القلم کی آیت ۸ تا ۹ پیش کر کے لکھا ہے:۔

"مشرکین کشمکش سے بچنے کے لیے اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان کے شرک اور ان کے معبودوں کی تردید ترک کر دیں تو وہ بھی اپنے شہر میں اسلام کے وجود کو گوارا کر لیں گے..... بلکہ وہ تو یہاں تک تیار ہو گئے تھے کہ اگر شرک کی مذمت اور تردید ترک کر دی جائے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار تسلیم کر لیں گے۔"

میں دریافت کرنا چاہوں گا کہ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابی و امی فداہ) کو شرک کی صرف تردید ترک کر کے مکے کی سرداری حاصل کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی تو آپ کے بعد کسی اور کو نظام اسلامی قائم کرنے کے نام پر صریح شرک کر گزرنے کی اجازت کہاں سے مل سکتی ہے؟ اور پیغمبر خدا سے بڑھ کر وہ کون اسلام اور مسلمانوں کا مفاد شناس ہے جس کو ان ناموں پر مشرکانہ اعمال تک کی اجازت مل جائے جبکہ آپؐ کو ان اعمال کے مقابلے میں نرمی برتنے کی اجازت بھی نہیں مل سکی۔

"میرا مقصد جماعت اسلامی کے موقف پر تنقید کرنا ہے اور نہ آپ کے استدلال پر، میں صرف اپنا اشکال پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے استدلالی مقدمات صحیح ہیں تو ان سے جماعت کے موقف کی تائید غلط اور اگر جماعت کا موقف صحیح ہے تو یہ مقدمات غلط۔" (زندگی ماہ نومبر ۱۹۶۶ء)

جواب

(مدیر "زندگی" کی وضاحت)

ستمبر ۶۶ء کے اشارات میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اشکال پیش آنے کا سبب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ میری بات پوری طرح واضح نہ ہو سکی ہو اس لیے پہلے دوسرے الفاظ میں اپنے اشارات کا مختصر تجزیہ پیش کرتا ہوں:۔

(۱) شرک یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک قرار دینا حقیقۃً انسان کے عقیدے سے تعلق رکھتا ہے جس کا محل قلب ہے۔ یہی شرک ناقابل معافی ہے اور اسی کو قرآن نے اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ کہا ہے۔

(۲) کسی کو سجدہ کرنا یا دوسرے مراسم عبودیت ادا کرنا شرک کا مظہر ہے۔ مظاہر شرک سے بھی شریعت اسلامیہ نے دو وجوہ سے روک دیا ہے ایک یہ کہ عموماً مظاہر شرک کے پیچھے عقیدے کا شرک بھی موجود ہوتا ہے دوسری وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اب قیامت تک اس کے مومن و موحد بندے عمل شرک کے قریب بھی نہ پھٹکیں ــــ اگر کوئی شخص کسی کو مشرکانہ عقیدے کے ساتھ سجدہ کرے تو وہ عقیدہ و عمل دونوں لحاظ سے شرک کا مرتکب ہوگا جس کو معاف نہ کرنے کا اللہ نے اعلان کر دیا ہے۔ اور اگر کوئی شخص عقیدے کے شرک میں مبتلا نہیں ہے لیکن مثال کے طور پر کسی کی تعظیم و احترام کا اظہار کرنے کے لیے یا کسی کی محبت کی سرمستی میں یا بے جا خوشامد میں مشرکانہ عقیدے کے بغیر سجدہ کر دے تو یہ فعل ایک بڑا گناہ ضرور ہوگا جس سے اس کو توبہ کرنی چاہیے لیکن اس کے اس فعل پر ناقابل معافی شرک کا اطلاق صحیح نہ ہوگا۔ یعنی اس کو دائرہ اسلام سے خارج کر کے "مشرک" قرار نہیں دیا جائے گا۔

(۳) میں نے اشارات میں جس چیز کو منصوص اور صریح شرک کہا ہے وہ جمہوریت نہیں بلکہ حاکمیت جمہور کا عقیدہ ہے۔ موجودہ پارلیمنٹیں چونکہ اس تصور حیات کو بروئے کار لانے کے مقامات ہیں اس لیے یہ شرک کے مظاہر بن گئی ہیں۔ مندروں کے مظہر شرک بننے اور ان مقامات کے مظہر شرک بننے میں عمل شرک کی نوعیت کا فرق ہے۔ مندروں میں بتوں کو سجدے کیے جاتے اور ان کے سامنے دوسرے مراسم عبودیت ادا کیے جاتے ہیں اور پارلیمنٹ کی عمارتوں میں اللہ تعالیٰ کی ہدایات سے بے پرواہ ہو کر یا ان کے علی الرغم قانون سازی کی جاتی اور تحلیل و تحریم کے فیصلے کیے جاتے ہیں ــــ یہ بات واضح ہے کہ ان عمارتوں کی دیواروں میں شرک گھسا ہوا نہیں ہے بلکہ خدا کی ہدایات سے بے پرواہ ہو کر اور انھیں نظر انداز کر کے قانون سازی کا عمل مظہر شرک ہے جس طرح مندروں میں بتوں کو سجدہ کرنا مظہر شرک ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی نیت سے بھی اس میں داخل ہو تو اس کے داخل ہوتے ہی شرک کا ارتکاب ہو جائے۔ اب اگر کوئی شخص اس طرح کی قانون سازی کو عقیدۃً بھی صحیح اور جائز سمجھتا ہے تو وہ عقیدہ و عمل دونوں ہی لحاظ سے شرک کا مرتکب ہوگا ورنہ صرف عملی شرک کا مرتکب قرار دیا جائے گا ــــ دین اسلام میں اللہ تعالیٰ ہی حاکم علی الاطلاق ہے۔ اسکے انسانی

زندگی کے لیے قانون دینے اور اشیاء کی تحریم و تحلیل کا حق ہے۔ اس حق میں کوئی اس کا شریک نہیں اس لیے حاکمیت جمہور کا عقیدہ حاکمیت الٰہ کے عقیدے کی ضد ہے۔

(۴) الکشن فی نفسہٖ کوئی ناجائز کام نہیں ہے۔ اسمیں عدم جواز اس نیت اور مقصد کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے جس کے لیے اس کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔ میں نے اشارات میں کہیں بھی غیر اسلامی نظام کے تحت نفس الکشن کو شرک یا مظہر شرک قرار نہیں دیا ہے۔

(۵) ہم چونکہ حاکمیت الٰہ کا عقیدہ رکھتے اور حاکمیت جمہور کو باطل سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہمارا موقف یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کے تصور پر مبنی غیر اسلامی نظام کو صحیح اور برحق سمجھتے ہوئے اس کو چلانے کی نیت سے الکشن میں حصہ لینا ناجائز ہے۔

(۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کی تردید ترک کرنے کا مطالبہ اس لیے رد فرما دیا تھا کہ یہ شرک سے مصالحت کا کام ہوتا جبکہ آپ شرک کی تردید اور توحید کے اثبات کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ آج بھی اگر یہ شرط لگا دی جائے کہ کوئی مسلمان اس وقت تک الکشن میں حصہ نہیں لے سکتا اور نہ اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کا ممبر بن سکتا ہے۔ جب تک وہ یہ عہد نہ کرے کہ وہ شرک کی تردید ترک کر دے گا تو اس الکشن میں حصہ لینا اور ممبر بننا ناجائز ہوگا۔

ان نکات کو سامنے رکھنے کے بعد وہ اشکال پیدا نہیں ہوتا جسے آں جناب نے پیش کیا ہے۔ جو شخص اعلان کرتا ہے کہ موجودہ نظام حکومت اور موجودہ دستور صحیح نہیں ہے میں اس کو بدلنے کے لیے الکشن میں حصہ لے رہا ہوں پھر وہ اسی کی مہم چلاتا اور ووٹروں کی رائے ہموار کرتا ہے اور اسی منشور پر الکشن لڑتا ہے تو اس شخص کے بارے میں عقیدے کے شرک کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا عملاً بھی ایسے الکشن میں حصہ لینے کو شرک کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ کسی بھی نظام کے تحت کوئی الکشن فی نفسہٖ ناجائز نہیں ہوتا بلکہ کسی ناجائز مقصد کے حصول کا ذریعہ بنکر ناجائز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ پارلیمنٹ کا عملی شرک قانون الٰہی کے علی الرغم قانون سازی اور تحلیل و تحریم کے فیصلے کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص اس عملی شرک کو بھی ختم کرنے یا اس کی تردید کرنے کے لیے پارلیمنٹ کا ممبر بنتا ہے تو اس شخص کو عملی شرک کا مرتکب کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

میں نے اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کو مندروں اور آستھانوں سے جو تشبیہ دی ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ مندروں میں خدا کے حق پرستش میں دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے اور پارلیمنٹوں میں خدا کے حق

تشریع میں دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے۔ مندروں کا مظہر شرک ہونا تمام مسلمانوں کو معلوم ہے لیکن پارلیمنٹوں کا مظہر شرک ہونا ان میں سے بہتوں کو معلوم نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مندروں اور پارلیمنٹوں میں آدمی جس نیت اور جس قصد سے بھی جائے وہ شرک کا مرتکب ہو جائے گا۔

فرض کیجئے، کسی مندر میں ٹکٹ خرید کر داخلے کی اجازت ملتی ہے۔ تین شخصوں نے ٹکٹ خریدے ایک کی نیت یہ ہے کہ وہ اس میں داخل ہو کر بت کو سجدہ کرے گا۔ ایک کی نیت یہ ہے کہ وہ مندر کی سیر کرے گا۔ ایک کی نیت یہ ہے کہ وہاں پہونچ کر تبلیغ کرے گا کہ اے لوگو! سجدہ کرنے کے لائق صرف خدا ہے، بتوں کو سجدہ کر کے شرک نہ کرو۔ کیا تینوں کا حکم ایک ہوگا؟ اور اگر تیسرا شخص ٹکٹ خریدنے کے وقت ہی اعلان کردے کہ میں ٹکٹ اس غرض سے خرید رہا ہوں کہ مندر میں جا کر توحید کی تبلیغ کروں گا تو اس تیسرے شخص کو آخر کس بنیاد پر شرک کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔

باقی رہی دستور کی وفاداری کا حلف لینے کی بات تو سب جانتے ہیں کہ اس کی حیثیت محض رسمی ہے اور بعض صورتوں میں محض حماقت ہے۔ آپ خود غور کریں کہ ایک شخص دستور کو غلط کہتا اور اس کو بدلنے کے لیے علی الاعلان الکشن لڑتا ہے اور جب کامیاب ہو جاتا ہے تو اس سے دستور کی وفاداری کا حلف لیا جاتا ہے۔

آج بھی کمیونسٹوں اور ڈی۔ ایم۔ کے۔ کے ممبروں سے جو حلف لیا جاتا ہے اس کی حیثیت ایک لغو حرکت کے سوا اور کیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ حلف دلوانے والا بھی جانتا ہے کہ یہ ممبر جو حلف لے رہے ہیں وہ ایک بے معنی رسم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے ایسے ممبروں کے حلف کو۔ جو دستور کو ختم کرنے کی نیت اور اعلان کے ساتھ پارلیمنٹ میں گئے ہوں۔ حکماً عمل شرک کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ حقیقتہً شرک کا تو اس میں شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ بلاشبہہ ایک لغو حرکت کا ارتکاب کرنا پڑے گا لیکن آئینی طور پر نظام باطل کو ختم کرنے کے لیے اس کی گنجائش موجود ہے۔

یہی معاملہ کچھ نیچے درجے میں ان افراد کا بھی ہے جو موجودہ نظام حکومت کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے کوئی اہم اسلامی مفاد حاصل کرنے کے لیے الکشن میں حصہ لیتے

ہیں ان پر بھی شرک کے ارتکاب کا جرم عائد نہیں ہوتا۔ شرک کے مرتکب وہ لوگ قرار دیئے جائیں گے جو حاکمیت جمہور کے عقیدے پر مبنی غیر اسلامی نظام کو صحیح اور برحق مانیں اور اس کو چلانے کے ارادے سے الکشن میں حصہ لیں اور ممبر بنیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ میں نے اشارات میں جو کچھ لکھا ہے اور جماعت اسلامی نے الکشن کے سلسلے میں جو موقف اختیار کیا ہے ان دونوں میں تضاد نہیں ہے۔

اخیر میں ضمنی طور پر ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ جماعت اسلامی سے باہر کے علماء بھی نظام حکومت کو برحق مانتے ہوئے اس کے الکشن میں حصہ لینے کو جائز نہیں کہتے اور اسلامی مفاد کے حصول کے لیے۔ موجودہ نظام کو برحق سمجھے بغیر ۔۔۔ جائز کہتے ہیں آخر ان کے نزدیک ان دونوں میں تطبیق کیا ہے؟ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی عالم دین کو بھی حاکمیت الٰہ کے حق ہونے اور حاکمیت جمہور کے باطل ہونے میں شبہہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود ایک صورت کے ناجائز اور دوسری صورت کے جائز ہونے کی تاویل ان کے نزدیک کیا ہے؟

اگر علماء کے ان دو اقوال میں اشکال پیش نہیں آتا تو جماعت اسلامی کے ان دو اقوال میں کیوں اشکال پیش آرہا ہے؟ امید ہے کہ میری توضیح سے اشکال رفع ہو جائے گا۔

(زندگی ماہ نومبر ۶۶ء)

اس بحث کا باقی حصہ آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے۔ (باقی)

دربارِ عالمگیری

(۱۵)

(جناب مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی، ایم اے، پی ایچ ڈی)

صحابہ کا اسی پر عمل درآمد رہا کہ علمارِ صحابہ ایسے موقع پر جمع کرلیے جاتے اور ان سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا جاتا۔ اس طرح گویا "اجماع" بھی اُصولِ شریعت میں سے ایک اصل سمجھی جانے لگی۔ اسی کے لگ بھگ تشریع (قانون سازی) کے سلسلہ میں "تعامل اہل مدینہ" کو بھی حجت بننے میں دخل رہا اور مسائل کو حل کرنے میں اس سے بھی استدلال کیا گیا۔ اس لیے کہ صحابہ (اہل مدینہ) مقتضیاتِ احوال، ناسخ ومنسوخ اور شئونِ حالیہ سے زیادہ واقف تھے۔

اس امر کا اظہار اس محل پر بے موقع نہیں کہ نصوصِ قرآنیہ اور حدیثیہ کے برقرار رہتے ہوئے بعض ان احکام میں جو ان نصوص سے استخراج کیے گئے ہوں، مجتہدینِ اُمّت کے لیے یہ گنجائش تسلیم کی گئی ہو کہ وہ زمانہ کے اقتضا کے مطابق ان میں تغیر کردیں۔ اور تغیرِ احوال کے مطابق فتویٰ بدل دیں۔ چنانچہ حافظ ابن قیم نے اپنی مشہور کتاب "اعلام الموقعین" میں

فصل فی تغیر الفتویٰ واختلافہا	تغیرِ زمانہ اور اختلافِ مکانی کے مطابق فتوے
بحسب تغیر الازمنۃ والامکنۃ[1]	کے بدل جانے اور مختلف ہونے کا باب (ملخصاً)

کے تحت اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ باغ کے درختوں میں ابھی پھل نمودار نہیں ہوئے ان کی بیع نفعاً

---

[1] اعلام الموقعین جزء ثالث صفحہ ا وما بعد۔

جائز نہیں کیونکہ یہ ایک نامعلوم اور مجہول چیز کی بیع ہے، لیکن بعض بلاد و امصار کے علماء اور اہل فتویٰ نے اگر کچھ پھل نکلے ہوں اور کچھ نہ نکلے ہوں اس قسم کی بیع کو جائز رکھا ہے اور شمس الائمہ حلوانی نے اس قسم کی معاملت کو ناجائز نہیں قرار دیا، چنانچہ ڈاکٹر احمد امین نے اپنی کتاب ضحی الاسلام[۱] میں لکھا ہے:۔

ومن امثلۃ ذلک ایضاً اجازۃ	اس کی مثالوں میں سے ایک مثال بعض علما
بعضہم بیع ثمار البستان اذا	کا باغوں کے پھلوں کی بیع جائز رکھنا ہے جب کہ
کان بعضہا قد خرج وبعضہا لم	کچھ نکلے ہوں اور کچھ نہ نکلے ہوں اس لیے کہ
یخرج لان العرف جری بذالک۔	مقامی عرف یہی تھا۔

پھر لکھتے ہیں:۔

وقال شمس الائمۃ استحسن ذلک	شمس الائمہ نے فرمایا میں اس کو بُرا نہیں
لتعامل الناس فانہم تعاملوا ببیع	سمجھتا اس لیے کہ وہاں کے لوگوں کا اس پر عمل
ثمار الکرم بہذہ الصفۃ ولہم فی	درآمد تھا اس لیے وہ لوگ انگور کی بیع اس شکل
ذلک عادۃ ظاہرۃ وفی نزع الناس	میں کرتے چلے آئے تھے اور لوگوں کو ان کی
من عاداتہم حرج[۲]۔	روش سے ہٹانے میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اس مسئلہ میں کہ کسی چیز کے بیع کرنے میں کون کون اور دوسری چیزیں خصوصاً بیع مکان کے معاملہ میں داخل ہوتی ہیں اور کون کون چیزیں داخل نہیں ہوتیں، مصر کے علماء نے فتویٰ دیا تھا کہ اگر کوئی اپنا گھر کسی کے ہاتھ فروخت کرے تو چونکہ قاہرہ میں مکانات علی العموم کئی طبقات کے ہوتے ہیں اس لیے چڑھنے اُترنے کے لیے اگر وہاں کوئی علیحدہ سے سیڑھی موجود ہے تو بیع مکان میں اس کو بھی شامل سمجھا جائے گا خواہ بیع کرتے وقت اس کا ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ لیکن جہاں مکانات میں بالاخانے وغیرہ نہیں ہوتے وہاں اگر گھر میں بانس، لکڑی یا لوہے کی سیڑھی ہے تو وہ گھر کی بیع میں شامل نہ ہوگی اور مشتری بلا ذکر اور شرط اس کا حق دار نہ ہوگا[۳]۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ علماء اور مفتیوں کے اس طرح کے فتوے دینے میں نص قرآن

---

[۱] ضحی الاسلام جزء ثالث ص ۲۳۹۔ [۲] رسائل شمس الائمہ جلد دوم ص ۱۲۰۔ [۳] ضحی الاسلام جزء ثالث ص ۲۳۹۔

اور نص حدیث دونوں کا نسخ مجتہدین کی رائے سے لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہدین نے نصوص کو اپنی جگہ برقرار رکھا ہے اس لیے کہ ان کا نسخ ان کے دائرۂ اختیار سے خارج تھا، لیکن اس نص سے جو حکم مستنبط ہوتا تھا اس کو مصالح پر نظر کر کے بدل دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصارف صدقات سے مؤلفۃ القلوب کے مصرف کو اپنے دورِ خلافت میں موقوف کر دیا۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اس مصرف کا نفاذ اس وقت کے مناسب تھا جب اسلام ابتدائی مرحلہ میں اضمحلال اور ضعف کے ساتھ ترقی پذیر تھا اور اس وقت کا اقتضا تھا کہ مظنون شر و فتنہ سے بچے رہنے کی تدابیر کی جائیں اور جب اسلام کو شوکت اور دبدبہ حاصل ہو گیا اس وقت اس کی احتیاج نہ رہی۔ ظاہر ہے کہ اس شکل میں نص قرآنی کی منسوخیت اختیار سے باہر تھی لیکن زمانہ کے بدلنے کے ساتھ حکم میں تبدیلی کر دی گئی، اس کو نص کا نسخ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ خاص حالات میں نص کے نفاذ اور عدم نفاذ کے بارہ میں حضرت فاروق اعظم کا یہ ایک فیصلہ تھا۔

اسی طرح سارق کی سزا قطع ید ایک نص قرآنی ہے لیکن اگر دور وہ آجائے کہ لوگ قحط اور غلہ کی نایابی کی وجہ سے بھوک سے مرنے لگیں تو سرقہ کے ارتکاب کی صورت میں بجائے ہاتھ کاٹ ڈالنے کے تعزیزاً اس کو دوسری سزاؤں کے دینے پر اکتفا کیا۔

معتبرا ان السرقۃ ربما کان	ان کے پیش نظر یہ بات رہی کہ ایسے حالات
یندفع الیہا السارقون	میں بسا اوقات چرانے والے بھوک کی مجبوری
حینئذ بدافع الضرورۃ	سے اور مضطر ہو کر چراتے ہیں ان میں ارتکاب
لا بدافع الاجرام وفی ذلک	جرم کا داعیہ نہیں ہوتا، کم از کم ان کا جرم کی
شبہۃ فی الجرم علی الاقل	نیت سے کرنا مشتبہ تو ہو ہی جاتا ہے اور قاعدہ
والحدود تندرئ بالشبہات[1]	ہے کہ حدود میں مجرم کو شبہ کا فائدہ دے کر حدود ساقط کر دی جاتی ہیں۔

اسی طرح حالات زمانہ کے بدلنے سے احکام کے بدل جانے کی ایک اور واضح مثال اور نظیر حضرت عمر

---

[1] المحوق بالمدنیۃ استاذ زرقا جزء اول صہ بحوالہ المدخل۔

رضی اللہ عنہ کا عراق، مصر اور شام کی زمینوں کا مجاہدین پر تقسیم نہ کرنے کا فیصلہ ہے، جب کہ نص قرآنی اور حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بظاہر اس کے خلاف تھا۔ نص قرآنی کا مفاد یہ ہے کہ ملک فتح کرنے کے بعد مال غنیمت اور زمین کا ۱/۵ حصہ بیت المال میں جمع کیا جائے اور بقیہ کو فاتحین پر تقسیم کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی یہی رہا۔ جب خیبر کی سرزمین فتح ہوئی تو ۱/۵ بیت المال کے لیے نکالنے کے بعد آپ نے بقیہ کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا اور یہ ارشاد خداوندی

واعلموا ان ما غنمتم من شیئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل۔

کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ مجاہدین ان ممالک کے فتح ہونے پر اسی توقع کو لے کر حضرت عمر کے پاس حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنی عرضداشت پیش کی۔ حضرت عمر نے جو جواب دیا وہ یہ ہے۔

"دیکھو جب بعد کو مسلمان اس سرزمین پر قدم رکھیں گے تو انھیں یہ منظر نظر آئے گا کہ وہاں کی کل زمین کے حصے بخرے کیے جا چکے اور لوگ وراثۃً اس کے مالک بنے بیٹھے ہیں اور آرام کر رہے ہیں، میں اس کو روا نہیں رکھ سکتا، اس پر عبدالرحمن بن عوف نے بڑھ کر پوچھا کہ پھر آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا یہ زمین وغیرہ مجاہدین کے لیے عطاء خداوندی نہیں ہیں، حضرت عمر نے فرمایا کہ بات وہی ہے جو تم کہتے ہو لیکن اس معاملے میں میری رائے یہ نہیں ہوئی اس لیے کہ آئندہ فتوحات ملکی میں مسلمانوں کو کوئی بڑا مادی نفع نہیں ہوگا بلکہ کسی سرزمین کا رکھ رکھاؤ ہی ان کے لیے ایک وبال جان بن جائے گا۔ جب زمین اور کاشتکاروں کی یوں تقسیم کر دی گئی تو حکومت اسلامیہ کے لیے ذریعہ آمدنی کیا ہوگا جس سے آئندہ سرحدوں کی حفاظت دشمنوں کی مدافعت، بیواؤں اور یتیموں کی دیکھ بھال ہو سکے۔"

بہر کیف حضرت عمر سے بہت کچھ لوگوں نے اصرار کیا اور یہ کہنے لگے کہ ہماری تلواروں کی بدولت ہمیں جو کچھ مل رہا ہے اس سے آپ ہمیں محروم کر دینا چاہتے ہیں اور ہم کو چھوڑ کے آپ کے ملحوظ خاطر وہ لوگ ہیں جنھوں نے نبرد آزمائی کے موقع پر نہ تلوار ہاتھ میں لی اور نہ میدان جنگ میں حاضر ہوئے۔ آپ کے پیش نظر آئندہ آنے والی نسلیں ہیں، ہمارا حق آپ نے پس پشت ڈال دیا۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا بہر حال یہ میری رائے ہے۔ لوگوں نے کہا یہ آپ کی رائے ہے تو آپ اس معاملہ میں اور بزرگوں اور لوگوں سے

بھی مشورہ کرلیں۔ چنانچہ آپ نے مہاجرین اولین کو بلایا اور ان سے مشورہ کیا۔ اس میں بھی اختلاف آرا ہوا۔ عبدالرحمٰن بن عوف کی وہی سابق رائے تھی لیکن حضرت عثمان، طلحہ اور ابن عمر نے حضرت عمر کی رائے کی تائید کی۔ پھر آپ نے دس سربر آوردہ انصار کو بلا کے ایک میٹنگ کی جس میں آپ نے سب سے پہلے یوں تخاطب کیا۔

"میں نے جو آپ کو زحمت دی اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ لوگ بار امانت میں اور ان معاملات میں جو آپ نے مجھے تفویض کر دیئے ہیں میرے شریک ہوں، میں بھی آپ کا ہی ایک فرد ہوں بخالفین اور موافقین ہو چکیں۔ اب آپ حق شناسی سے کام لیں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ خواہ مخواہ میرا ساتھ ہی دیں۔ کتاب اللہ آپ کے پاس ہے وہ خود حق کا اظہار کر دے گی۔ بخدا میں نے اگر اپنا مطمح نظر ظاہر کیا تو وہ بھی اسی سے اخذ کر کے۔"

اس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا آپ کچھ فرماتے کہ ہم بھی سن لیتے، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ

"تم نے ان لوگوں کی باتیں سن لیں جو یہ کہہ بیٹھے ہیں کہ اس معاملے میں میں ان پر ظلم کر رہا ہوں اور ان کی حق تلفی کے درپے ہوں۔ العیاذ باللہ میں اور ظلم! میری بدبختی ہوگی اگر میں ان کا حق مار کے دوسروں کو دے دوں، میرے ذہن میں تو یہ بات آئی کہ ملک فارس (کسریٰ) کے فتح کے بعد اتنی بڑی سرزمین اور کون فتح کرنے کو باقی ہے، اللہ تعالیٰ نے بطور غنیمت ان کے اموال اور زمینوں وغیرہ پر ہم کو تسلط دیا تو اموالِ منقولہ تو میں نے ان پر ہی تقسیم کر دیئے، خمس کو خمس کے مقصد و مصرف میں لے لیا، اب رہ گئی یہاں کی زمین اور کاشتکار، اس کو اپنے قبضہ میں رکھ کے میں نے یہ ترکیب کی کہ یہ انھیں کے سپرد کر دی جائے اور اس کے بدلہ میں ان سے خراج اور جزیہ لیا جایا کرے جو مجاہدین اور ان کی اولاد در اولاد کے کام آتی رہے۔" بہرحال ان محاذوں کا مستقل فوجوں کے قیام کے ذریعہ تحفظ بھی ضروری ہے، آخر یہ بڑے بڑے شام، کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے شہروں میں فوجیں رکھنا اور ان کے رکھ رکھاؤ کے اخراجات ناگزیر ہی ہیں۔ اگر یہ زمینیں میں فاتحین اور مجاہدین کو بانٹ دوں تو ان کو آزو قہ دینے اور ان کے رکھ رکھاؤ کے لیے آمدنی کہاں سے آئے گی۔"

حضرت عمر کی یہ تقریر سن کے سب نے آپ کی رائے کی تائید کی اور کہا کہ "واقعی اگر یہاں فوجیں نہ

رہیں اور ان کے رکھ رکھاؤ کے لوازمات پورے نہ ہو سکے تو دشمنانِ اسلام ان شہروں پر پھر قابض ہو جائیں گے چنانچہ زمین کی مساحت (پیمائش) کر کے اس کا انتظام کیا گیا۔ اور بات ختم ہوئی۔"

بہرکیف اس واقعہ کو اس تفصیل سے بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہاں کی زمینیں حضرت عمر نے وہاں کے باشندوں ہی کی سپردگی میں دے کے ان سے خراج وصول کرنے کا انتظام کیا اور مجاہدین فاتحین پر تقسیم نہ کیں اور حضرت عمر نے اپنی خداداد قوت اجتہاد سے نص قرآنی اور حدیث نبوی کا محل ا: زنشا ظاہر کر دیا اور یہ سبق بھی دے دیا کہ نصوص کو ہمیشہ مقاصد شریعت اور عامۃ الناس کی فلاح اور بہبود کی روشنی میں دیکھ کے اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

یہ بات واضح رہے کہ حضرت عمر کے اس فعل میں حاشا ثم حاشا سنتِ نبوی کی مخالفت پنہاں نہ تھی۔ بلکہ دوسری آیاتِ قرآنیہ کو سامنے رکھ کے مصالح عامہ کی روشنی میں ایک قسم کا عمل درآمد تھا۔ یہ صحیح ہے کہ خیبر کی اراضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین پر تقسیم کر دی تھی، اس وقت مصالح وقتی کا تقاضا یہی تھا کہ یہ مجاہدین اپنا گھر بار، مال و متاع چھوڑ کے مکہ سے آئے تھے اور اب حضرت عمر نے اس طرح تقسیم نہیں کی، اب مصلحتِ وقتی اسی کی مقتضی تھی۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں۔

والذی رأی عمر رضی اللہ عنہ من الامتناع من قسمۃ الارضین بین من افتتحها عند ما عرفه اللہ ما کان فی کتابه من بیان ذلك توفیقا من اللہ کان له فیما صنع وفیه کانت الخیرۃ لجمیع المسلمین وفیما رآہ من جمع خراج ذلك وقسمته بین المسلمین عموم النفع لجماعتهم لان هذا لو لم یکن موقوفا علی الناس فی الاعطیات والارزاق لم تشحن الثغور ولم تقو الجیوش علی السیر فی الجهاد[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ جو رائے ہوئی کہ زمینوں کو فاتحین پر تقسیم نہ کیا جائے یہ اس وقت جبکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس مسئلہ کی اپنی کتاب سے سمجھنے کی توفیق عطا فرمادی، اس میں آپ کے مد نظر عامہ مسلمین کی خیر خواہی کا جذبہ تھا اور اس ذریعے خراج جمع کر کے اسے مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی جو رائے ہوئی یہ عامہ خلائق مسلمین کی نفع رسانی کے لیے تھی اس لیے کہ لوگوں کو داد و دہش اور آذوقوں میں اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو سرحدوں پر فوجیں نہ ہوتیں اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے لشکر مسلح اور طاقتور نہ ہوتے۔

[1] ۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک کثیر تعداد چھوڑی تھی، زمانہ اور وقت کے لحاظ سے جب نئے نئے مسائل پیش آئے تو لوگوں نے انھیں کی طرف رجوع کیا۔ مختلف دیار و امصار میں یہ پھیلے اور رفتہ رفتہ ان کے شاگردوں کی ایک تعداد وجود میں آئی مدینہ میں عائشہ صدیقہ، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، وغیرہم کے شاگرد نافع، عروہ بن زبیر وغیرہ وغیرہ مکہ میں عبداللہ بن عباس کے شاگردوں میں عکرمہ، مجاہد جیسی شخصیتیں، مصر میں عبداللہ بن عمرؓ کے شاگردوں میں یزید بن حبیب وغیرہ قابل ذکر ہیں ان شاگردوں کے استدلال کے طریقے وہی تھے جو ان کے استادوں کے لیکن ان کے استدلال کے اصول وضوابط غیر منضبط اور غیر مرتب ہی رہے، دوسری صدی میں جا کے اجتہاد اور استخراج مسائل کے اصول فی الجملہ مرتب ہوئے امام مالک مدینہ میں امام ابوحنیفہ عراق میں، امام شافعی، امام اوزاعی اور لیث بن سعد مصر و شام میں مقتضائے زمانہ اور مکان کے مطابق فتوے دیتے رہے۔ اگرچہ یہ ایک دوسرے کے معاصر نہ تھے لیکن تھے دوسری ہی صدی میں ان مجتہدین نے اصول اور ضوابط کے تحت فتوے دیے۔ تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے شروع میں فقہاء کے بادی النظر میں دو گروہ ہو گئے، ایک نے متقدمین کے اصول اپنائے اور دوسرے نے مجرد تقلید کی بجائے کچھ اپنے اصول بھی مرتب کیے۔ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں قاضی ابو یوسف، امام محمد، زفر اور حسن بن زیاد۔ امام مالک کے شاگردوں میں ابن نافع، ابن الماجشون۔ امام شافعی کے تلامذہ میں بویطی، مزنی وغیرہم نے اپنے اپنے اساتذہ کے اصول اپنائے اور انھیں کے تحت مسائل حاضرہ کا استخراج کیا، جنھوں نے ان اصولوں کی تقلید نہیں کی ان میں امام احمد بن حنبل اور داؤد ظاہری کے نام عنوان میں لیے جا سکتے ہیں۔ ان کے بعد جو علماء پیدا ہوئے انھوں نے تیسری اور چوتھی صدی کے مجتہدین کے اصول کی روشنی میں فتاوے دیئے۔ اور اغلب یہ ہے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد مطلق کا باب بالکل مسدود ہو گیا تھا۔ بعد کو جب تقلید کا دور شروع ہوا اور کسی نے اصول میں اور کسی نے فروع میں تقلید شروع کی اصول میں تقلید کرنے والے شاگردوں میں اپنے اساتذہ سے اختلاف آرا بھی رہا کیا۔ چوتھی صدی کے نصف آخر اور پانچویں کے اوائل میں جو ائمہ پیدا ہوئے انھوں نے عموماً اقوال جمع کیے اور اختلافات اور اتفاقات کی چھان بین کی، اس سلسلہ میں طحاوی اور کرخی احناف میں اور ابن ابی یزید مالکیہ میں مروزی ابن اسحاق شافعیہ میں حنابلہ میں الخرقی ہوئے ہیں۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں جو ائمہ ہوئے انھوں نے اپنے حلقہ کے مختلف مکاتب فکر سامنے رکھ کے رائیں قائم کیں اور سلف ائمہ کی رایوں میں جو رائے ان کو زیادہ مناسب معلوم ہوئی اس پر عمل درآمد کیا

اور اسی کے موافق فتاوے دیئے۔ اس فہرست میں کاشانی قاضی خاں اور مرغینانی وغیرہ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں مرتبین فتاوی کے مختلف انداز رہے کسی نے راجح اقوال جمع کیے، کسی نے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد راجح قول کے دلائل نقل کر دیئے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پانچویں صدی میں ایک جماعت پیدا ہوگئی تھی جس نے تقلید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے قاضی ابوبکر اندلسی جو چھٹی صدی میں ہوئے انھوں نے کتاب العواصم من القواصم اسی موضوع پر لکھی، چھٹی صدی ہی میں ابن رشد، ساتویں میں عزالدین ابن عبدالسلام، تقی الدین ابن دقیق العید نے اگرچہ تقلید کی کھلے بندوں مخالفت تو نہیں کی تاہم اجتہاد کے میدان کو وسیع تر ضرور کر دیا، پھر علامہ ابن تیمیہ نے تقلید کو رانہ پر سخت سے سخت تنقید کی اور اس کے بعد ان کے شاگرد علامہ ابن قیم نے اس کی تائید اور ترویج و اشاعت میں زور قلم صرف کر دیا، مصر میں ابن حجر عسقلانی اور ان کے شاگردوں نے بھی کسی حد تک اپنے اجتہاد کے بل پر فتوے دیئے، یہاں تک کہ ان کے ایک شاگرد جلال الدین سیوطی نے یہاں تک کہہ دیا کہ "اجتہاد ہر زمانہ میں فرض ہے" دسویں اور گیارھویں صدی میں اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہا نے بڑے بڑے کام کیے اور خاص خاص نقاط نظر کو سامنے رکھ کے کتابیں اور فتاوے مرتب کیے جن میں خصوصیت کے ساتھ خیرالدین رملی کے فتاوی اور سلطان عالمگیر اورنگ زیب کے جمع کرائے ہوئے مافی الموضوع فتاوی ہندیہ، بارھویں اور تیرھویں صدی میں بھی فقہ اسلامی کے سلسلہ سے بڑے بڑے کام ہوئے اور ان میں دو ہستیاں شاہ ولی اللہ دہلوی اور محمد بن علی شوکانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چند دن صحرائے عرب میں

(مولانا عبداللہ عباس ندوی)

حجاز کا وہ علاقہ جو طائف سے جنوب کی طرف تین سو کیلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے حجاز کہلاتا ہے جس طرح صوبۂ بہار میں ایک قصبہ کا نام بہار ہے اسی طرح حجاز، حجاز کے ایک علاقہ کا نام ہے۔ اس علاقہ کے مشہور قبائل زہران، غامد، دوس؎، عتیق اور شمران ہیں۔ ان میں زہران سب سے بڑا قبیلہ ہے جس کے سو سے زیادہ بطون ہیں اور ہر بطن کی بیسیوں شاخیں (افخاذ) ہیں۔

طائف سے جو سڑک نجران کو جاتی ہے اس کے وسط میں بیشہ واقع ہے اور بیشہ اور طائف کے وسط میں بلاد غامد و زہران پڑتے ہیں۔

یہ خالص عربوں کا وطن ہے، سمندر کی سطح سے ۰۰۵ سو فیٹ بلند ہے، بعض مقامات ۱۲ سو فیٹ بلند ہیں، اسی لیے ہمیشہ سردی رہتی ہے، عمومی موسم مسوری اور شملہ کا ہے، دس سال پہلے تک یہاں کچی سڑک بھی نہیں تھی، صرف اونٹوں یا خچروں کے ذریعہ لوگ آجا سکتے تھے۔ ایک پہاڑی سے اتریئے تو دوسری پہاڑی پر چڑھ جائیے، وادیاں بہت کم ہیں اور اگر ہیں تو بہت مختصر اور تنگ، جہاں وادیاں وسیع ہیں وہاں آبادیاں ہیں اور مزرعتیں ہیں اور وہی یہاں کی بستیاں ہیں۔ زراعت کا دارومدار بارش پر ہے کوئی نہر نہیں ہے، کنوئیں بہت کم ہیں اور جو ہیں اُن کی گہرائی ۵۴ فیٹ سے ۶۵ فیٹ تک بتائی جاتی ہے

؎ دوس حضرت ابوہریرہؓ کا وطن ہے جو اپنی کنیت سے پہلے عبدالرحمن بن صخر الدوسی کے نام سے معروف تھے۔ رضی اللہ عنہ
ان تمام قبائل کا نام حدیثوں میں متعدد جگہ آیا ہے۔

ایک کنوئیں پر ۵۰ سے ۶۰ ہزار ریال تک صرف ہوتے ہیں، کیونکہ یہاں مٹی نہیں ہے جس کی کھدائی آسان ہو پہاڑ کاٹنا پڑتے ہیں، گو وہ کٹائی ڈائنامیٹ کے ذریعہ آسان ہے مگر ایک وقت میں دو فٹ سے زیادہ پتھر نہیں کٹتے ہیں۔ پھر اس کے لیے بھی دو دو انچ کے سوراخ کرنا پڑتے ہیں۔

عقیق سے آگے نکلئے تو زرخیزی زیادہ ملے گی۔ کیونکہ وہاں پہاڑ کم ہیں اور "سہل" ہموار زمین زیادہ ہے۔ نجران سے طائف تک مسافت ۱۲ سو کیلومیٹر ہے جس میں صرف آٹھ سو کیلومیٹر تک اس سال پختہ سڑک ہو چکی ہے، باقی راستے کچے، ناہموار اور سنگلاخ ہیں۔ آپ کی موٹر ہچکولے کھاتی ہوئی جب کسی پہاڑی سے اتر رہی ہوگی تو آپ کو دوسرے پہاڑوں پر وہ سڑکیں نظر آئیں گی جن سے آپ کی گاڑی گزرے گی یعنی بل کھاتے ہوئے سانپ کی طرح ایک دھاری سامنے کے متعدد پہاڑوں پر نظر آئے گی اور صعود و ہبوط اور رفع و خفض کا یہ سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آئے گا۔

عربوں کی زیارت میں یہاں پہلی بار آیا ہوں، مگر بڑا اچھا ہوا کہ اس علاقہ کو دیکھ لیا۔ گویا عربوں کو پہلی بار دیکھا، حرمین کے شہروں یا جدہ میں ۹۹ فی صدی مہاجرین اور ان کی اولادیں ہیں۔ اختلاط امم کی وجہ سے اصل و نقل کی تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ افریقہ و ایشیا کے وہ ممالک جن کو اسلام لانے کے صدقہ میں "اعزازی عرب" ہونے کا فخر حاصل ہوا جیسے مصر و شام وہ کئی پشت پہلے عرب سے غرب ہو چکے۔ صرف یہ پسماندہ غریب اور خانہ بدوش قوم اپنے نسب اور خون کے لحاظ سے، اسلام کے ساتھ وفاداری کے لحاظ سے، ذہانت، بلند حوصلگی، غیرت و شجاعت کے لحاظ سے صحیح معنوں میں عرب ہے۔ یہی وہ حقیقی عرب ہیں جن کے مقدرات پر بادشاہتیں سودا کرتی ہیں۔ مختلف قوموں کے ملے جلے خون رکھنے والی نسلیں ان کے نام کا نعرہ لگاتی اور بنیا دکانِ سیاست سجاتی ہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ آج ان کی حالت پندرہ برس پہلے کی بہ نسبت بدرجہا بہتر ہے۔ جگہ جگہ مدارس ہیں، شفاخانے ہیں۔ حکومت مزارعین کو کھاد اور نئے آلات زراعت دیتی ہے، کنوئیں بنائے گئے ہیں، مواصلات کی سہولت بڑھ رہی ہے۔ مگر اس بہتر حالت کو بھی دیکھ کر ترس آتا ہے کہ

بہ ریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

یہاں یہ تو صحیح نہیں ہے کہ "از محنت او" متمدن علاقوں کو پھل رہا ہے۔ لیکن یہ سو فیصدی صحیح ہے کہ ان کے نام پر ان کے صدقہ میں اور ان کی بدولت لوگ دادِ عیش دے رہے ہیں۔

اوصاف | یہ قوم بڑی جفاکش اور صابر ہے، دین اس کے رگ و ریشہ میں رچا ہوا ہے۔ آپ اس سے ہر چیز کا سودا کر سکتے ہیں، سوائے دین اور غیرت و ناموس کے جو یہ قوم کسی حال میں فروخت نہیں کر سکتی، یہ دو چیزیں ان کے یہاں "لایعاد ولایباع" کا حکم رکھتی ہیں، یہ جاہل ہیں مگر ان کا ضمیر زندہ ہے، یہ مفلس ہیں مگر ان کا دل غنی ہے۔ تمدن کے لحاظ سے پسماندہ ہیں، مگر ایمانی طاقت کے لحاظ سے سب سے آگے اور متقدم ہیں۔

آپ نے عربوں کی سخاوت، مہمان نوازی، غیرت، اور حیا و شرم کے بارے میں جو تاریخ میں پڑھا ہو آج بھی انکے اندر وہ جوہر دیکھ سکتے ہیں مگر آج ہی دیکھ سکتے ہیں کل نہیں کیونکہ مواصلات کی سہولت، سڑکوں کی پختگی، ہوائی اڈوں کی تعمیر اور موجودہ نصاب تعلیم سے جو نسل "کل" تیار ہوگی وہ آج سے بہت مختلف ہوگی، یہ کوئی پیش بینی یا پیشین گوئی نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح دو اور دو کا مجموعہ چار بتایا جا سکتا ہے، اسی طرح مادی تمدن، نا خدا ترس نصاب تعلیم، اور کورِ دل اساتذہ کی تربیت کا نتیجہ معلوم ہے۔ لیس لوقعتها کاذبة

دینی پختگی | میں یہاں لسانی تحقیقات (LINGUISTIC INVESTIGATION) کے سلسلہ میں پندرہ روز رہا۔ تقریباً بارہ مواضعات کا دورہ کیا، یہاں کے ہفتہ واری بازار دیکھے۔ ان کے چوپالوں میں گیا، مزارعین سے ان کے کھیتوں میں جا کر ملا، اونٹ اور بھیڑ چرانے والوں سے ان کی وادیوں میں ملا، مگر کسی کو کسی حال میں بھی نماز سے غافل نہیں پایا۔ ہر نماز اول وقت میں اور جماعت کی پابندی کے ساتھ۔ ایک موضع میں جب پہونچا تو وہاں بازار کا دن تھا، بھیڑ، بکریاں، اونٹ، کپڑے، عبائیں، انگور، انار، غلہ، کھاد، چاندی کے زیور، زیتون کے تیل اور اسلحہ سب کچھ غیر منظم طریقہ پر موجود تھے، جیسا کہ دیہاتی بازاروں میں ہر جگہ ہوتا ہے، ایک ٹیلہ پر سے دیکھا تو بازار کی تنگ سڑک آدمیوں اور جانوروں سے بھری نظر آئی، سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ اتنے میں ظہر کی اذان ہوئی اور مجمع اس طرح آناً فاناً چھٹ گیا جیسے سوائے سامان اور جانور کے یہاں کوئی بھی آدم زاد ہی نہیں تھا۔ جدہ اور مکہ مکرمہ میں تو آپ کو شاذ و نادر ہی کوئی عرب ایسا نظر آئے گا جس کے چہرے پر داڑھی ہو، یہاں اس کے برعکس شاذ و نادر ڈھونڈھنے پر شاید کوئی بلا داڑھی کے نظر آجائے۔ اور اگر مل بھی گیا تو وہ شہر سے آیا ہوگا یا یہاں کسی سرکاری عہدہ پر تبادلہ میں آیا ہوگا، عورت تو بڑی چیز ہو۔ کسی کمسن بچی کی ایک انگلی بھی بے پردہ کہیں نظر نہیں آئے گی۔ اور یہ بات نہیں کہ عورتیں باہر نہ نکلتی ہوں، وہ گھر کے کام دھندوں کے علاوہ مشکوں میں پانی بھر کر لاتی ہیں۔ اپنے محرموں کا ہاتھ بٹانے کے لیے کھیتوں

پر موجود رہتی ہیں مگر گھر کے پردے کے ساتھ۔ کئی سال پہلے ایک مصری مدرس نے کسی عورت کی طرف بری نگاہ ڈالی تھی، اس کو اس عورت نے اپنی دستی بندوق سے ہلاک کر دیا تھا۔

تعلیم و تربیت | بلجرشی میں ایک غیر سرکاری مدرسہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کلاسوں میں جا کر انداز تعلیم اور دفتروں میں آکر نصاب تعلیم کو دیکھا۔ دینی مضامین کے ساتھ جغرافیہ، الجبرا، حساب اور تاریخ کے مضامین بھی تھے اور اس کے ساتھ دو مضمون نئے بھی دیکھے الرّمی اور الفروسیہ (نشانہ بازی اور شہسواری)۔ لوگوں نے بتایا کہ چھوٹے چھوٹے بچوں تک کا نشانہ بہت تیز ہے اور شہسواری میں طلبہ کافی دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے درجۂ پنجم کے ایک طالب علم سے پوچھا کہ تم ورزش کرتے ہو؟ اس نے ایجاب میں جواب دیا، پوچھا فٹ بال کھیلتے ہو؟ اس نے کہا فٹ بال کے لیے ہمارے یہاں زمین موزوں نہیں ہے "دوسرے یہ کھیل اجانب (غیروں) کا ہے، ہمارا کھیل فروسیہ (شہسواری) ہے۔ اس جواب سے دل بہت خوش ہوا اور میں نے مدرسین کو دل کھول کر داد دی۔

"الندوی" کا شہرہ | یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی کوردہ سے کوردہ علاقہ میں بھی آپ جائیں تو آپ کو کوئی نہ کوئی پڑھا لکھا ایسا آدمی مل جائے گا جو "الندوی" کی نسبت سنتے ہی سوال کرے گا کہ آپ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے خاندان سے ہیں؟ اب آپ چار پانچ منٹ مزید صرف کرکے بتلائیے کہ قرابت مند نہیں بلکہ خادم و تلمیذ ہوں۔ اور ندوی کی نسبت خاندان کی نہیں بلکہ علمی درسگاہ کی ہے، پھر وہ آپ کو بتائے گا کہ اس نے مولانا کی کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں، اور ادھر افسوس ہوگا کہ کاش چلتے وقت مکہ یا طائف کے کسی مکتبہ سے مولانا کی نئی کتابوں کے کچھ نسخے خرید لیے ہوتے تو کتنا بہترین ہدیہ ہوتا جو ان کو پیش کر سکتے تھے۔

ایک عیب بھی | عرب بدوؤں کے علاقہ میں جا کر ایک چیز بہت افسوسناک دیکھی کہ قرآن مجید کو صحت کے ساتھ پڑھنے کی اہمیت ان کے نزدیک اس درجہ میں نہیں ہے جس درجہ غیر عرب مسلمانوں میں ہے یہ لوگ آزادی میں اعراب کی پابندی نہیں کرتے، اس سے بڑھ کر کچھ حروف کا اضافہ اور کمی بھی ان کے یہاں اہمیت نہیں رکھتا۔ میں نے اس کو بہت سختی سے محسوس کیا اور اس کو ریکارڈ کر لیا تاکہ مکہ مکرمہ پہونچ کر شیخ عبدالملک بن ابراہیم[1] اور رابطہ کے ذمہ داروں کو سناؤں گا۔

ہند و پاک کے مسلمانوں میں تبلیغی جماعت کے افراد تقریباً ایک ایک چپہ کا دورہ کر چکے ہیں۔

(۱) شیخ عبدالملک بن ابراہیم مکہ یا سعودی حکومت میں اسد ... کے ایک بڑے ذمہ دار افسر ہیں۔

اور لوگوں کے دلوں میں احترام ہے اور ذکر خیر سے لوگ یاد کرتے ہیں۔ مگر وہ بے موسم کی بارش کی طرح گزر جاتے ہیں جس سے نہ موسم بدلتا ہے اور نہ زمین اچھی طرح تر ہونے پاتی ہے۔ یہ جگہیں تو عمریں صرف کرنے کی اور پائیدار کام کی طلبگار ہیں۔

اس دو ہفتے کے دورہ سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ عربوں کو دیکھ لیا، اس سے پہلے اگرچہ حجاز میں تقریباً دس سال رہا، مصر و شام، عراق، اردن کی سیاحت کی اور ہر ملک کے پڑھے لکھے لوگوں نیز عوام و خواص سے ملتا رہا۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرزمین عرب کو دیکھا تھا، اہل عرب کو نہیں، اور اگر میں یورپ نہ جاتا تو معلومات میں کوئی کمی نہیں رہتی۔ لیکن اگر یہاں نہ آتا تو یقیناً کمی رہ جاتی۔ کیونکہ یہاں کے حالات لوگوں کو معلوم نہیں ہیں، ان کی نشر و اشاعت نہیں ہوتی اور ان زاویوں کی لوگوں کی نگاہ میں اہمیت نہیں ہے جن پر میری نگاہ عظمت و محبت کے ساتھ پڑتی ہے۔

یہاں کی زبان زبان کے لحاظ سے یہ علاقہ ایک امتیاز رکھتا ہے یہاں کی دارجہ (یا لہجہ) نحوی زبان سے بہت قریب ہے۔ اور بجا طور پر اس کو فصحیٰ العامیات کہا جا سکتا ہے۔ جو لوگ زبان کے فلسفہ اور بولی جانے والی زبان کے متعلق نئی تحقیقات اور اُن کے نتائج سے آگاہ نہیں ہیں ان کو یہاں کی بان میں بہت سقم نظر آئے گا۔ لیکن جو لوگ ان حقائق سے واقف ہیں ان کو یہاں کی زبان میں قدامت اور صحت کے عناصر عربی کے تمام لہجات سے زیادہ ملیں گے۔ زبان میں سقم نظر آنے کا ایک سبب یہی ہے کہ ہمارے یہاں نحو و صرف کے بہت محدود قواعد کو عملی مشقوں کے ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ وہ قواعد اور ترکیبیں جو نحو کی درسی کتابوں میں نہیں ہیں ان کو عام طور سے لوگ غلط سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ سیبویہ کی الکتاب تو بڑی چیز ہے اگر شرح ابن عقیل یا المزھر بھی ٹھیک سے پڑھیئے تو یہ قواعد منضبط نظر آئیں گے جو یہاں کے عوام کی زبان پر ہیں۔ مثال کے طور پر اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کو عام طور پر غلط بتایا جائے گا، مگر یہاں کی بولی میں یہ عام بات ہے اور قواعد کے لحاظ سے صحیح ہے۔ ایک دو نہیں، بیس مثالیں نحو کی کتابوں میں موجود ہیں۔ الفاظ بھی اگر غور سے سُنیئے تو شاذ و نادر ہی کوئی لفظ دخیل یا معرب ملے گا، یہ اور بات ہے کہ اہل شہر ان کو ان معنوں میں عام طور سے نہ بولتے ہوں، مثلاً زمین پر پیر پٹکنے یا تیز بھاگنے کے لیے "رکض" کا فعل یہاں عام ہے۔ اور کون کہتا ہے کہ یہ غلط ہے؟۔

اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں کہ تفصیلی بحث کی جائے اس لیے صرف اشارۃً اپنا

تاثر بیان کیا ہے۔ اگرچہ موضوع ایک مفصل تحقیقی مقالہ کا طالب ہے۔

اسرار حدیث کھلتے ہیں یہاں احادیث نبویہ کی فہم آسان ہو سکتی ہے۔ پہاڑ، صحرا اور وادی میں بھیڑ، بکری اور اونٹ کا سب سے بڑی ثروت شمار ہونا، پتھر سے چُنے ہوئے یا مٹی کے کچے مکانات جن پر کھجور کے درخت کے شہتیر، اسی کے کوپل کی چھاونی، ریتیلی یا سنگلاخ زمین کا فرش، اسی طرح زمین کی چھوٹی چھوٹی گرد آباد مساجد، کھانے پینے میں سادگی، کھجور اور اونٹنی کے دودھ سے ضیافت، ایک پیالہ دودھ میں پوری مجلس کی شرکت، پانی کی قلت اور اس قلت کی وجہ سے اس نعمت کی قدر، یہ سب وہ باتیں ہیں جو آپ کو احادیث نبویہ اور خود سیرت نبوی میں جھلکتی ہوئی نظر آئیں گی، جب ان کو زندہ شکل میں یہاں دیکھیں گے تو ظاہر ہے ماحول اور ظروف کے اشتراک کی وجہ سے وہ باتیں جلد اور زیادہ واضح شکل میں ذہن نشین ہوں گی، ہاں مگر اس کے ساتھ آپ کے ذوقِ اتباعِ سنت کا ایک امتحان بھی ہوگا۔

"سور المومن شفاءٌ" (مومن کا جھوٹا شفا ہے) کا ترجمہ کر دینا اس کا مفہوم سمجھنا اور سمجھانا کتنا آسان ہو، یہی نہیں اس پر آپ تقریر بھی کر سکتے ہیں جراثیم کے نظریات کی تردید بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں کی عملی زندگی میں جب ایک بڑے پیالہ میں پانی آئے گا اور دسترخوان پر بیٹھنے والے بدو اس میں منھ لگا کر پینے کے بعد آپ کی طرف یہ پیالہ بڑھائیں گے اس وقت دیکھئے کہ آپ اپنے کو اندرونی جھجک سے کس حد تک بچا سکتے ہیں۔ اور اسی سے یہ جائزہ لیجئے کہ آپ کا ذوقِ اتباعِ سنت کتنے پانی میں ہے۔

حدیثوں میں آیا ہے کہ پانی تین سانس میں پیو اور سانس پانی کے برتن سے باہر لو۔ اس کی حقیقت بھی اچھی طرح اسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب پانی پینے کا یہ رواج آپ خود دیکھیں ورنہ تو ری گلاسوں میں یا پائپ سے شروبات پیتے وقت یہ بات کب سمجھ میں آ سکتی ہے۔

بلاد غامد و زہران اور تہامہ کی سیاحت کا ذکر نامکمل رہے گا اگر چند معمولی واقعات نہ بیان کر دیے جائیں، جو ان دو ہفتوں کے اندر پیش آئے، ان واقعات سے اس قوم کی ذہنیت، آدابِ زندگی اور معاشرت پر روشنی پڑتی ہے۔

رسول پاک سے محبت لسانیاتی جائزہ کے سلسلہ میں بنی غامد کے ایک بدوے گفتگو ہو رہی تھی، اس سے دریافت کیا تم نے حج کیا ہے؟ جواب ملا ہاں، یہ لوگ ہاں کو جب زور دے کر کہنا چاہتے ہیں تو "ای نعم" یا "ای واللہ" کے بجائے صرف "اللہ اللہ" دو بار ایک سانس میں ایک خاص انداز سے کہتے ہیں، پہلے لفظ

اللہ کو مغمّ اور دوسرے کو ترقیق لیکن ایک جھٹکے کے ساتھ کہتے ہیں) دریافت کیا مدینۂ منورہ گئے ہو؟ اُس نے کہا "نہیں"۔

پھر پوچھا اما تذکرت الرّسول ؟ (کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی ہو؟) جواب ملا — یا رَجُلُ! دقات قلبی کلها تذکرنی محمد اللّٰھم صلّ علیہ (رائے بھلے مانس! میرے دل کی ہر دھڑکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلاتی ہے)

خالص عربی رواج | باحہ میں میرے میزبان استاد محمد احمد زہرانی مدیر مالیۃ الباحۃ تھے۔ ایک صبح کو اشراق کے بعد واپس آیا تو میرے آنکے چند لمحے کے بعد تین بدو اندر آ گئے اور مجلس میں بیٹھ گئے۔ ناشتہ آیا، چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد میزبان نے ان نو واردوں سے پوچھا کیسے آ گئے؟

ایک نے کہا فطور (ناشتہ) کے لیے، دوسرے نے کہا مجھے تم سے کام ہے — معلوم ہوا کہ یہ عام رواج ہے کہ اگر کسی کا دروازہ کھلا ہو تو بلا تامل ہر ایک کو حق ہے کہ کھانے یا ناشتے کے وقت بلا تکلف چلا جائے، دوسرے یہ کہ صاحب خانہ بغیر نُزُل پیش کیے ہوئے یعنی ضیافت سے پہلے نہیں دریافت کر سکتا کہ تم کس لیے آئے ہو۔

اور دین کے ساتھ یہ بانکپن! | بنی زہدان کے ایک گاؤں حلمان میں میرے ایک ساتھی ایک چرواہے کو پکڑ لائے تیئس۲۳ چوبیس۲۴ سالہ تندرست نوجوان تھا، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس کمر میں حسب رواج خنجر باندھے ہوئے بلا تکلف آ کر مسند پر بیٹھ گیا۔ میرے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا کیف حالک یا شیخ؟ میں نے اس سے بات شروع کی۔

پوچھا شاعر ہو! کہا — "اللہ اللہ" (یعنی ہاں ہاں کیوں نہیں) کہا کچھ سناؤ، بولا پہلے تم بتاؤ کہ تم کون سے عرب ہو، من ای العرب انت۔ میں نے کہا ہندی ہوں۔ بولا نماز پڑھتے ہو؟ جواب دیا الحمد للہ پھر بولا سچ کہو نماز پڑھتے ہو یا نہیں، میں نے کہا ہاں بھئی پڑھتا ہوں، مگر اس قدر تحقیق کی کیا ضرورت پیش آئی؟۔

اس نے جواب دیا۔ باہر کے لوگ اکثر نماز نہیں پڑھتے ہیں، اگر حکومت کا قانون نہ ہو تو ان کو قتل کر دوں، ایک ہندی ڈاکٹر یہاں تھا، نماز نہیں پڑھتا تھا۔ میں نے کہا خیر! مگر یہ بتاؤ کیا تم غیر نمازیوں کو اپنے شعر نہیں سناتے — بولا: کیف هل انا شارب دخان او خمر اضیع فیهم شعری ؟۔

(بھلا کیوں؟ کیا میں سگریٹ نوش یا شراب خور ہوں کہ بے نمازیوں کو سنا کر ان میں اپنا شعر ضائع کروں؟)

اس کے علاوہ بہت سے چھوٹے موٹے واقعات ایسے پیش آئے جن سے عربوں کی ذہانت، حاضر جوابی اور معاملہ فہمی کا تجربہ ہوا، مثلاً ایک بدو لڑکے سے پوچھا کہ تم کو کہاں تک گنتی آتی ہے، بولا دس، بیس، سو، ہزار سب آتی ہے، میں نے کہا ملیون؟ اس نے فوراً جواب دیا ملیون جب آئے گا تو گن لوں گا ابھی فیصل کے پاس ہے اس کو یہ گنتی آتی ہوگی۔

میرا سفر زیادہ پر لطف ہوتا۔ اگر آزاد یا کسی کی مدد کے بیان آتا، عربوں کی مہمان نوازی ایک بالکل ہی اجنبی مسلمان کے ساتھ نظر آتی۔ مگر اپنی تن آسانی کی وجہ سے ایک رفیق ساتھ لے لیا تھا، ابتدائے قبائل کے امرا کو خطوط لکھ دیئے تھے هيئة الامر بالمعروف کے تمام رؤسا کو ہدایت تھی کہ تعاون کریں۔ اس کی وجہ سے جہاں گیا ایک ٹیم ساتھ گئی اور اس نیم سرکاری حیثیت کی بنا پر ہر دشواری سے ضرور محفوظ رہے کہ عربوں کو ذرا اور زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، مگر جو دیکھا وہ بھی یاد رہے گا ـــــ!

ترجمہ
و - ج

خدائی ریاست کا نظریہ

پرنسپلز آف پولیٹیکل سائنس (Principles of Political Science) علم سیاست کے اصول پر ایک جامع اور علمی کتاب ہے جو حال میں اس موضوع کے تین پروفیسروں کے قلم سے تیار ہوئی ہے جن میں سے دو مختلف یونیورسٹیوں میں پولیٹیکل سائنس کے شعبہ کے صدر بھی ہیں۔ یہ کتاب ہندستان کی کئی یونیورسٹیوں میں بی اے کے نصاب میں شامل ہے اور ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

ریاست کی اصل (ORIGIN) کے بارے میں کتاب کے اندر پانچ نظریات بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا نظریہ خدائی ریاست کا نظریہ ہے۔ اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ جدید علماء سیاسیات اس بارے میں کس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

یہ نظریہ کہ ریاست کی اصل خدا ہے، ریاست کے قدیم ترین نظریات میں سے ایک ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ریاست (State) خدا کی مخلوق (CREATION) ہے اور بادشاہ خدا کا قائم مقام یا اس کا نمائندہ ہے اور اس حیثیت سے اسے لوگوں کا مطاع اور محترم ہونا چاہئیے۔ زمین پر کوئی شخص نہیں ہے جو حکمراں (RULER) کے اوپر ہو۔ اس کا حکم قانون ہے اور اس کی تمام کاروائیاں صحیح ہیں۔ حکمراں کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ ایسا کرنا صرف ایک جرم نہیں، بلکہ گناہ بھی ہے۔ ۴۲

خدائی ریاست کا نظریہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا ریاست کے بارے میں انسانی خیالات کی تاریخ۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاسی اقتدار (Political Authority) غیرمرئی طاقتوں سے ہمرشتہ ہے۔ مہابھارت میں بھی یہ نظریہ درج ہے کہ ریاست کی اصل خدا ہے۔ "شانتی پروا" میں ایک حوالہ ہے کہ جب لوگوں نے دیکھا کہ ہرج ناقابل برداشت ہوگیا ہے تو وہ خدا کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ انھیں ایک سردار دے جو ان کی حفاظت کرسکے، اس دعا سے خوش ہوکر خدا نے منو کو ان کا حکمراں مقرر کیا۔ اس رزمیہ میں اور بھی ایسے ٹکڑے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بادشاہ اپنے اندر خدائی جوہر رکھتا ہے۔ تاہم یہ نوٹ کرنا چاہئے کہ مہابھارت نے اگرچہ ریاست کی اصل خدا کی خواہش کو قرار دیا ہے، مگر اس نے بادشاہ کے خدائی اختیارات (Divine Rights of Kings) کو تسلیم نہیں کیا ہے جو تمام تر ایک دوسرا اصول ہے۔ فی الحقیقت وہ لوگوں کو ہدایت کرتی ہے کہ ایسے ظالم بادشاہ کو مار ڈالیں جو دھرم یا سماجی اخلاقیات سے انحراف کرے۔ قدیم عہدنامے میں بھی ایسے اشارے ہیں کہ خدا حکمرانوں کا انتخاب کرتا ہے ان کا تقرر کرتا ہے، ان کو معزول کرتا ہے، حتی کہ انھیں قتل کرتا ہے۔ مسیحیت خدائی ریاست کے اعتقاد کو مضبوط کرتی ہے۔ سینٹ پال نے کہا ہے "تمام روحیں برتر قوتوں کی مطیع ہیں، کیونکہ خدا کے سوا کوئی طاقت نہیں، وہ طاقتیں جو خدا کے حکم سے مقرر ہیں" اس طرح کے خیالات دوسرے لوگوں کے مذاہب کے عقیدوں اور ان کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

خدائی ریاست کے نظریے کی تین تعبیریں ہیں جو اس وقت پائی جاتی ہیں۔ اول، یہ کہ خدا نے اپنے نائبین بھیجے تاکہ وہ اس زمین کے اوپر حکومت کریں۔ بہت سے مذہبی گروہ اب تک یہ سمجھتے رہے ہیں کہ ان کے حکمراں خدائی حکم کے تحت مقرر ہوئے ہیں۔ دوم، یہ عقیدہ جو بعض گروہ مثلاً یہودیوں کا ہے کہ خدا براہ راست ان کے اوپر حکومت کرتا ہے، ہندو بھی اس نظریے کے قائل ہیں کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے۔ تیسری تعبیر عقلی (Rational) ہے۔ اس کے مطابق خدا یا فطرت (Nature) نے انسان کے اندر ایسی جبلتیں (Instincts) ودیعت کردی ہیں کہ بعض افراد فرماں روائی کی قدرت اور خواہش دونوں رکھتے ہیں اور دوسرے لوگ اطاعت کی صلاحیت اور خواہش رکھتے ہیں اور اس چیز نے دھیرے دھیرے حکومت اور محکومیت کو جنم دیا اور بالآخر ریاست کو۔

پرانے عہدنامے اور مسیحی چرچ کی تعلیمات نے قرون وسطی کے مفکرین کو متاثر کیا۔ قرون وسطی

میں چرچ اور بادشاہ کے درمیان ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی ۔ پوپ اور شاہ دونوں نے دعویٰ کیا کہ وہ زمین پر خدا کے نائب ہیں ۔ چرچ کے کچھ حامیوں نے کہا کہ شاہ کو چرچ کا ماتحت ہونا چاہئے ۔ کچھ دوسرے لوگوں نے اصرار کیا کہ شاہ کو چرچ کے اوپر اقتدار حاصل ہے ۔ پروٹسٹنٹ ریفارمیشن کے زمانہ میں لوتھر اور کالون نے پھر اس نظریہ پر زور دیا کہ شہری اقتدار کی اصل خدا ہے اور اس ضرورت کا اظہار کیا کہ حکومت کی مثبت اطاعت ہونی چاہئے اور اس کا مقابلہ نہیں ہونا چاہئے ۔ جب قرون وسطیٰ میں چرچ اور شاہ کی کش مکش یہاں تک پہنچی کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا ، اس وقت بادشاہ نے ریاست کے خدائی نظریہ کی اپیل کی ۔ شاہ کے حامیوں نے یہ دلیل دی کہ خدا نے براہ راست طور پر بادشاہ کو اقتدار سونپا ہے ۔ اور شاہی طاقت سے جنگ کرنا گناہ ہے ۔ خدائی ریاست کے نظریئے کو ایک نئی شکل دی گئی ۔ بادشاہ کے خدائی اختیارات (Divine Rights of Kings) کا نظریہ پیش کیا گیا ۔ اس موخر الذکر نظریے کے نمایاں شارحین جیمز اول (انگلینڈ) اور سر رابرٹ فلمر تھے ۔ فرانس میں اس نظریئے کو بوسے (Bousset) نے اٹھایا اور اس کا مقصد لوئی چہاردہم کی مطلق العنانی کے حق میں تائید فراہم کرنا تھا ۔ ۸۵

جیمز اول (انگلینڈ) نے بادشاہوں کے خدائی اختیارات کے نظریئے کی واضح تشریح (Clear Exposition) اپنی کتاب میں کی ہے جس کا نام ہے The Law of Free Monarchies) ۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ بادشاہ اپنا اقتدار خدا سے حاصل کرتا ہے اور اس حیثیت سے وہ زمین کے لوگوں کے سامنے جواب دہ نہیں ہے ۔ وہ قانون سے بلند ہے اور وہ صرف خدا کے ماتحت ہے ۔ وہ ہر شخص کا مالک ہے اور زندگی اور موت کی طاقت رکھتا ہے ۔ بادشاہ خواہ برا ہی کیوں نہ ہو عوام اس کے خلاف بغاوت کا حق نہیں رکھتے ۔ بادشاہ کی نافرمانی خود خدا کے خلاف بغاوت ہے ۔ جیمز کے نزدیک ، بادشاہ خدا کہے جاتے ہیں ۔ کیونکہ وہ زمین پر خدائی طاقت سے ایک قسم کی مشابہت رکھتے ہیں ۔" . . . .

. . . . " جس طرح خدا کے .... بارے میں بحث کرنا کفر اور الحاد ہے ، اسی طرح یہ توہین اور زبردست نافرمانی ہے کہ خدا کے عمل کے بارے میں بحث

کی جائے یا یہ کہا جائے کہ خدا فلاں کام نہیں کرسکتا۔ فلمر (Filmer) بھی اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا۔ فرانسیسی وزیر بوسے نے بھی دعویٰ کیا کہ بادشاہ خود خدا کی عظمت کی ایک شبیہ ہے۔ اس نے کہا کہ خدا کے بغیر کوئی متمدن سماج نہیں بن سکتا۔ اس لیے عوام اس کے سوا کوئی اختیار نہیں رکھتے کہ وہ بادشاہ کے اقتدار کے آگے سر ڈال دیں۔ برے بادشاہ کا فیصلہ خدا کرے گا کوئی انسان اس زمین پر اس کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔

بادشاہ کے خدائی اختیارات کے اصول کی نمایاں خصوصیات اس طرح مختصر کرکے بیان کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ بادشاہ خدا سے اپنا اقتدار حاصل کرتا ہے اور شہنشاہیت خدا کے حکم سے ہے۔

۲۔ وراثتی حق ناقابل منسوخی ہے۔

۳۔ بادشاہ اپنی رعایا کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں، وہ صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔

۴۔ بادشاہ کے اقتدار کی مزاحمت کرنا گناہ ہے۔

بادشاہ کے لیے خدائی اختیارات ہونے کا نظریہ بعد کو ناقابل اعتبار ہوگیا۔ تاہم یہ عقیدہ کہ بادشاہ خدا کا نمائندہ ہے، اب بھی پس ماندہ علاقوں میں موجود ہے جیسے تبت اور نیپال۔

خدائی ریاست کا نظریہ موجودہ زمانہ میں ناقابل اعتبار ہوچکا ہے۔ کوئی ایسی محسوس شہادت (Tangible Evidence) نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ خدا اسٹیٹ کو بنانے یا اس کی وضع مقرر کرنے میں کوئی براہ راست مداخلت کرتا ہے۔ جے۔ این۔ فگیز (Figgis) کے نزدیک اس نظریہ کا زوال اس واقعہ میں ہے کہ آج کل لوگ عقل کی بالاتری میں یقین کرنے لگے ہیں اور عقیدہ کا تعلق روحانی معاملات سے ہوگیا ہے۔ یہ کہنا کہ خدا حکمراں کا انتخاب کرتا ہے، عقل عام کے بالکل خلاف ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد پر ایک منتخب صدر کی حیثیت کو بتانا مشکل ہوجاتا ہے۔ درحقیقت ریاست ایک تاریخی طور پر ارتقا یافتہ چیز (Historical Growth) ہے نہ کہ کوئی خدا کی مخلوق (Creation of God)۔ اس کے علاوہ یہ نظریہ بےکار قسم کے بادشاہوں کے وجود کی تشریح کرنے میں ناکام ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ ظالم بادشاہوں نے لوگوں کے اوپر حکومت کی ہے۔ جب خدا نیکی کا مجسمہ ہے تو اس کے نائندوں کو بھی نیک ہونا چاہیئے۔ برے بادشاہوں کا وجود یہ معنی رکھتا ہے کہ خدا یا تو قادر مطلق نہیں ہے، یا بادشاہ خدا کا نائب نہیں ہے۔

کیوں کہ خدا ایک ظالم کو اپنا نائب منتخب نہیں کریگا۔ مزید یہ کہ یہ نظریہ صرف شہنشاہی طرز حکومت کو حق بجانب ثابت کرتا ہے۔ بہرحال ایسی کوئی شہادت نہیں ہے۔ جس سے ظاہر ہو کہ یہ خدا کی پسند کے مطابق ہے۔ مزید یہ کہ یہ نظریہ ریاست کی تشکیل میں انسان کے حصّہ کو بہت گھٹا دیتا ہے۔ اور جمہوریت کے اصول کے منافی بھی ہے۔ آخری بات یہ کہ یہ نظریہ سیاسی طور پر خطرناک ہے۔ یہ عقیدہ کہ اقتدار ایک خدائی اجازت ہے (Divine Sanction) یہ مستبد حکمرانوں کے دعوے کو حق بجانب ثابت کرتا ہے اور محکوم کے اوپر حاکم کی آخری ذمہ داری کے اصول کو ختم کر دیتا ہے۔

اگرچہ خدائی ریاست کا نظریہ اب رد ہو چکا ہے۔ تاہم اس کا اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کے نیم مہذب حالات (Semi - civilized Conditions) میں مذہب نے لوگوں کو حکومت کا فرماں بردار بنانے میں اہم حصّہ ادا کیا۔ بعض قدیم حکمراں مذہبی بادشاہ تھے جو لوگوں کو دھوکا دینے میں نہیں ہچکچائے۔ قانون بھی اپنے اندر ایک مذہبی اجازت (Religious Sanction) رکھتا تھا اور قانون کی اطاعت ایک مذہبی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ اس نے لوگوں کو سکھایا کہ انھیں اس وقت بھی اطاعت کرنی چاہیئے جب وہ اطاعت قبول کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہ پاتے ہوں۔ یہ نظریہ اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ وہ سیاست میں ایک قسم کا اخلاقی احساس (- Sense of Morality) پیدا کرتی ہے۔ "یہ سمجھنا کہ ریاست خدا کا ایک عمل ہے، ریاست کو ایک اونچا اخلاقی مقام دینا ہے"[۵۱]

عرض مترجم

۱۔ دورِ جدید کے علماء کی ایک عام کمزوری جو اس ٹکڑے میں بھی واضح طور پر موجود ہے، وہ یہ کہ یہ حضرات اپنی تصنیفات کو معروضی مطالعہ (Objective Study) کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ مگر اکثر جانبداری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اس معاملے میں غلطی کا ایک جزو ایسا ہے جس سے شاید کوئی بھی شخص بری نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ زیادہ تر غیر شعوری نوعیت کی غلطی ہے۔ اگر شعوری نوعیت کی غلطی پائی جائے تو اس کو ناگزیر قرار دے کر اس کے ساتھ رعایت نہیں کی جا سکتی۔

---

۵۱ R.N. Gilchrist, Principles of Political Science, P. 75

خدائی ریاست کا نظریہ، ظاہر ہے کہ مذاہب سے متعلق ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مذاہب کی فہرست میں "اسلام" بھی شامل ہے۔ اور اس اعتبار سے اسلام کو امتیازی مقام حاصل ہے کہ اس نے دنیا کی عظیم ترین "خدائی ریاست" قائم کی ہے۔ جو صرف عظیم تھی بلکہ صحیح معنوں میں خدائی ریاست کا نمونہ بھی تھی اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خدائی ریاست کے نظریاتی خدوخال اور اس کا قانونی ڈھانچہ اگر واقعۃً کہیں پایا جاتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس لئے اس بحث میں اسلام کو نظر انداز کرنا ایک غیر شعوری غلطی نہیں ہو سکتی۔ یہ واضح طور پر ایک شعوری غلطی ہے جس کے لئے کم سے کم کوئی لفظ اگر استعمال کیا جائے تو وہ صرف تعصب ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ کا دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اسلام کو حذف کرنے کی وجہ سے خدائی ریاست کی صحیح ترجمانی بھی کتاب میں نقل نہ ہو سکی۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی ہندو ازم کی تاریخ لکھے اور ہندستان کو مکمل طور پر نظر انداز کر دے، جمہوریت کے آغاز کی تحقیق کرے اور فرانس کو بھول جائے، اشتراکی انقلاب کا تذکرہ کرے اور روس کا نام اس کی زبان پر آنے نہ پائے۔ خدائی ریاست کا نظریہ صرف اسلام کی تاریخ کا جزو نہیں ہے بلکہ وہ آج بھی پوری طرح زندہ ہے۔ ایسی حالت میں جب اس مسئلہ کی وضاحت اس طرح کی جائے کہ اس میں اسلام کا نقطۂ نظر سرے سے بیان ہی نہ کیا گیا ہو تو ایسی بحث کو کس طرح مکمل کہا جا سکتا ہے۔ ایسی ہر کتاب، بلا شبہہ، خدائی ریاست کے نظریہ کی ناقص ترجمانی ہے اور ناقص ترجمانی کسی علمی کتاب کے لئے ہرگز صحیح نہیں ہو سکتی۔

۲۔ اس غلطی کے لازمی نتیجہ کے طور پر جو دوسری غلطی ہوئی ہے، وہ یہ کہ خدائی ریاست کے نظریہ پر کی گئی تمام تنقیدیں صرف اصل نظریہ کے ایک مخصوص مدرسۂ فکر پر تنقیدیں ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص جمہوریت کے موضوع پر قلم اٹھائے اور "سوویٹ ریپبلک" (روسی جمہوریہ) اور "پیپلز چائنا" (عوامی چین) کے حالات بیان کر کے سمجھے کہ اس نے جمہوریت کا باب مکمل کر دیا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ روس اور چین کے "جمہوری" نظام کی بنیاد پر جمہوریت کا جو تصور قائم کیا گیا ہو اور اس کے اوپر جو تنقید کی گئی ہو، وہ لازمی طور پر اصل جمہوریت پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔

عیسائیت اور ہندو ازم کے نقطۂ نظر کی ترجمانی جو کتاب میں کی گئی ہے۔ اس کے متعلق مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے، اس کے متعلق عیسائی اور ہندو حضرات ہی زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات میں پورے یقین کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کا نقطۂ نظر اس ترجمانی سے ... اسلام کا تصور اس سے بالکل

الگ ہے اور چونکہ وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر ادا نہیں ہوا ہے اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کتاب میں مذہب کا پورا نقطہ نظر نقل نہیں ہوا ہے۔ اور خدائی ریاست پر عقیدہ رکھنے والوں کی مکمل ترجمانی اس میں نہیں آسکی ہے۔

۳۔ اسلام کے تصور ریاست کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مختصر طور پر عرض ہے کہ اسلام کی "خدائی ریاست" ان چاروں میں سے کسی ایک خصوصیت کی حامل بھی نہیں ہے جس کو مصنف نے بیان کیا ہے۔ اسلام کا تصور ریاست یہ ہے کہ خدا زمین و آسمان کا مالک ہے۔ اسی لئے اس کو حق ہے کہ اس کی حکمرانی سب کے اوپر قائم ہو۔ خدا کا نائب دنیا میں کوئی بادشاہ نہیں بلکہ خدا کا وہ قانون ہے جو اس نے پیغمبر کے ذریعہ بھیجا ہے۔ اس قانون کے آگے سب لوگ اسی طرح یکساں ہیں جس طرح خدا کے آگے سب لوگ یکساں ہیں۔ اس قانون الٰہی کا اطلاق عوام پر بھی ہوتا ہے اور بادشاہ کے اوپر بھی۔ سب لوگ اس کے آگے جواب دہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام میں خلیفہ کو بھی قاضی (جج) کے سامنے بذات خود عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا جو آج کی جدید ترین جمہوریتوں میں بھی ابھی تک ناقابل تصور ہے۔

مگر ظاہر ہے کہ قانون کے الفاظ خود سے کتاب کے صفحات سے نکل کر زندگی میں رائج نہیں ہو جائیں گے۔ اس کے لئے کسی ذریعہ کی ضرورت ہوگی۔ اور وہ ذریعہ صرف آدمی ہو سکتا ہے۔ اس کا طریقہ خدا نے یہ تجویز کیا ہے کہ لوگوں کی رائے سے حکمراں کا انتخاب کیا جائے۔ اس انتخاب میں جن خصوصیات کو خاص طور پر سامنے رکھا جائے گا وہ یہ کہ حکمراں خدا کے قانون کو جاننے والا اور خدا سے ڈرنے والا ہو۔ اور اس حیثیت سے دیگر عام افراد کو اس کے اوپر اعتماد ہو۔ ایسے شخص کو منتخب کر کے ریاست کا انتظام اس کے سپرد کیا جائے گا۔ اور وہ وزراء اور مشیروں نیز اسمبلی کے ذریعہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کریگا۔

جو لوگ اس طرح سے اسلامی ریاست کا حکمراں مقرر کریں گے۔ انھیں مکمل حق ہے کہ کسی وقت بھی اپنے حکمراں سے غیر مطمئن ہوں تو اپنا انتخاب واپس لے کر اسے معزول کر دیں۔ گویا کسی حکمراں کا عزل و نصب خدا کی طرف سے نہیں بلکہ عوام کی طرف سے ہوتا ہے۔ البتہ عوام کے سامنے انتخاب کے اور عزل و نصب کے جو اصول ہوتے ہیں، وہ وہی ہوتے ہیں جو خدا نے پہلے سے مقرر کر دیئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ اسلامی تصور ریاست کے مطابق بادشاہ خدا سے اپنا اقتدار حاصل نہیں کرتا نہ وہ پیدائشی طور پر کسی گدی کا وارث ہوتا ہے، بلکہ عوام اسے جمہوری طریقہ پر منتخب کرتے ہیں۔ البتہ وہ خدائی

قانون کے سامنے جواب دہ ہے۔ اسی طرح بادشاہت وراثتی حق نہیں بلکہ عوامی تقرر ہے جو اسی طرح منسوخ ہو سکتا ہے جیسے اس کا تقرر عمل میں آتا ہے۔ اسلامی ریاست میں بادشاہ جس طرح خدا کے سامنے جواب دہ ہے اسی طرح وہ عوام کے سامنے بھی جواب دہ ہے۔ البتہ عوامی جواب دہی کا معیار اسلامی ریاست میں خود عوام کی خواہشات نہیں بلکہ اسلام کا قانون ہے۔ اسی طرح بادشاہ کے اقتدار کی مزاحمت کسی بھی درجہ میں گناہ نہیں۔ البتہ انارکی اور فساد پیدا کرنا ضرور گناہ ہے۔

قابل مطالعہ چند نئی کتابیں

عرب و ہند عہد رسالت میں

(از قاضی اطہر مبارک پوری)

کتاب میں موضوع کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ۸ ابواب ہیں جن میں آخر کے یہ تین باب خاص طور سے لائق مطالعہ ہیں۔

(۱) پیغمبر اسلام اور ہندوستانی باشندے۔

(۲) عہد رسالت میں ہندوستانی اشیاء کا استعمال

(۳) اسلام اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد مستند ماخذ سے اہم اور نادر معلومات جمع کیے گئے ہیں۔

شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ قیمت مجلد -/۵

حضرت عثمان کے سرکاری خطوط

دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ عربی خورشید احمد فارق کی دو کتابیں "حضرت ابوبکر کے سرکاری خطوط" اور "حضرت عمر کے سرکاری خطوط" شائع ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں، یہ اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہے۔ وہی محققانہ و تنقیدی انداز اور وہی سائز

قیمت مجلد -/۶

تاریخ ردّۃ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عہد صدیقی کی بغاوتوں اور عسکری سرگرمیوں کی مفصل تاریخ اور بعض اہم نادر معلومات جن سے واقعات کے بالکل نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ قیمت مجلد -/۵

سرکشی بجنور

(از سر سید احمد خاں)

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت سر سید احمد خاں ضلع بجنور میں صدر امین کے عہدہ پر فائز تھے ایک خاص نقطۂ نظر سے انھوں نے اس معرکہ میں انگریزوں کی کھلی مدد کی تھی، ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد اپنے اسی نقطۂ نظر کے مطابق انھوں نے یہ کتاب بھی لکھی ہو۔ یہ ضلع بجنور کے اس سلسلہ کے واقعات کا گویا تفصیلی روزنامچہ ہے جو اپنے اندر بڑی اہم تیرہ رکھتا ہے۔ مدتوں سے یہ کتاب نایاب تھی۔ قریباً ۳۰ صفحے کے مقدمہ اور قریباً ۵۰ صفحات کے تحشیہ اور بہت سے حاشیہ کے اضافہ کے ساتھ اس کا یہ ایڈیشن چھپا ہے۔

قیمت مجلد -/۴

الفرقان لکھنؤ

ترتیب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

منظور نعمانی

قیمت فی پرچہ 65 P.

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے
مزید محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

فی کاپی .... ۶۵ پیسے

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۷/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-

جلد ۳۴	بابت ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ مطابق مارچ ۱۹۶۷ء	شمارہ ۱۰

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ مارچ تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔ اور ڈاکخانہ کی پہلی رسید کے ساتھ ہمیں براہ راست اطلاع دیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ ان کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ہندوستان کے چوتھے عام انتخاب نے پرانی بساطِ سیاست اُلٹ دی ہے اور ماننا پڑے گا کہ اس میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ کیرالا اور مدراس کو چھوڑ کر، جہاں کانگریس ایک حقیر اقلیت ہو گئی ہے۔ اور پنجاب کو چھوڑ کر جہاں مسلمانوں کا وجود برائے نام ہے، جہاں جہاں بھی کانگرس کو حکومت بنانے بھر کی اکثریت نہیں مل سکی یا ملی تو بہت معمولی اکثریت ملی، وہ ان مسلمان ووٹوں سے محرومی کا نتیجہ ہے جو اب تک کانگریس ہی کو ملتے رہے تھے۔ اور اس دفعہ بھی مل جاتے تو یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔

لیکن تصویر کا یہ رُخ بھی ہم سے مخفی نہ رہنا چاہئے کہ ہمارے ووٹوں کا وزن اضافی ہے حقیقی نہیں، کیرالا کے ایک خاص علاقے کو چھوڑ کر، جس سے انڈین مسلم لیگ کی زندگی وابستہ ہے، سارے ملک میں شاذ و نادر ہی ایسے مقامات ہیں جہاں سے کسی امیدوار کو ہم محض اپنے ووٹوں کے بل پر کامیاب کرا سکیں۔ باقی تمام ملک میں ہمارے ووٹ کی طاقت صرف یہ ہے کہ اکثریت کے ووٹ اگر دو یا دو سے زیادہ حریفوں کے درمیان کسی قابل لحاظ تناسب سے بٹ رہے ہوں تو ہم کسی ایک کے حق میں اپنا وزن ڈال کر اس کا پلڑا بھاری ... کسی کو شکست ... تو وہ بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اکثریت ... کے خلاف جا رہی ہو۔ اور فتح چاہیں تو اس کی بھی شرط یہی ہے کہ اکثریت کی پوزیشن ... ووٹوں سے شکست و فتح کا نقشہ نہیں بن سکتا۔

... کے نتائج ہی میں ہم اس حقیقت کا مشاہدہ کر سکتے ... کامیابی کا تناسب بہت زیادہ رہا۔ اس لیے ... سے ہم آہنگ تھی۔ لیکن ہم نے جن لوگوں کی ... اجتماعی حیثیت سے کیا ان کے مقابلے ... وہ بھی جب کہ بیشتر مقامات پر ہم نے

اپنی حمایت کے لیے امیدواروں کا انتخاب کرنے میں اُن کے کامیابی کے دوسرے امکانات کو بھی پیش نظر رکھا تھا اور جن سنگھ کو چھوڑ کر وہ تمام ہی مخالف پارٹیوں اور آزاد امیدواروں میں سے مضبوط امیدوار دیکھ کر چُنے گئے تھے) اس لیے کہ اس معاملے میں ہمارا اور اکثریت کی ایک ضروری تعداد کا اتفاق ہر جگہ نہیں ہو سکا ـــــ اس کے برعکس جن سنگھ جسے صرف اکثریتی فرقے کے ووٹ ملتے ہیں، وہ جن ریاستوں میں با اثر تھی وہاں وہ صرف اکثریتی ووٹوں ہی کے بل پر اُن تمام پارٹیوں کی مجموعی کامیابی سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب رہی جن کے بہت سے امیدواروں کو ہماری حمایت حاصل تھی۔ اور یہ کامیابی اُسے تنہا کانگریس کے مقابلے میں حاصل نہیں ہوئی، بلکہ کانگریس کے ساتھ ساتھ بہت سے اُن امیدواروں کے بھی مقابلے میں، جن کا ساتھ ہم نے دیا تھا ـــــ یہی فرق ہے حقیقی اور اضافی وزن کا!

اس فرق اور اس کے اثرات پر نگاہ رکھنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ ہم اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ ہندوستان کی حکومت بنانا اور بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہیں اُٹھا دیں اور جس کو چاہیں گرا دیں۔ کل تک ہم نے کانگریس کا ساتھ دیا تو وہ سارے ملک پر حکمراں رہی۔ اس سال ہاتھ کھینچ لیا تو اس کی زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے اگر اس طرح سوچا تو یہ بڑی بھول ہوگی۔ کل تک ہمارے ووٹ کانگریس کو اس لیے فائدہ دے رہے تھے کہ اکثریت کی بڑی مؤثر تعداد اس کے ساتھ تھی۔ اس دفعہ یہ تعداد بہت گھٹ گئی تھی۔ اس لیے اگر ہم اس کا ساتھ بھی دیتے تو پچھلی جیسی مضبوط پوزیشن اسے بہر حال حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اگر حالات موجودہ رُخ پر ہی چلتے رہے تو آئندہ کا نقشہ یہ ہوگا کہ بالفرض ہم اس کا ساتھ بھی دیں تو اس کی آج کی پوزیشن کو برقرار رکھنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

الغرض کسی کو اُوپر اُٹھانے کے لیے ہمارے ووٹ مؤثر اُس وقت ہیں جب اکثریت کی بھی ایک مؤثر تعداد اس کے ساتھ ہو۔ اور اس لیے اپنے ووٹوں میں اجتماعیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اس حیثیت کو بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اپنی طاقت کا غلط اندازہ بھی ہم کو نقصان پہونچا سکتا ہے۔

ہمیں اس حقیقت سے بھی غافل نہ ہونا چاہیے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی مخصوص دینی تہذیب اور ملی انفرادیت پر قائم رہتے ہوئے یہیں مساویانہ باعزت

زندگی حاصل ہو۔ اس لیے قدرتی طور پر انتخابات کے بارے میں ہمارے طرز عمل کے فیصلہ کا محور ہمارا یہی مقصد ہوگا اور ہونا چاہیے۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم ملک کی سیاسی پارٹیوں پر نظر ڈالیں گے تو ان میں بعض وہ نظر آئیں گی جن کے اصول و نظریات میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، اور ان سے اس کی توقع کرنا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آگ سے ٹھنڈک اور برف سے گرمی کی، اور بعض وہ ہوں گی جن کے بنیادی اصولوں میں اس کی گنجائش ہے۔ کانگریس بھی انھیں میں سے ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنے اصول اور اپنی تاریخ کے اعتبار سے وہ دوسری تمام سیکولر پارٹیوں کے مقابلہ میں اس لحاظ سے قابلِ ترجیح سمجھی جاتی تھی اور اسی لیے گزشتہ تین انتخابوں میں مسلمانوں کی عام تائید و حمایت اسی کو حاصل ہوتی رہی، لیکن اس کے ۱۹ سالہ دورِ اقتدار میں مسلمانوں نے مسلسل یہی دیکھا کہ ان کے دینی و تہذیبی تشخص، ان کی ملی انفرادیت اور اسی طرح کے ان کے دوسرے مسائل کے بارے میں کانگریس کے نمائندوں کا رویہ اس سے بہت زیادہ مختلف نہیں رہا جس کی توقع ہندو مہاسبھا یا جن سنگھ کے نمائندوں سے کی جا سکتی تھی۔ اس احساس اور تجربہ نے مسلمانوں میں کانگریس کے خلاف عام بیزاری پیدا کر دی اور انھوں نے اس چھٹے انتخاب میں اپنا وزن کانگریس کے خلاف ڈالا۔ اور حسنِ اتفاق کہ یہ ایسے وقت ہوا جبکہ کانگریسی حکومتوں کی نااہلی اور کانگریسیوں کی بدعنوانیوں کے نتیجہ میں عوام سخت تکلیفوں میں مبتلا تھے اور پورے ملک میں کانگریس سے بیزاری کی ہوا چلی ہوئی تھی۔ اور اس کو مسلمانوں کی تائید و حمایت کی ہمیشہ سے زیادہ احتیاج تھی، ان حالات میں مسلمانوں کی تائید سے محروم ہو جانے کی وجہ سے اسے شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ خدا کرے یہ سبق اس کے لیے کافی ہو۔

مسلمانوں نے اس انتخاب میں جو رول ادا کیا ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت صرف سلبی ہے — اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان کے صرف سلبی اقدام نے بھی ان کا وزن محسوس کرا دیا لیکن ان کے مسائل بالکل اپنی جگہ پر ہیں اور ان کے حل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ذہنوں کی تبدیلی ہو — اس کے لیے مسلم قیادت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک طرف ملت کو جوش و خروش کے ساتھ ایسے کاموں میں مشغول کرے اور ایسے اقدامات کی طرف ان کی رہنمائی کرے جن کے نتیجہ میں عوامی سطح پر ملک کے مختلف فرقوں خاص کر ہندوؤں اور مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ قرب و اعتماد اور حسنِ تفاہم کی فضا پیدا ہو اور پوری قوم اور ملک کے لیے مسلمانوں کی افادیت سب کے سامنے آئے — اور دوسری طرف مسلمانوں کے مخصوص مسائل کے بارے میں ملک کے

یاسی حلقوں کا ذہن صاف کرنے اور اُن کی غلط فہمیاں دور کرنے کی طرف خاص توجہ کی جائے۔ اس وقت کی فضا میں یہ کام انشاء اللہ بہت نتیجہ خیز ہوگا۔

اس وقت کا خاص فریضہ اور مقبول ترین عمل :-

تھوڑے بہت فرق کے ساتھ پورے ملک کو اس وقت غذائی کی اور شدید ترین مہنگائی کے عذاب نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اللہ کی پناہ آٹا روپیہ کا آدھا کیلو رہا ہے، یہی نرخ معمولی قسم کے چاول کا بھی ہے، ذرا سوچئے اس ملک میں اور خود ہمارے آس پڑوس میں بلکہ اپنے عزیزوں قریبوں میں بھی کتنے ہیں جن کے ساتھ بیوی کے علاوہ دو چار بچے بھی ہیں اور ان کی یقینی آمدنی ڈیڑھ روپئے یومیہ بھی نہیں ہے اگر وہ ایک وقت بھوکے بھی رہیں اور ننھے ننھے بچوں کو بھی فاقے کرائیں تو دوسرے وقت پیٹ بھرنے کے لیے بھی انھیں ڈیڑھ روپئے سے زیادہ چاہئیں! —— کیا گزر رہی ہوگی اس ملک کے ایسے کروڑوں بندوں پر!۔

ان سنگین حالات میں ارباب حکومت کی جو ذمہ داری ہے اس کے بارے میں اس وقت کچھ عرض کرنا نہیں ہے —— بلکہ صرف ان بندگانِ خدا سے جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نوازا ہے بلکہ اپنے جیسے اُن بھائیوں سے بھی جو دولتمندوں میں تو نہیں ہیں مگر ربِ کریم کی طرف سے ان کو اتنا رزق نصیب ہے کہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے ساتھ وہ کسی فاقہ کش بھائی کی بھی کچھ مدد کر سکتے ہیں، اُس کریم پروردگار کے نام پر جس کے فضل سے خود ہم فاقہ کشی کی اس مصیبت میں مبتلا نہیں کیے گئے ہیں، پوری دردمندی کے ساتھ یہ اپیل ہے کہ بندگانِ خدا کو بھوک کی تکلیف سے بچانے کے لیے اس وقت وہ سب کچھ کریں جو اُن کے امکان میں ہو، یہاں تک کہ جو لوگ اپنا پیٹ کاٹے بغیر کسی کی مدد نہ کر سکتے ہوں وہ اس سے بھی دریغ نہ کریں، یہ بھی انسانیت کا تقاضا اور ہم مسلمانوں کے لیے ایمانی فریضہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ

"وہ آدمی مسلمان نہیں جو رات کو پیٹ بھر کے سوئے اور اُسے معلوم ہو کہ اُسکے

قریب میں اللہ کا کوئی بندہ فاقہ سے ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اسلام نے اس معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں کی ہے. بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بھوکے جانوروں کی خبر گیری کی بھی ہدایت اور تاکید فرماتے تھے۔ اور ان کو بھوکا دیکھ کر آپ کا دل دکھا تھا۔

بلاشبہ موجودہ حالات میں بھوک کے مارے بندوں کے پیٹ کی فکر رحیم و کریم پروردگار کی نگاہ میں سب سے زیادہ محبوب عمل ہے، اور ایسے لوگ یقیناً اللہ کی رحمت کے خاص مستحق ہیں ــــ مشہور حدیث نبوی ہے۔

اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ	مخلوق پر رحم کھانے والوں پر خدا کی
اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ	رحمت ہوگی۔ تم زمین پر بسنے والوں پر رحم
مَنْ فِي السَّمَاءِ۔	کھاؤ رب السمٰوٰت تم پر رحم فرمائے گا۔

بہر حال بھوک کی مصیبت میں مبتلا بندگانِ خدا کی خبر گیری اور خدمت کے سلسلہ میں اس وقت انفرادی یا اجتماعی طور پر جس سے جو کچھ ہو سکے اس سے دریغ نہ کیا جائے، انشاء اللہ دنیا میں بھی اس کی یہ جزا ضرور ملے گی کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے حفاظت فرمائے گا۔

معذرت

زیر نظر شمارہ بعض اتفاقی موانع کی بدولت ایک ہفتے کی تاخیر سے بھی شائع ہو رہا ہے اور پھر بھی ۸ صفحات کم رہ گئے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

منیجر

كِتَابُ الدَّعَوَاتُ

مَعَارِفُ الحَدِيث

(مُسَلسَل)

ختمِ نماز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعائیں:-

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ كُنَّا إِذَا صَلَّيْنَا خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْبَبْنَا أَنْ نَكُونَ عَنْ يَمِينِهِ يُقْبِلُ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ رَبِّ قِنِي عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ ——— رواہ مسلم

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو ہم یہ چاہا کرتے تھے کہ آپ کے داہنی جانب کھڑے ہوں، آپ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہماری طرف رُخ فرماتے تھے تو میں نے سُنا آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے "رَبِّ قِنِي عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ" (اے پروردگار مجھے اپنے عذاب سے بچا اُس دن جس دن کہ تو بندوں کو اُٹھائے اور دوبارہ اُن کو زندہ کرے۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت براء کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد داہنی جانب رُخ کر کے بیٹھتے تھے، اور حضرت سمرہ بن جندب کی ایک روایت ہے جس کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سلام کے بعد مقتدیوں کی جانب رُخ کر کے بیٹھتے تھے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ

نمازِ تہجد کی افتتاحی دعائیں :-

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَتَهَجَّدُ قَالَ اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ وَقَوْلُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ أَسْلَمْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْكَ أَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَإِلَيْكَ حَاكَمْتُ فَاغْفِرْلِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تہجد پڑھنے کھڑے ہوتے تو یہ دعا کرتے "اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ الخ" (اے میرے اللہ ساری حمد و ستائش تیرے ہی لیے ہے اور تو ہی اس کا مستحق ہے، تو ہی قائم رکھنے والا ہے زمین و آسمان کا اور ان سب چیزوں کا جو ان میں ہیں (یعنی سارے عالم علوی اور سفلی کا وجود تیرے ہی ارادے سے قائم ہے) مولا! ساری حمد و ستائش کا تو ہی مستحق ہے، تو ہی نور ہے زمین و آسمان کا اور ان سب کا جو زمین و آسمان میں ہیں (یعنی سارے عالم میں جہاں بھی نور کی کوئی کرن ہے وہ تیرے ہی نور سے ہے) اور ساری حمد و ستائش تیرے ہی لیے ہے تو فرمانروا ہے زمین و آسمان اور اس ساری کائنات کا جو زمین و آسمان میں ہے۔ ساری حمد و ستائش تیرے ہی لیے سزاوار ہے، تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے، مرنے کے بعد تیرے حضور حاضری اور تیری ملاقات حق ہے، اور تیرا فرمان حق ہے، اور جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے اور سارے نبی برحق ہیں اور محمد بھی

برحق ہے اور قیامت کا آنا برحق ہے۔ اے اللہ میں نے اپنے کو تیرے سپرد کر دیا اور میں تجھ پر ایمان لایا اور میں نے تیرا سہارا پکڑ لیا اور پورا بھروسہ تجھ پر کر لیا اور اپنا رُخ تیری طرف کر دیا اور (مخالفین حق سے) تیری ہی مدد سے میری ٹکر ہے۔ اور میں نے اپنا مقدمہ فیصلہ کے لیے تیری ہی بارگاہ میں پیش کر دیا ہے۔ پس اے میرے اللہ بخش دے میرے وہ سب قصور جو مجھ سے پہلے سرزد ہوئے اور جو پیچھے ہوئے اور جو میں نے پوشیدہ کیے اور جو علانیہ کئے اور جن کے بارے میں تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، تو جسے چاہے آگے بڑھانے والا ہے اور جسے چاہے پیچھے ڈال دینے والا ہے، تیرے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں، صرف تو ہی معبود برحق ہے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن دعاؤں میں سے ہے جن سے آپ کے مقام معرفت اور آپ کی باطنی کیفیات و واردات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ إِفْتَتَحَ صَلٰوتَهٗ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ إِلٰهَ جِبْرَئِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ——— رواہ مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز تہجد کے لیے کھڑے ہوتے تو بالکل شروع میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرتے۔ "اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَئِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ" الخ (اے میرے اللہ، جبرئیل و میکائیل اور اسرافیل کے پروردگار، زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے، غیب اور شہود کو یکساں جاننے والے، تو ہی فیصلہ فرمائے گا بندوں کے درمیان ان کے اختلافات کے بارے میں، مجھے اپنی جانب توفیق سے اُس راہ حق و ہدایت پر چلا جس کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہو گیا ہے۔ تو ہی جسے چاہے گا سیدھے راستے پر چلائے گا۔

(صحیح مسلم)

ختمِ تہجد پر آپ کی ایک نہایت جامع دعا:۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيْلَةً
حِيْنَ فَرَغَ مِنْ صَلٰوتِهِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِكَ تَهْدِيْ
بِهَا قَلْبِيْ وَتَجْمَعُ بِهَا اَمْرِيْ وَتَلُمُّ بِهَا شَعْثِيْ وَتُصْلِحُ بِهَا غَائِبِيْ وَتَرْفَعُ
بِهَا شَاهِدِيْ وَتُزَكِّيْ بِهَا عَمَلِيْ وَتُلْهِمُنِيْ بِهَا رُشْدِيْ وَتَعْصِمُنِيْ بِهَا
مِنْ كُلِّ سُوْءٍ اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِيْ اِيْمَانًا وَّيَقِيْنًا لَيْسَ بَعْدَهٗ كُفْرٌ وَرَحْمَةً
اَنَالُ بِهَا شَرَفَ كَرَامَتِكَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ
الْفَوْزَ فِي الْقَضَاءِ وَنُزُلَ الشُّهَدَاءِ وَعَيْشَ السُّعَدَاءِ وَالنَّصْرَ عَلَى
الْاَعْدَاءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُنْزِلُ بِكَ حَاجَتِيْ وَاِنْ قَصُرَ رَاْيِيْ وَضَعُفَ عَمَلِيْ
اِفْتَقَرْتُ اِلٰى رَحْمَتِكَ فَاَسْأَلُكَ يَا قَاضِيَ الْاُمُوْرِ وَيَا شَافِيَ الصُّدُوْرِ
كَمَا تُجِيْرُ بَيْنَ الْبُحُوْرِ اَنْ تُجِيْرَنِيْ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ وَمِنْ دَعْوَةِ الثُّبُوْرِ
وَمِنْ فِتْنَةِ الْقُبُوْرِ اَللّٰهُمَّ مَا قَصُرَ عَنْهُ رَاْيِيْ وَلَمْ تَبْلُغْهُ نِيَّتِيْ وَلَمْ
تَبْلُغْهُ مَسْأَلَتِيْ مِنْ خَيْرٍ وَعَدْتَهٗ اَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ اَوْ خَيْرٍ اَنْتَ
مُعْطِيْهِ اَحَدًا مِنْ عِبَادِكَ فَاِنِّيْ اَرْغَبُ اِلَيْكَ فِيْهِ وَاَسْأَلُكَهٗ بِرَحْمَتِكَ
رَبَّ الْعَالَمِيْنَ اَللّٰهُمَّ ذَا الْحَبْلِ الشَّدِيْدِ وَالْاَمْرِ الرَّشِيْدِ اَسْأَلُكَ
الْاَمْنَ يَوْمَ الْوَعِيْدِ وَالْجَنَّةَ يَوْمَ الْخُلُوْدِ مَعَ الْمُقَرَّبِيْنَ الشُّهُوْدِ
الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ الْمُوْفِيْنَ بِالْعُهُوْدِ اِنَّكَ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ وَاِنَّكَ تَفْعَلُ
مَا تُرِيْدُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا هَادِيْنَ مُهْتَدِيْنَ غَيْرَ ضَالِّيْنَ وَلَا مُضِلِّيْنَ
سِلْمًا لِاَوْلِيَائِكَ وَعَدُوًّا لِاَعْدَائِكَ نُحِبُّ بِحُبِّكَ مَنْ اَحَبَّكَ وَ
نُعَادِيْ بِعَدَاوَتِكَ مَنْ خَالَفَكَ اَللّٰهُمَّ هٰذَا الدُّعَاءُ وَعَلَيْكَ
الْاِجَابَةُ وَهٰذَا الْجُهْدُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِّيْ نُوْرًا فِيْ
قَلْبِيْ وَنُوْرًا فِيْ قَبْرِيْ وَنُوْرًا مِّنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَنُوْرًا مِّنْ خَلْفِيْ وَنُوْرًا

عَنْ يَمِيْنِيْ وَنُوْرًا عَنْ شِمَالِيْ وَنُوْرًا مِنْ فَوْقِيْ وَنُوْرًا مِنْ تَحْتِيْ وَنُوْرًا فِيْ سَمْعِيْ وَنُوْرًا فِيْ بَصَرِيْ وَنُوْرًا فِيْ شَعْرِيْ وَنُوْرًا فِيْ بَشَرِيْ وَنُوْرًا فِيْ لَحْمِيْ وَنُوْرًا فِيْ دَمِيْ وَنُوْرًا فِيْ عِظَامِيْ اَللّٰهُمَّ اَعْظِمْ لِيْ نُوْرًا وَاَعْطِنِيْ نُوْرًا وَاجْعَلْ لِيْ نُوْرًا سُبْحَانَ الَّذِيْ تَعَطَّفَ الْعِزَّ وَقَالَ بِهٖ سُبْحَانَ الَّذِيْ لَبِسَ الْمَجْدَ وَتَكَرَّمَ سُبْحَانَ ذِي الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

—————— رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات نماز تہجد سے فارغ ہوئے تو میں نے آپ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِكَ تَهْدِيْ بِهَا قَلْبِيْ..... الخ (اے اللہ میں تجھ سے دعا اور التجا کرتا ہوں، تو محض اپنے فضل و کرم سے مجھ پر ایسی وسیع اور ہمہ گیر رحمت فرما جس سے میرا قلب تیری ہدایت سے بہرہ یاب ہو اور اپنے سارے معاملات میں مجھے تیری اس رحمت سے جمعیت نصیب ہو اور میری ظاہری و باطنی پراگندگی اور ابتری دور ہو اور مجھ سے تعلق رکھنے والی جو چیزیں میرے پاس نہیں، دور اور غائب ہیں تیری رحمت سے ان کو صلاح و فلاح حاصل ہو اور جو میرے پاس حاضر و موجود ہیں ان کو تیری رحمت سے رفعت اور قدر افزائی نصیب ہو اور خود میرے اعمال کا تیری اس رحمت سے تزکیہ ہو۔ اور تیری طرف سے میرے قلب میں وہی ڈالا جائے جو میرے لیے صحیح اور مناسب ہو اور جس چیز سے مجھے رغبت اور الفت ہو وہ مجھے تیری اس رحمت سے عطا ہو اور ہر برائی سے تو میری حفاظت فرما۔

اے میرے اللہ! میرے دل کو وہ ایمان و یقین عطا فرما جس کے بعد کسی درجہ کا بھی کفر نہ ہو (یعنی کوئی بات بھی مجھ سے ایمان کے خلاف سرزد نہ ہو) اور مجھے اپنی اس رحمت سے نواز جس کے طفیل دنیا اور آخرت میں مجھے عزت و شرف کا مقام حاصل ہو۔

اے اللہ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں قضا و قدر کے فیصلوں میں کامیابی کی اور تجھ سے مانگتا ہوں تیرے شہید بندوں والا اعزاز اور تیرے نیک بخت بندوں والی زندگی اور دشمنوں کے مقابلہ میں تیری حمایت و مدد۔

اے اللہ میں تیری بارگاہ میں اپنی حاجتیں لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اگرچہ میری عقل ورائے کوتاہ اور میرا عمل اور جدوجہد ضعیف ہے۔ اے رحیم وکریم! میں تیری رحمت کا محتاج ہوں۔ بس اے سارے امور کا فیصلہ فرمانے والے اور قلوب کے روگ دور کر کے ان کو شفا بخشنے والے مالک ومولا! جس طرح تو اپنی قدرت کاملہ سے (ایک ساتھ بہنے والے) سمندروں کو ایک دوسرے سے جدا رکھتا ہے (کہ کھاری شیریں سے الگ رہتا ہے اور شیریں کھاری سے) اسی طرح تو مجھے آتشِ دوزخ سے اور اس عذاب سے جدا اور دور رکھ جس کو دیکھ کے آدمی موت کی دعا مانگے گا اور اسی طرح مجھے عذاب قبر سے بچا۔

اے میرے اللہ! تو نے جس خیر اور نعمت کا اپنے کسی بندہ کے لیے وعدہ فرمایا ہو یا جو خیر اور نعمت تو کسی کو بغیر وعدہ کے عطا فرمانے والا ہو اور میری عقل ورائے اس کے شعور اور اس کی طلب سے قاصر رہی ہو اور میری نیت بھی اس تک نہ پہونچی ہو اور میں نے تجھ سے اس کی استدعا بھی نہ کی ہو تو اے میرے اللہ! تیری رحمت سے میں اس کی بھی تجھ سے التجا کرتا ہوں۔ اور تیرے کرم کے بھروسے اس کا بھی طالب اور شائق ہوں تو اپنے رحم وکرم سے وہ خیر و نعمت بھی مجھے عطا فرما۔

اے میرے وہ اللہ جس کا رشتہ مضبوط ومحکم ہے اور جس کا ہر حکم اور کام صحیح و درست ہو میں تجھ سے استدعا کرتا ہوں کہ "یوم الوعید" یعنی قیامت کے دن مجھے امن چین عطا فرما۔ اور "یوم الخلود" یعنی آخرت میں میرے لیے جنت کا فیصلہ فرما۔ اپنے ان بندوں کے ساتھ جو تیرے مقرب اور تیری بارگاہ کے حاضر باش ہیں اور رکوع وسجود یعنی نماز وعبادت میں مشغول رہنا جن کا وظیفۂ حیات ہے اور وفاءِ عہد جن کی خاص صفت ہے۔

اے میرے اللہ! تو بڑا مہربان اور بڑی عنایت ومحبت فرمانے والا ہے اور "فعّالٌ لما یرید" تیری شان ہے۔ اے اللہ ہمیں ایسا کر دے کہ ہم دوسروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنیں۔ اور خود ہدایت یاب ہوں، نہ خود گم کردہ راہ ہوں اور نہ دوسروں کے لیے گمراہ کن تیرے دوستوں سے ہماری صلح ہو اور تیرے دشمنوں کے ہم دشمن ہوں، جو کوئی تجھ سے محبت رکھے ہم تیری اس محبت کی وجہ سے اس سے محبت کریں اور جو تیرے خلاف چلے اور عداوت کی راہ

اختیار کرے تیری عداوت کی وجہ سے ہم بھی اس سے عداوت اور بغض رکھیں۔

اے اللہ! یہ میری دعا ہے اور قبول فرمانا تیرے ذمہ ہے اور یہ میری حقیر کوشش ہے اور اعتماد و بھروسہ اپنی کوشش اور دعا پر نہیں بلکہ صرف تیرے کرم پر ہے۔

اے اللہ میرے قلب میں نور پیدا فرما اور میری قبر کو نورانی کردے اور منور کردے میرے آگے اور میرے پیچھے اور میرے دائیں اور میرے بائیں اور میرے اوپر اور میرے نیچے (یعنی میرے ہر طرف تیرا نور ہی نور ہو) اور اے اللہ نور پیدا فرما میری شنوائی اور بینائی میں۔ اور میرے بال بال اور روئیں روئیں میں اور میرے گوشت و پوست میں اور میری رگوں میں دوڑنے والے میرے خون میں اور میری ہڈیوں میں۔ اے اللہ میرے نور کو بڑھا اور مجھے نور عطا فرما اور نور کو میرا اور میرے ساتھ کردے۔

پاک ہے وہ پروردگار جس نے عزت و جلال کی چادر اوڑھ لی ہے اور مجد و کرم اس کا لباس و شعار ہے، پاک ہے وہ رب قدوس جس کے سوا کسی کو تسبیح سزاوار نہیں، پاک ہر بندوں پر فضل و انعام فرمانے والا، پاک ہے جس کی خاص صفت عظمت و کرم ہے۔ پاک ہے "رب ذوالجلال والاکرام" (جامع ترمذی)

تشریح) سبحان اللہ کتنی بلند اور کسقدر جامع ہے یہ دُعا، تنہا اسی ایک دُعا سے (اور اس سے پہلے جو دُعائیں درج ہوئیں اُن سے بھی) اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے شئون و صفات کی کتنی معرفت حاصل تھی، اور عبدیت جو بندہ کا سب سے بڑا کمال ہے اس میں آپ کا کیا مقام تھا، اور سید العالمین اور محبوب رب العالمین ہونے کے باوجود اپنے کو آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے کرم کا کتنا محتاج سمجھتے تھے اور بندگی و نیازمندی کی کس فقیرانہ شان کے ساتھ اس سے اپنی حاجتیں مانگتے تھے، نیز یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دُعا کے وقت آپ کے قلب مبارک کی کیا کیفیت ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے انسانی حاجتوں کا کتنا تفصیلی اور عمیق احساس آپ کو عطا فرمایا تھا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ جیسے رؤف اور رحیم و کریم ہیں اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کے ایک ایک فقرہ پر

اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں کیسا تلاطم اور دعا مانگنے والے پر کتنا پیار آتا ہوگا۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضور کی دعائیں امت کے لیے آپ کا عظیم ترین ورثہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس ورثہ کی قدر و قیمت سمجھیں، اور اس سے پورا حصہ لینے کی کوشش کریں۔

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ

اور

اُن کی تبلیغی تحریک

از وحید الدین خاں

سنہ ۱۹۶۶ء کی سردیوں کا ایک دن تھا۔ میں نارتھ ایسٹرن ریلوے کے ایک اسٹیشن پر اُترا۔ کچھ دور آگے چلا تھا کہ سامنے نظر آیا کہ ایک پیدل قافلہ سڑک کو پار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قدیم وضع کا سادہ لباس، حُلیہ سے دینداری اور اخلاص نمایاں، بستر اور ضروری سامان کا بنڈل اپنے اوپر لادے ہوئے چلا جا رہا ہو۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کسی دوسری دُنیا کی مخلوق ہے جو اچانک زمین پر اُتر آئی ہے — شاید مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کون لوگ تھے۔ کیونکہ یہ اب عام طور پر لوگوں کے لیے ایک مانوس منظر بن چکا ہے۔ ملک میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنھیں کبھی نہ کبھی اس منظر سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ اب اس طرح کی شکلیں دیکھ کر ہر شخص خود سمجھ جاتا ہے کہ یہ کن لوگوں کا قافلہ ہے اور کس مقصد کیلئے اِدھر سے اُدھر سفر کر رہا ہے۔

اس طرح کے بیشمار قافلے آج ساری دُنیا میں اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کر رہے ہیں۔ شاید ۲۴ گھنٹے میں کوئی وقت ایسا نہیں ہوگا جبکہ دین کی یہ نقل و حرکت کہیں نہ کہیں جاری نہ ہو۔ یہ عظیم حرکت جو تبلیغ کے نام سے چل رہی ہے اور جس نے آج لاکھوں انسانوں میں ایک نیا جوش اور نئی ہلچل پیدا کر دی ہے، اس کا آغاز کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جو اپنے لاغر جسم، پستہ قد، اور غیر نمایاں شخصیت کے ساتھ لکنت کا بھی شکار تھا۔ اور مشکل سے اپنی کسی بات کو صاف طور پر ادا

کر سکتا تھا۔ یہی وہ حیرت انگیز وجود ہے جس کو لوگ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اس نے جو دینی نقل و حرکت پیدا کی، اس کو عوام کی زبان میں "تبلیغی جماعت" کہا جاتا ہے۔ مولانا اگرچہ جسمانی اعتبار سے کمزور اور دُبلے آدمی تھے۔ مگر اس کمزور جسم کے اندر ایک انتہائی طاقت ور چیز چھپی ہوئی تھی، اور وہ ہے لوگوں کو دین کی راہ پر ڈالنے کا بے پناہ جذبہ۔ یہی چیز تھی جس نے ایک کمزور شخص سے وہ کام کرا دیا جو طاقتوروں سے نہیں ہو سکتا۔

<u>ابتدائی حالات</u> انیسویں صدی کے آخر میں اگر کوئی شخص دہلی کی کسی اونچی عمارت پر چڑھے تو اس کو شہر کے باہر جنوبی سمت میں دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں کے درمیان چند بے ترتیب عمارتیں نظر آئیں گی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں نظام الدین اولیاء کا مزار ہے اور اسی نسبت سے یہ جگہ بستی نظام الدین کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں اس وقت ایک بزرگ رہا کرتے تھے جن کا نام مولانا محمد اسماعیل (م ۱۸۹۸ء) تھا۔ ان کا معمول تھا کہ جو مزدور اُدھر آ نکلتے اُن کا بوجھ اُتار کر رکھتے اور اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر اُن کو پانی پلاتے، پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی انہیں بزرگ کے صاحبزادے تھے۔ جن کی ولادت ۱۳۰۳ھ اور وفات ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۴ء) میں ہوئی۔

مولانا محمد الیاس صاحب خاندان ولی اللّٰہی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ ہندوستان میں آل تیمور کی غلط سیاست نے دین اسلام کو جو نقصان پہونچایا تھا اس کے تدارک اور اصلاح کا کام اللہ تعالیٰ نے اسی خاندان کے ذریعہ لیا۔ مولانا الیاس صاحب نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں زندگی میں ہماہمی پیدا کرنے کے لیے لوگوں کو فرضی واقعات یاد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کئی کئی پشت سے ان کے خاندان اور رشتہ داروں میں علماء اور بزرگوں اور مجاہدین کی شاندار روایات چلی آ رہی تھیں۔ ان کے گھر کے باہر اور اندر کی مجلسیں سید صاحب اور شاہ عبد العزیز صاحب کے خاندان کے قصوں سے گرم تھیں۔ ان بزرگوں کے واقعات مردوں اور عورتوں کی زبانوں پر تھے۔ اور گھر کی بیبیاں بچوں کو طوطا مینا اور پریوں کی کہانیاں سنانے کے بجائے ان کے بزرگوں کے واقعات سناتی تھیں۔ گھر میں ہر طرف نماز، روزہ،

تلاوت اور ذکر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ گھر کی کوئی بڑی بی خوش ہوتیں تو یہ نہ کہتیں کہ میرا بچہ آئی سی ایس میں جائے گا۔ بلکہ ان کی زبان سے نکلتا ــــ "بیٹے مجھے تجھ سے صحابہ کی خوشبو آتی ہے"۔

آپ کے گھر میں ایک تجارتی کتاب خانہ تھا جس کا انتظام آپ کے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب کرتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب چونکہ بچپن سے کمزور ہونے کی وجہ سے جسمانی مشقت کا کام نہ کر سکتے تھے اور وہ اس میں کچھ حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا وقت زیادہ تر مطالعہ اور دینی مشاغل میں گزرتا تھا۔ اس کے برعکس بڑے بھائی کافی محنت سے کتاب خانہ کے امور انجام دیتے تھے۔ ایک روز کتاب خانہ کے منتظم نے کہا مولوی الیاس کتاب خانہ کے کاموں میں کچھ ہاتھ نہیں بٹاتے۔ کوئی خدمت ان کے ذمہ بھی کر دینی چاہیے۔ بڑے بھائی نے تکدّر کے ساتھ جواب دیا ــــ "حدیث میں آیا ہے کہ ھل ترزقون الا بضعفائکم (تم کو جو رزق ملتا ہے وہ تمہارے کمزور افراد ہی کی برکت تو ہوتی ہے) میرا اعتقاد ہے کہ مجھے اسی بچہ کی برکت سے رزق مل رہا ہے۔ اس لیے آئندہ اس قسم کی بات مجھ سے نہ کہی جائے"۔

خلوص اور دینداری کے اس ماحول کا نتیجہ یہ تھا کہ مولانا کی پرورش اس طرح ہوئی گویا وہ دین کے گہوارے میں پل رہے ہیں۔ ایسی حالت میں جذبات کا دین کی راہ پر مڑ جانا بالکل فطری تھا۔ مولانا کے ایک ہم مکتب بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں جب وہ ان کے ساتھ مکتب میں پڑھتے تھے، ایک دن آپ لکڑی لے آئے اور کہا ــــ "آؤ میاں ریاض الاسلام! چلو بے نمازیوں پر جہاد کریں"۔

مکتب کی تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا نے قدیم طرز پر عربی و دینی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم (سہارنپور) میں استاد مقرر ہوئے۔ مگر قدرت کو منظور تھا کہ اب آپ کو اگلے مرحلہ کی تربیت گاہ میں پہونچایا جائے۔ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ آپ کے والد صاحب دہلی کے پاس بستی نظام الدین میں رہتے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ جاری کیا تھا جس میں کچھ غریبوں کے بچے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد آپ کے بھائی مولانا محمد صاحب نے اس مدرسہ کو سنبھالا۔ ۱۳۳۰ھ میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس وقت جب آپ اس علاقہ میں نظام الدین گئے تو وہاں لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ یہیں قیام کریں اور والد اور بھائی کی جگہ، جو ان کی وفات سے خالی ہوئی ہے، اس کو پُر کریں۔ آپ نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔

یہاں سے آپ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جبکہ میواتیوں سے تعلق کی وجہ سے آپ کو تبلیغی تحریک چلانے کی طرف توجہ ہوئی۔

<u>میواتیوں میں کام</u> | دہلی کے جنوب کا وہ علاقہ جس میں قدیم زمانے سے میو قوم آباد ہے، میوات کہلاتا ہے۔ یہ تقریباً اسی قسم کی ایک قبائلی آبادی تھی جیسا کہ عرب کے قدیم بدوؤں کے بارے میں ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں۔ ایک جاہل اور اُجڈ قوم جو غالباً حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء و متبعین کی کوششوں سے مسلمان ہو گئی تھی، مگر عملاً وہ اسلام سے اس قدر دور تھے کہ بجز اس خیال کے کہ "ہم مسلمان ہیں" اور کوئی چیز اسلامی ان کے اندر باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہر سنگھ اور بھوپ سنگھ جیسے نام رکھتے، ان کے سروں پر چوٹیاں ہوتیں۔ ان کے یہاں مورتیاں پوجی جاتیں، وہ ہندوؤں کے تیوہار اور تقریبات مناتے، دیوی دیوتاؤں کے نام پر قربانی چڑھاتے، شب برات میں ان کے یہاں سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا اٹھتا تھا۔ مگر وہ بھی ایک بُت تھا جو پوجا جاتا تھا۔ انھیں کلمہ تک یاد نہ تھا۔ حتیٰ کہ نماز کی صورت سے وہ اس قدر ناآشنا تھے کہ کبھی کوئی مسلمان اتفاق سے ان کے علاقہ میں پہونچ گیا اور اس نے نماز پڑھی تو گاؤں کے عورت، مرد، بچے سب اس کے گرد یہ دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے کہ یہ شخص آخر کیا کر رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں درد ہے یا اس کو جنون ہو گیا ہے کہ بار بار اٹھتا بیٹھتا اور جھکتا ہے۔ ان کی تہذیب کا یہ عالم تھا کہ عورت مرد سب نیم برہنہ گھومتے تھے۔ چوری ڈکیتی اور رہزنی ان کا پیشہ تھا۔ آپس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے درمیان لمبی لمبی خوں ریز لڑائیاں ہوتی رہتی تھی۔ وہ فطرتاً جفاکش اور بہادر تھے۔ مگر علم اور تربیت کی کمی نے انھیں جنگلی قبائل کی سطح سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ میجر پاؤلٹ، جو انیسویں صدی کے آخر میں ریاست الور کا اسسٹنٹ پولیٹیکل (؟) تھا، کے الفاظ میں:

"میو اپنے عادات میں آدھے ہندو ہیں"[1]

دہلی کی مسلمان سلطنت کے ابتدائی دور میں میواتی بہت تکلیف دہ عنصر بن گئے تھے۔ انھوں نے دہلی کے اوپر تاخت و تاراج شروع کر دی تھی۔ ان کے خوف سے راجدھانی کے دروازے

---

[1] Gazetteer of Ulwar, 1878

سرِ شام بند ہو جاتے۔ شام کو شہر پناہ سے باہر نکلنے کی کوئی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ غیاث الدین بلبن نے ان کے خلاف ایک زبردست مہم بھیجی جس میں میواتیوں کی بڑی تعداد قتل ہوئی۔ بعد کے حالات بھی بتاتے ہیں کہ انگریزی حکومت کے افسران اور الور اور بھرت پور کی ہمسایہ ریاستیں وہاں امن وامان قائم کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

۱۹۲۱ء کے زمانہ میں مزید ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ آریہ مبلغین سیکڑوں کی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے وہ باشندے جنھوں نے پہلے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا انھیں دوبارہ اپنے مذہب کی طرف واپس لایا جائے۔ ہر طرف ارتداد کی آگ پھیلنے لگی اور جاہل نو مسلم دیہاتی علاقوں میں آریوں کی کامیابی کی خبریں آنے لگیں۔

بستی نظام الدین عین میوات کے دہانہ پر واقع تھی۔ اور یہاں کے مدرسہ میں ان کے کچھ بچے پڑھتے تھے اور اسی کے ساتھ مولانا الیاس صاحب کے والد بزرگوار اور آپ کے بھائی صاحب مرحوم کے تعلق سے کچھ میواتی عقیدت مند بھی ہو گئے تھے اور وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی افسوس ناک حالت دیکھی تو ان کے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ آپ کے دونوں پیشرو (والد صاحب اور بھائی صاحب) دینی تعلیم کے ذریعہ پہلے سے بھی ان کی اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ فطری طور پر آپ کا پہلا ذہن اسی طرف گیا کہ اس سلسلے کو جاری رکھنا ان کی اصلاح کا حقیقی ذریعہ ہے۔ آپ نے اس میں اتنا اور اضافہ کیا کہ خود میوات کے اپنے علاقہ میں بھی دینی مکاتب ومدارس قائم کرنے کی تحریک کی۔

یہ دوسرا جز میواتیوں کے لیے سخت مشکل تھا۔ کیونکہ وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ بچہ کو کھیتی باڑی اور جانوروں کی دیکھ بھال سے ہٹا کر مدرسہ میں بٹھا دیں۔ تاہم آپ نے کوشش جاری رکھی۔ تبلیغ سے لے کر خوشامد تک ہر طریقہ اختیار کیا۔ میواتیوں سے کہا کہ "تم بچے دے دو، معلمین کی تنخواہ میں لاؤں گا"۔ بالآخر میوات میں سیکڑوں ایسے مکتب قائم ہو گئے جن میں قرآن اور ابتدائی دینی تعلیم ہوتی تھی۔

اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جس نے آپ کی کوششوں کے رُخ کو بالکل موڑ دیا۔ ایک بار آپ میوات کے سفر میں تھے۔ ایک مقام پر مولانا کے سامنے بڑی تعریف کے ساتھ ایک نوجوان

پیش کیا گیا کہ یہ میوات کے فلاں مکتب سے فارغ ہو کر نکلے ہیں۔ دیکھا تو ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے اور چہرہ اور وضع قطع میں کہیں اسلامیت کا کوئی نشان نہیں، یہ واقعہ مکاتب کی عملی ناکامی کی تصویر تھا۔ مکاتب کے نتائج کے بارے میں جو بے اطمینانی آپ کو رہا کرتی تھی، وہ اب پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہو گئی۔ مکاتب کے قیام سے بلاشبہ یہ فائدہ تھا کہ آہستہ آہستہ لوگوں کے اندر مولانا کی عقیدت بڑھ رہی تھی اور ایک دوسرا کام جو مولانا وہاں کرنا چاہتے وہ بھی ہو رہا تھا۔ یعنی میواتیوں کے آپس کے لڑائی جھگڑوں کو چکانا اور باہم صلح کرانا۔ اس میں ان کی کامیابی کا یہ عالم تھا کہ میوات کے لوگ کہنے لگے تھے —— "یہ شخص دیکھنے میں تو ایک مشت استخواں ہے۔ مگر جس معاملہ میں پڑ جاتا ہے، چٹکیوں میں اس کو سلجھا دیتا ہے۔ اور معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بڑے بڑے ضدی اس کے کہنے سے فوراً مان جاتے ہیں۔"

مگر اصل مسئلہ میواتیوں کی دینی بیداری کا تھا۔ اور اس معاملے میں مکاتب کی ناکامی اپنی جگہ بدستور باقی تھی۔ غور و فکر کے بعد آپ پر کھلا کہ اصل رکاوٹ یہ ہے کہ موجودہ طریقۂ کار کے تحت ہم یہ کر سکتے ہیں کہ میواتیوں کو ان کے اپنے مشاغل اور ماحول میں رکھ کر انھیں دین کا سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم تو انھیں محنت اور عرق ریزی سے دین کی باتیں بتاتے ہیں۔ مگر اس کے چند ہی لمحے بعد جب وہ اپنے گھر اور اپنے ماحول میں پہونچتے ہیں تو وہاں دوسرے قسم کی باتیں انھیں گھیر لیتی ہیں اور پھر خود بخود سفیدی پر سیاہی پھر جاتی ہے۔ اس کا واحد حل جو مولانا کو نظر آیا وہ یہ کہ میواتیوں کی جماعت بنا کر انھیں ان کے ماحول سے نکالا جائے۔ اور پھر مسجدوں میں، دینی مدارس میں، بزرگوں کی صحبتوں میں، اور دینداروں کے ماحول میں رکھ کر انھیں تعلیم دی جائے اور انھیں ذکر اور نماز اور دعا میں مشغول رکھ کر متاثر کرنے کی کوشش کی جائے۔ اب انھوں نے اس دوسرے طریقے کے مطابق کام شروع کر دیا۔

اس کام میں ابتداءً پہلے سے بھی زیادہ مشکلیں پیش آئیں۔ جس میواتی کا یہ حال تھا کہ ان کا اپنا بچہ مقامی مدرسہ میں دینا [illegible] گوارا نہیں [illegible] خود اپنا مشغلہ چھوڑ کر اور اپنا وقت نکال کر باہر جانے کے لیے کس طرح راضی [illegible] کوشش، دعائیں اور گریہ زاری نے بالآخر [illegible] گئی۔

اس سرکش قوم کو مولانا نے کس طرح رام کیا۔ اس کا اندازہ دو واقعات سے ہوگا۔ ایک مرتبہ دوران تبلیغ میں آپ نے ازراہ محبت ایک شخص کے اوپر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگ بگولا ہوگیا اور کہنے لگا کہ اگر اب کی تم نے ہاتھ لگایا تو میں لٹھ ماردوں گا۔ آپ نے فوراً اس کے پاؤں پکڑ لیے اور فرمایا کہ — "پاؤں کو تو نہیں کہا تھا" اس کے بعد اس کا غصہ کافور ہوگیا اور فوراً نرم پڑ گیا۔ اسی طرح آپ ایک بار ایک میواتی پر تبلیغ کر رہے تھے کہ وہ بگڑ گیا اور آپ کو ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ مولانا الیاس صاحب دبلے پتلے کمزور آدمی۔ گھونسہ کی تاب نہ لاکر زمین پر گر پڑے۔ کچھ دیر کے بعد جب ان کے حواس بجا ہوئے تو وہ گرد جھاڑ کر اٹھے اور میواتی کا دامن پکڑ لیا اور کہا:

"اچھا تم تو اپنا کام کر چکے، اب میری سنو"

یہ دیکھ کر میواتی آپ کے قدموں پر گر پڑا اور بولا "مولوی مجھے معاف کر ورنہ میری بخشش نہیں ہوگی۔"

اسی اخلاص اور اخلاق کا نتیجہ تھا کہ بالآخر لوگوں کے دل کھنچے۔ میواتیوں کی کثیر تعداد آپ کے ساتھ ہوگئی۔ ان کے قافلے جوق در جوق اپنے علاقوں سے نکل کر نظام الدین، سہارنپور، اور دوسرے مقامات کو جانے لگے۔ اور ہفتوں اور مہینوں تک ان کی زندگیاں دینی تعلیم و تربیت کے سائے میں گزرنے لگیں۔ نتیجہ نے بتایا کہ مولانا کا سوچنا بالکل صحیح تھا۔ اس کورس سے نکل کر جو لوگ میوات لوٹتے وہ بالکل بدل چکے ہوتے اور ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے ماحول کو بدلنے کا جذبہ ان کے اندر بیدار ہو چکا ہوتا تھا۔

اب میوات کی فضا بدلنے لگی۔ پورے علاقہ میں دین کی رغبت پیدا ہوگئی۔ جہاں میلوں تک کوئی مسجد نظر نہیں آتی تھی وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں۔ مکاتب و مدارس نہ صرف تعداد میں بڑھے بلکہ اب انھیں واقعی میوؤں کے درمیان دینی تعلیم و تربیت کے ادارے کا مقام حاصل ہوگیا۔ ہندوانہ وضع قطع کی جگہ اسلامی وضع و لباس ہر طرف نظر آنے لگا۔ ہاتھوں کے کڑے اور کانوں کی مرکیاں اترنے لگیں۔ بے شمار لوگوں نے داڑھیاں رکھنی شروع کر دیں۔ تقریبات سے مشرکانہ رسوم کا خاتمہ ہوگیا۔ سود خوری کم ہوگئی۔ شراب نوشی کا وجود مٹ گیا۔ قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کی وارداتیں بہت کم ہوگئیں۔ کئی گاؤں ایسے ہوگئے جہاں ایک بچہ بھی بے نمازی نہیں تھا۔ ان کی معاشرت، ان کے برتاؤ، معاملات غرض ہر چیز میں نمایاں فرق آگیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ قوم جو پہلے دینی شعور سے بالکل بے بہرہ تھی اس میں یہ جذبہ پیدا ہوگیا کہ وہ دنیا کو خدا کے دین سے آگاہ کرے۔ ان کی

سیدھی سادی زبانوں سے دین کی باتیں سن کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ تاریخ اپنے اوراق اُلٹ رہی ہو اور آغاز اسلام میں عرب کے نومسلم بدو دوبارہ پیدا ہو کر زمین کے اوپر چلنے پھرنے لگے ہیں۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک بزرگ ستمبر ۱۹۳۹ء میں میوات کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے انھوں نے ایک جاہل میواتی کو روک کر پوچھا .... "یہ تبلیغی دورے تم کس لیے کر رہے ہو" — اُس نے جواب دیا :

"ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ نہ ہم کو خدا کی خبر تھی نہ رسول کی۔ اس مولوی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی یہ نعمت پہونچائیں جو ہمیں ملی ہے۔"

میواتی کے یہ سیدھے سادے الفاظ سن کر ایسا معلوم ہوتا ہو جیسے تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔

مولانا کی شخصیت | کسی کام کی کامیابی کیلئے طریق کار کی صحت کے ساتھ کارکنوں کا اخلاص اور تعلق بھی ضروری ہے۔ یہ مولانا الیاس صاحب کی بے تاب طبیعت نے فراہم کر دیا۔ مولانا کو جن لوگوں نے دیکھا ہو ان کی متفقہ شہادت ہے کہ وہ اس قدر بے چین اور مضطرب آدمی تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ گوشت پوست کا مجسمہ نہیں بلکہ درد اور تڑپ کا مجسمہ ہیں۔ مولانا کے ایک قدیم رفیق ایک بار نظام الدین گئے اس وقت مولانا الیاس صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ انھوں نے گھر میں مولانا الیاس صاحب کی زوجۂ محترمہ کے یہاں کہلایا کہ مولانا کی کوئی خاص بات جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ محترمہ نے اندر سے کہلایا :

"جب میری شادی ہوئی اور میں رخصت ہو کر مولانا کے گھر گئی تو میں نے دیکھا کہ مولانا راتوں کو بہت کم سوتے ہیں۔ ان کی راتیں بستر پر کروٹ بدلنے اور آہ بھرنے میں گزرتی تھیں میں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ کو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ مولانا نے ایک آہ بھری اور فرمایا — کیا بتاؤں اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جائے تو جاگنے والا ایک نہ رہے۔ دو ہو جائیں۔"

مولانا کی ساری زندگی گواہی دیتی ہے کہ وہ سراپا درد دین تھے۔ وہ اگرچہ لکنت کی وجہ سے، نیز اکثر قدیم طرز کی زبان اور اصطلاحات میں بولنے کی وجہ سے عام لوگوں کو اپنی بات بخوبی سمجھا نہیں پاتے تھے۔ مگر جب وہ بولتے تو شدت احساس کی وجہ سے ان کا وجود مجسم بیان اور اظہار بن جاتا۔ اکثر

ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے، آہیں بھرتے اور فرماتے۔ "میرے اللہ میں کیا کروں، کچھ ہوتا ہی نہیں"۔ اس قدر کمزور اور لاغر تھے کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا۔ مگر اس کے باوجود تندرست اور طاقتور لوگوں سے زیادہ کام کرتے۔ فرمایا کرتے تھے — "دین کے فروغ کے لیے جان دینے کے شوق کو زندہ کرنا اور جان کو بے قیمت کر دینا ہماری تحریک کا خلاصہ ہے"۔ اپنے مقصد کے پیچھے آرام اور کھانا پینا تک بھول جاتے۔ میوات کے ناہموار علاقوں میں ۲۰۔۲۰ میل اور ۲۵۔۲۵ میل تک پیدل چلے جاتے کھانا موجود ہونے کے باوجود بعض اوقات اس ہنگامی زندگی کی وجہ سے کھانے کی نوبت نہ آتی۔ کبھی بار ایسا ہوا کہ جمعہ کے دن نظام الدین سے کھانا کھا کر روانہ ہوئے اور اتوار کو نظام الدین واپس آکر کھانا کھایا۔ راتوں کو جاگنا، پہاڑیاں عبور کرنا، میوات کے میدانوں میں کبھی گرم لو کی لپیٹیں اور کبھی زمستانی ہوا کے سرد جھونکوں کا مقابلہ کرنا، یہ ان کی زندگی تھی۔ اس طرح کے پرمشقت سفروں میں کبھی دیکھتے کہ ساتھی گھبرا گئے ہیں تو فرماتے :-

"جبل جہد کے پرلی طرف خدا ہے جس کا جی چاہے مل لے"

بیماری کے عالم میں کوئی خیریت پوچھتا تو فرماتے :

"بھئی تندرستی بیماری تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اس میں کیا خیریت اور کیا بے خیریت۔ خیریت تو جب ہو کہ جس کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ کام ہو"

ایک مرتبہ مولانا کے وطن کاندھلہ سے کچھ اعزہ عیادت کے لیے آئے۔ مولانا نے پوچھا کس لیے آئے۔ کہنے لگے آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔ فرمایا — "جو مٹنے کے لیے بنا ہے اس کی خیریت پوچھنے کے لیے کاندھلہ سے یہاں تک آؤ۔ اور رسول کریم کا دین جو مٹنے والا نہیں، وہ مٹایا جا رہا ہے، اور تم اس کی خبر نہیں لیتے۔" بیماری میں ڈاکٹر بولنے سے منع کرتے تو فرماتے — "تبلیغ کے لیے بول کر مر جانا پسند کرتا ہوں"۔ بہ نسبت اس کے کہ اس سے خاموش رہ کر صحت حاصل کروں"۔ ایک صاحب کو طلب خیریت کے سلسلے میں جواب دیتے ہوئے خط میں لکھا :

"طبیعت میں سوائے تبلیغی درد کے اور خیریت ہے"۔

مولانا کو تبلیغ کے کام سے اس قدر تعلق تھا کہ جب دیکھتے کہ ان کی ساری کوشش کے بعد جو لوگ ان کے گرد جمع ہوتے ہیں وہ زیادہ تر جاہل یا معمولی پڑھے لکھے لوگ ہیں تو سخت غمگین ہوتے،

مرض الوفات میں ایک مرتبہ گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا:

"کاش علماء اس کام کو سنبھال لیتے اور پھر ہم چلے جاتے"

لوگوں کے ساتھ رعایت کا یہ عالم تھا کہ ریل کے سفر میں ایک بار مغرب کے نوافل پڑھتے وقت ایک رفیق نے مسافروں کو سامنے سے گزرنے سے روکنے کا انتظام کیا۔ آپ نے منع فرمایا اور کہا کہ یہ حقوق عامہ ہے، تم دوسرے کو گزرنے سے نہ روکو بلکہ سُترہ کا انتظام کرو۔ کاندھلہ کے سفر میں ایک مرتبہ بھیڑ کی وجہ سے آپ سکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ ٹکٹ تھرڈ کلاس کا تھا۔ خیال ہوا کہ ٹکٹ چیک کرنے والا آئے گا تو ٹکٹ بنوا لیا جائے گا۔ وہ آیا تو اس نے ایسی بے ڈھنگی گفتگو کی کہ مولانا کو غصہ آ گیا۔ اور اس کو ڈانٹ دیا۔ ٹکٹ بنانے کے بعد وہ چلا گیا۔ تو مولانا انعام الحسن صاحب نے جو اس وقت ساتھ تھے کہا کہ حضرت! اس کو تو کہنے کا حق تھا۔ ان لصاحب الحق مقالا (جس کا حق آتا ہو وہ کہنے سننے کا مجاز ہے) مولانا نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور اگلے اسٹیشن پر اُتر کر اس ٹی ٹی آئی سے معذرت کی اور معافی مانگی۔

اسی کے ساتھ خدا سے تعلق اور آخرت کے استحضار کا یہ عالم تھا کہ نماز میں انہیں لذت ملتی۔ پہاڑی پر چڑھتے اور اوپر پہونچ کر جب تمام ساتھی تھک کر بیٹھ جاتے۔ مولانا فوراً نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ انتقال کے بعد جب غسل دیا گیا اور خوشبو لگائی جانے لگی تو ایک رفیقِ خاص کی زبان سے بے اختیار نکلا ـــ "پیشانی پر اچھی طرح خوشبو لگاؤ، یہ گھٹنوں سجدہ میں ٹکی رہتی تھی۔"

آپ کی یہی عبادتیں، قربانیاں اور خلق اللہ سے آپ کی محبت تھی جس نے آپ کی محنت اور آپ کے کام میں وہ تاثیر پیدا کر دی کہ آج جو لوگ تبلیغ کے کام کے پھیلاؤ اور اس کے حیرت انگیز نتائج کو دیکھتے ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مادی اصطلاحوں میں ان معجزانہ واقعات کی کس طرح تشریح کریں۔

ایک مکتوب میں مولانا نے لکھا:

"عاداتِ خداوندی عموماً دین میں اپنی جد و جہد کی مقدار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آدمی کسی مقصد کے لیے جتنا اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے اور تکالیف کو جھیلنے کے ذریعہ اپنے حالات، جوارح، قلب اور قوتوں کی شکستگی اور تعب و انکسار کو پہونچتا ہے، اتنا ہی حق تعالیٰ کی

رحمت کے نزول کا سبب ہوتا ہے۔ انا عند المنکسرۃ قلوبھم۔ کسی راہ کی ذلت کو اٹھائے بغیر اس کی عزت کو پہونچنا عادۃً ہوتا نہیں؟"

یہ الفاظ درحقیقت خود کہنے والے کی تصویر ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ آپ نے خود کو دین کی راہ میں گھلا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زندگی اور آپ کے کلام میں عجیب کشش پیدا ہوگئی۔ مولانا نے جو بات اوپر کے اقتباس میں کہی ہے اسی کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ آدمی جب کسی کام میں اپنے کو فنا کیے ہوئے ہو اس وقت اس کی شخصیت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ اس کی زبان سے تیر و نشتر کی باتیں نکلنے لگتی ہیں جو دلوں میں گھستی ہیں اور روحوں کو بے چین کر دیتی ہے۔ دلوں کو چھیدنے والے کلمات اسی کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کا دل مقصد کے غم میں چھلنی ہو گیا ہو۔

مولانا کے چند کلمات سے اس کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"سمجھے مولوی جی! یہ کام قرن اول کا سا ہے، اس کے لیے اپنی جانیں قربان کردو اور اپنا سب کچھ مٹا دو۔ اس کے لیے جتنا زیادہ قربان کروگے اتنا زیادہ پاؤگے۔"

کچھ لوگ مولانا سے ملنے گئے اور مہمان کی طرح رہ کر واپس چلے گئے۔ ان کو کہلایا ــــ "تم لوگ آئے اور چند روز مسند نشینی کر کے چل دیئے۔ یاد رکھو اس راہ میں بھوک اور پیاس کی تکلیفات برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں اپنا پسینہ بہاؤ اور خون بہانے کے لیے تیار رہو۔"

ایک خط میں اس پر افسوس کرتے ہوئے کہ فی گھر ایک آدمی بھی لوگ تبلیغ کے لیے نہیں دے رہے ہیں، لکھتے ہیں:

"میںتی! تم غور تو کرو۔ دنیا فانی میں کام کے لیے تو گھر کے سارے افراد ہوں اور اس کے لیے صرف ایک آدمی کو کہا جائے اور اس پر بھی نباہ نہ ہو، تو آخرت کو دنیا سے گھٹایا یا نہیں گھٹایا۔"

ایک مرتبہ لکھنؤ میں تبلیغی جلسہ ہوا۔ جلسہ کے بعد تحریک ہوئی کہ کچھ لوگ جماعت بنا کر کانپور کے لیے جائیں۔ مگر اعلان کے باوجود کوئی نام نہیں دے رہا تھا۔ مولانا بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو آمادہ

کرنا شروع کر دیا۔ حاجی ولی محمد صاحب کئی روز سے صاحب فراش تھے۔ بواسیر کی شکایت نے نقاہت پیدا کر دی تھی۔ آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا، تم کیوں نہیں جاتے۔ انھوں نے جواب دیا "میں تو مر رہا ہوں"۔ فرمایا۔ "مرنا ہی ہے تو کان پور جا کر مرو"

یہ چند جملے محض سمجھنے کے لیے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کبھی بھی اپنی اصلی حیثیت کے ترجمان نہیں ہوتے۔ کیونکہ جب اس طرح کا جملہ کہا جاتا ہے تو وہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو نہیں دیا جاتا بلکہ کہنے والا سامنے موجود ہوتا ہے اور سننے والا براہ راست اس کے کلمات کو سن رہا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں بات بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ الفاظ محض الفاظ نہیں ہوتے بلکہ اس میں دو اور چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ہیں ـــــ جذبات اور شخصیت۔ اس وقت وہ ایک ایسی حقیقت ہوتی ہے جس میں درد، خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ ایک زندہ شخصیت کا پورا وزن بھی شامل ہوتا ہے۔ ایسے کلمات جب وجود میں آتے ہیں تو فضا میں رعشہ پیدا کر دیتے ہیں وہ سوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ کتنے کٹر طبیعتیں رام ہو جاتی ہیں۔ غفلت میں پڑے ہوئے چونک اٹھتے ہیں، فطرت میں چھپی ہوئی عبودیت اس طرح جاگ اٹھتی ہے کہ ساری زندگی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ایسے ہی کلمات کے لیے کہا گیا ہے ـــ

از دل خیزد و بر دل ریزد۔

ایک صاحب ایک مرتبہ تبلیغی جلسہ سے واپس آئے تو مولانا نے فرمایا، کہو کچھ اپنی حالت پر افسوس بھی ہوا؟ انھوں نے کہا۔ "جو کچھ دیکھا اس کے بعد تو اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے بھی شرم آنے لگی ہے"۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی زندگی ہی میں کام اس حد کو پہونچ گیا کہ نومبر ۱۹۴۱ء میں جب میوات میں پہلا بڑا تبلیغی جلسہ ہوا تو ۲۵ ہزار آدمی اس میں شریک ہوئے۔ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو ۵۰۔ ۶۰ میل سے پیدل چل کر وہاں پہونچے تھے۔ ایک میواتی سے جب پہلی بار آپ نے کہا کہ جاؤ تبلیغ کرو تو وہ بولا "تبلیغ کیا ہووے ہے"۔ مگر یہی لوگ جو تبلیغ کا صحیح تلفظ بھی نہیں جانتے تھے وہ ایسے مبلغ بنے کہ انھوں نے مبلغوں کی ایک نئی قوم ملک میں پیدا کر دی۔ اگر کوئی اس وقت مبلغوں کے ان قافلوں کو دیکھے جو بستی بستی اس طرح گھوم رہے ہیں کہ کاندھوں پر کمل لپٹے ہوئے ہیں، بغل میں پیالے لٹکے ہوئے ہیں۔ چادر کے کونے میں چنے یا چند روٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ زبانیں تسبیح اور ذکر میں مشغول ہیں۔ آنکھوں میں شب بیداری کے آثار، پیشانی پر سجدے کے نشانات۔ ہاتھ پاؤں سے جفاکشی اور مشقت نمایاں، تو دیکھنے والوں کو وہ منظر یاد آ جاتا جب عرب کے مفلس اور غیر تعلیم یافتہ باشندے اسلام کی دولت کو پا کر سرشار تھے اور قریہ قریہ احکام دین کی تعلیم کے لیے چاروں طرف چلتے پھرتے نظر آتے۔

تبلیغ کی اندرونی طاقت مولانا نے اپنی تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو وہ کیا چیز دی تھی جس نے اتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ تھا آخرت کا خیال اور نصرت الٰہی کا یقین۔ مولانا نے اس حقیقت کو شدت سے لوگوں کے ذہن نشین کیا کہ اس کائنات کا ایک مالک ہے۔ اور اسی کے پاس لوٹ کر ہمیں جانا ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کی مرضی کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ جو کچھ ہوگا اسی کے کئے سے ہوگا۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے ایک واقعہ پر غور کیجئے۔ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک میواتی صحبت یافتہ سے ایک شخص نے پوچھا "اپنی تبلیغی زندگی کا کوئی واقعہ بتلائیے۔"

"مولانا نے ایک مرتبہ" میواتی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا "تین آدمیوں کی ایک جماعت مراد آباد بھیجی۔ جس میں سے ایک میں تھا۔ مولانا نے چلتے وقت یہ مختصر سی ہدایت دی کہ اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ۔ اور جب کوئی مشکل پڑے تو ایسا کرنا کہ بستی کے باہر جاکر تنہائیوں میں نماز پڑھنا اور دعا کرنا کہ خدایا ہماری مشکل حل کر دے۔ ہم لوگ بستی میں پہونچ کر ایک مسجد میں داخل ہوئے۔ مغرب کی نماز کے بعد اعلان کیا گیا لوگ ٹھہر جائیں۔ کچھ دین کی باتیں ہوں گی۔ مگر جب ہم سنتوں سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک ایک شخص جا چکا ہے۔ اور مسجد میں ہم تین کے سوا کوئی موجود نہیں۔ اب ہم ٹھیر کر اگلی شام کا انتظار کرنے لگے۔ دوسرے دن پھر مغرب کی نماز کے بعد یہی اعلان کیا۔ مگر دوسرے دن بھی یہی قصہ پیش آیا کہ نماز کے بعد سارے لوگ مسجد سے اٹھ اٹھ کر چلے گئے اور اب ہمیں مولانا کی نصیحت یاد آئی۔ رات گزار کر صبح کو ہم لوگ حسب ہدایت بستی کے باہر چلے گئے اور سارا دن دعا کرتے رہے۔ شام کو آکر پھر اسی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی اور جس طرح دو دن اعلان کر چکے تھے، اسی طرح آج بھی اعلان کیا ــــــ "نماز سے فارغ ہو کر آپ لوگ ٹھہر جائیں کچھ دین کی باتیں ہوں گی۔"

اتنا کہہ کر میواتی رک گیا۔ وہ پوچھنے والے کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ کسی نہایت اہم واقعہ کا انکشاف کرنے جا رہا ہو۔ کچھ دیر بعد خاموش رہنے کے بعد اس نے خاص زبان میں کہا:

"جیسے دھرتی نے سب کو پکڑ لیا، ایک بھی نہ اٹھا، حضرت! یہ کام تو بس یوں ہی چلے گا۔"

غرض جن لوگوں کو یہ تجربہ ہوا، اس تجربے نے انھیں کتنی قیمتی چیز عطا کی۔ اس نے انھیں

اس لازوال حقیقت کا راز دال بتایا کہ یہاں ایک ایسا خزانہ بھی پوشیدہ ہے جس کا مالک بننے کے لئے ٹوٹے ہوئے دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی طاقت جو زمین کو ہلا دے اور پہاڑوں کو کھسکا دے۔ یہ نہتوں کو عظیم ترین ہتھیاروں سے مسلح کرتا ہے، یہ بے علم افراد کو بڑے بڑے مدعیان علم سے مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ یہ وہ فیض ہے جس کو پاکر گونگے بولنے لگتے ہیں، اندھے دیکھنے لگتے ہیں اور لنگڑے چلنے لگتے ہیں۔ یہ ہر تالے کی کنجی ہے اور ہر دروازے کو کھولنے والا ہے۔ اس کے ملنے سے وہ سروسامان ملتا ہے کہ انتہائی بے سروسامانی کے باوجود آدمی زندگی کے تمام مراحل کو پار کرتا چلا جائے۔

اس طرح کے بیشما تجربے ہیں جن سے تبلیغ کی تاریخ بھری ہوئی ہے اور اس نے تبلیغ کے افراد کو ذہنی اور نفسیاتی طاقت دی ہے کہ وہ انتہائی مشکل حالات کے باوجود اقدام کرنے سے نہیں ہچکچاتے سخت ترین ماحول میں گھس کر کام کرنے میں ہراساں نہیں ہوتے۔ وہ دعا کو اپنے لئے عصائے موسیٰ سمجھتے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ یہ عصا انھیں کسی بھی مقام پر دغا نہیں دے سکتا۔

ہر شخص اور ہر قوم کو کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہے جس کے اوپر وہ اپنے اقدام اور استحکام کے لئے بھروسہ کرسکے اور جس کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کرے، تمام لوگ ایسا سہارا فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس کے جس سرچشمے سے عام طور پر لوگ واقف ہیں وہ صرف مادی سازوسامان ہے، لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ جدید ترین ٹکنالوجی کو استعمال کرکے بڑے بڑے کارخانے کھڑے کرو۔ بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کے ذریعہ سارے ملک کی دولت اکٹھا کرلو۔ بموں اور ہوائی جہازوں سے اپنی فوجی چھاؤنیوں کو بھردو۔ جبری فوجی ٹریننگ کے ذریعہ سارے ملک کو عظیم فوج میں تبدیل کردو۔ خلائی سائنس کے محیر العقول کارنامے دکھا کر دنیا کے اوپر اپنا سکہ جمادو، ریڈیو، ٹیلی وژن، پریس، اور ان تمام چیزوں کے مالک بن جاؤ جن کو آج طاقت و قوت سمجھا جاتا ہے ـــــــ گویا جن لوگوں کے پاس اس قسم کے سازوسامان فراہم کرنے کی حالات نہ ہوں، ان کے لئے اس دنیا میں کچھ نہیں ہے۔ مگر تبلیغی نظریہ آدمی کو طاقت کے ایسے خزانے سے آشنا کرتا ہے جس کے لئے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے جو ہر آدمی کے پاس موجود رہتی ہے خواہ وہ کسی حال میں ہو۔ اور وہ ہے آدمی کا دل۔ اگر آدمی اپنے دل کو خدا کے آگے ڈال دے تو ساری

کائنات اس کی قدموں کے نیچے آجائے گی۔

یہ طاقت کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کو اقتصادی امداد روک کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ناکہ بندی کر کے اسے مسدود کیا جا سکتا ہے حتی کہ ٹینکوں کا مارچ اور ہوائی جہازوں کی بمباری بھی اسے فنا نہیں کر سکتی۔ اور نہ اس قسم کی کوئی خبر اس کے لئے اندیشہ ناک ثابت ہو سکتی ہے کہ حریف نے زیادہ طاقتور قسم کا ہتھیار ایجاد کر لیا ہے۔

غور کیجئے، جو نظریہ آدمی کو اتنی بڑی طاقت دیتا ہو، جو نہتوں کو سب سے زیادہ طاقتور فوج میں تبدیل کر دینے والا ہو، اس کی کشور کشائی اور جہاں گیری کا کیا ٹھکانا۔ اور تبلیغی کارکنوں کے وہ حیرت انگیز واقعات جو مغرب سے لے کر مشرق تک پیش آرہے ہیں۔ ثابت کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس سرچشمہ میں سے ایک حصہ عطا فرمایا ہے۔ مگر خدا کی یہ نعمت اپنی پوری شکل میں اس وقت ظاہر ہوگی جب پوری قوم اس راہ پر آجائے۔ مولانا الیاس صاحب کو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اگر پوری قوم اسی راہ پر آجائے تو خدا کی نصرت ان کے اوپر اس آخری اور انتہائی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے جب ایک بے حیثیت قوم اٹھ کر پوری دنیا کو زیر و زبر کر دے۔ جب کسی تارکے منبر ان کے امیر کی آواز مدینے سے نہاوند کی پہاڑیوں تک سنائی دے۔ جب سمندروں اور جنگلوں پر ان کا حکم چلنے لگے جب قومیں ان کی باج گزار ہوں اور زمین میں ہر طرف ان کا جھنڈا لہرانے لگے۔ یہ سب ممکن ہے اور اس امکان کا سرا صرف اس واقعہ میں ہے کہ ہم ——— "اللہ کو اپنا لیں"۔

نصرت قرآن میں | یہاں "نصرت" کے بارے میں قرآن کا تصور بیان کرنا مناسب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت جو بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ جس کو قرآن میں "حیات طیبہ" کہا گیا ہے اور دوسری وہ جس کے لئے استخلاف اور تمکین فی الارض کے الفاظ آئے ہیں۔ دونوں آیتیں حسب ذیل ہیں:۔

من عمل صالحا من ذکر او انثی و	جو نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت
ھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ و	اور وہ مومن ہو تو ہم اس کو حیات طیبہ کی
لنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون	زندگی دیں گے، اور ان کے عمل کا بہترین
نحل ۔ ۹۷	بدلہ دیں گے۔

دوسری آیت یہ ہے:

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا۔ نور - ۵۵

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیا، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں زمین میں اقتدار بخشے گا جس طرح پچھلوں کو اقتدار دیا تھا۔ اور ان کے لئے ان کے دین کو جما دے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔

"حیاۃ طیبہ" سے مراد یہ ہے کہ شخصی طور پر ایک آدمی کو اچھی اور ستھری زندگی حاصل ہو۔ ایک مفسر کے الفاظ میں اس اچھی اور ستھری زندگی کے اجزاء و مثال کے طور پر یہ ہیں ——— "دنیا میں حلال روزی، قناعت، غنائے قلبی، سکون و طمانیت، ذکر اللہ کی لذت، حب الٰہی کا مزہ، ادائے فرض عبودیت کی خوشی، کامیاب مستقبل کا تصور، تعلق مع اللہ کی حلاوت، وغیرہ"۔ یہ چیزیں جس کو ملتی ہیں اس کی زندگی تنگی اور فراخی ہر حال میں بہترین کیفیات سے مالا مال رہتی ہے۔ دوسری چیز استخلاف اور تمکین ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ نصرت ہے جو اجتماع اور معاشرہ کے اوپر نازل ہوتی ہے۔ ایک مفسر کے الفاظ میں:

"یہ خطاب فرمایا حضرت کے وقت کے لوگوں کو۔ یعنی جو ان میں اعلیٰ درجہ کے نیک اور رسول کے کامل متبع ہیں، رسول کے بعد ان کو زمین کی حکومت دے گا اور جو دین اسلام خدا کو پسند ہے ان کے ہاتھوں سے دنیا میں اس کو قائم کرے گا۔ گویا جیسا کہ لفظ استخلاف میں اشارہ ہے، وہ لوگ محض دنیوی بادشاہوں کی طرح نہ ہوں گے۔ بلکہ پیغمبر کے جانشین ہو کر آسمانی بادشاہت کا اعلان کریں گے۔ اور دین حق کی بنیا دیں جما دیں گے۔ اس وقت مسلمانوں کو کفار کا خوف مرعوب نہ کرے گا۔ وہ کامل امن و اطمینان کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔ اور دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا۔ ان مقبول و معزز بندوں کی ممتاز شان یہ ہوگی کہ وہ خالص خدائے واحد کی بندگی

کریں گے جس میں ذرہ برابر شرک کی آمیزش نہ ہوگی۔ صرف ایک خدا کے غلام ہوں گے، اسی سے ڈریں گے، اسی سے امید رکھیں گے، اسی پر بھروسہ کریں گے۔ اسی کی رضا میں ان کا جینا اور مرنا ہوگا۔ کسی دوسری ہستی کا خوف و ہراس ان کے پاس نہ پھٹکے گا۔ نہ کسی دوسرے کی خوشی ناخوشی کی پرواہ رکھیں گے۔"

ان دونوں آیتوں میں جس شخصی اور اجتماعی نعمت کا ذکر ہے، ان کے دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور دونوں میں ان کے استحقاق کی ایک ہی مشترک بنیاد بتائی گئی ہے، اور وہ ہے ـــــ ایمان اور عمل صالح۔ گویا حیات طیبہ اور تمکین فی الارض کے حصول کا راز اللہ تعالیٰ کے حصول میں پوشیدہ ہے۔ اگر ہم حقیقی معنوں میں مومن بن جائیں اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرلیں تو وہ خدا جو مالک الملک ہے جو حالات کو کنٹرول کرتا ہے اور واقعات عالم کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے، وہ ہمارے لئے ایسے اسباب وحالات پیدا کرے گا کہ ایک طرف ہم ذاتی طور پر دین کی حقیقت کو پالیں، اور دوسری طرف اگر ہمارا ایمان اور عمل صالح اجتماعی سطح پر پہونچ جائے تو خدا کی نصرت پورے اجتماعی دائرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور ہماری کوششیں ایسے موافق رخ اختیار کرینگی جن کے اجتماعی نتائج نکلنے لگیں۔

مولانا الیاس صاحب کے نزدیک یہ نصرت کا تصور تبلیغ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس سے مبلغ کو وہ قوت اور وہ سہارا حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر ماحول اور ہر قسم کے حالات میں دینی کام کا آغاز کرسکے اور ایک ناقابل شکست اعتماد کے ساتھ اپنے کام کو آخر تک جاری رکھے۔ یہ ایک طرف مبلغ کی قوت ہے۔ دوسری طرف وہ اس یقینی امید کا سرچشمہ بھی ہے کہ جس کے اوپر تبلیغ کی جاری ہے اسکا دل بھی خدا ہی کی مٹھی میں ہے اور وہ اس کو زیر کرکے رہے گا۔

دل سے خطاب | اکتوبر ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال اپنے لاہور کے مکان میں آرام کرسی پر نیم دراز ہیں۔ حقہ سامنے ہے اتنے میں ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ علیک سلیک اور رسمی مزاج پرسی کے بعد گفتگو شروع ہوتی ہے۔

"آپ ایک کتاب لکھئے" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"کیسی کتاب" نوواردنے پوچھا۔

تحقیقات کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے قصبات اور دیہات میں ہزارہا غیرمسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان از خود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور ان سے قبول اسلام کے اسباب دریافت کر کے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اس سے تبلیغ اسلام کے مقصد کو بیحد تقویت حاصل ہوگی۔

"کیا صداقتِ اسلام کے متعلق پہلے دلائل ناکافی ہیں؟"

"بہت کافی ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے کئی ایسے عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دل اور دماغ کے کام کرنے کے طریقوں میں بہت فرق ہے۔ دماغ اکثر اوقات ہزارہا مضبوط دلائل کو مسترد کر دیتا ہے اور ان کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ لیکن دل اس کے برعکس بعض اوقات کمزور سے کمزور چیزوں سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ قبول اسلام کا تعلق جس قدر دل سے ہے، دماغ سے نہیں۔ اصل بات جو مبلغ کو معلوم ہونا چاہیئے، یہ ہے کہ وہ کون کون سے نشتر ہیں جن سے دل متاثر ہوا کرتے ہیں۔ کفار اور مشرکین کے انقلاب حیات کی ہزارہا مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے حالات کے تحت، ایک خیال یا ایک مذہب پر چٹان کی طرح قائم ہوتا ہے۔ ناگہاں غیب سے اس کے دل پر ایک نشتر چلتا ہے اور چشم زدن میں اس کی زندگی کی تمام گزشتہ تاریخ بدل جاتی ہے۔ صداقت اسلام کے عقلی دلائل تو آپ کے پاس بہت ہیں۔ مگر قلبی دلائل کم ہیں۔ اگر آپ نومسلموں کے پاس جائیں تو وہ بتائیں گے کہ اسلام کی وہ کون سی بیساختہ ادا تھی جو ان کے دل کو بھا گئی۔ اگر ان کے بیانات ایک کتاب میں جمع کر دئے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ انقلاب حیات کی ایک بالکل نئی دنیا مبلغین کے سامنے آ جائے گی اور انہیں اشاعت اسلام کے لئے ایسے نئے دلائل یا جدید ہتھیار مل جائیں گے جن سے اسلام کا موجودہ کتب خانہ خالی ہے۔"

اس کے بعد مثال کے طور پر چند واقعات بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر اقبال نے مزید کہا:

"قبول اسلام میں اصل چیز دل ہے۔ جب دل ایک تبدیلی پر رضامند ہو جاتا ہے اور کسی بات پر قرار پکڑ لیتا ہے تو پھر باقی تمام جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ اس تبدیلی کی تائید کے لئے وقف ہو جائے۔ ہمیں اسلام کے قدیم اور جدید مبلغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔ قدیم مبلغوں کا وار غیرمسلموں کے دلوں پر ہوتا تھا۔ وہ اپنی للہیت، بے نفسی، خوش خلقی اور احسان و مروت کی جادو اثر اداؤں سے

دلوں کو گرویدہ کرتے تھے۔ اور اس طرح ہزارہا لوگ از خود بغیر کسی بحث و تکرار کے ان کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ مگر جدید مبلغوں کا سارا زور دماغ کی تبدیلی پر صرف ہوتا ہے۔ وہ صداقت اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں۔ مقابلہ میں دوسری حجت غیر مسلم پیش کر دیتے ہیں۔ اس پر بحث و تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ مسلمان اپنی بات پر اڑ جاتا ہے۔ غیر مسلم اپنے قول پر تن جاتا ہے۔ اس سے ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہدایت ختم ہو جاتی ہے۔"

"مبلغین اسلام کو دلوں کے متاثر کرنے کے لئے نکلنا چاہیئے یا دماغوں کے"۔ ڈاکٹر اقبال نے مزید تفصیل کرتے ہوئے کہا۔" اس کے فیصلے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم فطرت کی روش کی پیروی کریں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فطرت اپنی فتوحات حاصل کرنے کے لئے اپنا تعلق ہمیشہ دلوں سے جوڑتی ہے۔ فطرت کھانے میں لذت پیدا کرتی ہے اور آپ اسے بے اختیار کھا جاتے ہیں۔ اس وقت ایک بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا۔ کیا یہ کھانا طبی لحاظ سے مفید ہو گا۔ آپ ایک ضروری کام پر جا رہے ہوتے ہیں کہ ناگہاں پھولوں کی ایک خوشنما زمین اور لب جو کا ایک حسین نظارہ سامنے آجاتا ہے، آپ وہاں بے اختیار بیٹھ جاتے ہیں، وہیں ٹھنڈی ہوا کا ایک دلنواز جھونکا آتا ہے اور آپ کو میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ اس وقت کوئی بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا۔ مجھے سونا چاہیئے یا نہیں۔ مختصر یہ کہ فطرت ہر کام میں اسی طرح دلوں کو گرویدہ کر کے مطلب نکالتی ہے۔ وہ دماغوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتی۔ اسلام چونکہ سربسر نور فطرت ہے۔ اس واسطے مبلغین اسلام کو چاہیئے کہ اخلاق و محبت کی گہرائیوں سے دلوں کو اس طرح شکار کریں کہ ان میں سرکشی اور انکار کی سکت ہی باقی نہ رہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مبلغ اسلام، اسلامی کیرکٹر کی عظمت کے مالک ہوں۔ تاکہ سرکش سے سرکش آدمی بھی ان کے سامنے اپنی گردن جھکا دیں۔ باقی رہے دماغی مباحث اور عقلی تکرار، تو اس سے نہ تو دل مطمئن ہو سکتے ہیں نہ منقلب ہو سکتے ہیں۔ اور نہ فطرت رام ہو سکتی ہے۔"

شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مولانا الیاس صاحب کی ذات اور ان کی پھیلائی ہوئی تبلیغ کم از کم مسلمانوں کے اندر کام کی حد تک، ڈاکٹر اقبال کے اس خواب کی تعبیر ہے۔ مولانا کی پوری زندگی اور تبلیغی تحریک کی پوری تاریخ اس طریق تبلیغ کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے اور اس کے حیرت انگیز نتائج بارہا دیکھے گئے ہیں۔ یہاں واقعات کو جمع کرنا مقصود نہیں ہے۔ میں اصل مدعا کو واضح کرنے کے لئے صرف

ایک مثال نقل کروں گا۔

ایک عربی مدرسہ کے کچھ طلبہ مولانا الیاس صاحب کے یہاں حاضری کے لئے نظام الدین گئے۔ اسمیں ایک نہایت شریر طالب علم بھی تھا جس کو اس کے ساتھیوں نے کہہ سن کر وہاں جانے کے لئے راضی کیا تھا۔ جانے کو تو وہ طالب علم چلا گیا۔ مگر جب رات ہوئی اور لوگ سو گئے تو وہ کچھ ساتھیوں کو لے کر سنیما دیکھنے کے لئے دہلی روانہ ہوگیا۔ ان لوگوں کو نظام الدین سے دہلی جانے کے لئے تو بس مل گئی مگر دوسرا شو دیکھ کر جب وہ فارغ ہوئے تو واپسی کے لئے کوئی بس نہیں تھی۔ مجبوراً رات کو یہ لوگ دہلی ہی میں رہ گئے۔

یہاں نظام الدین میں صبح کی نماز کے بعد حسب معمول جب مولانا الیاس صاحب وعظ کے لئے منبر پر بیٹھے تو انھوں نے کہا —— مدرسہ کے لوگ جو کل شام کو آئے ہیں وہ سب قریب آجائیں"۔ اس وقت وہاں صرف دو طالب علم تھے۔ مولانا نے کہا خیر انتظار کیجئے۔ وہ لوگ شاید ضروریات کے لئے کہیں گئے ہوں۔ واپس آجائیں گے تو گفتگو شروع ہوگی۔ مگر وہ لوگ کافی دیر بعد نظام الدین پہونچے۔ اب ان کا معاملہ مشتبہ ہوگیا۔ نیز بعض ذریعوں سے بھی معلوم ہوگیا کہ وہ لوگ سنیما دیکھنے کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے۔

اس وقت مذکورہ مدرسہ کے ناظم صاحب بھی نظام الدین میں موجود تھے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ طلبہ نے یہاں آکر اس قسم کی "بیہودگی" کی ہے تو وہ سخت برہم ہوئے۔ مذکورہ طالب علم کے بارے میں پہلے ہی سے ان کی رائے خراب تھی۔ کیونکہ وہ مدرسہ میں بُری عادتوں کی وجہ سے کافی بدنام تھا۔ وہ اس قدر ڈھیٹ ہوچکا تھا کہ ایک بار مدرسہ کی انجمن کے لئے چندہ وصول کرنے گیا اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ۲۰ ہزار روپے چندہ وصول کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر روپیہ ملا تو اس نے پورے روپیہ کی ناولیں خرید ڈالیں اور ان کے پارسل انجمن کے کتب خانہ کے نام روانہ کر دیئے۔ یہاں جب ذمہ داران مدرسہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے بندھے ہوئے بنڈل بازار میں بھجوا دئے اور انھیں ردی میں فروخت کرا دیا۔

رات کے واقعہ کے بعد یہ سارے واقعات ناظم صاحب کے ذہن میں آگئے۔ اس سے پہلے اس کو سمجھانے بجھانے کی ساری کوششیں ناکام ہوچکی تھیں۔ انھوں نے سوچا کہ اب یہ لڑکا ناقابل اصلاح ہوچکا ہے اور مدرسہ کو مزید بدنامی سے بچانے کے لئے اس کا فوراً اخراج ہوجانا چاہئے۔ چنانچہ انھوں نے مدرسہ کے پرنسپل کو خط لکھا کہ فلاں طلبہ نے یہاں آکر ہمارے مدرسہ کو سخت بدنام کیا ہے ان کے نام فوراً مدرسہ سے خارج کر دئے جائیں۔

ادھر جو صاحب اس طالب علم کو کہہ سن کر نظام الدین لوا گئے تھے۔ وہ پریشان ہوئے۔ انکی سمجھ میں آیا کہ مولانا الیاس صاحب سے یہ تمام بات کہہ دی جائے۔ چنانچہ تنہائی میں حاضر ہو کر انھوں نے مولانا کو پورا واقعہ بتادیا۔ مولانا نے کہا ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سب درست فرمادے گا۔

اس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر جب شام کی مجلس ہوئی تو مولانا نے قلم کاغذ اور لفافہ منگوایا۔ اور مدرسہ کے ناظم صاحب کو قریب بلا کر کہا کہ آپ کے مدرسہ کے پرنسپل صاحب کے نام ایک خط میں املا کراتا ہوں اس کو لکھئے۔ اس کے بعد انھیں کے ہاتھ سے اس مضمون کا ایک خط لکھوایا کہ آپ کے مدرسہ سے کچھ لڑکے یہاں آئے۔ میں اُن سے بہت خوش ہوں۔ وہ یہاں سے بہت کچھ لے کر جارہے ہیں۔ میری خصوصی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ اور آپ سے گزارش ہے کہ آپ ان سے اعزاز واکرام کا معاملہ فرمائیں۔ اس کے بعد ناظم صاحب سے کہا کہ آپ بھی اس پر اپنی تصدیق لکھئے۔ ناظم صاحب نے خاموشی سے تصدیق لکھ دی۔ اور اس کے بعد مولانا نے اپنے ہاتھ سے وہ خط لفافہ میں بند کر کے اپنے خاص آدمی کو دیا کہ جاؤ ڈاک میں ڈال آؤ۔

اس واقعہ کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ مدرسہ کا سب سے زیادہ شریر طالب علم وہاں کا سب سے زیادہ شریف اور سنجیدہ طالب بن گیا۔ اور تبلیغ کا باقاعدہ کارکن بن گیا۔ لوگ اس سے پوچھتے کہ تمھاری زندگی میں اتنا زبردست تغیر کیسے ہو گیا تو وہ صرف ایک جملہ کہتا ——— "مولانا الیاس نے مجھے چھین لیا۔" جس شخصیت کو مدرسہ کا علم اور ناظم کے اختیارات قابو میں نہیں لاسکے تھے۔ اس کو اخلاق کی طاقت نے مسخر کر لیا۔

اس طرح کے واقعات سے مولانا الیاس صاحب کی زندگی اور تبلیغی تحریک کی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ دعا اور محبت و اخلاق اور خیر خواہی نے ہزاروں قلوب کو جیتنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تبلیغ کی زبان میں ایک عجیب تسخیری شان پیدا ہو گئی ہے۔ آپ تبلیغ کے کسی بھی جلسے میں شریک ہو کر اس کے مقررین کی تقریریں سنئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہاں ایک ایسی زبان استعمال ہوتی ہے جو ساری تحریکوں سے جدا ہے۔ اس زبان کے اجزا میں ——— سادگی گھلاوٹ، حقیقت سے قریب تر استدلال، روح کو مانوس کرنے والا انداز، دل کو چھیدنے والے کلمات [illegible] کہ تبلیغ کے کارکن، ڈاکٹر اقبال کے الفاظ میں، دل کی راہ سے

چلتے ہیں۔ اس لئے خواہ ان کے یہاں عقلی ساز کا سامان کم ہو مگر دل والی باتوں کی بہتات ہے اور یہ اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ (باقی)

الفرقان
ملکیت اور دیگر تفصیلات
فارم نمبر ۴
دیکھئے رول (۸)

۱۔ مقام اشاعت ... ... کچہری روڈ لکھنؤ
۲۔ وقفۂ اشاعت ... ... ماہانہ
۳۔ پرنٹر کا نام
۴۔ پبلشر کا نام ... ... محمد منظور نعمانی
۵۔ ایڈیٹر کا نام
۶۔ مالک کا نام
شہریت ... ... ہندوستانی
پتہ ... ... کچہری روڈ، لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مذکورۂ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

محمد منظور نعمانی
(پبلشر)

قرآن کا تصورِ انسان

(جناب امیں احمد، استاد شعبہ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی)

دورِ جدید کے ایک نامور مفکر نے آج کی دنیا کا جائزہ لے کر بہت خوب کہا تھا کہ "ہم نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اُڑنا اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا لیکن زمین پر اچھے انسانوں کی طرح رہنا نہ سیکھ سکے۔"

آج کے انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ ذرائع و وسائل کی دنیا میں تو اس نے محیر العقول ترقی کر لی ہے۔ لیکن فکر و اخلاق کے میدان میں زندگی کی شاہراہ اس کے سامنے صاف اور واضح صورت میں آج بھی موجود نہیں ہے۔ اس کی فکر پراگندہ اور سماجی تعلقات نت نئی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہیں۔ اسکی روح مضطرب ہے اور وہ ایک بہتر دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہے، وہ اپنی عقل کو رہنما بنانے نئے نئے سوالات کے حل تلاش کرنے اور بگاڑ کی اصل تک پہونچنے میں لگا ہوا ہے۔ ان حالات میں غور و فکر کا ایک یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ آج کی دنیا کے سامنے انسان کا جو تصور ہے کہیں وہی خام نہ ہو۔ ظاہر ہے ایک غلط تصورِ انساں پر تہذیب و تمدن کی جو بھی عمارت تعمیر ہوگی، وہ کتنی ہی فلک بوس کیوں نہ ہو، اسکی بنیاد کی خامی اسے متاثر و مجروح کرے گی۔

زیرِ نظر مقالے میں قرآن کے تصورِ انسان کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس تصورِ انسان کے آئینہ میں دورِ جدید کے انسان کے ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی جا سکے جو اسکو پریشان و سرگرداں کئے ہوئے ہیں۔

قرآن وہ واحد کتاب ہے، جس کا خطاب انسان اور انسانیت سے ہے اور جسے نازل کرنیوالا کوئی گوشت پوست اور محدود عقل کا انسان نہیں ہے بلکہ ایک "عقلِ کل" ایک "قادرِ مطلق" اور ایک "علیم و خبیر" ہستی ہے۔

یہ صحیفہ الٰہی جس ہستی کو مخاطب کرتا اور اسکی ہر آیت اور ہر نشانی جس ذی روح کو مخاطب کرتی ہو، اور اس کے ضوابط وحدود جس مقصد کو سامنے رکھ کر مقرر کئے گئے ہیں، وہ صرف انسان اور انسانیت ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے کسی موقع پر بھی فرد کو اپنا مخاطب نہیں قرار دیا بلکہ ہمیشہ "انسان" "انسانیت" اور "گروہ ابن آدم" کو اپنا مخاطب گردانا ہے۔

قرآن عہد حاضر کی وہ اولیں کتاب ہے، جس نے انسان کے بارے میں ایک واضح اور متعین نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ جس نے ان مابعد الطبیعاتی مسائل پر حتمی اور قطعی فیصلے کئے ہیں، جو مدت ہائے دراز سے فکر انسانی میں ایک غلجان برپا کئے ہوئے تھے اور مابعد الطبیعاتی مسائل پر ایسے حتمی فیصلے وہ ذات ہی کر سکتی تھی، جو زمان و مکان کی خالق ہو۔ چنانچہ قرآن پاک نے سب سے پہلے انسان کی اصل اور حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر دنیا میں انسان کی حیثیت، کائنات میں اس کے مقام اور مقصد اور ان اختیارات و فرائض کو متعین فرمایا ہے جو انسان کو عطا کئے گئے ہیں۔

انسان کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ یہ سوال ایک مدت سے مفکرین کا موضوع بنا رہا ہے۔ دور جدید کے مفکرین مثلاً لامارک ڈارون، ٹی ایچ ہکسلے، ہنری برگساں اور لائیڈ مارگن وغیرہ نے تصور ارتقاء کی مدد سے انسان کی حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی اور بعد از تلاش بسیار یہ کہہ سکے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، جو تجرباتی ٹھوکروں، طبیعاتی انقلابوں، حیاتیاتی تبدیلیوں اور بعض حادثوں کے سبب وجود میں آیا ہے۔ جس انسان کے آباء و اجداد چوپائے، اچھلنے کودنے والے جانور اور درندے ہوں، وہ اپنے ماضی سے کیا رہنمائی حاصل کرتا ہے اور اس سے انسانیت کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ قرآن نے اس کے مقابلے میں انسان کے ایک مستقل اور آزاد وجود کا تصور پیش کیا ہے۔ وہ انسان کو ایک حادثہ کی پیداوار نہیں قرار دیتا، بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے اور ایک مقدر عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے چنانچہ:-

"جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک کھری سڑی ہوئی کیچڑ سے خمیر کی ہوئی کھن کھن بولنے والی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں......" (۱۵-۲۸)

"کیا ہم نے تمہیں ذلیل پانی سے پیدا نہیں کیا پھر ہم نے اس کو ایک محفوظ قرار گاہ میں رکھا ایک مقررہ وقت تک، پھر ہم نے اندازہ ٹھہرایا سو ہم کیا اچھا اندازہ کرنے والے ہیں" (۷۷-۲۰)

"جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" (البقرہ-۳۰)

ان آیاتِ قرآنی سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ (۱) تخلیقِ انسان ایک حادثاتی امر نہیں ہے۔
۲۔ تخلیقِ انسان ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوئی ہے (۲-۳)
۳۔ انسان ایک مستقل اور آزاد وجود کا مالک ہے۔ یہ کسی ارتقائی عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے انسان کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:۔ "ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی پھر تمہاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔" (اعراف۔ ۱۱)

"تصور کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ پھر جب اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اسکے اندر اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔" (ص۔ رکوع ۵)

انسانی جسم میں روح کا پھونکا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ محض ایک مادی وجود نہیں ہے۔ اسکے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ پھر یہ کہ روزِ اوّل سے انسان کا ایک آزاد وجود ہے۔ وہ نہ تو محض حیوانِ ناطق ہے۔ اور نہ ہی کوئی متمدن جانور، بلکہ ابتدا ہی سے ایک آزاد مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے عقل و شعور نباتاتی نشو و ارتقار سے اکتساب نہیں کی ہے بلکہ روزِ اوّل سے ہی اسے عقل و شعور اور ارادہ کی قوت سے نوازا گیا ہے جس کے ساتھ ہی اس پر بعض اخلاقی ذمہ داریاں بھی عائد کی گئی ہیں۔

انسان کے وجود کے بارے میں ایک مثبت اور واضح تصور دینے کے بعد قرآن دنیا میں انسان کی حیثیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ چنانچہ تخلیقِ آدم سے قبل اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے اپنے ارادہ کا اظہار ان الفاظ میں فرماتا ہے:۔

"واذ قال ربك للملٰئكة انی جاعل فی الارض خلیفة" (البقرہ - ۳۰)

(ترجمہ) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

گویا دنیا میں اللہ کے اس خلیفہ کی حیثیت کسی ادنےٰ مخلوق یا کائنات کے ایک ناقابلِ التفات جزو کی نہ تھی بلکہ اسے کائنات کے مرکز و محور ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وہ کائنات کے کسی تغیر و تبدل سے وجود میں نہیں آیا بلکہ کل کائنات کو اس کے لئے پیدا کیا گیا۔ چنانچہ تخلیقِ آدم کے وقت فرشتوں کا حضرت آدم کو سجدہ کرنا گویا علامتی حیثیت سے پوری انسانیت کو سجدہ کرنا تھا۔ قرآن انسان کی مرکزیت اور برتری کو ان الفاظ میں تسلیم کرتا ہے:۔

"وسخر لکم اللیل والنہار والشمس والقمر والنجوم۔" اس نے تمہاری بھلائی کے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں... وہی جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ۔ اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے یہ سب کچھ اسی لئے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار رہو۔"

یہاں پر قرآن نے بنیادی طور پر اس نظریہ کا ابطال کیا ہے کہ انسان اس کائنات کا ایک 'ساختہ' ہے۔ اس کے برعکس قرآن ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے کہ انسان کو کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور کائنات کی ہر شے اس کے لئے مسخر یعنی 'معاون' کر دی گئی ہے۔ تمام قوانین فطرت کو اس امداد کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ انسانی فکر کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے 'عظمت آدم' اور تفوق انسانیت کے تصورات انسان کو وہ بلندی اور اہمیت دینے میں ناکام ہو چکے ہیں جو قرآن مجید نے اسکو عطا کیا ہے۔

(۲)

انسان کی اس عظمت اور بلندی کا مقصد کیا ہے۔ یہ وہ بنیادی سوال ہے جسے قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ تمام عظمت و بلندی صرف اس لئے ہے کہ انسان شکر گزار بنے، اس کے مقابلے میں انسان کی روش یہ رہی ہے کہ اس اہمیت اور بلندی نے اسے اپنے بارے میں سخت غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا۔ اس نے جب قوانینِ فطرت کو اپنے ساتھ تعاون کرتے اور فطرت کی عظیم قوتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہوتے دیکھا، تو یکایک اپنے اندر الوہیت کی صفات محسوس کرنے لگا۔ قرآن اس روش کو ناشکر گزاری سے تعبیر کرتا ہے۔ انسان کے اس طرزِ عمل کو قرآن میں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو۔ بنی اسرائیل۔ ۱۱، ابراہیم ۔ ۳۴، بنی اسرائیل ۶۷-۲، السجدہ ۹،۴۸ الشوریٰ ۴۸، اعراف ۱۹، عبس ۱۷، فجر ۱۵، بلد ۱۰، عادیات ۶، حج ۶۶، روم ۳۴، سجدہ ۲۷، زمر ۸، اعراف ۱۹، روم ۳۶، السجدہ ۴۹۔

قرآن نہ تو انسان کو حقیر و ذلیل کر کے پیش کرتا ہے اور نہ اسے اپنی الوہیت کے دھوکے میں مبتلا ہونے دیتا ہے۔ وہ پہلے انسان کو اس کی حقیقت کا احساس ان الفاظ میں دلاتا ہے کہ:۔

"بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھا (الدھر)

اور پھر انسان کو ایک منصبِ عظیم یعنی "خلافت فی الارض" پر فائز کرتا ہے۔ گویا قرآن انسان کو اوّل ان غلط اور خود ساختہ بلندیوں سے اتار کر اس کی حقیقت اس پر آشکار کرتا ہے اور اس کے بعد دوبارہ انسان کو حقیقی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں ارتقاء کی سمت کم تر سے بلند تر کی طرف ہے۔ یہی تصورِ ارتقاء انسان کو کسی احساسِ کمتری میں مبتلا کرے بغیر عظمتِ آدم کا صحیح تصور دیتا ہے۔

انسان کو مرکزِ کائنات بنانے کے بعد ضروری تھا کہ انسان کو حق و باطل میں تمیز کرنے اور فیصلہ کرنے کا علم بھی دیا جائے۔ یہ علم کسی تجربہ کی صورت یا کسی مسلسل عمل کے نتیجہ میں ظاہر نہیں ہوا۔ بلکہ تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی انسان کو دیدیا گیا۔ چنانچہ سورۂ بقر میں ارشاد ہوتا ہے: "وعلم آدم الاسماء کلھا" یعنی اس کے بعد اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھلا دیئے۔ یہ وہ خصوصیت تھی جو انسان کو فرشتوں پر فوقیت عطا کرتی ہے اور یہی علم کی صفت انسان کو دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے لیکن انسان کو صرف علم دنیا کا کافی نہ تھا علم محض کبھی بھی عمل کا بدل نہیں ہو سکتا چنانچہ عمل کی اصلاح کے لئے قرآن نے انسان کو ایک طرف تو ارادہ اور اختیار کی صلاحیت دی اور دوسری طرف اس ارادہ و اختیار کو استعمال کرنے کے لئے بعض محرکات بھی فراہم کر دیئے تاکہ ارادہ و اختیار صحیح سمت میں حرکت کر سکیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"...... مگر (اللہ کی حیثیت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلاف سے روکے اس وجہ سے) انھوں نے باہم اختلاف کیا۔ پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" (البقرہ ۲۵۳)

"یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ نہ ہمارے باپ دادا۔ بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا ......" (انعام۔ ۱۴۸)

"اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آچکی، کوئی چیز اس بات سے کہ وہ ایمان لائیں۔ اور اپنے پروردگار سے معافی مانگیں روکنے والی نہیں ہے ......" (الکہف ۱۸۔ ۵۵)

"اسی طرح ہم نے اس کو (نیکی اور بدی کی) راہیں دکھلا دیں۔" (۹۱۔ ۱۰)

گویا اللہ تعالیٰ نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ انسان کو بھی فرشتوں کی طرح 'ہدایت یافتہ' بنا دے یعنی وہ برائی پر قادر ہی نہ ہو بلکہ اس نے انسان کو یہ اختیار دیا کہ وہ اگر چاہے تو برائی سے اجتناب کرے اور اگر چاہے تو اسے اختیار کر لے۔ اسی علت کے سبب حیات بعد الموت میں جواب دہی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن انسان کو علم، عقل، ارادہ و اختیار سے آراستہ کرنے کے بعد اور یہ یاد دہانی کرانے کے بعد کہ وہ درحقیقت ایک ذمہ دار اور ذی شعور مخلوق ہے اسے ان فرائض و ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے جو اس کے خالق نے اس پر عائد کی ہیں، عمل کے لئے خود مختار چھوڑ دیتا ہے۔ وہ کوئی پابندی ایسی نہیں لگاتا کہ انسان کسی ایک راستہ پر چلنے پر مجبور ہو۔ ارشاد ربانی ہے:۔

"جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں اگر ان کو پالینے کے بعد بھی تم نے لغزش کھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پرے ساتھ لئے خود سامنے آموجود ہو اور فیصلہ کر ہی ڈالا جائے۔ آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ کے حضور میں ہونے والے ہیں۔" (۲ - ۲۰۹ - ۲۱۰)

گویا قرآن انسان سے اس بات کا متمنی ہے کہ وہ دلیل کھل کر سامنے آجانے کے بعد لا محالہ اپنی قوت اختیار کا استعمال کرتے ہوئے اپنے لئے سواء السبیل کا انتخاب کرے گا۔ وہ ایمان کی قدر و قیمت اسی میں سمجھتا ہے کہ بدی پر اختیار ہونے کے باوجود انسان بدی کا ارتکاب نہ کرے اور نیکی کو اختیار کرے۔ لیکن چونکہ انسان کو محدود صلاحیتیں دی گئی ہیں، اس لئے قرآن انسان کو بغیر کسی پاسبان عقل کے چھوڑ دینے کا قائل نہیں ہے۔ انسان کبھی اپنے داخل کا کلی طور پر انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسکا نقطۂ نظر کسی معاملے پر بھی مکمل خارجی نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ کسی بیرونی ہدایت اور بیرونی ذریعہ علم کا حاجت مند رہا ہے۔ قرآن اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے عنایت کردہ نظام زندگی کو بطور ایک حل کے پیش کرتا ہے۔ یہ تصور حیات ایک ایسی ہستی کا ترتیب دیا ہوا ہے، جو علیم و خبیر اور بصیر ہے، ہر قسم کی غرض اور خطا سے پاک ہے۔ اس لئے یہی ضابطہ حیات ایک معروضی ([illegible]) معیار پر پورا اتر سکتا ہے۔

(۳)

قرآن پاک انسان کی حقیقت کائنات میں اس کے مقام اور مقصد سے بحث کرتے وقت اس دنیاوی زندگی کو ایک ایسے 'تجرباتی احساس' سے تعبیر کرتا ہے جس کی کوئی دائمی حیثیت نہیں ہے۔ جو محض حقیقت کا ایک سایہ اور پرتو ہے۔ چنانچہ قرآن دنیاوی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی حقیقی اور ابدی زندگی کا انتہائی واضح نقشہ کھینچنے کے بعد [illegible] ایک سوال کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے "اس وقت ان کا رب [illegible] یہ کہیں گے

بلکہ دے تمہارے رب کی حقیقت ہی ہے ...... (انعام ۲۴-۳۲)

قرآن کریم کی رو سے یہ دنیا انسان کا مستقل اور دائمی مسکن نہیں بلکہ ابدی زندگی کی تمہید ہے، اور اس کی حیثیت ایک مختصر اور متعین مدت کے لئے ترتیب دی ہوئی امتحان گاہ کی سی ہے۔ اس چیز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ الدنیا مزرع الاخرۃ دنیا آخرت کے لئے کھیتی کی حیثیت رکھتی ہے یعنی جو کچھ یہاں بوؤ گے وہاں کاٹو گے۔ قرآن انسان کو مشاہدہ محض کی دنیا سے نکال کر شاہد حق کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ بار بار انسان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ وہ آیات الہی میں غور کرے اور پس پردہ جو حکمت کار فرما ہے، اس کا احساس و مشاہدہ کرے۔

(۴)

قرآن ہمیں جو تصور انسان دیتا ہے، وہ نہ تو معصوم کہا جا سکتا ہے اور نہ پیدائشی طور پر گنہگار رہا، بلکہ ہم اسے ایک با اختیار انسان کا تصور کہہ سکتے ہیں۔ کچھ مذاہب نے یہ تصور پیش کیا کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے۔ قرآن اس تصور کی تردید تخلیق آدم کے واقعہ سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی۔ جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہونچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ (۲-۳۷-۳۸)

قرآن واضح طور پر تردید کرتا ہے کہ آدم کو کسی گناہ کی پاداش میں دنیا میں بھیجا گیا۔ اس موقع پر اگر قرآن کی دوسری سورت کی اس آیت کا مفہوم ذہن میں رکھا جائے، جس میں اللہ تعالے تخلیق آدم کے ارادہ کا اظہار فرشتوں کے سامنے فرماتا ہے تو یہ نہیں کہا جاتا کہ میں جنت میں رکھنے کے لئے ایک انسان بنا رہا ہوں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ "میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔" اول الذکر آیت میں واضح طور پر حضرت آدم کی توبہ کی قبولیت کے اعلان کے بعد انسان کے اولین گناہ، کا تصور باقی نہیں رہتا۔ قرآن اس بات کی بھی تردید کرتا ہے کہ حضرت آدم کو ترغیب میں حضرت حوا کا حصہ تھا بلکہ وہ ان مرد اور عورت دونوں کو مساوی طور پر غش کے بہکانے میں آجانے والا قرار دے کر دونوں کی معافی کا اعلان کرتا ہے اور ان کی بھول کو حرف غلط کی طرح مٹا کر انہیں پاک و صاف قرار دینے کے بعد زمین پر اپنے نائب کی حیثیت سے بھیجتا ہے۔ گویا قرآن کسی پیدائشی گناہ گار انسان کی جگہ ایک صحت مند اور

قوی ارادہ انسان کا تصور پیش کرتا ہے۔ قرآن انسان کی عظمت، گناہ نہ کرنے میں نہیں قرار دیتا بلکہ گناہ کی تحریکات کے باوجود گناہ سے دامن بچا جانے اور ... اور غلطی کے اعتراف اور مائل بہ اصلاح ہونے میں قرار دیتا ہے۔

قرآن انسان کی انفرادی ذمہ داری کے ساتھ اس کی اجتماعی ذمہ داری کو بھی غیر معمولی اہمیت دیتا ہے، قرآن کا انسان اعتقادات کو اپنا ذاتی معاملہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ایک معاشرہ اور ایک عالمگیر برادری کے رکن کی حیثیت سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے کمربستہ نظر آتا ہے۔ ایمان کے کلمہ جامعہ کا اقرار کرتے ہی ایک شخص ایک طرف خدا سے جڑ جاتا ہے تو دوسری طرف ایک اُمت کا جزو بھی بنجاتا ہے۔ دونوں عمل بیک وقت رونما ہوتے ہیں۔ یہ اُمت صرف عقیدہ، ایمان اور اخلاق کی بنیاد پر بنتی ہے۔ یہی وہ واحد اصولی فرق و امتیاز ہے، جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ وہ تمام انسان جو خلافت فی الارض کی ذمہ داری کو شعوری طور پر اٹھاتے ہیں، ایک اُمت بنجاتے ہیں۔ یہی اُمت وسط ہو اور وہ تمام انسان جو اس حق کا انکار کرتے ہیں، ایک دوسرے گروہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حدیث نبوی میں آتا ہے کہ "الکفر ملة واحدة" قرآن کا انسان مطلوب ایک حق گو اور حق شناس ہستی ہے، جو انفرادی زندگی کے ساتھ ہی اجتماعی زندگی میں بھی اصلاح و تہذیب میں مصروف نظر آتی ہے۔

(۵)

قرآن ہمیں جو تصورِ انسان دیتا ہے، وہ مساواتِ انسانی پر مبنی ہے۔ وہ کسی نسل کی برتری، رنگ کی تفریق یا زبان کے تعصب کو راہ نہیں دیتا، بلکہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ "لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلائے ...." (النساء۔۱)

نوع انسان کی مساوات ان تمام بتوں کو پاش پاش کر دیتی ہے جنھیں ہم قومیت وطنیت اور رنگ و نسل وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس طرح ایک باپ کی اولاد آپس میں کوئی تفاخر نہیں کر سکتی بالکل اسی طرح کل نوعِ انسان باہم کسی قسم کا تفاخر کرنے کا حق نہیں رکھتی۔

(۶)

انسانی مساوات کے اس عالمگیر تصور کے ساتھ ہی قرآن انسان کی فطرت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ

ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین فطرت کے ساتھ تخلیق کیا ہے : لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۔" اور اسکے ساتھ ہی انسان کی فطرت میں سچائی اور صداقت کی ہر آواز پر لبیک کہنے کا ایک داعیہ رکھ دیا ہے ۔ یہ داعیہ حق دراصل ایک "تحت الشعوری احساس" ہے اس قدیم تجربہ کا، جو بنی نوع انسان نے ایک 'میثاق' کی شکل میں اللہ کے تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا (ملاحظہ ہو سورہ اعراف ۔ ۱۷۱) یہی تحت الشعوری احساس ہے جو ایک سخت منکر سے منکر انسان کو بھی مصیبت و آزمائش میں اللہ کا نام لینے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ خود قرآن بیشمار مقامات پر یہ کہتا ہے کہ جب انسان سمندروں میں طوفانوں میں گھر جاتا ہے تو کیسے مدد کے لئے پکارتا ہے ۔ وغیرہ ...... اسی تحت الشعوری احساس کو جگانے اور اسے ایمان کی شعوری سطح تک لانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا ۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو مذکّر (یاد دلانے والا) اور اُن کی دعوت کو ذکر یا تذکرہ یا تذکیر (یاد، یادداشت، یاد دہانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ۔ دراصل یہ تذکیر اور یاد دہانی اسی عہد نامہ کی تھی جو نوعِ انسانی کی ارواح کے اجتماع سے لیا گیا تھا اور یوں یہ فطری داعیہ محض ایک احساس سے آگے بڑھ کر ضابطہ حیات اور وہ بھی غیر متبدل اصولوں میں بدل جاتا ہے، جہاں ظن و گمان کی گنجائش نہیں رہتی ۔ صداقت کا یہی فطری داعیہ ہے جو انسان کے اوّلین گناہ کے وقت ضمیر کی پکار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔

لیکن قرآن اپنے انسان مطلوب کو محض اس فطری داعیہ کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑ دیتا ۔ بلکہ وہ کہتا ہے " وعلی اللہ قصد السبیل ومنہا جائر ۔" (النحل ۔ ۹)

یعنی " اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ راستے ٹیڑھے موجود ہیں ۔"

اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے نبوت کی ابتدا ہوتی ہے اور قرآن کا انسان مطلوب ایک آزاد و مختار حیثیت رکھنے والا، ذی شعور، ذی ہوش اور ذی ارادہ مخلوق کی حیثیت سے خلافت فی الارض کی ذمہ داری پر فائز بنی نوع انسانی کی عالمگیر مساوات کا داعی اپنی رہنمائی اور رہبری کے لئے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ فرمان اور فرمان بردار انبیاء علیہم السلام کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہی وہ ہمہ گیر تصور ہے، جس کی غیر موجودگی یا جس کی کسی کڑی کے گم ہو جانے سے انسان اس اندھے شخص کی طرح ہو جاتا ہے جو تاریکیٔ شب میں اندھیرے کمرے میں ایک ایسی سیاہ بلی تلاش کر رہا ہو جو وہاں موجود نہ ہو ۔

(فکر و نظر کراچی)

Vol. 34 No. 10 Regd. No. L-1??

MARCH 1967

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow



الفرقان لکھنؤ

34 (11)

مرتبین

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

قیمت فی پرچہ 65 P.

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ کتاب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ	ماہنامہ	سالانہ چندہ
غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ ہوائی ڈاک کے لیے مزید محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا	# الفرقان لکھنؤ فی کاپی ...... ۶۵ پیسے	ہندوستان سے ...... ۷/- پاکستان سے ...... ۷/- ششماہی ہندوستان سے ...... ۴/- پاکستان سے ۴/-

جلد ۳۴	بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ مطابق اپریل ۱۹۶۷ء	شمارہ (۱۱)

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو. براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ر اپریل تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔ اور ڈاک خانہ کی پہلی رسید کے ساتھ ہمیں براہ راست اطلاع دیں۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۱۰ر تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ اس کی اطلاع ۱۰ر تاریخ تک آجانی چاہیئے، اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

سالانہ چندہ غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ ہوائی ڈاک سے کے لیے مزید محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا	لکھنؤ **الفرقان** ماہنامہ فی کاپی ... ... ۶۵ پیسے	سالانہ چندہ ہندستان سے ... ... ۷/- پاکستان سے ... ... ۷/- ششماہی ہندستان سے ... ... ۴/- پاکستان سے ۴/-

شمارہ (۱۱)	بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ مطابق اپریل ۱۹۶۷ء	جلد ۳۴

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۸ھ/ اپریل تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔ اور ڈاک خانہ کی پہلی رسید کے ساتھ ہمیں براہ راست اطلاع دیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے، اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

حال میں ایک پادری صاحب نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق عیسائی اعتقادات کو قرآن پاک سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف کا یہ مضمون صدقِ جدید لکھنؤ کی تین قریبی اشاعتوں میں نکلا ہے۔

پادری صاحب کی اس جرأت کی داد نہیں دیجاسکتی کہ حضرت مسیح کے بارے میں جس اعتقاد کو رد کرتے ہوئے قرآن دعوتِ مباہلہ تک دے چکا ہے۔

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ

(آل عمران ۔ ع ۶)

پس اے پیغمبر جو حجت کرے تم سے عیسٰی کے بارے میں بعد اسکے کہ جو آ گیا ہے تمہارے پاس قطعی علم۔ تو کہدو کہ آؤ بلائیں ہم اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو، اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو، خود اپنے آپکو اور تم کو۔ پھر ہم سچے دل سے اس بات کی دعا کریں کہ لعنت ہو اللہ کی اُن پر جو اس معاملے میں ناحق پر ہیں۔

اُسی اعتقاد کا ثبوت وہ قرآن سے دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پادری صاحب کا کہنا ہے کہ قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق "کلمۃ منہ" اور "رُوحٌ منہ" کے الفاظ آتے ہیں (یعنی کلمۃ من اللہ و روحٌ من اللہ) جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اللہ کی جنس سے ہیں۔ یعنی پادری صاحب کے قول کے مطابق یہاں لفظ "مِنْ" بیانِ جنس کے لئے ہے، جیسا کہ عربی زبان میں اس کا استعمال اسی مقصد سے ہوتا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ قرآن بھی (معاذ اللہ)

حضرت مسیح کی الوہیت کا اقرار کرتا ہے۔

دوسری دلیل پادری صاحب کی یہ ہے کہ قرآن حضرت مسیح سے ایسے افعال کا صادر ہونا بیان کرتا ہو جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں اور حضرت مسیح کے علاوہ کسی بھی دوسرے انسان کے لئے ایسے افعال قرآن میں بیان نہیں ہوئے۔

کوئی تعجب نہ ہوتا کہ اگر پادری صاحب نے یہ مضمون عیسائیوں کا عقیدہ مضبوط کرنے یا مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسری غیر عیسائی قوم کو اپنے عقیدہ کی صداقت بتانے کے لئے لکھا ہوتا۔ لیکن یہ مضمون لکھا گیا ہے ایک ایسے پرچے میں جسکے پڑھنے والے غالباً ننانوے ۹۹ فی صدی مسلمان ہیں اور جس کا اڈیٹر مفسر قرآن۔ ایسے مخاطبین کے سامنے اور ایسی لچر باتیں! اگر قرآن کے یہ الفاظ ایسے سیاق سباق میں نہ ہوتے جو صراحۃً عیسائی عقیدے کی تردید یا اصلاح پر مبنی ہے تو گمان کیا جا سکتا تھا کہ پادری صاحب غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مگر جس سیاق سباق میں یہ الفاظ ہیں وہاں تو کسی غلط فہمی کی گنجائش ہی نہیں۔

- حضرت مسیحؑ کے متعلق "کلمۃٍ منہ" کے الفاظ سورہ آل عمران کے پانچویں رکوع میں آئے ہیں ملاحظہ ہو۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ	جب کہا فرشتوں نے کہ اے مریم اللہ بشارت
يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ	دیتا ہے تجھ کو اپنے ایک کلمہ کی جسکا نام مسیح عیسیٰ
الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا	ابن مریم ہے جو معزز ہوگا دنیا اور آخرت
فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ	میں اور مقربین میں سے۔ اور کلام کرے گا
الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ	لوگوں سے گہوارے میں اور پختہ عمر میں (بھی)
وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَتْ	اور ہوگا نیک لوگوں میں سے۔ کہا مریم نے کہ
رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ	اے میرے پروردگار کیسے ہوگا میرا کوئی بچہ
بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ	جب کہ نہیں چھوا ہے مجھے کسی مرد نے فرمایا کہ
مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا	اللہ ایسے ہی پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے وہ
يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝	جب طے کرتا ہے کسی بات کو تو بس فرماتا ہو کہ
	ہو جا سو وہ ہو جاتی ہے۔

یہاں "اذا قضی امراً فانما یقول لہ کن فیکون" کے الفاظ خود بتلا رہے ہیں کہ "کلمۃ منہ" کا کیا مطلب ہے۔ لیکن آگے حضرت مسیح کے متعلق بیان کا یہ سلسلہ جہاں ختم ہوا ہے وہاں اور صراحت سے فرمایا گیا ہے کہ:

اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝ (آل عمران ع ۶)	عیسیٰ کی مثال اللہ کے یہاں بلاشبہ آدم کی جیسی ہے۔ کہ بنایا اُس کو مٹی سے پھر کہا اس سے کہ ہو جا سو وہ ہو گیا حق بس وہ ہے جو تیرے رب کی جانب سے ہے۔ لہٰذا تم نہ ہو شک کرنے والوں میں سے۔

اور اسی سے متصل وہ آیتِ مباہلہ ہے "فمن حاجك من بعد ما جاءك من العلم" جو اوپر نقل کی گئی یعنی مسیح کے بارے میں حقیقت بس یہ ہے اور جو اس میں بحث کرتا ہے اس کو مباہلہ کی دعوت ہے۔

"روح منہ" کے الفاظ سورۂ نساء کے بائیسویں رکوع میں ہیں اور وہاں تنہا اسی آیت سے پورا معاملہ صاف ہو جاتا ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے۔

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ ط اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَۃٌ ط اِنْتَھُوْا خَیْرًا لَّکُمْ ط اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ط سُبْحٰنَہٗ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ۝	اے اہل کتاب مت حد سے بڑھو اپنے دین میں۔ اور مت کہو اللہ کے متعلق غیر حق۔ نہیں ہیں مسیح عیسیٰ ابن مریم مگر اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ جو اس نے ڈالا مریم کی طرف اور ایک روح اس کی طرف سے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے تمام رسولوں پر۔ اور مت کہو کہ اللہ تین ہیں۔ باز آجاؤ اس میں تمہارے لئے بھلائی ہو۔ اللہ تو بلاشبہ ایک ہی ہے۔ برتر ہے اس بات سے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اسکی

ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور
کافی ہے وہ کارساز ہونے کے لئے۔

غور فرمایئے کہ قرآن تو حضرت مسیح کو "کلمتہ" و "روح منہ" اس سیاق میں کہہ رہا کہ وہ اللہ کی جنس سے نہیں ہیں بلکہ بطن مریم میں اللہ کا ڈالا ہوا ایک کلمہ اور اسکی القاء کردہ ایک روح ہیں۔ اور پادری صاحب اس سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن انھیں اللہ کی جنس سے بتاتا ہے

اسی طرح وہ خاص قسم کے خارق عادت افعال جن کا ذکر قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے طور پر کرتا ہے۔ یعنی مٹی کے پرندے بنا کر ان میں جان ڈال دینا۔ مردوں کو زندہ کر دینا۔ کوڑھیوں اور اندھوں کو شفا دیدینا۔ ان سب کے بیان میں بھی "باذن اللہ" (بحکم خداوندی) کی قید لگی ہوئی ہے۔ سورہ آل عمران ہی کے پانچویں رکوع کی جو آیتیں اوپر نقل کی گئی ہیں انھیں کے بعد (ایک آیت چھوڑ کر) ان معجزات کا بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ	اور اسے رسول بنایا جائے گا بنی اسرائیل کی طرف کہ میں لے کر آیا ہوں تمہارے رب کے پاس سے نشانی۔ میں بناتا ہوں تمہارے لئے مٹی سے ایک پرندہ کی شکل اور پھر پھونکتا ہوں اس میں بس ہو جاتا ہے وہ (واقعی) پرندہ اللہ کے حکم سے۔ اور اچھا کرتا ہوں مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اور زندہ کرتا ہوں مردوں کو اللہ کے حکم سے۔

پس قرآن مجید تو ان معجزات کو درحقیقت اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے کہ یہ اسکی نشانیاں تھیں۔ اس کے حکم سے تھیں۔ پھر اس سے حضرت عیسیٰ کی الوہیت نکلنے کا کیا سوال؟ معجزہ تو احیاء موتیٰ اور خلق طیر کا ہو، یا شق قمر اور فلق بحر کا۔ لاٹھی کو سانپ بنا دینے کا ہو یا شجر و حجر کو گویا کر دینے کا۔ انہیں

جس کسی کو بھی "باذن اللہ" نہ سمجھئے بلکہ اسی کا فعل جانئے جس کے ہاتھ پر یہ صادر ہو رہا ہے تو یہ اس کی الوہیت کی دلیل بن سکتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اور اگر باذن اللہ مانئے تو پھر کوئی بھی معجزہ ہو اس کے صدور سے انسان انسان ہی رہتا ہے خدا نہیں بنجاتا۔

پادری صاحب نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا اثبات قرآن کے سر لگانے میں اس کی آیات کے دو تین لفظ لے لئے ہیں اور باقی الفاظ جن سے آیت کا مدعا بالکل ہی برعکس نکلتا تھا ان سے کوئی مطلب نہیں رکھا ہے بالکل اسی طرح یہ دعویٰ بھی انھوں نے کر دیا ہے کہ قرآن حضرت مسیح کی مصلوبیت کا مطلقاً انکار تھوڑے ہی کرتا ہے۔ وہ تو صرف یہود کے اس دعوے کی تردید کرتا ہے کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ (ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ ابن مریم کو) چنانچہ کہتا ہے کہ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ (نہ انھوں نے اسکو قتل کیا اور نہ انھوں نے اسکو صلیب دی۔) اور یہ ٹھیک ہے کیونکہ واقعہ میں مسیح کے قاتل اور اسکو صلیب دینے والے رومی حکمراں تھے ـــــ گویا اگر پادری صاحب کی بات مان لی جائے تو قرآن۔ یہود کی صفائی پیش کر رہا ہے۔ وہ صفائی جسے عیسائی کلیسا نے ابھی سال ڈیڑھ سال پہلے یہودیوں کی درخواست پہ مان کر انھیں قتل مسیح کے جرم سے بری کر دیا ہے۔

حالانکہ قرآن کا جملہ ان الفاظ پہ مکمل نہیں ہوا ہے جن سے پادری صاحب اپنے مطلب کی بات نکال رہے ہیں ان کے آگے بھی کچھ الفاظ ہیں اور وہ یہ ہیں۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ — بلکہ انھیں اشتباہ میں ڈال دیا گیا

یعنی نہ وہ مسیح کو نہیں قتل کر پائے نہ صلیب پر چڑھا پائے بلکہ انھیں دھوکے میں ڈالدیا گیا ـــ کیا قرآنی جملہ کا یہ تکملہ پڑھ کر بھی وہی نتیجہ نکلتا ہے جو پادری صاحب نکال رہے ہیں یا نفسِ قتل و مصلوبیت ہی کی نفی سمجھ میں آتی ہے؟

اس کے بعد بھی شبہ کی گنجائش ہو تو قرآن اسی سلسلۂ کلام میں اسے بھی رفع کرتا ہے اور کہتا ہے۔

وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝ بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا — اور نہیں قتل کیا انھوں نے اسکو یقیناً بلکہ اللہ نے اٹھالیا اُسکو اپنی طرف اور اللہ سب پر غالب اور صاحب حکمت ہے۔

یہ سارا بیان سورۂ نساء کے بائیسویں [22] رکوع میں موجود ہے۔ اور کسی کے لئے بھی گنجائش نہیں ہے کہ پادری صاحب کے خیال کی تصدیق کر سکتے۔ قرآن نفس اس واقعہ ہی کی تردید کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ قتل کئے گئے یا صلیب پر چڑھائے ہی گئے۔ وہ کہتا ہے کہ یہود مغالطے میں ہیں جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ مسیح کے قتل میں کامیاب ہو گئے مصلوبیت اور قتل کا عمل تو اللہ کی حکمتِ بالغہ سے کسی اور پر ہوا۔ اور مسیح کو اُس نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنی طرف اٹھالیا۔

عیسائی عقیدے کا یہ تضاد کس قدر عجیب و غریب ہے کہ ایک طرف تو حضرت مسیح کو جنس الٰہی سے مانا جاتا ہے۔ وہ اللہ جس کی شان ہے العزیز، القادر، الغالب، المتکبر، القاہرُ فوق عبادہٖ! اور دوسری طرف ایسی عاجزی، بے بسی، بے چارگی اور مسکنت کا تصور ان کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ اشرار یہود انھیں پکڑ کر انتہائی تذلیل و توہین کرتے ہوئے پھانسی دلوا دیتے ہیں! مگر اس کے برعکس قرآن جو انھیں اللہ نہیں کلمۃ اللہ کہتا ہے وہ جناب الٰہی سے ان کی اس خاص نسبت کی بھی یہ عظمت بیان کرتا ہے کہ انھیں کوئی شریر ہاتھ نہیں لگا سکا بلکہ اللہ نے انھیں بڑی عزت و حرمت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ اوپر اٹھالیا۔ "وجیھاً فی الدنیا والآخرۃِ ومِنَ المقربین" قرآن نے کہا اور دنیا میں انکی وجاہت کو بال برابر مجروح نہیں ہونے دیا ——— انصاف سے کہئے کون سا مسیح بہتر ہے؟ وہ جسے قرآن پیش کرتا ہے یا وہ جسے عیسائیت سامنے لاتی ہے؟

قرآن جب تک نہیں اترا تھا اس وقت تک یہ بات جاننے کا یقیناً کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ حضرت مسیح مصلوب نہیں ہوئے بلکہ مرفوع ہو گئے۔ لیکن جب قرآن نے آکر وہ خبر دی تھا جو حضرت مسیح کی انتہائی بلندیٔ مرتبت کو ظاہر کرتی ہے اور عیسائیوں کے اس عقیدے سے بھی میل کھاتی ہے کہ اُن کا وجود انسانی نہیں الوہی تھا، تو چاہیئے یہ تھا کہ عیسائی سب سے پہلے آمنّا صدقنا کہتے ہوئے نظر آتے۔ مگر یہاں مصلوبیت کی بنیاد پر کفارے کا عقیدہ بن چکا تھا۔ اور اس عقیدے میں انسانی سہل پسندی کے لئے وہ لاگ تھی جو چھڑائے نہ چھوٹے۔ اس لئے ایک طرف حضرت مسیح کی الوہیت ثابت کی جاتی رہی اور دوسری طرف اس کی بالکل ضد مصلوبیت کے برحق ہونے کا بھی اعلان کیا جاتا رہا۔ اور اب حد یہ ہے کہ قرآن کے سر بھی یہ دونوں باتیں لگائی جا رہی ہیں جنھیں وہ عیسائیوں سے بھی چھڑانا چاہتا تھا۔ (سُبحانَکَ ھذا بھتانٌ عظیم)

کِتَابُ الْاَذْکَارِ وَالدَّعْوَاتْ:

مَعَارِفُ الْحَدِیْث

(مُسَلْسَل)

مختلف اَوقاتْ و اَحوال کی دُعائیں

اب تک جو دُعائیں مذکور ہوئیں وہ سب نماز کے اندر کی یا نماز کے بعد کی تھیں، اور نماز چونکہ اپنی رُوح و حقیقت کے لحاظ سے خود دُعا و مناجات بلکہ اس کی مکمل ترین صورت ہے اور اس کا موضوع ہی اللہ تعالیٰ کے حضور میں اظہارِ عجز و نیاز اور دُعا و سوال ہے۔ اس لیے اُس میں اس طرح کی دُعائیں، کامل معرفت اور کمالِ عبدیت کی علامت ہونے کے باوجود کوئی اعجوبہ نہیں، ——— لیکن جو دُعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے اوقات خاصکر کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور دوسرے بشری و حیوانی تقاضوں والے اعمال کے اوقات کے لیے تعلیم فرمائی ہیں، جن کے ذریعہ یہ اعمال بھی سراسر رُوحانی و نورانی اور اللہ تعالیٰ کے تقرب کا وسیلہ بن جاتے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و تعلیم کا خاص الخاص معجزہ ہے۔ ذیل میں انہی دُعاؤں کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے ———

صبح اور شام کی دُعائیں:-

ہر آدمی کے لیے رات کے بعد صبح ہوتی، اور دن ختم ہونے پر شام آتی ہے، گویا ہر صبح اور ہر شام زندگی کی ایک منزل طے ہو کر اگلی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

آپ نے ارشادات اور اپنے عملی نمونہ سے امت کو ہدایت فرمائی کہ وہ ہر صبح شام اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ مستحکم کرے، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے، اپنے قصوروں کے اعتراف کے ساتھ معافی مانگے اور سائل اور بھکاری بن کر رب کریم سے مناسب وقت دعائیں کرے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ اَبَا بَكْرِ الصِّدِّیْقَ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مُرْنِیْ بِكَلِمَاتٍ اَقُوْلُهُنَّ اِذَا اَصْبَحْتُ وَاِذَا اَمْسَیْتُ قَالَ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ رَبَّ كُلِّ شَیْءٍ وَمَلِیْكَهٗ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَشَرِّ الشَّیْطَانِ وَشِرْكِهٖ قَالَ قُلْهَا اِذَا اَصْبَحْتَ وَاِذَا اَمْسَیْتَ وَاِذَا اَخَذْتَ مَضْجَعَكَ۔

رواہ ابو داؤد والترمذی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے ذکر و دعا کے وہ کلمے تعلیم فرما دیجئے جن کو میں صبح اور شام کہہ لیا کروں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا کرو۔ "اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...تا ... وَشَرِّ الشَّیْطَانِ وَشِرْكِهٖ" (اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے، غیب و شہود کا پورا علم رکھنے والے، ہر چیز کے مالک و پروردگار، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی قابل پرستش نہیں، میں تیری پناہ چاہتا ہوں اپنے نفس کے شر سے اور شیطان کے شر سے اور اس کے شرک سے یعنی اس بات سے کہ وہ مجھے شرک میں مبتلا کرے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابو بکر تم اللہ سے یہ دعا کیا کرو صبح کو اور شام کو اور سونے کے لیے بستر پر لیٹتے وقت۔ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُعَلِّمُ اَصْحَابَهٗ یَقُوْلُ اِذَا اَصْبَحَ اَحَدُكُمْ فَلْیَقُلْ "اَللّٰهُمَّ بِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ اَمْسَیْنَا وَبِكَ نَحْیَا وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ" وَاِذَا اَمْسٰی فَلْیَقُلْ "اَللّٰهُمَّ بِكَ اَمْسَیْنَا وَبِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ نَحْیَا وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَیْكَ النُّشُوْرُ"۔

رواہ ابو داؤد والترمذی واللفظ لہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو تلقین فرماتے تھے کہ جب رات ختم ہو کر تمھاری صبح ہو تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا کرو "اَللّٰهُمَّ بِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ اَمْسَيْنَا...... وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ" (اے اللہ تیرے ہی حکم سے ہماری صبح ہوتی ہے اور تیرے ہی حکم سے ہماری شام، تیرے ہی فیصلہ سے ہم زندہ ہیں اور تیرے ہی حکم سے ہم وقت آجانے پر مریں گے اور پھر تیری ہی طرف لوٹ کر جائیں گے)

اسی طرح جب شام ہو تو عرض کرو "اَللّٰهُمَّ بِكَ اَمْسَيْنَا وَبِكَ اَصْبَحْنَا...... تا ...... وَاِلَيْكَ النُّشُوْرُ" (اے اللہ تیرے ہی حکم سے ہماری شام ہوتی ہے اور تیرے ہی حکم سے ہماری صبح، اور تیرے ہی فیصلہ سے ہم زندہ ہیں اور تیرے ہی فیصلہ سے مریں گے اور پھر اٹھ کر تیرے ہی حضور حاضر ہوں گے۔) ——— (جامع ترمذی و سنن ابی داؤد)

تشریح رات کے اندھیرے کے بعد صبح کے اجالے کا نمودار ہونا اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، انسان عموماً دن ہی میں اپنے سارے کام کاج کرتے ہیں۔ اگر رات کے بعد صبح نہ ہو تو گویا قیامت ہو جائے۔ اسی طرح دن کے ختم پر شام کا آنا اور رات کا شروع ہونا بھی بڑی نعمت ہے۔ شام آکر کاموں سے چھٹی دلاتی اور آرام و راحت کا پیام لاتی ہے۔ اگر ایک دن شام نہ آئے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عام انسانوں پر کیا گذر جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ہدایت فرمائی ہے کہ جب صبح یا شام ہو تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا احساس و اعتراف کیا جائے۔ اسی کے ساتھ اس کو بھی یاد کیا جائے کہ جس طرح اللہ کے حکم سے دن کی عمر ختم ہو کر رات آتی ہے اور رات کی عمر ختم ہو کر دن نکلتا ہے اسی طرح اس کے حکم سے ہماری زندگی چل رہی ہے اور اس کے حکم سے مقررہ وقت پر موت آجائے گی اور پھر اللہ کے حضور میں پیشی ہوگی۔ الغرض روزانہ صبح و شام اللہ کی نعمت کا اعتراف اور موت اور آخرت کو یاد کیا جائے نہ صبح کو اس سے غفلت ہو نہ شام کو۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمْسٰى قَالَ ـــ "اَمْسَيْنَا وَاَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرِ مَا فِيْهَا

وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَ الْهَرَمِ وَسُوْءِ الْكِبَرِ وَفِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ" ـــــ وَاِذَا اَصْبَحَ قَالَ ذَالِكَ اَيْضًا اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ" الخ ـــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب شام ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرتے "امسینا و امسی الملك لله" الخ (یہ شام اس حال میں ہو رہی ہے کہ ہم اور یہ ساری کائنات اللہ ہی کے ہیں۔ ساری حمد و ستائش اُس اللہ کے لیے ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک ساجھی نہیں، راج اور ملک اسی کا ہے، وہی لائق حمد و ثنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ـــ اے اللہ یہ آنے والی رات اور جو کچھ اس رات میں ہونے والا ہے میں اس کے خیر کا تجھ سے سائل ہوں اور اسکے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ پروردگار تیری پناہ سُستی اور کاہلی سے (جو امورِ خیر سے محرومی کا سبب بنتی ہے)، تیری پناہ بالکل نکما کر دینے والے بڑھاپے سے، اور کبرسنی کے بُرے اثرات سے، تیری پناہ دُنیا کے ہر فتنہ سے، اور یہاں کی ہر آزمائش سے) ـــ اور جب صبح ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بس ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یوں عرض کرتے " اصبحنا و اصبح الملك لله " الخ۔ ہماری صبح اس حال میں ہو رہی ہو کہ ہم اور یہ ساری کائنات اللہ ہی کے ہیں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس دُعا میں اپنی ذات اور ساری کائنات کے اوپر اللہ تعالیٰ کی ملکیت کا اقرار اور اس کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی توحید کا اعلان ہے ـــ پھر رات یا دن میں جو خیر اور برکتیں ہوں اُن کا سوال ہے اور جو کمزوریاں خیر و سعادت سے محرومی کا سبب بن جاتی ہیں اُن سے پناہ طلبی ہے۔ اور آخر میں دُنیا کے ہر فتنہ اور عذاب قبر سے پناہ مانگی گئی ہے ـــ سبحان اللہ! کیسی جامع دُعا ہے اور اس میں اپنی بندگی اور نیازمندی کا کیا اظہار ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَعُ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ حِيْنَ يُمْسِیْ وَحِيْنَ يُصْبِحُ " اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَ الْعَافِيَةَ فِیْ دِيْنِیْ وَدُنْيَایَ وَاَهْلِیْ وَمَالِیْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَ

امِنْ رَوْعَاتِیْ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ یَمِیْنِیْ وَ
عَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ۔

(رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ صـ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب شام یا صبح ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا ضرور کرتے تھے۔ "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ" الخ (اے اللہ میں تجھ سے دُنیا اور آخرت میں معافی اور عافیت کا طالب و سائل ہوں۔ اے میرے اللہ میں اپنے دین اور دُنیا اور اپنے اہل و عیال اور مال کے بارے میں معافی اور عافیت کا طلبگار ہوں، اے اللہ میری شرم و عار والی باتوں کی پردہ داری فرما۔ میرے دل کی گھبراہٹ اور تشویشات دور فرما کر مجھے امن و اطمینان نصیب فرما۔ اے اللہ میری حفاظت فرما میرے آگے سے اور پیچھے سے اور میرے دائیں بائیں اور میرے اوپر کی جانب سے اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ نیچے کی جانب سے مجھ پر کوئی آفت آئے۔ مجھے ہمیشہ اس سے محفوظ رکھ۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صبح شام کی دعاؤں میں یہ دعا بڑی جامع ہے انسانی ضرورت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان چند لفظوں میں نہ آگیا ہو ___ اللہ تعالیٰ قدر شناسی عطا فرمائے اور عمل کی توفیق دے۔

عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ یَقُوْلُ اِذَا اَمْسٰی وَاِذَا اَصْبَحَ ثَلَاثًا رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا اِلَّا کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّرْضِیَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ___ رواہ احمد والترمذی

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان بندہ صبح اور شام تین دفعہ کہے "رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا" (میں راضی ہوں اللہ کو اپنا مالک و پروردگار مان کر اور اسلام کو اپنا دین بنا کر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مان کر) تو اللہ نے اس بندہ کے لیے اپنے ذمہ کر لیا ہو کہ

قیامت کے دن اس کو ضرور خوش کرے گا۔ (مسند احمد، جامع ترمذی)

(**تشریح**) سبحان اللہ کتنی عظیم بشارت ہے کہ جو مومن و مسلم بندہ ان مختصر کلمات کو صبح و شام تین تین دفعہ کہہ کے اللہ و رسول اور ان کے دین کے ساتھ اپنے ایمانی تعلق کو تازہ اور مستحکم کرے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا حتمی فیصلہ ہے کہ میں قیامت کے دن اس کو راضی اور خوش کردوں گا۔ اس بشارت کے معلوم ہوجانے کے بعد اس دولت کو حاصل کرنے سے غافل رہنا کتنا عظیم خسارہ اور کتنی بڑی محرومی ہوگی۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ غَنَّامٍ الْبَيَاضِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَالَ حِينَ يُصْبِحُ "اللَّهُمَّ مَا أَصْبَحَ بِي مِنْ نِعْمَةٍ أَوْ بِأَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيكَ لَكَ. لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ" فَقَدْ أَدَّى شُكْرَ يَوْمِهِ وَمَنْ قَالَ مِثْلَ ذَالِكَ حِينَ يُمْسِي فَقَدْ أَدَّى شُكْرَ لَيْلَتِهِ۔ — رواہ ابوداؤد

عبداللہ بن غنام بیاضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ صبح ہونے پر اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرے کہ "اللّٰھم ما اصبح بی من نعمۃ او بأحد..." (اے میرے اللہ اس صبح جو بھی نعمت مجھے نصیب ہے یا تیری مخلوق میں سے کسی کو بھی میسر ہے وہ تنہا تیرے ہی کرم کا نتیجہ ہے، تیرا کوئی شریک ساجھی نہیں، تیرے ہی لیے ساری حمد و ثنا اور بس تیرا ہی شکر ہے) تو اس نے اس دن کی ساری نعمتوں کا شکر ادا کردیا اور جس نے شام ہونے پر اللہ تعالیٰ کے حضور میں اسی طرح عرض کیا تو اس نے پوری رات کی نعمتوں کا شکر ادا کردیا۔

(**تشریح**) حق یہ ہے کہ بندہ اللہ کی نعمتوں کا کسی طرح شکر ادا نہیں کرسکتا۔ یہ رب کریم کا صرف کرم ہے کہ ایسے حقیر سے شکر کو بھی وہ کافی قرار دیتا ہے۔ منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے پروردگار آپ کی نعمتیں بے شمار ہیں میں کیسے ان کا شکر ادا کروں، ارشاد ہوا کہ تمہارا یہ محسوس کرنا کہ وہ نعمتیں میری ہی طرف سے ہیں بس یہی کافی شکر ہے۔ لک الحمد و لک الشکر۔

عَنْ أَبِي مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَصْبَحَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ أَصْبَحْنَا وَأَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اَللّٰهُمَّ إِنِّي

اَسْأَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ وَفَتْحَهٗ وَنَصْرَهٗ وَنُوْرَهٗ وَبَرَكَتَهٗ وَهُدَاهُ وَ أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِيْهِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهٗ " ثُمَّ إِذَا أَمْسٰى فَلْيَقُلْ مِثْلَ ذَالِكَ ــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت ابومالک اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب صبح ہو تو کہو " اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ... تا ..... اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِيْهِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهٗ " (صبح اس حالت میں ہوئی کہ ہم اور ساری کائنات اللہ رب العالمین کی ملک اور اس کے قبضہ میں ہیں۔ اے اللہ میں تجھ سے اس دن کی خیر اور فتح و نصرت، نور و برکت اور ہدایت کا سائل ہوں۔ اور اس دن اور اس کے بعد کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ پھر جب شام ہو تو اسی طرح کہو۔　　(سنن ابی داؤد)

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ " فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝ أَدْرَكَ مَا فَاتَهٗ يَوْمَهٗ ذَالِكَ وَمَنْ قَالَهُنَّ حِيْنَ يُمْسِيْ اَدْرَكَ مَا فَاتَهٗ فِيْ لَيْلَتِهٖ ــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی (سورۂ روم کی یہ تین آیتیں) صبح ہونے پر تلاوت کرے وہ اس دن کی وہ ساری خیر اور برکتیں پالے گا جو اس سے فوت ہوں گی۔ اور اسی طرح جو کوئی شام آنے پر یہ تین آیتیں تلاوت کرے وہ اس رات کی وہ ساری خیر و برکات پالے گا جو اس سے فوت ہوں گی ــــ وہ آیات یہ ہیں :-

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝	اللہ کی پاکی بیان کرو جب تمھارے لیے صبح ہو اور جب شام آئے ــ اور زمین و آسمان میں ہر وقت اس کی حمد و ثنا ہوتی ہے ــ اور

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ ○

جو تھے پہر اور دوپہر کے وقت بھی اسکی پاکی بیان کرو، وہی قادرِ مطلق زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے برآمد کرتا ہے اور زمین پر مردگی طاری ہو جانے کے بعد اپنی رحمت سے اسے حیاتِ تازہ بخشتا ہے۔ اور تم بھی اسی طرح مرنے کے بعد زندہ کر دیے جاؤ گے۔

(سنن ابی داؤد)

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ يَقُوْلُ فِيْ صَبَاحِ كُلِّ يَوْمٍ وَمَسَاءِ كُلِّ لَيْلَةٍ "بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَلَا يَضُرُّهُ شَيْءٌ ــــــــ رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہر دن کی صبح اور ہر رات کی شام کو تین دفعہ یہ دُعا پڑھ لیا کرے اُسے کوئی مضرت نہیں پہونچے گی اور وہ کسی حادثہ سے دوچار نہیں ہوگا۔ دُعا یہ ہے :۔

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

اس اللہ کے نام سے جس کے نام پاک کے ساتھ زمین و آسمان کی کوئی چیز بھی مضر نہیں ہو سکتی اور وہ سب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے راوی ان کے صاحبزادہ ابان ہیں۔ ان پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا جس سے ان کا جسم متاثر تھا۔ ایک دفعہ جبکہ یہ حدیث بیان کر رہے تھے ایک آدمی خاص طرح کی نظر سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گئے کہ اس کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہو رہا ہے کہ جب آپ یہ حدیث اپنے والد ماجد حضرت عثمان سے سُن چکے تھے تو پھر آپ پر فالج کا حملہ کیسے ہو گیا، اس حدیث میں تو اس دُعا کے صبح و شام پڑھنے والے کے لیے ہر حادثہ سے

جو شام تک کی حفاظت کی نبوی ہے ۔ ابان نے اس آدمی سے کہا میاں دیکھتے کیا ہو، نہ میں غلط بیان کرتا ہوں نہ حضرت عثمان نے مجھ سے غلط بیان کیا تھا ، حدیث بالکل صحیح ہے اور اس میں جو وعدہ ہے وہ بھی برحق ہے ۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ کسی معاملہ کی وجہ سے مجھے سخت غصہ تھا اس غصہ کی حالت میں اس دن وقت پر یہ دعا پڑھنا بھول گیا' اسی دن یہ فالج کا حملہ ہوا ۔ چونکہ تقدیر الٰہی میں فالج ہونا مقدر تھا اس لیے اسی دن بھلا دیا گیا ــــ حضرت ابان کا یہ بیان بھی حدیث کے ساتھ سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں مروی ہے ــــ صبح شام تین دفعہ اس دعا کا پڑھنا اللہ کے نیک بندوں کے معمولات میں سے ہے اور بلاشبہ اس میں آفاتِ ارضی و سماوی سے حفاظت کی ضمانت ہے ۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ خُبَيْبٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِقْرَأْ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ . وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ حِيْنَ تُمْسِيْ وَحِيْنَ تُصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تَكْفِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ــــ ــــ ــــ رواہ ابوداؤد

عبداللہ بن خبیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا شام کو اور صبح کو (یعنی دن شروع ہونے پر اور رات شروع ہونے پر) تم قل ھو اللہ احد ، اور قل اعوذ برب الفلق و قل اعوذ برب الناس تین بار پڑھ لیا کرو ــــ یہ ہر چیز کے واسطے تمہارے لیے کافی ہوں گی ۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) قل ھو اللہ' اور معوذتین قرآن مجید کی بہت چھوٹی سورتوں میں ہیں ، لیکن اپنے مضمون کے لحاظ سے بہت فائق اور بالاتر ہیں جیسا کہ فضائلِ تلاوتِ قرآن کے سلسلے میں کچھ ہی پہلے بیان بھی کیا جا چکا ہے ۔ حدیث کا مفاد یہ ہے کہ جو لوگ اور زیادہ نہ پڑھ سکیں وہ صبح شام کم از کم یہی تین سورتیں تین بار پڑھ لیا کریں ، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے ، یہی انشاء اللہ کافی ہوں گی ۔ ہر مسلمان کو یہ یاد بھی ہوتی ہیں ۔

عَنْ اَبِيْ مَالِكٍ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَدِّثْنَا بِكَلِمَةٍ نَقُوْلُهَا اِذَا اَصْبَحْنَا وَاِذَا اَمْسَيْنَا وَاضْطَجَعْنَا فَقَالَ قُوْلُوْا : " اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ وَالْمَلٰئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ

أَنَّكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ فَإِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ أَنْفُسِنَا وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ وَشِرْكِهٖ وَأَنْ نَقْتَرِفَ سُوْءً أَوْ نَجُرَّهٗ إِلٰى مُسْلِمٍ۔

رواہ ابوداؤد

حضرت ابو مالک اشعری سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت کوئی ایسا کلمہ بتا دیجئے جسے ہم صبح کو، شام کو اور جب سونے لگیں تو پڑھ لیا کریں، آپ نے فرمایا، یوں عرض کیا کرو "اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ... تا ..... أَوْ نَجُرَّهٗ إِلٰى مُسْلِمٍ" اے اللہ زمین و آسمان کے خالق، غیب و شہود کے جاننے والے تو ہر چیز کا مالک ہے اور ملائکہ بھی شہادت دیتے ہیں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، لہذا ہم تجھ سے پناہ مانگتے ہیں اپنے نفسوں کے شر سے اور شیطان رجیم کے شر سے اور اس کے شرک سے اور اس سے کہ ہم خود کسی گناہ کا ارتکاب کریں یا کسی مسلمان بندہ تک اس کو پہونچائیں۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس دعا میں شیطان رجیم کے شر اور شرک سے پہلے اپنے نفس کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے، اس میں سبق ہے کہ شیطان کے شر سے بھی زیادہ خطرہ اپنے نفس کے شر سے ہے۔ اس لیے ہمیشہ اللہ سے اس کے لیے پناہ مانگتا رہے اور خود بھی بچتا رہے۔

خاص سونے کے وقت کی دعائیں:-

نیند کو موت سے بہت مشابہت ہے سونے والا مرنے ہی کی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے نیند، بیداری اور موت کے درمیان کی ایک حالت ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاکید کے ساتھ ہدایت فرماتے تھے کہ جب سونے لگو تو اس سے پہلے دھیان اور اہتمام سے اللہ کو یاد کرو، گناہوں سے معافی مانگو اور اس وقت کی خاص دعائیں کرو ـــــ اس سلسلہ میں جو دعائیں آپ نے تلقین فرمائیں اور جو آپ کے معمولات میں تھیں وہ ذیل میں پڑھی جائیں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهٗ أَمَرَ رَجُلًا قَالَ إِذَا أَخَذْتَ مَضْجَعَكَ قُلْ اَللّٰهُمَّ أَنْتَ خَلَقْتَ نَفْسِيْ وَأَنْتَ تَوَفَّاهَا لَكَ مَمَاتُهَا وَمَحْيَاهَا إِنْ

اَحْيَيْتَهَا فَاحْفَظْهَا وَإِنْ اَمَتَّهَا فَاغْفِرْ لَهَا. اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَ الْعَافِيَةَ "فَقِيْلَ لَهٗ سَمِعْتَ هٰذَا مِنْ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُهٗ مِنْ خَيْرٍ مِّنْ عُمَرَ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ——— رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو بتایا کہ جب تم سونے کے لیے بستر پر لیٹ جاؤ تو اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کرو "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَ نَفْسِیْ ...... تا ..... اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ" (اے میرے اللہ تو نے ہی مجھے پیدا کیا ہے اور تو ہی جب چاہے گا میری روح قبض کرے گا۔ میرا مرنا اور جینا تیرے ہی اختیار میں ہے۔ اگر تو مجھے زندہ رکھے تو (ہر بلا اور گناہ سے اور شر و فتنہ کی ہر بات سے) میری حفاظت فرما اور اگر تیرا فیصلہ میری موت کا ہو تو میری مغفرت فرما اور بخش دے۔ اے میرے اللہ میں تجھ سے معافی اور عافیت کا سائل ہوں (کہ میرے لیے معافی کا اور دنیا و آخرت میں عافیت کا فیصلہ فرما) — حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جب یہ دعا تلقین فرمائی تو کسی نے ان سے کہا کہ یہ آپ نے اپنے والد ماجد حضرت عمرؓ سے سنی ہوگی۔ انھوں نے فرمایا میں نے اس ہستی سے سنا ہے جو حضرت عمرؓ سے بھی بہتر تھی، میں نے یہ دعا براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ (صحیح مسلم)

تشریح) یہ مختصر دعا عبدیت کے جذبات سے بھرپور ہے اور اللہ کے حضور میں عبدیت و نیاز مندی اور اظہار عاجزی و بے بسی ہی سب سے زیادہ اس کی رحمت کو کھینچنے والی چیز ہے، خاص کر سوتے وقت کسی بندہ کو اس طرح کی دعا کی توفیق ملنا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص نظر عنایت و کرم اس کی طرف متوجہ ہے۔

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اٰوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا فَكَمْ مِّمَّنْ لَا كَافِیَ لَهٗ وَلَا مُؤْوِیَ لَهٗ ——— رواہ مسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آرام کرنے کے لیے بستر پر تشریف لاتے تو اس طرح اللہ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرتے۔

" اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ ...... تا ...... وَلَا مُؤْوِیَ لَهٗ " (اس اللہ کی حمد اور اس کا شکر جس نے ہمیں کھلایا پلایا اور ہماری پوری ضرورتیں عطا فرمائیں اور آرام کے لیے ہمیں ٹھکانا دیا۔ کتنے ہی ایسے بندے ہیں جن کی نہ کوئی ضروریات پوری کرنے والا ہے نہ کوئی انھیں ٹھکانا دینے والا ہے۔ (صحیح مسلم)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ ہم جو کھاتے پیتے ہیں اور جو کچھ ہمیں ملتا ہے وہ سب ربّ کریم کا عطیہ ہے، ہمارے کسی ہنر اور کرتب کو اس میں دخل نہیں، اس لیے وہی لائق حمد و شکر ہے۔ جس نے سوتے وقت یہ دُعا کی اُس نے کھانے پینے اور اُن سب نعمتوں کا جن سے اُس نے فائدہ اٹھایا شکر ادا کر دیا۔

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَخَذَ مَضْجَعَهُ مِنَ اللَّيْلِ وَضَعَ يَدَهُ تَحْتَ خَدِّهِ ثُمَّ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَأَحْيٰى وَإِذَا اسْتَيْقَظَ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ ——— رواه البخاری ورواه مسلم عن البراء بن عازب

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو آرام فرمانے کے لیے بستر پر لیٹتے تو اپنا ہاتھ رخسار مبارک کے نیچے رکھ لیتے (یعنی داہنا ہاتھ داہنے رخسار کے نیچے رکھ کر داہنی کروٹ پر قبلہ رو لیٹ جاتے جیسا کہ دوسری احادیث میں تفصیل سے ہے) اور پھر اللہ کے حضور میں عرض کرتے " اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَأَحْيٰى " (اے اللہ تیرے ہی نام پہ مجھے مرنا اور تیرے ہی نام پہ مجھے جینا ہے۔ اور جب سو کر اُٹھتے تو اللہ کا شکر اس طرح ادا کرتے " اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ " (حمد و شکر اس اللہ کے لیے جس نے موت طاری کرنے کے بعد ہم کو جلایا اور بالآخر ہمیں اسی کے پاس جانا ہے) (صحیح بخاری)

تشریح) چونکہ نیند میں بہت کچھ مشابہت موت کی ہے اس لیے اس دُعا میں نیند کو مرنے اور بیدار ہونے کو زندہ ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس طرح روزمرہ کے سونے جاگنے کو حیات بعد الموت کی یاد دہی اور اس کی تیاری کی فکر کا ذریعہ بنایا گیا ہے ——— سونے اور جاگنے کے وقت کی دعاؤں میں سے یہ دعا بہت مختصر ہے اور اس کا یاد کرنا بہت آسان ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو توفیق عطا فرمائے۔

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ لِی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَیْتَ مَضْجَعَکَ فَتَوَضَّأْ وُضُوْءَکَ لِلصَّلٰوۃِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰی شِقِّکَ الْاَیْمَنِ وَقُلْ اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ فَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ وَاَلْجَأْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَھْبَۃً وَرَغْبَۃً اِلَیْکَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ اٰمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ فَاِنْ مُتَّ مُتَّ عَلَی الْفِطْرَۃِ وَاجْعَلْھُنَّ اٰخِرَ مَا تَقُوْلُ فَقُلْتُ اَسْتَذْکِرُھُنَّ وَبِرَسُوْلِکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ قَالَ وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ ۔۔۔۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا جب تم بستر پر سونے کا ارادہ کرو تو پہلے وضو کرو جس طرح نماز کے لیے وضو کرتے ہو، پھر اپنی داہنی کروٹ پر لیٹ جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرو "اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ ۔۔۔ تا ۔۔۔ وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ" (اے اللہ میں نے اپنی ہستی کو بالکل آپ کے سپرد کر دیا اور اپنے سب امور آپ کے حوالہ کر دیئے اور آپ ہی کو اپنا پشت پناہ بنا لیا، آپ کے جلال سے ڈرتے ہوئے اور آپ کے رحم و کرم کی طلب و امید کرتے ہوئے میرے مولا تیرے سوا کوئی جائے پناہ اور ربچاؤ کی جگہ نہیں، میں ایمان لایا تیری مقدس کتاب پر جو تونے نازل فرمائی اور تیرے نبی پاک پر جن کو تونے پیغمبر بنا کر بھیجا) ۔۔۔ آپ نے یہ دعا تلقین فرمانے کے بعد براء بن عازب سے ارشاد فرمایا کہ رات کو سونے سے پہلے یہ دعا تمہارا آخری بول ہو، یعنی اس دعا کے بعد کوئی بات نہ کرو اور بس سو جاؤ، اگر اللہ کے حکم سے اسی حال میں تم کو موت آ گئی تو تمہاری موت بڑی مبارک اور دین فطرت پر ہوگی۔

براء بن عازب کہتے ہیں کہ میں حضور کے سامنے ہی اس دعا کو یاد کرنے لگا تو میں نے آخری جملہ میں "نَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ" کی جگہ "برسولک الذی ارسلت" کہا (جو بالکل اس کے ہم معنی تھا، صرف ایک لفظ کا فرق تھا) تو آپ نے فرمایا، نہیں "نَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ" کہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس دعا میں اللہ پر اعتماد اور تسلیم و تفویض کی روح بھری ہوئی ہے اور ساتھ ہی

ایمان کی تجدید بھی ہے۔ اس مضمون کے لیے دنیا کا بڑے سے بڑا ادیب بھی اس سے بہتر الفاظ تلاش نہیں کر سکتا، بلاشبہ یہ دعا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزانہ دعاؤں میں سے ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَاْمُرُنَا اِذَا اَرَادَ اَحَدُنَا اَنْ یَّنَامَ اَنْ یَّضْطَجِعَ عَلٰی شِقِّهِ الْاَیْمَنِ ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ وَرَبَّ الْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَیْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰی مُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ دَابَّةٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِهَا اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَكَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَكَ شَیْءٌ اِقْضِ عَنَّا الدَّیْنَ وَاَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ ———— رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ہدایت فرماتے تھے کہ جب ہم میں سے کوئی سونے کا ارادہ کرے تو اپنی داہنی کروٹ پر لیٹے اور اللہ سے یوں دعا کرے "اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ وَرَبَّ الْاَرْضِ ..... تا ..... وَاَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ" (اے میرے اللہ آسمان و زمین کے مالک اور عرش عظیم کے مالک، ہمارے اور ہر چیز کے مالک، دانے اور گٹھلی کو اپنی قدرت سے پھاڑ کر اس سے پودا نکالنے والے، تورات و انجیل اور قرآن کے نازل فرمانے والے! میں تیری پناہ مانگتا ہوں زمین میں چلنے یا رینگنے والی تیری ہر مخلوق کی شر سے جس پر تیرا مکمل قابو ہے — اے اللہ تو ہی اول (سب سے پہلا) ہے کوئی چیز تجھ سے پہلی نہیں، تو ہی آخر (سب کے بعد باقی رہنے والا) ہے۔ کوئی چیز نہیں جو تیرے بعد ہو، (اے مالک کل اور قادر مطلق اور اول و آخر) مجھ پر جو قرض ہے اُسے ادا کرا دے اور فقر و محتاجی دور فرما کر مجھے غنی اور خوش حال کر دے)

(صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں بھی سونے کے لیے داہنی کروٹ پر لیٹنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اور خود حضور کا بھی یہی معمول تھا اس کروٹ پر لیٹنے کی صورت میں قلب جو بائیں پہلو میں ہے اوپر معلق رہتا ہے اور اللہ والوں کا تجربہ ہے کہ لیٹتے وقت ذکر و دعا اور توجہ الی اللہ کیلئے یہی شکل زیادہ مناسب ہوتی ہے ——— یہ دعا

اُن بندگانِ خدا کے زیادہ حسبِ حال ہے جو مقروض اور معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ بندہ یہ دعا کرکے سوئے اور ربِ کریم سے امید رکھے کہ وہ رزق میں کشائش کی کوئی صورت پیدا فرمائے گا۔



حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی تبلیغی تحریک

(۲)

از: وحید الدین خاں

پروگرام مولانا الیاس صاحب نے اپنے کام کو یہ ابتدائی خاکہ بنایا تھا۔ اس کو وہ چھ نکات کی شکل میں بیان کرتے تھے:

۱۔ کلمۂ اسلام کو دلوں میں بٹھانا۔

۲۔ نماز کو اس کی حقیقی شکل میں قائم کرنا۔

۳۔ دین کا علم سیکھنا۔

۴۔ اکرام مسلم

۵۔ تبلیغی و اصلاحی گشت

۶۔ تصحیح نیت اور اخلاص و احتساب

ان چھ نکات کو اگر مزید گھٹایا جائے تو ان کو تین پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ——— کلمۂ توحید، نماز اور گشت۔ بقیہ تینوں اجزا دراصل انھیں چیزوں کے تقاضے ہیں جو ان کو صحیح طور پر اختیار کرنے کے بعد لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو الگ سے بیان کرنا محض وضاحت کے لئے ہے نہ کہ تعین کے لئے۔

مولانا الیاس صاحب کے اس دعوتی پروگرام کی تشریح مختلف الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے۔ خود مولانا اس کو "حضور کے طریقہ کو زندہ کرنے کی کوشش" کا نام دینا پسند کرتے تھے اور اسی قسم کے الفاظ

اور اصطلاحات میں اس کی وضاحت فرماتے تھے۔ بلاشبہ یہ الفاظ آپ کی دعوت کو اس کی اصل حیثیت میں ظاہر کرنے کے لئے موزوں ترین بلکہ محبوب ترین ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو جدید انداز میں سوچتے ہیں اور جنھیں کسی بات کی صداقت کا اس وقت پورا اطمینان ہوتا ہے جب وہ اس کی تعبیر نفسیاتی، عمرانی یا فلسفیانہ الفاظ میں سن لیں، ان کے ذوق کی رعایت سے بھی اس پروگرام کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

یہاں ضمناً عرض ہے کہ بعض لوگوں نے میوات کا علاقہ یا صاحب دعوت کے زمانہ میں مسلمانوں کی عام حالت کا حوالہ دے کر اس کی اہمیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ یہ بھی اس کا ایک پہلو ہے۔ لیکن اگر یہی کل بات ہو تو اس سے مولانا کی دعوت کی صرف زمانی قدر ثابت ہوگی۔ محض اس بنا پر اسکے اندر کسی دوامی قدر کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ مولانا کی دعوت میں حقیقۃً کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو صرف زمانی اہمیت کی حامل ہو اور جس کا دوامی طور پر کوئی فائدہ نہ ہو۔

مولانا الیاس صاحب کی دعوت میں کلمۂ توحید کو اولین اور بنیادی حیثیت حاصل ہے کلمۂ توحید کیا ہے۔ اس بات کا یقین کہ خدا ہی اس کائنات کا خالق و مولیٰ ہے اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ شخص ہیں جن کے ذریعہ مکمل صداقت کا ظہور ہوا ہے۔ ایک شخص جب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے تو گویا وہ اپنی اس اندرونی کیفیت کا اظہار کرتا ہے کہ اس نے اس یقین کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ اور وہ زندگی کے اس طریقہ پر آنے کا اعلان کر رہا ہے جو ایک طرف اس یقین کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ خدا ہی حقیقۃً وہ ذات ہے جو انسان کے جذبات اور امنگوں کا مرکز ہے اور وہی وہ ہستی ہے جس پر اس کو سارے معاملات میں بھروسہ اور اعتماد کرنا چاہیئے۔ اور دوسری طرف یہ اعلان گویا اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی اس احساس سے سرشار ہے کہ وہ زندگی کا راستہ پا چکا ہے اور اسے معلوم ہو چکا ہے کہ سچائی کا سرچشمہ کیا ہے جس کی رہنمائی میں اسے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیئے۔

یہ یقین و اعتماد اور یہ [illegible] وہ چیز ہے جو سارے انقلابات کی بنیاد ہے۔ دنیا کے کسی بھی انقلاب کی تاریخ پڑھ لیجئے آپ کو ملے گا کہ اسی قسم کا احساس —— خواہ وہ باعتبار حقیقت صحیح ہو یا غلط —— کچھ لوگوں میں پیدا ہو گیا تھا اور وہی بالآخر تحریک اور انقلاب کا سبب

بنا۔ فرانس کا انقلاب، کمیونزم کی کامیابیاں اور مختلف ملکوں میں قومی آزادی کی جد و جہد دراصل اسی قسم کے احساس کی بنیاد پر شروع ہوئی اور اسی کی بنیاد پر چلتی گئی۔ ابتداً ان میں سے کسی تحریک کے پاس نہ تو ہتھیار تھے نہ مال و دولت کی کثرت، حتی کہ آئندہ بننے والے نظام کا کوئی تفصیلی نقشہ بھی نہیں تھا۔ ان کا اول و آخر سرمایہ بس ایک تخیل تھا جو ان کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ اور وہ یہ کہ ان پر سیاسی، معاشی یا قومی "سچائی" کا انکشاف ہوا ہے۔ اس احساس نے انکے دلوں میں آگ لگا دی، ان کی قوتوں کو مجتمع کیا۔ انھیں مستقبل سے بے پرواکر کے وقت کے خلاف کھڑا کر دیا۔ اور انھیں ایک ایسی مجنونانہ جد و جہد میں لگا دیا جس کا آخری انجام صرف کامیابی ہو سکتا ہے۔

یہ اس یقین کا انجام تھا جو صرف جزدی نوعیت کا تھا اور جس کو ہم صحیح بھی نہیں سمجھتے۔ پھر وہ یقین جو کلی صداقت کی بنیاد پر پیدا ہوا ہو اور جو فی الواقع صداقت ہو نہ کہ محض غلط فہمی سے صداقت سمجھ لیا گیا ہو، ایسی صداقت اگر دلوں میں اتر جائے اور ایسے دین کے لئے اگر جنون پیدا ہو جائے تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ دوسری تحریکوں نے اگر کسی جغرافی خطہ یا زندگی کے کسی گوشہ کے لئے ذہن کو متحرک کیا ہے تو یہ عقیدہ سارے کرۂ ارض کے لئے انسان کو بے تاب کر دینے والا ہے۔ دوسری تحریکوں کے افراد اگر ملک و قوم کے نام پر توپوں کے دہانے کے آگے کھڑے ہو گئے تو وہ تحریک جس کے افراد مالک کائنات کے اعتماد پر اٹھے ہوں ان کے سیل رواں کو کون روک سکتا ہے۔ دوسری تحریک کے افراد اگر اپنے خود ساختہ تخیلات کی برتری سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے تھے تو عالم کل اور خالق فطرت کے دیئے ہوئے تصورات میں جہاں گیری کی کیا کچھ طاقت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا الیاس صاحب امت کو جو کلمہ دینا چاہتے تھے وہ اس زمین کی عظیم ترین طاقت ہے۔ اس کو "کلمہ کی تحریک" کہا جا سکتا ہے مگر ایسا کہنے والوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر تحریک، خواہ وہ کتنی ہی انقلابی ہو، ابتداءً کلمہ ہی کی تحریک تھی۔ خواہ وہ سیاسی کلمہ ہو یا معاشی کلمہ یا قومی کلمہ۔ پھر دینی کلمہ جو درحقیقت سارے کلمات کا جامع ہے۔ اس کی بنیاد پر اگر کوئی تحریک اٹھے تو اس کو محدود یا ناقص کس بنا پر کہا جا سکتا ہے۔

مولانا کی دعوت کا دوسرا جزو نماز ہے۔ عام طور پر لوگ نماز کی حقیقت اور اہمیت کو

نہیں جانتے اس لئے وہ اس کی دعوتی عظمت کو سمجھ نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کلمہ کو ذہنی طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح نماز کو عمل کی زندگی میں بنیادی مقام ہے۔ نماز اپنی اصلی اور اندرونی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی طرف متوجہ ہونے اور اس سے حسّیاتی، ربط قائم کرنے کا نام ہے۔ نماز بندے کو اپنے رب سے اس طرح جوڑتی ہے کہ وہ گویا کہ اسے دیکھنے لگتا ہے اور اس سے اسکی سرگوشیاں جاری ہوجاتی ہیں۔ نماز وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے بندوں سے ملاقات کرتا ہے۔ جب آدمی نماز کو اس کے سارے ارکان کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے اور وہاں دل دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول ہوتا ہے تو وہ ایک اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور اس کی روح ایک ایسے تجربہ سے دوچار ہوتی ہے جہاں عبدیت اور معبودیت کی حدیں ملنے لگتی ہیں۔ بندگی، خدائی کے جلوؤں میں نہا اٹھتی ہے۔

یہ تجربہ انسان کی شخصیت کو ایک نئی جلا دیتا ہے اور اور اس کو ایسی عجیب وغریب نعمتیں عطا کرتا ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں نماز کی حقیقت کی مکمل تفصیل ہے۔ یہاں میں مختصراً چند کا ذکر کرتا ہوں۔

ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو قرآن میں "خشوع" کہا گیا ہے۔ خشوع کے معنی ہیں فروتنی عاجزی اور جھکاؤ۔ نماز کی شکل میں آدمی جب خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور اس کو یاد کرتا ہے تو خدا کی خدائی اور اپنی بندگی کا احساس اس پر اس طرح طاری ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک قسم کی عاجزی اور فروتنی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا وجود سمجھنے لگتا ہے جو خدا کے سامنے بہت جھکا ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر سے کبر نکل جاتا ہے جو اکثر برائیوں کا سرچشمہ ہے کمزور کے اوپر طاقت ور کا ظلم، ماتحت کے اوپر افسر کا برا سلوک، قانونی طور پر بہتر پوزیشن والے آدمی کا قانونی طور پر کمتر پوزیشن والے کو دبانا، صاحب اثر شخص کا بے اثر اشخاص کو خاطر میں نہ لانا، صاحب مال کا بے مال لوگوں سے بے اعتنائی برتنا، اکثریت کے افراد کا اقلیت کے افراد کو لوٹنا غرض جب بھی کوئی زور آور آدمی بے زور افراد کو تختۂ مشق بناتا ہے تو ایسی تمام صورتوں میں ہمیشہ کبر ہی اس کی خاص وجہ ہوتی ہے اگر کسی معاشرہ کے افراد میں کبر کا خاتمہ ہوجائے تو بے شمار برائیوں کا خود بخود خاتمہ ہوجائے گا۔

نماز کا دوسرا فائدہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ـــــ "وہ برائیوں اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے۔" نماز میں آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے، وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ خدا کا تابعدار بن کر زندگی گزارے گا، وہ اس آنے والے دن کو یاد کرتا ہے جب اسکی زندگی کا حساب ہوگا اور عذاب و ثواب کی ترازو قائم کی جائے گی۔ یہ سب باتیں اگر سچے دل سے ہوں تو زندگی کو بدل دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔

نماز کا ایک اور اہم ترین پہلو وہ ہے جس کو "ذکر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے خدا کی یاد سے دل کا معمور رہنا۔ اس طرح نماز گویا اس بات کے لئے آدمی کو تیار کرتی ہیں کہ اس کے دل و دماغ ان صحیح ترین خیالات سے بھرے رہیں جو حقیقتاً کسی کے ذہن و قلب میں ہونے چاہئیں۔ یہ فکر اور اور جذبات کی اعلیٰ ترین تربیت ہے۔

یہ نماز کے وہ نتائج ہیں جو نفسیاتی اور سماجی پہلو رکھتے ہیں اور جن کے اثرات معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ نماز کی اصلی حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ خدا کے آگے اپنا سر رکھ دے اور اس کا دل کہہ رہا ہو ـــــ "خدایا میں تیرا ہو گیا۔ تو بھی میرا ہو جا۔"

مولانا کی دعوت کا تیسرا جزو گشت ہے۔ "چلّہ" کے لفظ نے اس کو کافی بدنام کیا ہے۔ حالانکہ یہ صرف ایک اعتباری مدت ہے جو تربیت اور دعوت کی اس دوگونہ مہم کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ گشت دراصل اس حقیقت کا مظہر ہے کہ آدمی اپنے عقیدہ میں اتنا بے تاب ہو چکا ہے کہ اس کے لئے گھر سے باہر نکل پڑا ہے۔ ایمان کے ساتھ تبلیغ کا سودا بھی اس کے سر میں سما گیا ہے، وہ اپنے درد کو سارے عالم کا درد بنا دینا چاہتا ہے۔ یہی کیفیت جب عملی شکل اختیار کرتی ہے تو تبلیغ کی اصطلاح میں اسی کا دوسرا نام گشت یا اس کی ایک مقررہ مدت کا نام چلہ ہے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ نے گشت کے طریقہ پر جو اس قدر زور دیا اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر تبلیغی فائدوں کے علاوہ بہت سے تعلیمی تربیتی اور اصلاحی فائدے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ آدمی جب تبلیغ کے گشت میں دور دور کے سفر پر نکلتا ہے تو وہ دین سیکھتا ہے، اپنی اخلاقی اصلاح کرتا ہے، لوگوں کی حالت دیکھ کر اپنے اندر دینی کام کی اہمیت کا احساس پیدا کرتا ہے، قربانیاں اور مشقتیں اس کے اندر وہ سوز اور تڑپ پیدا کرتی ہے جس کے بعد ایک طرف

وہ دین داری کی حقیقی لذت سے آشنا ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کی زبان سے نکلے ہوئے تبلیغی کلمات میں جان پڑ جاتی ہے۔

گشت کے لئے لوگوں کو باہر نکالنا مولانا الیاس صاحب کے دینی طریق کار کی جان ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے یہ موقع ملتا ہے کہ لوگوں کو ان کے ماحول سے نکال کر ایک دینی ماحول میں پہنچایا جائے اور اس کے بعد ان کے اوپر تبلیغ کی جائے تاکہ وہ خالی الذہن ہو کر دین کی باتیں سنیں اور مختلف ماحول میں جا کر اس کا اثر زائل کرنے کے بجائے مسلسل اس سے اثر لیتے رہیں۔ یہ طریقہ عملی طور پر بے انتہا مفید ثابت ہوا ہے اور اس کے اتنے شاندار نتائج نکلے ہیں کہ وہ لوگ جنھوں نے قریب سے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

گشت، حدیث کے الفاظ میں، اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کرنا ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ جو قدم دین کی راہ میں گرد آلود ہوں، ان کو دوزخ کبھی نہ چھوئے گی۔ سرکس میں بعض آدمی یہ کرتب دکھاتے ہیں کہ وہ آگ کے الاؤ میں جسم کو ڈالتے ہیں اور ان پر آگ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اپنے جسم پر خاص طرح کی مالش کر لیتے ہیں۔ اس مالش کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ آگ انھیں چھو نہیں سکتی۔ اسی طرح دین کی راہ کی گرد وہ چیز ہے جو دوزخ کی آگ کو بے اثر کر دینے والی ہے جس کے اوپر یہ گرد پڑ گئی وہ گویا دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو گیا۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مولانا الیاس صاحب یا ان کے پیروؤں کے نزدیک تبلیغ کا گشت بذات خود وہ چیز ہے جس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ کسی خاص گروہ کا گشت نہیں بلکہ دین کا گشت اس سے مراد ہے۔ کسی کا گشت اسی وقت اس حدیث کا مصداق بنے گا جب وہ حقیقۃً دین کا گشت ہو، اور جتنا زیادہ وہ دین کے لئے ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ اسکا مصداق ہوگا اور دین سے اس کا تعلق جتنا کم ہوگا اتنا ہی اس کا مصداق ہونا مشتبہ ہوتا چلا جائے گا۔ کسی خاص گروہ سے نسبت اس کو حدیث کا مصداق نہیں بنا سکتی۔

مولانا الیاس صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا:

"ہمارے طریقہ کار میں دین کے واسطے جماعتوں کی شکل میں گھروں سے دور نکلنے کو بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس کا خاص فائدہ یہ ہے کہ آدمی اس کے ذریعہ اپنے دائمی اور جامد ماحول سے نکل کر ایک نئے صالح اور متحرک ماحول میں آجاتا ہے جس میں اس کے دینی

جذبات کے نشوونما کا بہت کچھ سامان ہوتا ہے۔ نیز اس سفر و ہجرت کی وجہ سے جو طرح طرح کی تکلیفیں مشقتیں پیش آتی ہیں اور دربدر پھرنے میں جو ذلتیں اللہ کے لئے برداشت کرنی ہوتی ہیں ان کی وجہ سے اللہ کی رحمت خاص طور سے متوجہ ہو جاتی ہے۔"

وسیع تصور

مولانا الیاس صاحب نے اپنے زمانہ میں تبلیغ کا کام جس ڈھنگ سے چلایا تھا، اس کے متعلق مولانا فرماتے تھے کہ ——— "یہ تبلیغ کی الف ب ہے" اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ الف ب کوئی اور چیز ہوتی ہے اور ت۔ ث۔ ی کوئی دوسری چیز۔ حقیقت یہ ہے کہ جو الف۔ ب ہے وہی ت۔ ث۔ ی بھی ہے مگر جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر پر ہوتی ہیں اور جو لوگ حقائق کا ان کی گہرائیوں کے ساتھ مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ ان کو بتانا پڑتا ہے کہ قطرہ کس طرح پھیل کر بحر بیکراں بنتا ہے۔ قطرہ ہی کا دوسرا نام بحر بیکراں بھی ہے۔ مگر عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قطرہ کوئی دوسری چیز ہے اور بحر بیکراں کوئی اور چیز۔

مولانا الیاس صاحب کے اس قول کو اس مثال کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے جیسے کوئی ڈرائیور اسٹیم تیار کر رہا ہو۔ اور وہ کہے کہ یہ تو میرے کام کی الف بے ہے۔ اسٹیم تیار کرنا ایک لحاظ سے کام کی الف ب ہے اور ایک لحاظ سے وہی سارا کام ہے۔ کیونکہ اسٹیم کے بغیر نہ انجن چل سکتا ہے اور نہ گاڑی حرکت میں آسکتی ہے۔ صرف یہی نہیں ہے کہ اسٹیم کے بغیر کوئی انجن اپنی منزل پر نہیں پہونچ سکتا ہے بلکہ اسکے بغیر دو قدم چلنا بھی اس کے لئے ناممکن ہے۔

کام کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے ہی دن از اول تا آخر کام کا پورا نقشہ بنا لیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس اصل بنیاد کو پکڑ لیا جائے جو دوسرے تمام اجزاء کے لئے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلا طریقہ پارلیمنٹ کی قانون سازی کا ہے اور دوسرا تحریک کا۔ پارلیمنٹ کا اصول اگر تحریک کے لئے کیا جائے تو اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کے ساتھ اسی اصول کے تحت معاملہ کیا کہ آغاز نبوت میں دین کی صرف بنیادی باتوں کی تعلیم دی گئی۔ اور لمبی مدت تک اسی پر سارا زور دیا جاتا رہا۔ اس کے بعد جیسے جیسے حالات آگے بڑھتے گئے، بقیہ چیزیں نازل کی جاتی رہیں۔

اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اصل اساس مضبوط ہو جاتی ہے۔ اور اساس کی مضبوطی کے بغیر کوئی بھی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ کی رو سے ہر کام کی توفیق خدا ہی سے ملتی ہے۔

ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، ان پر عمل کرنے میں آدمی اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس کے ساتھ خدا کی توفیق بھی شامل حال ہو جائے۔

مولانا الیاس صاحب نے ایک مرتبہ اس سوال پر کلام کرتے ہوئے کہ "مسلمانوں کو حکومت و اقتدار کیوں نہیں بخشا جاتا۔" فرمایا:

"اللہ کے احکام اور اوامر و نواہی کی حفاظت و رعایت جب تم اپنی ذات اور اپنی منزلی زندگی میں نہیں کر رہے ہو (جس پر تمھیں اختیار حاصل ہے اور کوئی مجبوری نہیں ہے) تو دنیا کا نظم و نسق کیسے تمہارے حوالہ کر دیا جائے۔ ایمان والوں کو حکومتِ ارضی دینے سے تو منشاء الٰہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مرضیات اور اس کے احکام کو دنیا میں نافذ کریں تو تم جب اپنے حدود اختیار میں آج یہ نہیں کر رہے ہو تو دنیا کی حکومت تمھارے سپرد کر کے کل کے لئے تم سے اس کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔"

تبلیغ اور قلم | ایک نیاز مند سے (جن کو مولانا کے تبلیغی کام سے بھی تعلق تھا اور اس کے علاوہ تحریر و تصنیف ان کا خاص مشغلہ تھا) ایک دن مولانا نے فرمایا ——— "میں اب تک اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ ان تبلیغی کام کے سلسلے میں کچھ زیادہ لکھا پڑھا جائے اور تحریر کے ذریعہ اس کی دعوت دی جائے۔ بلکہ میں اس کو منع کرتا رہا۔ لیکن اب میں کہتا ہوں کہ لکھا جائے اور تم بھی خوب لکھو۔ مگر یہاں کے فلاں فلاں کام کرنے والوں کو میری یہ بات پہونچا کر ان کی رائے بھی لے لو۔" چنانچہ ان نامزد حضرات کو مولانا کی بات پہونچا کر مشورہ طلب کیا گیا۔ ان صاحبان نے اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ اس بارہ میں اب تک جو طرزِ عمل رہا ہے، وہی اب بھی رہے۔ ہمارے نزدیک یہی بہتر ہے۔

اس کے بعد مولانا کو یہ بات پہونچائی گئی۔ مولانا نے دوبارہ فرمایا ——— "ہم پہلے بالکل کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ کوئی ہماری بات سنتا نہیں تھا۔ اور کسی کی سمجھ میں ہماری بات آتی نہیں تھی۔ اس وقت یہی ضروری تھا کہ ہم خود ہی چل پھر کر لوگوں میں پہلے طلب پیدا کریں۔ اور عمل سے اپنی بات سمجھائیں۔ اسوقت اگر تحریر کے ذریعہ عام دعوت دی جاتی تو لوگ کچھ کا کچھ سمجھتے۔ اور اپنے سمجھنے کے مطابق ہی رائے قائم کرتے اور اگر بات کچھ دل کو لگتی تو اپنی سمجھ کے مطابق کچھ سیدھی کچھ الٹی اس کی عملی تشکیل کرتے اور پھر جب نتائج غلط نکلتے تو ہماری اسکیم کو ناقص کہتے۔ اس لئے ہم یہ بہتر نہیں سمجھتے تھے کہ لوگوں کے پاس تحریر کے

کے ذریعہ ہماری دعوت پہونچے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے اب حالات بدل چکے ہیں۔ ہماری بہت سی جماعتیں ملک کے اطراف میں نکل کر کام کا طریقہ دکھلا چکی ہیں۔ اور اب لوگ ہمارے کام کے طالب بن کر خود ہمارے پاس آتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو اتنے آدمی دے دئیے ہیں کہ اگر مختلف اطراف میں طلب پیدا ہو اور کام سکھانے کے لئے جماعتوں کی ضرورت ہو تو جماعتیں بھیجی جا سکتی ہیں۔ تو اب ان حالات میں بھی کس مپرسی والے ابتدائی زمانہ ہی کے طریقہ کار کے ہر ہر جز و پر جمے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تحریر کے ذریعہ بھی دعوت دینی چاہیئے۔"

بعض مواقع پر مولانا نے اس کا بھی اظہار فرمایا کہ اس وقت جس قسم کے کارکن ہمارے گرد جمع ہو سکے ہیں اس کے مطابق کام ہو رہا ہے، اور دوسری دوسری صلاحیتوں والے لوگ آئیں تو کام میں مزید اضافہ ہو۔

قلم کے ذریعہ کے بارے میں مولانا کے جو خیالات تھے، ان کو غالباً حسب ذیل طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کوئی تحریک جب نئی نئی شروع ہوتی ہے تو ایک اہم مسئلہ اس کے صحیح تعارف کا ہوتا ہے اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ داعی کی زبان بذات خود زیادہ سے زیادہ تعارف کا ذریعہ بنے مگر ایک وقت آتا ہے جب دعوت ساری فضا میں گونج اٹھتی ہے اور اس کی صدا سے سارا ماحول آشنا ہو جاتا ہے۔ اس وقت غلط تعارف کا اندیشہ بہت کم ہو جاتا ہے۔ کچھ الفاظ اصطلاح عام بن کر لوگوں کے ذہنوں میں جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس وقت مقرر یا محرر کے الفاظ ہی دعوت کے تعارف کا کام نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ سننے والے کا اپنا وہ ذہن بھی شامل ہو جاتا ہے جو پہلے سے اس دعوت کے بارے میں ایک تعارف سے آشنا ہو چکا ہے۔ جب کوئی تحریک اس دوسرے مرحلہ پر پہونچ جائے تو ان ابتدائی تحفظات کی ضرورت نہیں رہتی جو دعوت کے آغاز میں ضروری سمجھے گئے تھے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر تحریک کے لئے کام کرنے کے ہزار پہلو ہوتے ہیں۔ مگر عملی طور پر تحریک انھیں کاموں میں حصہ لیتی ہے جس کے لئے اس کے پاس کارکن موجود ہوں۔ ایسا کام جس کے لئے کارکن ہی حاصل نہ ہوں اس کو چھیڑنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ مولانا

الیاس صاحب کا کام ابتداءً جس نقشہ کے مطابق چلا، ایک لحاظ سے اگرچہ اس کی اہمیت یہ تھی کہ وہ بنیادی اور اصلی کام تھا، مگر اس کے ظاہری ڈھانچہ میں اس واقعہ کا بھی دخل تھا کہ اس وقت جس نوعیت کے کارکن فراہم ہوئے وہ اسی ڈھنگ سے کام کو چلا سکتے تھے۔ اب اگر تحریک کو پھیلاؤ حاصل ہو جائے تو کام میں بھی اسی طرح پھیلاؤ ہو جائے گا جیسا کہ کارکنوں کی اقسام میں پھیلاؤ ہوا ہے۔

۳۔ مولانا نے ایک مرتبہ بہت قیمتی بات فرمائی — آپ نے فرمایا کہ ایک طریقہ دین کی عمومی تعلیم و تربیت کا ہے۔ اور دوسرا طریقہ وہ ہے جو "ضرورت حادثہ" کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ پہلا جو طریقہ ہے وہی دورِ نبوت میں ملتا ہے اور عمومی تعلیم و تربیت اسی طریقہ پر ہونی چاہیئے۔ دوسرا طریقہ حالات و ماحول کی رعایت سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے طریقہ میں دوامی قدر ہے اور دوسرے طریقہ میں زمانی قدر۔

مولانا کے اسی ملفوظ کی روشنی میں ہم تصنیف و اشاعت کے کام کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تصنیف و تالیف کی بے حد اہمیت ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ آج علمی سطح پر جو مسائل چھڑے ہوئے ہیں ان کو صحیح طور پر کتابی شکل ہی میں ایک دوسرے کے سامنے لایا جا سکتا ہے۔ دورِ عباسیہ میں یونانی علوم کی اشاعت سے اسلام کے لئے بہت سے ذہنی مسائل پیدا ہوئے جن کے جواب کے لئے علم کلام ایجاد ہوا اور علما نے قلم کے ذریعہ ان کا جواب دیا۔ اسی طرح دورِ جدید میں افکار و خیالات کا ایک نیا سیلاب امڈ آیا ہے جو مختلف پہلوؤں سے اسلام کو چیلنج کر رہا ہے۔ ہمیں اسلام کی طرف سے اس کا جواب فراہم کرنا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ کا فکر اس کام کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ البتہ ان کے الفاظ میں اس کام کو ضرورتِ حادثہ کے تحت پیدا شدہ کام سمجھنا چاہیئے نہ کہ اس کو اصلی اور عمومی کام سمجھ لیا جائے۔

اسی طرح ضرورت حادثہ کی اور بہت سی اقسام ہو سکتی ہیں مگر سب کا استقصاء یہاں مقصود نہیں۔

(ختم)

توحید و شرک

از افادات حضرت شاہ ولی اللہؒ

[شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے خاص انداز سے توحید و شرک کی حقیقت پر بحث فرمائی ہے۔ ذیل میں اسی بحث کو اُردو کے قالب میں پیش کیا جارہا ہے —— ادارہ]

توحید

توحید جو دین کا ستون اور تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مفہوم میں وحدانیت حق کے چار درجے شامل ہیں۔

۱۔ تنہا وہی واجب الوجود ہے کسی اور کی یہ شان نہیں۔

۲۔ تنہا وہی خالق عرش، خالق سموات وارض اور دیگر جوہری موجودات کا بھی بلاشرکت غیرے خالق ہے۔

۳۔ زمین و آسمان یعنی کُل کائنات کا مدبّر اور کارپرداز بھی تنہا وہی ہے۔ کسی دوسرے کا کوئی ہاتھ تدبیر عالم میں نہیں۔

۴۔ عبادت کا مستحق بھی تنہا وہی ہے۔

توحید کے پہلے دو مرتبے ایسے ہیں، جن کے بارے میں کتُب الٰہیہ کو کسی بحث کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ میں سے کسی کو بھی ان میں کلام نہیں تھا۔ بلکہ جیسا کہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے، توحید کے یہ درجے ان کے یہاں بھی مسلّم تھے۔

تیسرا اور چوتھا درجہ آپس میں لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں لوگوں کے مختلف قسم کے مشرکانہ خیالات ہیں۔ ان اختلافات کی بنیاد پر ان لوگوں کی اکثریت تین گروہوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔

۱۔ کواکب پرست ۔ جو ستاروں کو مستحق عبادت جانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان کی عبادت دُنیا میں نفع مند ہوتی ہے اور وہ ان کو حاجت روا بھی سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دُنیا کے حوادث و واقعات اور انسان کی خوش بختی و بدبختی اور تندرستی و بیماری میں ان کا بڑا دخل ہے۔ یہ بے شعور اور بے جان اجسام نہیں ہیں۔ ان کے پیچھے صاحب شعور و ادراک نفوس ہیں جو انکی حرکت کا نظم و ضبط کرتے ہیں۔ اور اپنے عبادت گزاروں پر ان کی نظر ہے ـــــ ان تصورات کے تحت یہ کواکب پرست ان کواکب کے ناموں پر ہیکل تعمیر کرتے ہیں اور عبادتی رسوم ادا کرتے ہیں۔

۲۔ بُت پرست ۔ یہ وہ گروہ ہے جو کارخانۂ ہستی کے بڑے بڑے اور اٹل معاملات کی حد تک مسلمانوں کا ہم عقیدہ ہے، یعنی وہ بھی مانتا ہے کہ ان میں خدا کے سوا کسی کا دخل نہیں۔ لیکن دوسرے اُمور میں غیراللہ کے بھی اختیارات مانتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے زمانے میں ،،،،،،، خدا کے کچھ نیک بندوں نے اس کی عبادت و ریاضت سے تقرب کا وہ مقام حاصل کرلیا تھا کہ خدا نے انھیں بھی خدائی (الوہیت) کا اعزاز بخش دیا۔ پس باقی انسانوں کے لیے وہ بھی مستحق عبادت ہیں۔ ان لوگوں کی نظر میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شہنشاہ اپنے کسی غلام کے حُسن خدمت سے خوش ہو کر اُسے خلعتِ شاہی بخشدے اور اپنی سلطنت کے کسی حصے کا نظم و نسق ان کے سپرد کردے تو وہ اس حصے کے باشندوں کے لیے واجب الاطاعت ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ کی عبادت بھی جبھی قبول ہوگی جب کہ اس کے ساتھ ان "خاصان خدا" کی بھی پوجا کی جائے۔ بلکہ (ان بُت پرستوں کے خیال کے مطابق) خدا کی بارگاہ تو وراء الوراء ہے۔ اس لیے براہِ راست اس کی عبادت سے تو اس تک رسائی ہم شما کے بس ہی میں نہیں، لہٰذا ہمیں ان مقربین ہی کی عبادت کرنی چاہیئے۔ تاکہ ان کے واسطے سے اللہ کا قرب حاصل ہوسکے۔

ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ وہ مقرب ہستیاں اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر وہ سنتی ہیں، دیکھتی ہیں، اپنے پرستاروں کی سفارش کرتی ہیں اور ان کی مددگار و کارساز ہیں۔ پس ان کے ناموں پر

پتھروں کی کچھ مورتیاں تراش لی گئیں جنھیں بطورِ علامت سامنے رکھ کر ان صالحین کی عبادت کی جانے لگی۔ لیکن اگلی نسلوں میں جاکر علامت اور معبود کا یہ فرق بھی مٹ گیا اور بذاتِ خود یہ مورتیاں ہی معبود سمجھی جانے لگیں۔ چنانچہ اس مسلکِ شرک کی تردید میں کبھی قرآن اس کی اصل کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہو کہ فرمانروائی اور بادشاہی تو صرف اللہ ہی کی ہے کوئی بھی اس میں شریک نہیں۔ اور کبھی اس مورت پرستی ہی کو سامنے رکھ کر کہتا ہے کہ یہ تو بے جان پتھر ہیں! تم اتنا نہیں سوچتے کہ ان میں کیا رکھا ہے؟

اَمۡ لَهُمۡ اَرۡجُلٌ يَّمۡشُوۡنَ بِهَاۤ	کیا ان کے پاؤں ہیں کہ جس سے چل سکیں
اَمۡ لَهُمۡ اَيۡدٍ يَّبۡطِشُوۡنَ بِهَاۤ	کیا ان کے ہاتھ ہیں کہ کچھ پکڑ سکیں
اَمۡ لَهُمۡ اَعۡيُنٌ يُّبۡصِرُوۡنَ	کیا ان کے پاس آنکھیں ہیں کہ جن سے
بِهَاۤ اَمۡ لَهُمۡ اٰذَانٌ يَّسۡمَعُوۡنَ	دیکھ سکیں۔ کیا کان ہیں کہ ان سے
بِهَا۔	سُن سکیں؟۔

۳۔ نصاریٰ۔ تیسرا گروہ نصاریٰ کا ہے۔ جن کا گمان یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کو اللہ کا ایسا قرب اور دیگر مخلوق پر ایسی برتری حاصل ہے کہ انھیں عبد کہنا سُوءِ ادب ہے اور ان کے مرتبۂ خاص کی بے توقیری ہے۔ اس بنیاد پر نصاریٰ کا ایک گروہ آپ کو "ابن اللہ" کہہ کر آپ کے مرتبۂ خاص کا اظہار کرتا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انہیں "انھیں اللہ" ہی کہنا چاہئے، کیونکہ آپ سے احیاءِ موتیٰ اور خلقِ طیر (مردوں کو زندہ کرنا اور جانداز پرندے بنا دینا) جیسے اوصاف کا ظہور اس بات کی علامت ہے کہ اللہ کی ذاتِ واجب الوجود آپ میں حلول کیے ہوئے ہو۔ پس آپ کا کلام اللہ کا کلام ہے اور آپ کی عبادت اللہ کی عبادت ہے۔

یہ نصرانی عقیدے کی اصل تھی۔ مگر بعد کے لوگوں میں یہ شعور بھی باقی نہیں رہا کہ یہ نام (ابن اللہ اور اللہ) اپنے پورے اور حقیقی مفہوم میں مراد نہیں تھے۔ چنانچہ "ابن اللہ" جو مجازاً ایسے اختصاص کو ظاہر کرنے کے لیے بولا گیا تھا جو عام رعیت کے مقابلے میں بیٹے کو حاصل ہوتا ہے، حقیقی معنی میں استعمال کیا جانے لگا اور حضرت مسیح کو بعینہٖ خدا کا بیٹا قرار دے دیا گیا۔ اور اسی طرح جن بعد والوں نے "اللہ" کا لفظ پسند کیا انھوں نے آپ کو پورے معنی میں اللہ بنا لیا۔ حالانکہ کہنے

والوں نے صرف جزوی خدائی کا اظہار اس لفظ سے کرنا چاہا تھا۔ بہر حال ابتدا اور انتہا دونوں ہی غلط تھیں اور قرآن نے دونوں کا رد کیا۔ کہیں فرمایا کہ اس کی بیوی کہاں ہے جو کوئی بیٹا ہوتا؟ کہیں فرمایا کہ وہ "بدیع السمٰوٰتِ والارض" ہے۔ یعنی خدائی یہ ہے کہ بغیر کسی مادۂ وجود کے کسی چیز کو وجود میں لائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کو صرف حکم "کُن" سے وجود بخشا۔

قرآن کی تمام تر بحث توحید کے انھیں آخری دو مرتبوں سے ہے، جن میں مشرکانہ اعتقادات رونما ہوئے ہیں۔ قرآن ان اعتقادات کا مکمل رد کرتا ہے۔

حقیقتِ شرک

شرک کی حقیقت سمجھنے کے لیے عبادت کا مفہوم جاننا ضروری ہے۔ عبادت کا مطلب ہے انتہائی تذلل اور فروتنی اختیار کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی درجہ کا تذلل اور فروتنی اختیار کرنے کو عبادت نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کا انتہائی درجہ ہونا چاہیے۔ مثلاً کسی کے لیے تعظیماً کھڑا ہو جانا بھی فروتنی کی ایک صورت ہے۔ مگر سجدے کے مقابلے میں کمتر صورت ہے۔ لہٰذا عبادت کا اطلاق دوسری صورت پر ہونا چاہیے، نہ کہ پہلی پر۔ لیکن اسی کے ساتھ آدمی کی نیت اور جذبے سے بھی فروتنی کا درجہ گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ مثلاً ایک سجدہ خدا کی تعظیم کے لیے ہو تو اس میں فروتنی کا جذبہ کچھ اور ہی ہوگا۔ دوسرا بادشاہ کی تعظیم کے لیے ہو تو اس کی نوعیت دوسری ہوگی۔ تیسرا استاذ کے لیے کیا جائے تو اس میں فروتنی کی اندرونی کیفیت اور بھی کم ہوگی۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تذلل و فروتنی کی کسی صورت کے عبادت ہونے نہ ہونے کا اصل مدار نیت پر ہے۔ یہی بات آدم علیہ السلام کے لیے ملائکہ کے سجدۂ تحیہ سے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اُن کے بھائیوں کے سجدہ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ (یہ دونوں واقعے اسی لیے شرک کی حد میں نہیں آتے کہ ان میں نیت صرف اُس تعظیم کی تھی جو ایک مخلوق کی طرف سے دوسری باعظمت مخلوق کی کی جاتی ہے)۔

نیت کے اس دقیق فرق کو سمجھنے کے لیے مزید وضاحت اور تنقیح کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے پہلے چند مقدمات ذہن نشین کر لینا چاہئیں۔

۱۔ کسی کے مقابلے میں تذلل اور فروتنی کا جذبہ اس پر موقوف ہے کہ آدمی اپنے کو کمزور اور

دوسرے کو قوی سمجھے، اپنے کو کمتر اور دوسرے کو برتر سمجھے، اپنے کو انقیاد و سرافگندگی پر مجبور پائے اور دوسرے میں نفاذِ حکم اور تسخیر کی شان دیکھے۔

۲۔ انسان جب بھی خالی الذہن ہو کر غور کرے گا تو لامحالہ محسوس کرے گا کہ قوت، شرف اور تسخیر وغیرہ اوصافِ کمال اپنے موصوف کے اعتبار سے دو الگ الگ درجوں اور مرتبوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک درجہ ان اوصاف کا وہ ہے جسے انسان اپنے لیے اپنے جیسے کسی دوسرے انسان کے لیے مان سکتا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جس کا تصور آدمی اپنے جیسے کسی کے لیے نہیں کر سکتا۔ بلکہ صرف اس ہستی کے لیے مان سکتا ہے جو ذاتی طور پر دائرۂ حدوث و امکان سے ماورا ہو ـــ یعنی پروردگارِ عالم ـــ یا جس کسی میں (آدمی کے تصور کے مطابق) اس ہستی کی کچھ خصوصیات منتقل ہو گئی ہوں۔

مثلاً کسی عام انسان کے لیے "تسخیر و تدبیر" کا وصف استعمال کیا جائے تو یہاں تسخیر و تدبیر کا وہ تصور ذہن میں آئے گا جو ذہنی اور جسمانی قوتوں کے استعمال کا محتاج ہے۔ اور مختلف کاوشیں اس کے لیے لازم ہوتی ہیں۔ مگر جب خدا کے لیے یہ وصف زبان پر آئے گا تو بغیر کسی کد و کاوش کے تصور کے "کن فیکون" درجے کی تسخیر و تدبیر مراد ہو گی، جس کے لیے "تکوین" کا لفظ آتا ہے۔

اسی طرح عظمت و قوت کا تصور جب مخلوق میں سے کسی کے لیے کیا جائے گا تو وہ ایسی چیزوں کی بنیاد پر ہو گا جن کا حصول کسی بھی انسان کے لیے ناممکن نہیں ہے۔ مثلاً بادشاہ کی عظمت و قوت اس بنیاد پر ہے کہ اس کو اعوان و انصار کی ایک عظیم فوج میسر ہے اور کچھ اختیارات اس کے ہاتھ میں آ گئے ہیں۔ کسی سورما کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس کے دست و بازو میں دوسروں سے زیادہ توت آ گئی ہے۔ استاذ کی عظمت شاگرد کے مقابلے میں یہ ہے کہ اس کے پاس علم زیادہ ہے۔ بہر حال ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو کسی نہ کسی درجے میں دوسروں کے پاس موجود نہ ہو یا کم از کم قابلِ حصول نہ ہو۔ برخلاف اس کے خدا کی عظمت کی بنیادوں کو کوئی چھونے کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔ اور وہ ان کسبی بنیادوں سے وراء الورا ہے۔

الغرض جو شخص بھی اس دنیا کے سلسلۂ حدوث و امکان کی انتہا ایک ایسی ہستی واجب الوجود پر مانتا ہے جو کسی معاملے میں کسی چیز کی محتاج نہیں، وہ مجبور ہے کہ ان اوصاف کو حقیقت کے اعتبار سے دو درجوں میں تقسیم کرے۔ ایک درجہ اس ہستیٔ ماوراء کے لیے۔ اور ایک اپنے جیسے گرفتارانِ

حدوث و امکان کے لیے۔

پس شرک کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اوصافِ کمال کا وہ درجہ خدا کے علاوہ کسی اور کے لیے مان بیٹھے جو ہستیٔ داور کے لیے خاص ہے اور اسی تصور کے ماتحت اس کے سامنے تذلل اور فروتنی اختیار کرے۔

اسبابِ شرک | یہ بات کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ اس کے چند اسباب ہیں جو سب مل کر غلطی کا باعث ہوتے ہیں۔

۱۔ عام طور پر انسان اوصافِ کمال کے اُس درجہ کی صحیح معرفت نہیں رکھتے جیسے وہ ذاتِ واجب الوجود کے لیے خاص جانتے ہیں۔ اس کی بڑی واضح مثال وہ حکایت ہے جو ایک حدیث میں آئی ہے کہ ایک شخص جو بڑا گنہگار تھا اور آخر وقت میں اُسے فکر ہوئی کہ میں اللہ کی پکڑ سے کیسے بچوں گا تو اُس نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ مرنے کے بعد میری لاش کو جلا کر اس کی آدھی راکھ ہوا میں اُڑادی جائے اور آدھی سمندر میں بہادی جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص اللہ کی اس قدرت پر یقین رکھتا تھا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ جلا سکتا ہے اور جلائے گا۔ مگر خدا کے اس کمالِ قدرت کا تصور وہ بس اُن ممکنات تک رکھتا تھا جن کو وہ خود ممکن سمجھتا تھا اور چونکہ یہ بات اس کے نزدیک ناممکنات میں تھی کہ اس طرح منتشر کردی جانے والی راکھ بھی جمع کی جاسکتی ہے اس لیے یہ چیز اُس نے خدا کی قدرت کے باہر بھی۔ عام طور پر انسانوں کا یہی حال ہے کہ وہ خدا کی صفات کا صحیح تصور نہیں رکھتے۔

۲۔ دونوں درجوں کے اوصاف کے بیان میں الفاظ بالعموم مشترک یا قریب قریب مشترک استعمال ہوتے ہیں۔ قدرت کا لفظ ممکنات کی صفت بیان کرنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور یہی لفظ واجب الوجود کی صفت میں آتا ہے۔ یہی حال قوت، تسخیر، تاثیر، تدبیر، علم وغیرہ الفاظ کا ہے۔ پس تعبیرات اور الفاظ کا یہ اشتراک بھی لوگوں کے لیے غلط فہمی کا باعث ہو جاتا ہے۔

۳۔ انسان ایسے واقعات سنتا یا دیکھتا ہے کہ نوعِ انسانی ہی کے بعض افراد یا ملائکہ سے ایسے معاملات کا ظہور ہوا جو اسے اپنے ابنائے جنس سے مستبعد معلوم ہوتے ہیں مثلاً خرقِ عادت، یا کشف، یا دُعا کا غیر معمولی اثر وغیرہ۔ تو ان افراد کے لیے وہ الوہی عظمت اور الوہی قدرت کے شبہ میں پڑ جاتا ہے۔

ان اسباب کی بنا پر انسانوں میں شرک کا بازار گرم رہا ہے اور ہر نبی کو اسکی بڑی جدوجہد

کرنا پڑی ہو کر دونوں رخوں کے درمیان واضح خط کھینچ کر درجۂ مقاربہ کو واجب تعالیٰ کی ذات میں محصور کر دے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی فرق کو سمجھانے کے لیے ایک طبیب سے فرمایا۔

انّما انت رفیقٌ والطبیبُ هو الله۔ — تم تو بس رفیق ہو طبیب حقیقت میں اللہ ہے۔

یا اسی طرح فرمایا

السید هو الله — سید (آقا) تو اللہ ہے۔

ان تنبیہات سے آپ کا اشارہ ان الفاظ کے اطلاق کے اسی فرق کی طرف تھا۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ الفاظ کے اشتراک میں معنوی فرق کو فراموش نہ کیا جائے۔

اشتباہ اور مغالطے کے یہ مریض کئی قسم کے ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جو اللہ کی عظمت سے بالکل ہی غافل ہو گئی صرف شرکا، کی عبادت کرتی ہے، اپنی ہر حاجت انھیں کے سامنے رکھتی ہے اگرچہ عقلی اور منطقی طور پر جانتی ہے کہ اس عالم وجود کا منتہیٰ اللہ ہی کی ذات ہے۔ لیکن عملی طور پر اس نے اللہ سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو اللہ کو مالک اور مدبّر مانتی ہے۔ لیکن یہ گمان کیے ہوئے ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنے کسی غلام کو خلعتِ عظمت و الوہیت عطا کر کے بعض خاص امور میں تصرف کا اختیار دے دیتا ہے اور دوسرے بندوں کے بارے میں اس کی سفارش بھی سنتا ہے۔ اس گمان کی بنا پر ان لوگوں کی زبانیں ان مخصوص بندوں کو عبد اور بندہ کہتے ہوئے ہچکچاتی ہیں کہ یہ بے ادبی ہو جائے گی۔ لہٰذا "ابن اللہ" یا "محبوب اللہ" کے القاب سے انھیں یاد کرتے ہیں۔ اور خود کو ان کا بندہ قرار دیتے ہیں لہٰذا ایسے نام بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً عبد المسیح، عبد العزّیٰ۔ یہ جمہور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا مرض ہے۔ اور ہمارے زمانے میں اُمتِ محمدیہ کے بعض غالی منافق بھی اس مرض میں مبتلا ہیں ع۵

مذکورۂ بالا تنقیح سے ظاہر ہوا کہ شرک اپنی اصلیت کے اعتبار سے انسان کے باطن

ع۵۔ چنانچہ عبد الرسول وغیرہ نام اسی مرض کی علامت ہیں۔ — مترجم

کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس عالم میں تدبیر و تاثیر اور تسخیر کا جو مرتبہ اللہ کے لیے خاص ہے، جسے تکوین کہا جاتا ہے اس میں کسی اور کی کلی یا جزئی شرکت مان لینا اصل شرک ہو جس کے نتیجے میں آپ سے آپ عبادت میں بھی شرک رونما ہوتا ہے۔ مگر شریعت کا حکم چونکہ ظاہر پر لگتا ہے اس لیے اس کا اصول یہ ہے کہ مظنّہ شئے کو اصل شئے کا درجہ دیا جائے (یعنی جو چیز عادۃً کسی چیز کا مظہر ہوتی ہو اُسے اصل چیز ہی کے حکم میں رکھا جائے) لہٰذا بتوں کا سجدہ، ان کے نام پر قربانی اور ان کی قسم جیسے اعمال کو جو عادۃً اعتقادی شرک ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں صریح کفر اور شرک ہی قرار دیا گیا ہے ـــــ اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں عادۃً یہ لزوم نہ پایا جائے وہاں صرف ظاہر پر حکم نہ ہوگا۔

اقسامِ شرک

اگلی قوموں میں مشرکانہ اعتقاد کے ماتحت جن جن باتوں کا رواج رہا ہے اور اس رواج نے ان باتوں کو شرک کا نشان بنا دیا، شریعتِ محمدیہ میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی ان تمام عادی صورتوں کو یک قلم ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اقسامِ شرک سے ہماری مراد یہی صورتیں ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مشرکین بتوں اور ستاروں کو سجدہ کیا کرتے تھے۔ شریعتِ محمدی میں غیر اللہ کو سجدہ ممنوع قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ	مت سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو بلکہ سجدہ
وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ	کرو اس اللہ کو جس نے انھیں بنایا۔

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ توحیدِ عبادت اُن احکام میں سے نہیں ہے جن میں شریعتوں کی تبدیلی کا کوئی اثر پڑتا ہو، جیسا کہ بعض متکلمین نے گمان کرلیا ہے کہ اس معاملے میں بھی شرائع کے اختلاف سے احکام مختلف ہوتے رہے ہیں۔ اس لیے کہ عبادت میں توحید کا حکم تدبیر و تکوین میں اللہ کے لاشریک ہونے پر مبنی ہے، جیسا کہ ہم اوپر تنبیہ کر چکے ہیں۔ اور قرآن نے اس حقیقت کو بڑی وضاحت کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ:

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؕ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ؕ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ ـــ الیٰ اٰخر قولہ تعالیٰ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ؕ

(النمل ع ۵ ـ پ ۱۹ ـ ۲۰)

آپ کہئے (حمد و سلام کے بعد) کہ بتاؤ اللہ بہتر ہے یا وہ جنھیں تم شریک کرتے ہو؟ کیا وہ بہتر نہیں ہے جس نے پیدا کیے آسمان و زمین اور جس نے اتارا کیا تمھارے لیے آسمان سے پانی، پھر اُگائے ہم نے اس پانی سے لہلہاتے ہوئے باغ، کہ تم جن کا ایک پیڑ بھی نہیں اُگا سکتے تھے۔ کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی معبود بنانے کے قابل ہو سکتا ہے؟ مگر یہ پھر بھی برابری کرتے ہیں!

کیا وہ بہتر نہیں ہے جس نے زمین کو مستقر بنایا، اس کے بیچ میں نہریں نکالیں اس کے اوپر پہاڑوں کے سلسلے بنائے اور مل کر بہتے ہوئے دریاؤں کے پانی میں خطِ فاصل رکھا؟ کیا اسکے ساتھ کوئی اور معبود بنانے کے لائق ہو سکتا ہے، نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔

ـــ اور اس سلسلۂ کلام کے انتہا پر ارشاد ہوتا ہے کہ ـــ تم اگر سچے ہو تو تم بھی (اپنے شرکاء کے معبود ہونے کی) کوئی دلیل لاؤ۔

غیر اللہ کے ساتھ عبادت کا معاملہ کرنے کے رد میں قرآن کا یہ استدلالی انداز صاف بتاتا ہے کہ عبادت کے معاملے میں شریعتوں کے بدلنے سے کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ حکم

دلیل و برہان کی جس اساس پر قائم ہے وہ ازل سے ابد تک غیر متبدّل ہے۔ اس میں زمان و مکان کا کوئی قصہ نہیں۔

۲۔ مشرکین کا دستور تھا کہ وہ تندرستی اور کشائش رزق کے لیے غیر اللہ کو پکارتے تھے اُن کے لیے منتیں مان کر حاجت برآری کی امیدیں باندھتے تھے۔ بعض کے نام جپ کر ان کی برکت سے کام نکلنے کی توقع کرتے تھے۔ ان طریقوں کی بیخ کنی کے لیے اللہ نے اُمّتِ محمدیہ پر واجب ٹھہرایا کہ وہ اپنی نمازوں میں عہد و اقرار کریں کہ

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ — صرف تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

مزید حکم دیا کہ

لَاتَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَداً — اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دُعا سے مُراد عبادت نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہہ دیا ہے۔ بلکہ استعانت مراد ہے۔ اور اس کی دلیل اللہ کا یہ دوسرا ارشاد ہے کہ

بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ فَیَکْشِفُ مَاتَدْعُوْنَ۔ — بلکہ (بعض خاص مصیبتوں کے وقت) تم صرف اللہ ہی کو پکارتے ہو اور وہ دور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کے لیے تم اُسے پکارتے ہو۔

۳۔ مشرکین اپنے ٹھہرائے ہوئے بعض شرکا کو "بنات اللہ" اور "ابناء اللہ" کے لقب سے پکارتے تھے۔ اُمّتِ محمدیہ کو اس کی بھی بہت سخت ممانعت کی گئی کہ کسی سے اللہ کا تقرب ظاہر کرنے کے لیے اس طرح کے الفاظ نہ استعمال کیے جائیں۔ ان سے بالآخر فاسد عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ بعض مشرکین اپنے دینی اور روحانی پیشواؤں کو یہ درجہ دے لیتے تھے کہ انھیں تحلیل و تحریم کا اختیار ہو۔ ان کے حلال کہہ دینے سے فی الواقع ایک چیز حلال ہو جاتی ہے۔ اور جس چیز کو وہ حرام کہہ دیں اس میں حرمت سرایت کر جاتی ہے۔ یہ مرض اہلِ کتاب کا تھا۔ چنانچہ اُن کی اس عادت پر قرآن نے ان الفاظ میں نکیر کی کہ:

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ ٹھہرایا ہے انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو ارباب من دون اللہ۔

اس معاملے میں شرک کا راز یہ ہے کہ تحلیل و تحریم کا مطلب ہے ایک تکوینی فیصلہ جو عالم بالا سے نافذ ہوتا ہے کہ فلاں شئے پر مواخذہ ہے اور فلاں شئے پر کوئی مواخذہ نہیں اور تکوین اللہ کی صفات میں سے ہے اس میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مطلب یہ ہوا کہ تحلیل و تحریم صرف اللہ کا حق ہے اور حضورؐ کی طرف جو تحلیل و تحریم کی نسبت ہمارے قانونِ شریعت میں کی جاتی ہے کہ آپ نے فلاں چیز کو حلال اور فلاں کو حرام ٹھہرایا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ تحریم و تحلیل کے بارے میں آپ کا قول اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز کی حرمت و حلت کی قطعی دلیل ہے۔[عـ۵]

۵۔ مشرکین کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے معبودتوں اور ستاروں کی خوشنودی کے لیے جانور ذبح کیا کرتے تھے۔ یہ ذبیحہ یا تو ان کے مفروضہ استھانوں پر ہوتا تھا ورنہ وقت ذبح ان کا نام لیا جاتا تھا کہ فلاں کے نام پر۔ ہماری شریعت نے اس کو بھی منع کیا۔

۶۔ مشرکین میں اپنے معبودانِ باطل کی خوشنودی کیلئے جانوروں کو انکے نام پر چھوڑ دینے کی رسم تھی، جن کو وہ اصطلاحی طور پر سائبہ اور بحیرہ کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی ممانعت فرمائی اور ان رسوم کو باطل قرار دیتے ہوئے فرمایا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَائِبَةٍ۔ نہیں ٹھہرایا ہے اللہ نے کوئی "بحیرہ" اور نہ کوئی "سائبہ"۔[عـ۶]

۷۔ ایک عادت قسم بغیر اللہ کی تھی۔ یعنی اپنے گمان میں جن لوگوں کو مقدس سمجھتے تھے ان کے

عـ۵ شاہ صاحب کے اس ارشاد کی مزید توضیح یوں کی جا سکتی ہے کہ حضورؐ کی زبان ترجمانِ وحی تھی۔ وما ینطق عن الھویٰ اِن ھو الا وحیٌ یوحیٰ دین کے معاملے میں کوئی بات آپ کی زبان سے نکلنا اس بات کی سند ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ لہٰذا یہاں اس اشتباہ کا سوال نہیں کہ کوئی تحلیل و تحریم آپ کی ذاتی سمجھ لی جائے۔ عـ۶ سائبہ وہ جانور جسے بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جائے۔ اور بحیرہ وہ کہ جس کا دودھ بتوں کے نام مخصوص کر دیا جائے۔

نام کی جھوٹی قسم کھانے میں جان و مال کے نقصان کا اعتقاد رکھتے تھے۔ چنانچہ نزاع میں فریق ثانی کو ان ناموں کی قسم دلائی جاتی تھی۔ اس کی حرمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمائی کہ

من حلف بغیر اللّٰہ فقد اشرك　　جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

۸۔ غیر اللہ کا حج کیا جاتا تھا، یعنی شرکاء کی نسبت سے بعض مقامات کو متبرک قرار دے کر وہاں حاضری دی جاتی تھی۔ حضورؐ نے اس کی ممانعت میں فرمایا کہ

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ اَلْمَسْجِدِ الحرام ومسجدی هذا والمسجد الاقصیٰ۔　　(اس طرح کی نیت سے) سوائے تین مسجدوں کے کسی اور جگہ کا سفر نہ کیا جائے۔ ایک مسجد حرام، ایک یہ میری مسجد اور ایک مسجد اقصیٰ۔

۹۔ مشرکین اپنے بچوں کے نام عبدالعزیٰ اور عبدالشمس وغیرہ رکھتے تھے۔ اللہ رب العزت نے اس کی مذمت میں ارشاد فرمایا کہ

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْکُنَ اِلَیْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰهُمَا　(الاعراف۔ ع۔ ۲۴)　　وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور (پہلے) اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ سکون حاصل کرے اس سے۔ پس جب وہ دونوں ملے تو حمل رہ گیا عورت کو ہلکا سا۔ تو وہ حمل کے ساتھ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بڑھا تو دونوں سائل ہوئے اللہ سے کہ اگر تو نے (ساتھ خیریت کے) عطا فرمایا ہم کو تو ہوں گے ہم شکر گزاروں میں سے۔ مگر جب اس نے دامن مراد بھر دیا تو ٹھہرانے لگے ان عطیے میں اس کے شرکاء۔

اسی بنا پر بکثرت حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنے اصحابؓ کے نام عبدالعزیٰ اور عبدالشمس وغیرہ بدل کر عبداللہ اور عبدالرحمٰن رکھے ــــــ بہرحال یہ ہیں شرک کے وہ معروف قالب جن سے شارعؑ نے صراحۃً اسی لیے منع فرمایا کہ ان میں شرک بس گیا ہے۔

ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت

(از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

موجودہ تہذیب جدید کا تجزیہ | موجودہ جدید تہذیب کے اقانیم ثلثہ یہ ہیں :۔

(۱) فکر و ضمیر کی حریت

(۲) مادی ذہنیت

(۳) ذوق حسن و جمال

یہ تینوں رومی و یونانی تہذیب سے لئے گئے ہیں اور اس وقت لئے گئے ہیں جبکہ مذہب دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنی افادیت کھو چکا تھا۔

دراصل مسیحیت نے دنیوی حالات و معاملات کی طرف کوئی توجہ دی اور نہ اجتماعی و تمدنی مسائل سے اپنا تعلق قائم رکھا اور دنیا کو اس قدر حقیر و ذلیل کر دکھلایا کہ فطرت خود اس کے خلاف ردعمل پر مجبور ہوئی،

اس صورت حال سے تینوں نے کافی فائدہ اٹھایا، اور کسی مزاحمت کے بغیر نہایت آزادی و بیباکی کے ساتھ ان کو برگ و بار لانے کا موقع ملا،

ابتداء میں زندگی آگے بڑھنے کی طرف زیادہ متوجہ تھی، اس بنا پر مزاحمت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، لیکن بعد میں جب برگ و باری کی "جولانیاں" قابو سے باہر ہوئیں، اور خرمن انسانیت جلنے لگا تو فلسفہ کے ذریعہ آگ بجھانے کی کوشش ہوئی۔ حالانکہ یہ آگ فلسفہ کی خشکی سے نہیں، ایمان و وجدان کی "سیرابی" سے بجھ سکتی تھی۔

"جولانیوں" کے بے قابو ہونے کے بعد آگ کے شعلے کسی ایک گوشہ میں محدود نہ رہ سکے، بلکہ عقائد

خیالات، افکار و احساسات، سیاسی و اقتصادی نظام، اجتماعی و عمرانی فلسفہ، عائلی و معاشرتی تنظیم، شخصی و انفرادی تشکیل، غرض زندگی کا ہر شعبہ اور شعبہ کا ہر گوشہ اس کی لپیٹ میں آگیا۔ فطرت کا مفہوم بدلا، زندگی کے نئے تصور نے جنم لیا، فلسفہ و تاریخ کی مادی تعبیر ہوئی، اور مذہب و اخلاق کی معاشی توجیہ ہوئی اور بات یہاں تک پہونچ گئی کہ

(۱) انسان نورانی الاصل کی جگہ حیوانی النسل قرار پایا　　(نظریۂ ارتقاء (ڈارون)

(۲) فطرت کی لطافت جبلت کی کثافت سے بدل گئی،　　(نظریۂ جبلت (میکڈوگل)

(۳) عفت و عصمت کا آبگینہ جنسیت کی ہوسناکی سے پامال ہوا، (نظریۂ جنسیت (فرائڈ)

(۴) انسان کی روحانیت اشتراکیت کی قساوت سے پاش پاش ہوئی (نظریہ اشتراکیت (کارل مارکس)

اور بالآخر تہذیب جدید نے انسان کو ایک ایسی "نوع" میں تبدیل کر دیا جس کے اغراض و مقاصد مبداؤ منتہا سب قدیم تہذیب سے مختلف تھے،

اس کا شریف و صالح انسان وہ نہیں ہے جو اخلاقی جواہر و بلند کرداری سے آراستہ ہو بلکہ وہ ہے جو فتحیاب ہو کر بقاء و ارتقاء حاصل کرے خواہ اس کے اوصاف و اخلاق "درندے" جیسے ہوں،

اسی طرح رذیل و غیر صالح وہ ہے جو شکست کھا کر ناکام و نامراد رہے۔ اگرچہ وہ "فرشتہ" جیسے خصائل و اوصاف سے متصف ہو،

یہ تبدیلی اور قلب ماہیت محض اس بناء پر ہوئی کہ مذہب دنیا سے کنارہ کش ہو گیا، اور انسانی مسائل کارخانوں، تجربہ گاہوں اور اعداد و شمار کے دفتروں میں حل ہونے لگے،

مادی ترقیات | جدید تہذیب نے اگرچہ انسان کی روحانی خصوصیات کو نہ باقی رہنے دیا، لیکن مادی ترقیات میں اس قدر محیر العقول کارنامے انجام دیے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں، چنانچہ اس نے عالم فطرت کا مطالعہ کیا، کائنات کے سربستہ راز کھولے، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، تاروں کی گزرگاہوں تک پہونچی، سمندر کی سطحوں کو پاٹا، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روندا، مختلف علم و فن ایجاد کیے، قوت و طاقت کے نئے سامان فراہم کیے، نشر و اشاعت کے نئے ذریعے اختیار کیے، صنعت و حرفت کی نئی راہیں نکالیں، تجارت و زراعت کی نئی تنظیم کی، جلب منفعت کی شاہراہیں کھولیں، دفع مضرت کی اسکیمیں بنائیں، ذرائع آمدنی میں اضافہ کیا، ضروریات زندگی کی نئی طرح ڈالی، اس طرح ایک نیا نظام معاشرت

وجود میں آیا اور نئی زندگی نے جنم لیا۔

روحانی تسکین کا سامان | اس نئی زندگی میں صرف مادی ضرورتوں کا بندوبست نہیں ہے، بلکہ روحانی تسکین کا سامان بھی ہے، مثلاً فنون لطیفہ کی عریاں نمایش، عیش میں مشغول حسن وجمال کی تصویریں، شراب کی لہریں، رقص و سرود کی محفلیں، موسیقی کے نئے نئے عنوانات، حسن ونمایش کے نئے نمونے اور ڈانس کے نئے طریقے، بوائے فرینڈ و گرل فرینڈ کا سسٹم، کال گرل، کمپنی گرل اور پارٹی گرل میں تبدیل شدہ لیڈیاں، بعض ایسے "ازم" جن کی رو سے جنسی خواہش کو دبانا و چھپانا گناہ ہے، اور جنسی تسکین کا یہ فلسفہ کہ جس طرح انسان اپنی پیاس بجھانے میں آزاد اور خود مختار ہے کہ جس سے چاہے پانی کا گلاس حاصل کرے، اسی طرح جنسی پیاس بجھانے میں وہ آزاد ہے کہ جس سے اور جس طرح چاہے اپنی پیاس بجھا کر تسکین حاصل کرے، اس میں کسی قسم کی رکاوٹ شخصی و پرسنل معاملے میں مداخلت ہے، وغیرہ،

مغرب کی ترقی میں سلبی پہلو کا اثر انداز ہے | تہذیب جدید کے اس مجموعہ میں صرف ایجابی پہلو کو دخل نہیں ہے، بلکہ سلبی پہلو بھی اثر انداز ہے، مذہب کے خلاف چونکہ فطرت کا "ردعمل" موجود تھا اس بنا پر تشکیل جدید کے معماروں نے دفاعی انداز اختیار کرنے میں زیادہ سہولت سمجھی اور زندگی کی گاڑی کو اسی "لائن" پر ڈال دیا۔

بلاشبہ یہ "انداز" ذہنی و فکری قوتوں کو منظم کر کے کاروانِ حیات کو تیز سے تیز تر بنا دیتا ہے، لیکن "بریک" پر اس کو قابو نہیں حاصل ہوتا ہے، اس لئے اسٹیم (احساس وجذبات) کی طاقت زندگی کی گاڑی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے، اور انسان محض "تماشائی" بن کر رہ جاتا ہے،

ایک شبہہ کا جواب | ممکن ہے بعض حضرات کو شبہہ ہو کہ مذکورہ وسائل واسباب روح کی روایت ولطافت کے خلاف انسان کی تسکین کا ذریعہ کیسے قرار پائے، اور ان سے کیونکر تسکین حاصل ہو سکتی ہے؟

لیکن روایت ولطافت کی جس بنیاد پر شبہہ کی گنجائش نکلتی ہے، جدید تہذیب نے اسکی بنیاد ہی کو منہدم کر دیا ہے، اب انسان اصل کے لحاظ سے "نورانی" نہیں بلکہ "حیوانی" بن گیا ہے اور ترقی کا جو اصول جسم انسانی کے تمام اعضا میں کام کر رہا ہے، بعینہٖ وہی اصول ذہنی وعصبی نظام میں جاری ہے، یعنی جسم کی طرح انسان کی تمام تر ذہنی وفکری خصوصیات بھی حیوان سے بتدریج ارتقاء کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی ہیں، اور نفس، روح، عقل، شعور وغیرہ مادہ ہی کی ایک صورت اور اسی کی نشو و

ارتقاء کا نتیجہ ہیں، یا ہر سے کسی اور "جوہر" یا روحانی مداخلت کی کار فرمائی نہیں ہے،
اس بنا پر روح کی گذشتہ روایت و لطافت کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا، جدید انسان کی جیسی روح تھی اس کی مناسبت سے تسکین کے لئے سامان فراہم کئے گئے ہیں،

تہذیب جدید کے پاس سب کچھ ہے | غرض تہذیب جدید کے پاس مادی ضرورتوں اور روحانی تسکین کے لئے سب کچھ ہے، عورت، دولت، حکومت، تصورات، نظریات، ایجادات، اختراعات، علم و فن، فلسفہ و سائنس کار و ہوائی جہاز، بنگلہ و فرنیچر، کلب و پارک، شراب و کباب، سینما، کیمرا، ٹیلی ویژن، ریڈیو، ٹرانسسٹر، ٹرانسمیٹر، ریفریجریٹر، ایرکنڈیشن، حسن کی نمائش، جوانی کی امنگ، محبت کی فراوانی، اور ہوس کی حکمرانی وغیرہ۔

نیز اس کے قدموں پر مہ و انجم کی جبینیں جھکی ہوئی ہیں، اس کے عشرت خانوں میں پھولوں کی سیجیں بچھی ہوئی ہیں۔ اس کے قبضہ میں سرمستی کی جاگیریں ہیں، اس کے تصرف میں ہوس رانی کی قندیلیں ہیں، اس کے چہرہ پر غازۂ سے تاب ہے، اس کی آنکھ میں سرمۂ برق پاش ہے اور ان سب کے ساتھ "لوریاں" دینے کے لیے گرجا، پادری، انجیل مقدس اور اقانیم ثلثہ (ابن، اب، روح القدس) بھی موجود ہیں۔

مشرقی تہذیب کا حال زار | ادھر مشرقی تہذیب جس کو بد قسمتی سے تمامتر "اسلامی" سمجھ لیا گیا ہے، اس میں غربت و افلاس ہے، فاقہ زدہ جھریاں پڑے چہرے ہیں بے نور آنکھیں اور خشک ہونٹ ہیں، خالی دماغ اور بجھے دل ہیں، ویران بستیاں اور سنسان سڑکیں ہیں، چٹیل جنگل اور بنجر کھیت ہیں، غم خانے ہیں جن کو مٹی کا دیا میسر نہیں ہے، جھونپڑیاں ہیں جن کے چولھے ٹھنڈے پڑے ہیں، بے روزگاری کی حسرت و نامرادی ہے۔ باپ کی مجبوری اور اولاد کی سرکشی ہے، بیوائیں ہیں جن کے سینہ کو فاقہ کی "انی" برمائے ہوئے ہے، یتیم بچے ہیں جن کے آنسو خشک ہو چکے ہیں، دوشیزائیں ہیں جو یاس و حرمان کی تصویر بنی بیٹھی ہیں، معصوم کلیاں ہیں جو بن کھلے مرجھا رہی ہیں،

ذات پات اور رسم و رواج کی لعنتیں ہیں، مفت خوری و کام چوری کی عادتیں ہیں، ذاتی مفاد و اغراض کی پرستش ہے، قسمت کا ماتم ہے، جوانوں و نوجوانوں تک میں مایوسی ہے،
نیز حکمراں ہیں جن کا عزازیل سے سمجھوتہ ہو چکا ہے، قائدین ہیں جن کا حکمرانوں سے معاہدہ ہو چکا ہے، امراء ہیں جن کی عیاشی کی داستانیں ضرب المثل ہیں، زمیندار ہیں جن کے شکنجے میں کاشتکار کراہ رہے

ہیں، علماء ہیں جن کے دماغ جواب دے چکے ہیں، صوفیاء ہیں جن کے دل سرد ہو گئے ہیں، نئی جلوہ گاہوں کے مدہوش ہیں، جنھوں نے ہوش میں آنے سے انکار کر دیا ہے، مذہبی طبقہ ہے جس کی باہمی دست و گریبانی سے ملاء اعلیٰ میں پریشانی ہے۔ مذہب ہے جس میں شرک و نفاق کی آمیزش ہے۔ مذہب ہے جس میں دین و دنیا کی تقسیم ہے، اور ان کے ساتھ "رب العٰلمین رحمۃ للعالمین"، "ہدی للناس" اور "شفاء للناس" کے نام بھی موجود ہیں،

مشرق مغرب کی گود میں جا بیٹھا | اس تہذیب کا حامل معاشرہ سسکیاں لے رہا اور دم توڑ رہا تھا، عرصہ کے بعد جب اس نے کروٹیں بدلنا اور ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا تو اس کے سامنے ایک طرف لٹی پٹی فرسودہ چیزیں اور یاس و حرماں کی تصویریں تھیں، دوسری طرف نشاط و امنگ سے معمور زندگیاں اور قوت و طاقت سے بھرپور "توانائیاں" تھیں،

بیمار تو تھا ہی جس میں نہ ضبط و تحمل کی طاقت تھی اور نہ مدافعت و مزاحمت کی صلاحیت، مشرق و مغرب کے اس تضاد کو برداشت نہ کر سکا اور تہذیب جدید کی گود میں جا بیٹھا،

بالغ نظر علماء نے روکا، صاحب دل صوفیہ نے دعا کی، دانشوروں نے سمجھایا، مفکروں نے زور لگایا، دیدہ وروں نے شور مچایا اور فلسفیوں نے ماتم کیا لیکن یہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکا بلکہ ان بزرگوں کی کوششیں ان لوگوں کو بھی زیادہ متاثر نہ کر سکیں جن کی آنکھیں ابھی نہیں کھلی ہیں، اور جن کی علیٰحدگی "عصمت بی بی از بے چادری" کے مصداق ہے،

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کہیں فطرت خود ہی "ردعمل" پر تو مجبور نہیں ہو رہی ہے؟ اور تنگی و فرسودگی تو اس بغاوت کا سبب نہیں بن رہی ہے؟

یہ صحیح ہے کہ بیماری جھنجھلاہٹ پیدا کرتی ہے اور مشروب پینے سے انکار پر آمادہ کرتی ہے لیکن "ساقی" اپنی ذمہ داری سے کیسے سبکدوش ہو سکتا ہے، جبکہ پلانے میں اس نے بیمار کی حالت کا لحاظ کیا ہے اور نہ زمانہ کی رعایت سے نئے ساغر و مینا تیار کیے ہیں،

فطرت خود کاٹ چھانٹ کرتی ہے | دراصل یہ عالم کون و فساد ہے، یہاں ہر بگاڑ کے ساتھ بناؤ اور ہر تخریب کے ساتھ تعمیر ہے، نظامِ عالم کے ہر گوشہ میں کاٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے اور وہ خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتا رہتا ہے، جہاں کوئی شئے فٹ کر دی گئی، پھر وہ کمتر شئے کے لئے جگہ نہ چھوڑے گی،

اسی طرح یہاں قوموں کا عروج و زوال اور تہذیبوں کا اتار چڑھاؤ ہمیشہ ہوتا رہا ہے لیکن آجتک نہ

کوئی قوم اپنی سابقہ حالت پر واپس آئی ہے اور نہ کوئی تہذیب اپنی عمارت اور کھنڈروں کے سا
لوٹ سکی ہے۔

قانون فطرت کی یہ کارفرمائی مشرق و مغرب میں مسلم ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا خلاف ورزی کبھی نہیں ہوتی ہے۔

اس بنا پر جس طرح مغرب نے اصول و مبادیات اپنی قدیم تہذیب سے اور دوسرے ضروری سامان مشرق سے لے کر تہذیب جدید کی عمارت تیار کی ہے، اسی طرح مشرق کو اصول و مبادیات اپنی قدیم تہذیب اور دوسرے ضروری سامان مغرب سے لے کر ایک اور "تہذیب جدید" کی عمارت تیار کرنی چاہیے۔

یہ کوئی انوکھی بات نہ ہوگی، بلکہ ہر نئی تہذیب قدیم و موجود تہذیب کی بے شمار چیزیں لے کر دوبارہ آب و تاب اور نئے نقش و نگار کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

مغرب کی قدیم تہذیب کے پاس چونکہ اصول و مبادی کم تھے اس لئے اس کے کاروانِ حیات کو دفاعی انداز اختیار کرنا پڑا اور اس کو "بریک" پر قابو نہ رہ سکا، لیکن مشرق کی قدیم تہذیب اصول و مبادیات سے مالامال ہے، جو "کاروان" کو ایجابی انداز عطا کرتے اور "بریک" کو بے قابو نہیں ہونے دیتے ہیں۔

ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت اس لئے ہے کہ مشرق ہے اور مغرب ہے، ان میں سے کوئی بھی محض دوسرے کی نقل و تقلید سے اپنے مسائل حل نہیں کر سکتا، پھر کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جن میں کسی کی تخصیص نہیں ہے، ان کو حل کئے بغیر کوئی قوم نہ مطمئن ہو سکتی اور نہ بقاء کی ضمانت حاصل کر سکتی ہے، مثلاً (۱) زندگی کے اطمینان و سکون کا مسئلہ (۲) جذبات پر عمل کرنے کا مسئلہ اور (۳) عورت کا مسئلہ

یہ تینوں اس قدر اہم ہیں کہ ان کے حل کے بغیر ہر جگہ اور ہمیشہ زندگی خود زندگی ــــب ہے اور تمدن خود تمدن کا دشمن ثابت ہوا ہے، ان ہی سے گریز و فرار کی بنا پر موجودہ تہذیب سا دام کا شکار ہو رہی ہے اور فطرت کا انتقام شروع ہو گیا ہے،

موجودہ تہذیب کے ساتھ انتقامی کارروائی (۱) زندگی کو پرسکون بنانے کے لئے عقل و فلسفہ کی نگاہیں عرصہ ہوا بیکار

بت ہو چکی ہیں، لیکن ایمان و وجدان کی شمع ابتک روشن ہے، جس کی جانب مغرب نے کوئی توجہ نہیں ا، جس کے نتائج حسب ذیل ہیں:

خودکشی کے جس قدر واقعات مغرب میں ہو رہے ہیں مشرق اپنی تمام مایوسیوں اور ناکامیوں کے وجود اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہ تہذیب طبعی نیند سے محروم ہو گئی ہے، اور نیند لانے کے لئے تقریباً بچاسی فیصدی آبادی تک خواب آور گولیوں کے استعمال پر مجبور ہو رہی ہے،

یہ تہذیب فطری سکون سے محروم ہو گئی ہے اور عارضی سکون کے لئے نشہ آور گولیوں کا استعمال بکثرت ہونے لگا ہے،

شراب پانی کی طرح عام ہو گئی ہے، بچے، بوڑھے، جوان سب اس مصیبت میں مبتلا ہیں، اور ب تو ایل، ایس، ڈی (نشہ) کی مقبولیت روز افزوں ہے، جس کے استعمال سے انسان اتنا مدہوش ہو جاتا ہے کہ اس کی تمام دبی ہوئی خواہشات قول و فعل کے ذریعہ ظاہر ہونے لگتی ہیں،

اس تہذیب نے باہمی الفت و محبت کے احساسات لطیف بالکل ختم کر دیے ہیں، اور آج ہر انسان اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہے،

ان واقعات و حالات سے ظاہر ہے کہ موجودہ تہذیب اپنی تمام رعنائیوں اور دلکشیوں کے باوجود اخلاقی انحطاط کے کس درجہ پر پہونچ گئی ہے اور کس قدر غم آفریں بن گئی ہے، روح کی بےچینی اور ضمیر کی بیقراری اتنی بڑھ گئی ہے کہ انسان کو کسی کروٹ چین نصیب نہیں ہے، اور کوئی ایسا رشتہ اقی نہیں رہ گیا ہے جس کے ذریعہ جسم و روح میں ربط و تعلق قائم رہ سکے۔

جد[illegible] تہذ[illegible] (۲) کوئی ایسی مشین ابتک ایجاد نہ ہو سکی جو عقل کو جذبات پر غالب رکھ سکے، اس کا کے [illegible] یہ بھی [illegible] نتیجہ یہ ہے کہ مغرب نے شکم کی بھوک پر تو قابو حاصل کر لیا ہے لیکن جنسی بھوک میں تہذیب [illegible] ختم کر دیے ہیں، پھر بھی تسکین کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، عورت کو مختلف ازموں کے دنتائ[illegible] کے ذریعہ ہوس رانی کے لئے طرح طرح سے استعمال کیا جا رہا ہے، استلذاذ بالمثل کے سے ہر ۱۹۶۵ء میں لندن کے دار العوام سے جواز کا فتوی لیا جا چکا ہے، اسکے بعد دیکھئے جنسی تسکین کے لئے کونسی صورت اختیار کی جاتی ہے۔

اس تہذیب نے عورت کے کس بل نکال لئے ہیں	(۳) عورت کا مسئلہ نازک سے نازک تر بنتا جا رہا ہے، اور مغرب کا دماغ اس کو حل کرنے میں ناکام ہو چکا ہے،

عورت ایک جوہری اور مستقل مخلوق ہے، جس کی کارگزاریوں اور قربانیوں سے انسانیت کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، اس کے بغیر جنت بھی آدم کے لئے ویران تھی، اس میں حوا ہی سے جان پڑی، اگر عورت نہ ہو تو دنیا بے آب و رنگ ہو کر رہ جائے۔

اسی کی بدولت آدم نے "ٹریننگ کورس" کی تکمیل کی اور اسی کی معصومانہ لغزش دنیا کی آبادی کا سبب بنی، اس نے اپنی زندگی دے کر زندگی کے "راز" سکھائے، اسی کی گود نے علم و ہنر کے چشمے بہائے، اور اسی کی مسرت نے خار میں پھول کھلائے۔

تہذیب جدید کے لئے بھی اس کی کارگزاریاں و قربانیاں کچھ کم نہیں ہیں، لیکن اس نے اس کا نسوانی وقار کھو کر محض بزم عشرت کا کھلونا بنا دیا۔ اور اس غریب کو اس قابل نہ رکھا کہ وہ اپنے نسوانی شرف سے انسانی عزت و شرف کی حفاظت کر سکے، اس کے شیشۂ دل کو اپنی "مشین" کا پرزہ بنایا، اس کے آبگینۂ عصمت کو فولادی "سان" پر چڑھایا۔ اس کے معصوم حسن کو نمائش کے بازار میں فروخت کیا اور جب ان سب میں وہ بے زبان تکلی تو مرغیوں کی طرح اس کو انڈا سینے پر لگایا، چنانچہ اسی اپریل ۱۹۶۶ء میں نیویارک کے مشہور تاجر مرے زیرٹیس (Manny Zaeates) نے اشتہار دیا ہے کہ "ایک ایسی ماڈل ٹائپ گرل کی ضرورت ہے جو مرغی کے انڈوں پر بیٹھکر مرغی کی طرح ان کو سینے کا کام دے سکے، ایسی نوجوان خاتون کو روزانہ سو ڈالر (پانچ سو روپیہ) اجرت دیجائے گی اور کام کے ختم پر ایک ہزار ڈالر بطور انعام ملے گا۔"

ایسی جلیل القدر خدمت کے لئے بھی "ماڈل گرل" نے اپنی وفاداری اور خود سپردگی پر آنچ نہ آنے دی اور ساٹھ سو سے زائد درخواستیں بھیجکر اپنی عالی ظرفی و فراخ حوصلگی کا ثبوت پیش کر دیا۔

ماڈل گرل آفت پرکالہ میں تبدیل ہو چکی ہے	غرض موجودہ تہذیب نے عورت کی اصل حیثیت بالکل ختم کر دی ہے اور اب وہ بھی اس سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے جس میں اسکو موجودہ تہذیب نے بہا

دیا ہے، چنانچہ ہر طریقہ کے مانع حمل آلات کے استعمال کے باوجود امریکہ میں ۱۹۶۵ء کے سروے کے مطابق ہر سال دس لاکھ اسقاط ہوتے ہیں، اس سے چھوٹے ملک "اٹلی" میں بھی یہی تناسب ہے بلکہ اس

سال چالیس ہزار عورتیں اسقاط کے صدمہ سے مرجاتی ہیں۔

"ڈنمارک" کی شرح پیدائش پچھتر ہزار فی سال ہے۔ لیکن ہر سال پندرہ ہزار سے پچیس ہزار تک اسقاط ہوتے ہیں، جن میں قانون کے مطابق صرف دو ہزار آپریشن ہوتے ہیں۔

"پیرس" اور "ہیمبرگ" شہروں میں اسقاط کی تعداد پیدائش سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے، اسی طرح بن باپ کے بچوں کی پیدائش میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، انگلستان اور "ویلز" میں منع حمل کی تمام تدبیروں اور اسقاطوں کے باوجود پچاس فی صد کنواری ماؤں کا اضافہ حال میں ہوا۔

عورتوں اور مردوں کے مشترک عریاں کلب قائم ہو جانے کے بعد عورت کی حیثیت چائے کے کپ اور سگریٹ کے پاکٹ سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے، اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں رجعت قہقری کر کے اپنی اصل پوزیشن پر نہ آجائیں، ان حالات میں توقع ہو سکتی ہے کہ مغربی تہذیب کی شکستہ کشتی اس بھنور سے نکل سکے گی،

موجودہ تہذیب کی بے بسی پر پاپائے روم کی خاموش شہادت

اس کا حل خود یورپ کے پاس بھی نہیں ہے، چنانچہ ابھی حال ہی میں ان حالات سے تنگ آکر پاپائے روم نے ایک کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے عصمت فروشی کی روک تھام پر زور دیا، لیکن جب ان سے سوال کیا گیا کہ اگر کسی ملک (جرمنی وغیرہ) میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو تو عصمت فروشی کا انسداد کس طرح کیا جائے۔ اس پر وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔

پاپائے روم جس مذہب کے نمائندہ ہیں، اس کے پاس اس صورتِ حال کا کوئی حل نہیں ہے، اور جو حل ہے اس کا اعتراف کرنے سے صدیوں کی بنائی ہوئی عمارت مسمار ہوتی ہے، اس بنا پر خاموشی کے سوا ان کے لئے چارۂ کار کیا تھا۔

تہذیب صرف زندگی کے دن پورے کر رہی ہے

اس تہذیب کا دوسرا ہلاکت خیز پہلو اسلحہ کی دوڑ ہے۔ چنانچہ امریکی وزیر دفاع نے اعلان کیا ہے:-

"ہمارے شہری علاقوں پر راکٹ پر ملنے سے اٹھاسی گھنٹے کے اندر دس کروڑ آدمی ہلاک ہو جائیں گے، ملک کی ساٹھ فیصد صنعتی استعداد تباہ ہو جائیگی علاوہ ایٹمی تابکاری

سے واقع ہونے والی اموات اس کے علاوہ ہوں گی۔"

اسی کے جواب میں روس کے وزیر دفاع نے تم ٹھونک کر اس کا یہ جواب دیا ہے کہ :۔

"روس نے ایسا خوفناک "میزائل" تیار کر لیا ہے جو علاوہ دنیا کے کسی حصہ پر ایٹم گرا کر اسے تباہ کر سکتا ہے، جس کا امریکہ کے پاس کوئی دفاع نہیں ہے۔"

یہ دم خم ۱۹۶۵ء کے ہیں، جس میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، اور چین کے حالیہ ایٹمی تجربہ نے تو ہر طرف ایک تہلکہ مچا رکھا ہے۔

اسلحہ کی اس دوڑ کے بعد تہذیب جدید آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھ گئی ہے، اگر اب بھی اس تہذیب کے حاملوں کا اخلاقی احساس بیدار نہ ہوا تو دنیا ان کے ہاتھوں جہنم بن جائے گی اور اس تہذیب کی لگائی ہوئی آگ خود اس کو خاکستر کر کے رکھ دے گی،

ایک اور جدید تہذیب کی بنیادیں

لیکن ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے، ان حالات کی اصلاح کے لئے ایک جدید تہذیب کی تشکیل کی ضرورت ہے، جس میں

(۱) انسان کی نوراتی اصل کو ابھارا جائے،

(۲) مادیت و روحانیت کا آمیزہ تیار کیا جائے،

(۳) ایمان و وجدان کے ذریعہ زندگی کو پرسکون بنایا جائے،

(۴) مؤثر اعمال اور تدبیروں کے ذریعہ جذبات پر عقل کو غالب رکھا جائے،

(۵) عورت کی قدر و منزلت اور صنفی خصوصیت کو ملحوظ رکھ کر اس کے اعمال و فرائض متعین کئے جائیں،

تشکیل کے لئے تین قسم کی توانائیاں درکار ہیں

اس جدید تہذیب کی تشکیل کے لئے تین قسم کی توانائیاں درکار ہیں:
(۱) سیاسی توانائی (۲) علمی توانائی اور (۳) مذہبی توانائی

مغرب نے ان ہی تینوں کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ اور ان ہی کے زوال نے مشرق کو اس کی اندھی تقلید پر مجبور کیا،

پہلی دو باتوں کے سلسلہ میں ہمارے بزرگوں کی مساعی بڑی حد تک کامیاب ہو چکی ہیں، یعنی سیاسی اداروں میں جان پڑ گئی ہے، اور علم و ہنر میں پیش رفت ہو چکی ہے،

لیکن مذہبی توانائی کا کام ہنوز باقی ہے۔ اس کے لئے دو باتوں کی شدید ضرورت ہے۔

(۱) مذہب کو زندگی میں جاری وساری بنایا جائے،

(۲) مذہب کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو اور اس کی تعلیمات فطرت وکائنات کے سربستہ رازوں کی تحقیقات میں مددگار ہوں،

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اس کے لئے مختلف جماعتیں اپنے اپنے انداز سے کام کر رہی ہیں اور خوشی ہے کہ ان کے ذریعہ مذہب کی تخم ریزی ہو رہی ہے، اور اس کی روایات سے تعلق قائم ہو رہا ہے، لیکن مجموعی اثرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تھکی ماندی قوتیں اور کام سے جی چرانے والی طبیعتیں ہیں کہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے پناہ لینے کے لئے بیٹھ گئی ہیں اور آگے بڑھنے سے گھبرا رہی ہیں۔

دوسری بات کے لئے کچھ نئی طاقتیں ابھر رہی ہیں، جن سے بجا طور پر توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان کی اکثریت ہوس کی نیرنگیوں اور عقل کی چیرہ دستیوں سے اس قدر مرعوب ہے کہ انہیں مذہب کی دلیرانہ نمایندگی کی سکت نہیں اور مشرق میں رہنمائی کی جرأت نہیں ہے،

ایسی حالت میں مذہبی توانائی کا کام کس قدر اہم ہے اور اس کے بغیر تہذیب جدید کی تشکیل کیوں کر ہو سکتی ہے،

وقت کا یہی وہ کام ہے جس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، جو شخص حالات وتقاضوں کو ملحوظ رکھ کر رضائے الٰہی کے لئے اس کام کو انجام دے گا، موجودہ دور میں تجدید احیائے دین کا سہرا اسی کے سر بندھے گا،

تشکیل کے لئے یہ وقت سب سے بہتر ہے

نئی تہذیب کی تشکیل کے لئے اس سے اچھا وقت غالباً پھر کبھی نہ آئے گا، کیونکہ مادیت کے سیلاب نے خود مغرب کے مفکرین کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور مشرق کے پاس وہ اخلاقی و روحانی روایات موجود ہیں، جنھوں نے ایک زمانہ میں مغرب کی رہنمائی کی تھی، دوسری طرف موجودہ دور کی وہ اختراعات موجود ہیں جن سے تہذیب جدید کی عمارت بنی ہے، وہ پیمانہ بھی موجود ہے جس کے ذریعہ خیر وشر کی حد بندی ہوتی ہے، ان سب کے صالح اجزاء کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب جنم لے سکتی ہے،

دیکھنا صرف یہ ہے کہ موجودہ اشیاء میں سے کس کو لینا اور کس کو چھوڑ دینا ہے، کس میں کانٹ چھانٹ

کرنا اور کس سے نظر بچا کر نکل جانا ہے، کس کو بعینہٖ "فٹ" کرنا اور کس کو بالکلیہ نظر انداز کر دینا ہے، کس میں نئی روح ڈالنا ہے، اور کس کے لیے نیا قالب تیار کرنا ہے، عبوری مرحلہ کس طرح گذارنا اور ہنگامی حالات کا کیسے مقابلہ کرنا ہے اور سب سے بڑی بات فطرت کی کاٹ چھانٹ کو سمجھنا اور اس سے عبرت حاصل کرنا ہے کہ چالیس سال کے عرصہ میں نہ معلوم کتنے "کافردل" کو "بجبر وہ مسلمان کر چکی ہے،

چونکہ مغرب نے اپنی جلوہ آرائیوں سے مشرق کی نگاہ اور دل دونوں کو فریب خوردہ بنا دیا ہے، اس بنا پر حزم و احتیاط کے باوجود اس کام میں شدید مخالفت ہوگی اور مختلف زاویۂ نگاہ کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ ایک طبقہ تردامنی کا دوسرا چاک گریبانی کا طعنہ دے گا، کسی کو "جدید" سے گھبراہٹ ہوگی، کوئی "تشکیل" سے برافروختہ ہوگا، اپنوں کی ناراضی اور بیگانوں کی شماتت کا مقابلہ کرنا پڑے گا، لیکن یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی، تعمیر و اصلاح کی راہ میں ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے۔ اس لئے "لومۃ لائم" کی پرواکیے بغیر بس اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اور خود کو مسئول مان کر تشکیل کے فرائض انجام دیتے رہنا چاہیئے۔

"ابتک اس سلسلہ میں کوئی ٹھوس و جامع کوشش نہیں کی جاسکی ہے، اور یہ کوشش بھی "جادو" کی چھڑی نہ ثابت ہوگی کہ اس کو اچھوتے ہی سارے کام بنجائیں، بلکہ اس میں کامیابی کے لئے ایک عرصہ درکار ہوگا، البتہ اس کوشش سے فوری اور بڑا فائدہ یہ ہوگا یہ کوشش "ریکارڈ" میں آجائیگی، اور خود فطرت حسب ضرورت اس سے استفادہ پر مجبور ہوتی رہے گی، اور ایک دن دنیا یہ بھی دیکھ لیگی کہ مشرق مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائے گا، اور نئے نقش و نگار اور نئی آب و تاب کے ساتھ دنیا کے افق پر نمودار ہوگا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

(بشکریۂ معارف اعظم گڑھ)

اسلامی لٹریچر میں

دینی روح اور علمی افادات سے بھرپور ایک

یعنی اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ — احادیثِ نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب

معارف الحدیث

[illegible]

زمانے کی نفسیات کا لحاظ — ہر سطح کے فہم و نظر کی رعایت — اور رشد کی اصل تصدیق پر زور

[illegible]

[illegible] ہر باب شروع کرنے کے تمہیدی نوٹ، شریعت کے نظام حکمت پر

[illegible] کی ایک مثال کہے جا سکتے ہیں

تالیف

مولانا محمد منظور نعمانی

جلد اول — ایمان و آخرت [illegible] کی حدیثیں [illegible]

جلد دوم — تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں [illegible]

جلد سوم — [illegible] کی حدیثیں [illegible]

[illegible]

کتب خانہ الفرقان [illegible] روڈ، لکھنؤ

34 No 11 Regd. No. L-353
APRIL 1967
Monthly 'ALFURQAN' Lucknow

Only cover printed at PRINTERS & PRINTERS Lucknow 3